



اگست 2012

پہننے  
دین

پیشانی کے ساتھ  
کمر کا بچ  
گہری کرت سیکھا





## عیدِ مبارک



- |     |             |                 |     |                   |                  |
|-----|-------------|-----------------|-----|-------------------|------------------|
| 283 | خالد جیلانی | کرن کا دسترخوان | 267 | شعاع عمیر         | کرن کرنا خوشبو   |
| 280 | اداری       | حسن و صحت       | 271 | بشری محمود        | یاد دل کے دیکھئے |
| 285 | ذوالقرنین   | تہل پہ دہلا     | 274 | شگفتہ سیلوان      | فجہ شیعہ لپیٹتے  |
| 286 | مدیرہ کرن   | ناعہ منی کے نام | 276 | ریحانہ امجد بخاری | مُسکراتی کرنیں   |

اگست 2012

جلد 35 نمبر 5

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار، کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے اپنی حسن پر خشک پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، تاج محل آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

محمد عثمان رضا 11

محمد عثمان رضا 11

حمد  
نعت



- |     |              |                |
|-----|--------------|----------------|
| 12  | شائین رشید   | صدیق اسماعیل   |
| 18  | سمبل         | میری باتیں     |
| 23  | راشد قادری   | دو کا پہلا     |
| 28  | شائین رشید   | میرا پہلا روزہ |
| 263 | رابعہ افتخار | مجھے تھیلے     |



- |     |             |             |
|-----|-------------|-------------|
| 230 | فوزیہ یاسین | دست کوزہ گر |
| 34  | نبیلہ عزیز  | در دل       |



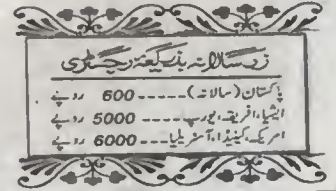
- |     |                 |                      |
|-----|-----------------|----------------------|
| 70  | عائشہ نصیر احمد | وصال کی شام          |
| 166 | مصباح نوشین     | محبتیں بکھرے نہ دینا |



- |     |                   |              |
|-----|-------------------|--------------|
| 212 | ریحانہ امجد بخاری | وہ اک پری ہے |
| 122 | فرحت شریک         | وفائیری ضد   |
| 134 | نفیسہ سعید        | میرا ستارہ   |



- |     |              |                 |
|-----|--------------|-----------------|
| 59  | فاقت جاوید   | دوستیاں کا لین  |
| 115 | شہزادی عباس  | رکشا والے بھائی |
| 197 | فاخرہ گل     | یہ ہے زندگی     |
| 155 | رابعہ افتخار | عید تہالے سنگ   |
| 252 | ام طیفور     | چھوٹیاں         |



ماہنامہ خواتین و انجمن اور ادارہ خاتین و انجمن کے تحت شائع ہونے والے ہر مہینہ شائع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل، جملہ ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت کی جھڑپ یا ذرا بھی تکلیف اور سلسلہ وار قطع کے کسی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ کا نقلیہ چارہ جاتی کا حق نہ ہے۔



اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ رحمت و مغفرت کا بابرکت مہینہ ہم پر سایہ لگن ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جسے نزول قرآن کا مہینہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس ماہ مبارک میں صبح و شام، دن رات تمام ہی اوقات دعاؤں کی قبولیت کے ہیں۔ درجیم و کریم رب کا درمیانے والوں کے لیے ہمہ وقت کھلا ہے۔ صبر و شکر، ذکر و عبادت رضا بالغضا، نیکیوں پر استقامت اور گناہوں سے اجتناب غرض یہ کہ وہ کون سے محاسن و خوبیوں میں جو عبادات پر ہم میں موجود ہیں۔

درس رمضان یہ ہے کہ جب کوئی نہ دیکھے تب بھی اللہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہی ایک اللہ جو ہم سے دُور ہے اور نہ ہی ہم سے جدا۔ جس نے حقیقت صوم کو پایا اس نے تقویٰ کو پایا اور جس نے تقویٰ اختیار کیا اسے قرب الہی نصیب ہو گیا۔ لہذا یہ ہی وقت ہے تقویٰ اختیار کر کے قرب الہی حاصل کرنے کا۔ اسی ماہ مبارک میں ہم نے آزادی میسی نعمت حاصل کی۔ یوم آزادی کے پر مسرت موقع پر اللہ رب العزت سے پاکستان کے تعلقے دوام اور خوشحالی کے لیے دعا کریں اور عہد کریں کہ آنے والے دنوں میں ہم صرف سچے محبت الوطن پاکستانی ہوں۔ آپس کی نفرتوں اور کدو دقوں سے پاک سچے پاکستانی بنیں۔ یہ ہی حب الوطنی کا تقاضا ہے۔

تاریخ کرام کو یوم آزادی اور ماہ رمضان مبارک۔

### محمود خاور کی برسی،

زندگی کے حقائق کا مشاہدہ اور غمزدہ فکر کے ساتھ وسیع اور بخیرہ موج صاف ان ہی لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے جو عین نگاہوں سے دنیا کو دیکھتے ہیں۔ "محمود خاور" بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھے جو دنیا کو بہت گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت حساس دل پایا تھا۔ ان کے تھکے محلوں میں بڑی کاٹ تھی۔

20۔ اگست کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین کرام سے دُعا کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ (آمین)

### اس شمارے میں،

- 1. نمبر پہلا دوزخ، رمضان المبارک کے موقع پر اداکاروں سے سروے،
- 2. نعت خزانہ صدیق اسماعیل سے شاپن رشید کی باتیں،
- 3. اداکارہ ساجد علی سے شاپن رشید کی ملاقات،
- 4. اداکار "داؤد فاروقی" دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- 5. "محمد سےیلے" میں معتقدہ زاہدہ افتخار کی باتیں،
- 6. فوزیہ یاسین اور نبیلہ حمزہ کے سلسلے وار ناول،
- 7. "میں عین کبوتر نے دنیا" مصباح نوشین کا دلچسپ مگن ناول،
- 8. "وصال کی شام" عائشہ نعیم احمد کا مگن ناول،
- 9. "نمبر سترہ" نفیسہ سعید کا ناولٹ،
- 10. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 11. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 12. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 13. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 14. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 15. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 16. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 17. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 18. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 19. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 20. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 21. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 22. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 23. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 24. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 25. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 26. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 27. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 28. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 29. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 30. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 31. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 32. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 33. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 34. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 35. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 36. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 37. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 38. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 39. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 40. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 41. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 42. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 43. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 44. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 45. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 46. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 47. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 48. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 49. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 50. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 51. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 52. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 53. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 54. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 55. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 56. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 57. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 58. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 59. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 60. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 61. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 62. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 63. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 64. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 65. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 66. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 67. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 68. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 69. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 70. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 71. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 72. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 73. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 74. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 75. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 76. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 77. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 78. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 79. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 80. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 81. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 82. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 83. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 84. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 85. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 86. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 87. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 88. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 89. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 90. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 91. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 92. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 93. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 94. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 95. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 96. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 97. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 98. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 99. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،
- 100. "دفا میری فدا" فرحت ثرکت کے ناول اور کادور اور نئی حد،

### ہفت،

کرن کتاب نگاری کرت سنگمار، ہر شمارے کے ساتھ نعت پیش خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔

تیری ذات اعلیٰ صفات ہے  
تو رحیم ہے تو کریم ہے

تو گمان و فہم سے دُور ہے  
تیرا ذرے ذرے میں نور ہے

تو ہی کار سازِ جہان ہے  
تیرے ہاتھ خلق کی جان ہے

ہے تیری رضا میری زندگی  
تیری یاد ہے میری بندگی

تو ہی جسم و جاں میں مقیم ہے  
تیری ذات اعلیٰ صفات ہے

تیرا بندہ سالک بے نوا  
کرے کس زباں سے تیری ثناء

کہ یہ ادنیٰ ہے تو عظیم ہے  
تیری ذات اعلیٰ صفات ہے

آئی نبی کی یاد تو دل شاد کر گئی  
ان کے مریضِ عشق کی قسمت سنو گئی

گھیرا ہوا تھا گردشِ ایام نے مجھے  
یادِ نبی یہ مشکلیں آساں کر گئی

سینے میں نور بھر گیا دل پر ہوئی جلا  
نعتِ رسولِ پاک بڑا کام کر گئی

بادِ صبا دیا رہِ مدینہ سے آئی تھی  
زلفِ نبی کی خوشبو سے سرشار کر گئی

ان کی نگاہِ خاص پہ قربان جلیئے  
دُنیا کے پیچ و تاب سے آزاد کر گئی

بحرِ معصیت میں جو پھنس گئی کبھی  
ان کے کرم سے ڈوبتی کشتی ابھر گئی

سالکِ سیاہ تھے میرے اعمال تو مگر  
فردِ عمل کچھ ان کے کرم سے سنو گئی



## صدیق اسماعیل سے ملاقات شاہین رشید



میں ہماری رہائش تھی اور اس علاقے میں آج بھی یمن برادری کثرت سے آباد ہے۔  
★ ”آپ کے بس بھائی اور آپ کی تعلیم؟“  
★ ”چار بھائی اور دو بہنیں اور والدین ہماری کل کائنات تھی۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر میٹرک تک کی تعلیم ”اوکھائی یمن“ اسکول سے حاصل کی اور پھر اسلامیہ کالج سے میں نے گریجویشن کیا۔“  
★ ”کب یہ انکشاف ہوا کہ آپ کے گلے میں سر ہے؟“

★ ”میرے والد نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی ”بادای مسجد“ کے نام سے اور یہ گاؤں کلی میں تعمیر ہوئی تھی۔ اور اس مسجد میں میں ابتدا سے ہی ہوں اور مسجد میں چونکہ حمد و نعت ہوتی تھی تو بچپن سے ہی یہ آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اور ہمارے علاقے میں ایک بہت ہی اچھے نعت خواں تھے

صدیق اسماعیل ایک خوب صورت آواز ہمارے ملک کا سرمایہ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں جب ان کی آواز گونجتی ہے تو داخل ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کی مناسبت سے ہم نے صدیق اسماعیل صاحب کا انٹرویو کیا۔ آپ بھی فیض یاب ہوں۔  
★ ”السلام علیکم۔ کیسے ہیں۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟“

★ ”وعلیکم السلام۔ جی الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور جناب میں 17 رمضان المبارک 1956ء میں کراچی میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام اسماعیل ہے اور انہوں نے ہی میرا نام محمد صدیق رکھا ہمارا تعلق یمن برادری سے ہے اور جیسا کہ آپ سب کو پتا ہے کہ یمن ————— زیادہ تر بزنس کرتے ہیں تو میرے والد بھی بزنس میں تھے۔ میٹھار کے علاقے



★ ”گویانی ہوئی سے آپ کی شہرت کا آغاز ہوا؟“  
★ ”جی ہاں بی وی نے مجھے کافی شہرت دی اور بی وی میں ہی مجھے دیکھ کر لوگ پھر نجی محفلوں میں مجھے بلائے گئے۔ پھر کراچی میں بلدیہ عظمیٰ کراچی کے ”میسر عبدالستار افغانی“ نے مجھے بلدیہ عظمیٰ کراچی کے لیے مستقل ہائر کر لیا اور اس کے تحت جتنی بھی سرکاری تقریبات ہوتی تھیں جن میں سربراہان مملکت شرکت کیا کرتے تھے مجھے حمد و نعت کے لیے بلایا جاتا تھا۔“  
★ ”پھر تو آپ کی بڑے بڑے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی ہوگی؟“

★ ”بالکل جی۔ دنیا کے مشہور معروف لوگ اور سربراہ آتے تھے اور ان سب سے میری ملاقات ہوتی تھی اور پھر ان خدمات کے عوض مجھے 1986ء میں جنرل ضیاء الحق نے پرائڈ آف پرفارمنس دیا۔ اور پھر مجھے یورپ اور دیگر ممالک میں بھی بلایا جانے لگا 1982ء میں عمرے کی سعادت بھی پہلی بار حاصل ہوئی۔“

★ ”سب سرکاری سطح پر ہوتا تھا؟ یعنی غیر ملکی دورے؟“  
★ ”نہیں۔ سرکاری سطح پر نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بسنے والے لوگوں کی پرائیویٹ تنظیمیں مجھے بلاتی

حاجی یوسف اشرفی صاحب ڈان کی آواز جب میرے کانوں میں گونجتی تھی تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اور ان کو سن کر مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی حمد و نعت پڑھا کروں۔ اور پھر میں بھی مسجد میں جا کر حمد و نعت پڑھنے لگا اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس آواز سے خوش ہو کر ہمیں اتنا بڑا انعام دے گا اور ہم پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے گا۔“  
★ ”موسیٰ کے لیے تو ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا حمد و نعت کے لیے بھی ٹریننگ ضروری ہوتی ہے؟“

★ ”جی بالکل ضروری ہوتا ہے۔ جس طرح سونا اور ہیرے کو تراشانہ جانے اس میں خوب صورتی نہیں آتی ہے۔ تو میں نے بھی حاجی یوسف اشرفی صاحب سے تربیت لی اور اس وقت میری عمر تقریباً ”نویادس سال تھی۔ جب میں نے ریڈیو میں بچوں کے پروگرام میں حمد و نعت پڑھنا شروع کی کیونکہ اس وقت ریڈیو ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جہاں ہم اپنا شوق پورا کر سکتے تھے تو بچوں کے پروگراموں میں پسندیدگی کے بعد مجھے جنرل پروگراموں میں بھی لیا جانے لگا۔“  
★ ”ریڈیو تک کیسے پہنچے تھے؟“

★ ”ریڈیو پاکستان تک ایسے پہنچا کہ ریڈیو پاکستان نے مقابلہ نعت خوانی کرایا جس میں شہر کے 100 بچے شامل ہوئے اور اس میں الحمد للہ میری پہلی پوزیشن تھی۔ اور پھر اقاعدے سے میں ریڈیو پاکستان کراچی سے پروگرام کرنے لگا۔ پھر جب کراچی میں بی بی وی کا آغاز ہوا تو بی بی وی کی پہلی نعت پڑھنے کے لیے مجھے بلایا گیا۔ اس وقت عبدالکریم بلوچ پروڈیوسر ہوا کرتے تھے۔ سید آفتاب عظیم، قاسم جلالی، سعید محسن علی اور دیگر پروڈیوسرز نے میرے بہت پروگرام کیے۔“

★ ”اس زمانے میں لائو کاروائج تھا یا ریکارڈنگ کا؟“  
★ ”ارے نہیں ریکارڈنگ نہیں ہوتی تھی بلکہ لائو پروگرام ہوا کرتا تھا چار گھنٹے کی نشریات ہوتی تھیں۔ تو میں نے کافی پروگرام کیے۔“





”بیگم میمونہ ہاؤس وائف تھیں۔ اب تو تقریباً“  
سال ہو گیا ہے وہ اللہ کو پیار ہو گئی ہیں لیکن یہ بڑی  
خوشی کی بات ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی سارے بچوں  
کی شادیاں کر سکیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے  
میرے ساتھ دو مرتبہ حج کیے، عمرے کیے۔ میرے  
ساتھ سفر بھی بہت کیے۔ بغداد، کربلا، معلہ اور کئی  
جگہوں کی زیارتیں ہم نے مل کر کیں۔“

★ ”سال پہلے ان کا انتقال ہوا تو زیادہ عمر تو نہیں ہوگی  
ان کی؟“  
★ ”جی ہاں۔“  
انقتال کے  
وقت ان کی عمر 45 سال تھی۔ وہ شوگر کی مریضہ تھیں۔  
ایک دن اچانک ان کی شوگر لو ہو گئی اور وہ ”گوا“ میں  
چلی گئیں اور بس اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔“  
★ ”اب زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“  
★ ”ظاہر ہے کہ وہ میری شریک حیات تھیں۔ بہت  
لیسا ساتھ رہا ان کا اور میرا ہر جگہ میرے ساتھ ہوتی  
تھیں۔ میرا ہی نہیں بچوں کا بھی بہت خیال رکھتی  
تھیں وہ تو ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں تھیں۔ ہم  
سب بہت اودھو اور محسوس کرتے ہیں ان کے بغیر۔“  
★ ”بچپن سے لے کر اب تک آپ مزاج کے کیسے

بڑنس کر لو؟“  
★ ”مجھے اعزازی طور پر بہت سی جاب کی آفرز  
ہوئیں۔ مجھے بینک والے بلاتے تھے پی آئی اے نے  
آفر کی، لیکن میں ایسی پوزیشن میں نہیں تھا کہ جاب  
کرنا کیونکہ اس زمانے میں بے مصروفیات ہوتی تھیں  
اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں جاب کے لیے ہاں  
بھریوں اور کچھ نہ کر سکوں اور بلاوجہ میں تنخواہ وصول  
کرنا رہوں چنانچہ میں شکر ہے کے ساتھ معذرت کر  
لیتا تھا کہ میں جاب کو وقت نہیں دے سکوں گا۔ ہاں  
جب ریٹو ہو یہ بڑھنے جاتا تھا تو وہاں سے مجھے چیک ملا  
کرتے تھے تو مجھے بہت خوشی ہوتی تھی اور آپ کو  
بتاؤں کہ میں نے اپنے تعلیمی اخراجات بھی خود پورے  
کیے اور کبھی مجھے انگٹے کی ضرورت نہیں پڑی۔“  
★ ”حدودت تو آپ بڑھتے ہی تھے۔ دین کے ساتھ  
دنیا کو بھی رکھایا دنیاوی خواہشات کو مار دیا؟“  
★ ”میں نے دنیاوی خواہشات کو مارا تو نہیں لیکن  
اللہ تعالیٰ نے ہمارا ذہن اس طرف لگایا نہیں۔ اور  
نوجوانی میں انسان کی بہت سی خواہشات ہوتی ہیں لیکن  
یہ کہہ دینا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے اللہ  
نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ  
کوئی غلط کام نہیں کیا۔ نظروں میں حیا بھی تھی اور  
دماغ کو ایسا بنادیا کہ کوئی قدم برعہانے سے پہلے اس نے  
سوچنے سمجھنے کا موقع ضرور دیا۔ دوستیاں سب سے  
رہیں لیکن پاکیزگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔“  
★ ”شادی کب ہوئی اور بچے کتنے ہیں؟“  
★ ”جب میں چوبیس سال کا تھا تو میری شادی ہو گئی  
اور میری پسند سے ہوئی اور ہماری برادری میں ہی ہوئی  
اور میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور دونوں بیٹیوں کی  
شادی ہو چکی ہے میں نے اپنے بچوں کی تربیت پہ  
خصوصی توجہ دی۔ میرے بڑے بیٹے سلمان نے چار  
ماسٹرز کیے ہیں۔“  
★ ”بیٹیوں کی شادی ہوئی اور بیگم ہاؤس وائف ہیں  
کیا؟“

”چمنلڑ کے لیے آپ نے اپنی خدمت دس غیر  
ملکی دودوں پر بھی گئے تو آپ اپنی خدمت کا معلومہ  
لیتے تھے یا لوگ آپ کو ہدیہ دیتے تھے۔ مطلب آمدنی کا  
کیا ذریعہ ہوتا تھا؟“  
★ ”جب میں نے نعت گوئی شروع کی تو ہدیہ اور  
نذرانے کا کوئی رجحان نہیں تھا لیکن جب شب و روز  
اس میں گزرنے لگے تو جی پوچھیں تو اپنے بڑنس کی  
طرف ہمارا رجحان نہیں ہوا۔ اس حمد و نعت کو ہم  
نے اپنا نصیب سمجھ لیا اور اسی کو اللہ نے ہماری آمدنی کا  
ذریعہ بنانا تھا۔ ہم نے از خود بھی کوئی فرمائش نہیں کی  
نہ کچھ مانگا۔ لوگ خود ہی ہماری خدمت کرتے تھے اور  
کرتے ہیں تو ہمیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں  
پڑی، بس اللہ تعالیٰ نے ہماری ذیولنی لگا دی کہ اپنے رب  
کی ثناء خوانی کروں اور اس میں اپنی زندگی بسر کرو۔“  
★ ”یعنی آپ کا کوئی زندگی بنانے سنوارنے کے لیے  
کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑی جیسا کہ نوجوانی میں لوگ  
اپنی زندگی بنانے کے لیے کرتے ہیں؟“  
★ ”الحمد للہ۔ میں آپ کو کچھ بتاؤں کہ ہم پر اللہ کا اتنا  
کرم ہوا ہے کہ پیسہ ہمارے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ ہم  
پیسوں کے لیے نہیں بھاگے ہمیں بوقت ہی نہیں ملتا تھا  
اللہ اور اس کے حبیب کی ثناء خوانی سے کہ ہم کچھ اور  
سوچتے۔ اللہ نے ہماری جھولی کو اتنا بھریا کہ ہمیں  
کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“  
★ ”آپ کے بھائیوں اور بہنوں میں کوئی اس فیلڈ  
میں آیا اور والدین کا کیا رد عمل تھا جب آپ اس  
جانب آئے؟“  
★ ”نہیں بھائیوں بہنوں میں کوئی اس طرف نہیں  
آیا اور والدین کی دعاؤں سے ہی اللہ نے مجھے یہ مقام دیا  
ہے اور انہوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا ہے۔ اور  
میرے بھائیوں اور بہنوں نے بھی میرا بہت ساتھ دیا  
ہے۔ اور گھر میں سب سے زیادہ میری پذیرائی ہوتی  
تھی۔“  
★ ”والد صاحب نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جاب کر لویا

میں اپنے اخراجات پر۔“  
★ ”کن کن ممالک میں آپ جا چکے ہیں؟“  
★ ”یورپ کے تقریباً تمام ممالک۔ امریکہ کی  
بہت سی ریاستوں میں بیجیم، ٹائوے، ڈنمارک وغیرہ  
میں پروگرام کیے امریکہ کا تو ایک ماہ کا دورہ کیا۔ اور  
پروگرام کیے۔“  
★ ”عمرے کی سعادت سرکاری سطح پر حاصل ہوئی یا  
آپ خود گئے؟“  
★ ”سرکاری سطح پر بھی گیا اور کئی بار خود سے کیا وہاں  
تو اپنی فیملی کو بھی لے گیا جن میں میرے بھائی اور بہنیں  
بھی شامل تھیں۔“  
★ ”آپ کو لکھنے کا بھی تو شوق تھا اور شاید آپ نے  
کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں؟“  
★ ”کچھ تو نہیں صرف دو ہی کتابیں لکھی ہیں۔  
”انوارِ حرمین“ اور ”رنگِ حنا“ ان میں — دو سو  
تیس لغتیں شامل ہیں۔ اور ان کتابوں کو سرکاری  
سطح پر بھی بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور ابھی میں آپ  
کو غیر ملکی دودوں کے بارے میں بتا رہا تھا کہ میں آپ  
کو بتاؤں کہ مجھے سرکاری طور پر مار سسٹن کی  
حکومت نے بلایا اور بارہ دن اپنا مہمان رکھا اس وقت  
کے صدر قاسم مٹین تھے اور پاکستان کے سفیر سلمان  
گیلانی تھے اور سلمان گیلانی نے زیرِ لے مجھے بلایا گیا اور  
وہاں کے صدر نے مجھے سول اعزاز سے بھی نوازا۔ اور  
ساؤتھ افریقہ کا میں آٹھ مرتبہ دورہ کر چکا ہوں اور ان  
کے تمام بڑے شہروں میں میرے ساتھ پروگرام کیے  
گئے اور اب بھی غیر ملکی دورے جاری ہیں۔“  
★ ”یہ غیر ملکی دورے صرف اور صرف پاکستان کی  
بدولت ہیں جس نے آپ کو نام اور پہچان دی ہے؟“  
★ ”جی بالکل آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میری پہچان  
میرا ملک پاکستان ہے اور اب تو جب سے پاکستان میں  
بہت سارے چمنلڑ کھل گئے ہیں تو تقریباً ”سب ہی  
چمنلڑ ہمیں بلاتے ہیں اور ہمارے پروگرام ریکارڈ  
کرتے ہیں۔“



رہے؟

✽ ”میرے مزاج کی اپنی ایک طبیعت یا روئین کہہ لیں کہ بنی ہوئی ہے کہ مجھے کھانا وقت پہ چاہیے اور اچھا کھانا چاہیے۔ میرا کہہ بالکل صاف سمجھنا ہوتا چاہیے۔ میری چیزیں جہاں رکھی ہیں وہیں رکھی رہنی چاہیں اگر ان کی ترتیب میں کوئی فرق آجائے تو میری طبیعت میں چڑچڑاہٹ آجاتا ہے۔ اور اس طرح جب میں کسی محفل میں جاؤں اور وہاں بد نظمی دیکھوں تو میرے مزاج میں فرق آتا ہے۔“

✽ ”عام لائف میں کیسے ہیں؟“

✽ ”عام لائف میں میں بہت ملنے جلنے والا انسان ہوں سب سے بہت ہی خلوص و پیار سے پیش آتا ہوں۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مزاج کے خلاف کوئی

کام ہو رہا ہو یا میری بات کو کوئی سمجھنے کی کوشش نہ کر رہا ہو تو پھر مجھے غصہ آتا ہے ظاہر ہے کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ غصہ آنا ایک فطری عمل ہے اور مجھے بھی آتا ہے۔“

✽ ”پھر کیا کرتے ہیں؟“

✽ ”حدیث شریف میں ہے کہ جب غصہ آئے تو درود شریف پڑھ لیا کرو تاکہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ ہمارا شعبہ ایسا ہے کہ ہم عام لوگوں کی طرح لوگوں سے بد مزاجی سے مل نہیں سکتے کیونکہ ہمارا تاثر ہماری امانت ہے ہمارا اخلاق ہی ہماری میراث ہے۔ اگر ایک سے بد مزاجی سے ملیں گے تو وہ آگے سولوگوں کو بتائے گا اور سو ہزاروں کو بتائیں گے۔ اس لیے ہم کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں سے اچھی طرح ملیں۔ نرم لہجہ رکھیں اور محبت سے بات کریں لوگ ہماری طرف کیوں لپکتے ہیں کوئی تو بات ہے کوئی تو نسبت ہے ہم میں۔ اس لیے کہ ہم حمد و ثناء کرتے ہیں۔“

✽ ”عید کی آمد آمد ہے۔ آپ بتائیں کہ لوگ عید پر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کیوں کرتے ہیں؟“

✽ ”شاید اس لیے کہ رمضان المبارک کے پورے

مہینے میں لوگ عبادت کرتے ہیں اور پھر عید ان کے لیے انعام ہوتی ہے تو اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ عید کے دن نیا جوڑا پہنیں گے لوگوں سے ملیں گے اس حد تک کے اخراجات تو جائز بھی ہیں۔ عید منانے کا حق تو ان کو ہے جنہوں نے پورے مہینے عبادت کی ہو اور روزے رکھے ہوں۔ تراویح پڑھی ہو اور استغفار کی ہو۔ عید کا دن ان کے لیے انعام ہے۔“

✽ ”اتنی منگائی ہے اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟“

✽ ”منگائی۔۔۔ اس نے تو عوام کا جناحرام کر دیا ہے۔۔۔ لوگوں کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ لوگ خود کسی کر رہے ہیں۔ پہلے تین طبقے ہو کر تھے امیر، غریب اور متوسط۔ اب تو متوسط طبقہ تقریباً ختم ہو کے رہ گیا ہے۔ اب صرف دو طبقے رہ گئے ہیں امیر اور غریب متوسط طبقے کے لوگوں کو محدود آمدنی میں اپنی عزت بچا کر رکھنی ہے بچوں کو تعلیم بھی دینی ہے۔۔۔ اور اپنے بھرم کو بھی قائم رکھنا ہے ان کے لیے اس وقت بہت زیادہ مشکلات ہیں۔ ہاتھ پھیلائے والے طبقے کے لیے تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن وہ جو عزت کے ساتھ رہنا چاہتا ہے اس کے لیے یہ بہت مشکل وقت ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے صدیق اسماعیل صاحب سے اجازت چاہی۔

✽ ✽

مردوق کی شخصیت۔

ماڈل \_\_\_\_\_ رائے خان  
ٹرانسکرپشن \_\_\_\_\_ موسیٰ رضا  
میک اپ \_\_\_\_\_ روزینہ بی بی پارلر



# سجیل کی باتیں

شائین کرشید



جب سوپ "محمود آباد کی ملکائیں" شروع ہوا تو اس کی پہلی قسط میں ہی ایک شوخ و چچیل سی لڑکی بہت بھائی۔ بہت کم لڑکیاں اپنی پہلی پرفارمنس سے متاثر کرتی ہیں اور بہت عرصے کے بعد ایسا ہوا تھا کہ کسی نئی آرٹسٹ نے پہلی ہی پرفارمنس میں متاثر کیا ہو۔ نازک سی گول اور بڑی بڑی آنکھوں والی اس آرٹسٹ کا نام کل علی ہے۔ بہت باادب اور خوش مزاج ہیں۔ مگر اپنی مصروفیات کی وجہ سے انٹرویو کے لیے بہت انتظار کروایا۔ لیکن بلا خرابت ہوئی مئی جونڈر قارئین ہے۔

☆ "کیسی ہیں کل۔ آج ٹائم کیسے نکال لیا انٹرویو کے لیے؟"

☆ "ٹھیک ہوں اور ج پوچھیں تو ٹائم تو آج بھی نہیں تھا۔ لیکن آپ کافی عرصے سے کہہ رہی تھیں تو میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ بس اسی لیے آج آپ کے لیے ٹائم نکال ہی لیا۔"

☆ "بہت شکریہ۔ مجھے اندازہ ہے آپ کی مصروفیات کا گہرا ہوا ہے آج کل؟"

☆ "بس جی دن رات کام ہی ہو رہا ہے۔ آج کل ایک نئے سیریل "محبت جائے بھاڑ میں" کی ریکارڈنگز چل رہی ہیں اسی میں مصروف ہوں۔"

☆ "اچھا۔! بڑے مزے کا نام ہے، آپ کا رول کیا

ہے؟"

☆ "جی سیریل تو ہے ہی اچھا لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے نام کی وجہ سے بھی لوگ اس سیریل کو ضرور دیکھیں گے اور اس میں میرا لڑنگ رول ہے اور ویسے بھی کافی بڑی کاسٹ ہے مثلاً "عبدین صدیقی، منادیل پذیر، عمران اسلم، میں، رشیم مین کاسٹ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کافی لوگ ہیں۔"

☆ "انتا زیادہ کام اور جان چھوٹی سی تھک تو جاتی ہوں گی؟"

☆ "جی۔۔۔ کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ آپ تو یہ سمجھیں کہ میں تو گھر رسونے کے لیے ہی جاتی ہوں۔ میرا تو فون بھی میری ماما کے پاس ہی ہوتا ہے۔"

☆ "تو کیوں لے رہی ہیں اتنا کام کہ آرام کا بھی وقت نہ ملے؟"

☆ "ان شاء اللہ اب ایسا نہیں ہو گا۔ اب ایک وقت میں ایک یا دو ہی پروجیکٹس کروں گی جیسے میں آج کل "محبت جائے بھاڑ میں" ہی کر رہی ہوں اس کے بعد دو سراسر و جیکٹ لوں گی۔"

☆ "آپ کی بہن بھی اس فیلڈ میں ہیں؟"

☆ "جی جی۔ اب نہیں ہے اس نے بھی میرے ساتھ ہی کام شروع کیا تھا اور دو ہی ڈرامے کیے ہیں "چھوٹی سی کہانی" اور "محمود آباد کی ملکائیں"۔ اب پھر اسے مشکل لگا یا شاید مزا نہیں آیا۔ اس نے چھوڑ دیا۔"

☆ "آپ گھر میں بڑی ہیں؟"

☆ "میں اپنے بارے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میرا پورا نام کل علی ہے۔ ویسے تو سب مجھے پیار سے "سجا" یا میرا نام ہی لیتے ہیں۔ لیکن آج کل تو جو نام ڈرامے میں مشہور ہو جاتا ہے۔ اسی نام سے بلاتے ہیں اور میں سترہ جنوری 1994ء میں لاہور میں پیدا ہوئی۔ میرا ستارہ کیپری کورن ہے اور میری ہائٹ 5 فٹ 4 انچ ہے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میں گھر میں بڑی ہوں میرے بعد ایک بہن اور پھر بھائی ہے۔ میں سیکنڈ ایئر کی



طالبہ ہوں اور اردو اسپیکنگ ہیں ہم لوگ "میری امی راحت فرخوس بڑی اچھی نعت خواں ہیں اور وہ بھیٹر میں بھی عثمان مبین اور لہری صاحب کے ساتھ کام کر چکی ہیں اور مولانا شاہ احمد نورانی میری امی کے ماموں ہیں اور میرے ابو سید صولت علی بزنس میں ہیں۔"

☆ "آپ سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہیں۔ نیوچر میں کون سی فیلڈ میں جانے کا ارادہ ہے؟"

☆ "میرا تو خیال ہے کہ میں جس فیلڈ میں ہوں اسی کو ردھوں گی۔ اس لیے ان شاء اللہ سیکنڈ ایئر کے بعد "میڈیا" کی لائن کو ہی اپناؤں گی۔ میرا کوئی ارادہ نہیں ڈاکٹریا انجینئر بننے کا اور ڈاکٹریا انجینئر بننے کے باوجود میں اس لائن میں رولوں کو فائدہ بہتر ہے کہ "میڈیا" کی ہی لائن میں جاؤں۔"

☆ "نیا جو آئن کیا ہے؟"

☆ "نہیں بالکل نہیں۔۔۔ اور میں نے تو کہیں سے بھی کچھ نہیں سیکھا شاید اللہ نے صلاحیتیں دیں اسکول میں بہت اچھی Debater اور نعت خواں رہ







## راشد فاروقی

شاہین رشید



- 1 "خاندان کی دو شخصیات جو آپ کو بہت چاہتی ہیں؟  
○ "میری بیوی اور میری بیٹی۔ دونوں مجھے بہت چاہتی ہیں۔"
- 2 "کوئی دو نام جو آپ کو بہت پسند ہیں؟  
○ "ایسا تو کبھی نہیں سوچا۔ مجھے تو اپنا ہی نام بہت پسند ہے۔"
- 3 "دیا میں جو آپ کو دوسروں میں ممتاز کرتی ہیں؟  
○ "یہ سوال تو آپ کو دوسروں سے پوچھنا چاہیے میں اپنے بارے میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ ویسے شاید میں صاف گو ہوں جو کہ دوسرے نہیں ہوتے اور میری طرافت جو لوگوں کو بہت پسند ہے۔"
- 4 "تو تاریخی ادوار جس میں آپ جانا چاہتے ہیں؟  
○ "اگر میں قیام پاکستان کے وقت ہوتا تو مجھے اچھا لگتا پاکستان کو اپنے سامنے بننے ہوئے دیکھتا اور 1857ء کی جنگ آزادی میں ہوتا تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔"

\* "بہت کم کی ہے۔ برائیدل شوز وغیرہ میں ہالنگ کر لیتی ہوں مگر ہالنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے فی الحال۔ آگے کے لیے کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

\* "قلم میں جائیں گی؟"

\* "ایک قلم کی ہے میں نے۔ عام رضا کی جس میں فواد اور نادیہ بیل ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ قلم ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ قلم ہے اور اس میں میرا لپٹا ہوا ہے۔"

\* "اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

\* "جی میں اپنے ڈرامے دیکھتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اپنے آپ کو دیکھنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے دیکھتی ہوں کہ مجھے اندازہ ہو جائے کہ میں نے کیا کام کیا ہے اور میں مزید کتنا اچھا کر سکتی تھی۔"

\* "رانے زمانے کے ڈرامے دیکھے جیسے "حینہ معین" کے اور "بچیا" کے؟"

\* "جی میں ڈرامہ سیریل "تہائیاں" کے کچھ کلیپس دیکھے تھے تو مجھے بہت مزا آیا تھا اور معین اختر (مروحہ) کی تو میں بہت بڑی فین ہوں اور ان کا ڈرامہ "روزی" تو میں نے بہت ہی شوق سے دیکھا تھا۔ مجھے ان کی اداکاری بہت ہی اچھی لگی تھی اور میں نے کئی بار ان کا یہ ڈرامہ دیکھا ہے۔"

\* "اس فیلڈ کی سیاست سے ڈر لگتا ہے؟"

\* "کچھ کچھ۔ مگر میری مہمات میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس لیے کوئی فکر کی بات نہیں اور ویسے بھی میں اپنے آپ کو کام میں ہی مصروف رکھتی ہوں۔ ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔"



ہوں لیکن کبھی کبھی کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود بخود رونے آجاتا ہے اور "محمود آباد کی ملاک میں" جب آن ایئر ہوا تو سب سے زیادہ میرے کام کو پسند کیا گیا اور میری اتنی تعریف ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی اور اس سوچ کو میں نے خود چھوڑا کیونکہ میں کہتی ہوں کہ ایک چیز اپنی حد میں ہی اچھی لگتی ہے اور اس کو وہاں ہی ختم کر دینا چاہیے جہاں اس کا عروج ہو، بجائے اس کے کہ ایک وقت ایسا آئے کہ لوگ بے زار ہو جائیں۔ تو میں نے یہ سوچ کر چھوڑا اور میں سمجھتی ہوں کہ میں نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اب دیکھ رہی ہیں اس کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ اب کہانی کہیں سے کہیں چلی گئی ہے۔ اگر میں بھی اس میں ہوتی تو لوگ مجھے گالیاں ہی دے رہے ہوتے۔ اب مجھے سب کچھ ہے کہ بہت اچھا کیا بڑے وقت پہ چھوڑ دیا کرتے۔"

\* "سہلا سیریل تھا اور اس میں نام صرف آپ کی اداکاری عمدہ تھی بلکہ آپ خوب صورت بھی بہت نظر آئیں۔ اپنا آپ دیکھ کر کیسا لگتا تھا؟"

\* "بہت اچھا لگتا تھا اپنے آپ کو دیکھ کر۔ اور میں اپنے اللہ تعالیٰ کی بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اتنا اچھا بنایا۔ مجھے اپنے آپ سے بہت پیار ہے میں جب جسمانی طور پر معذور اور واجبی سی شکل کے لوگ دیکھتی ہوں تو اللہ کا بہت شکر ادا کرتی ہوں۔ اور کبھی میں گھر میں تھوڑے خرے دکھاؤں تو سب یہی کہتے ہیں کہ بیٹا غرور مت کرنا تو غرور نہیں ہے مجھ میں لیکن بحیثیت ایک لڑکی کے تھوڑا غرور ضرور ہے۔"

\* "ایک دم سے اتنی شہرت ملی تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے؟"

\* "ڈر تو لگتا ہے۔ کیونکہ شہرت حاصل کرنا تو آسان ہے لیکن شہرت کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔ بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ کبھی غرور تکبر نہ آئے مجھ میں۔ کیونکہ غرور تکبر ہی اصل میں نڈال ہوتا ہے۔"

- 5 "کن دو افراد کے SMS کے جواب آپ فوراً دیتے ہیں؟"
- "اپنی بیوی کو دیتا ہوں۔ خواہ خوشی سے دوں یا ڈر کے دوں اور میرے کام سے متعلق کسی کا ایس ایم ایس آئے تو فوراً دیتا ہوں۔"
- 6 "کوئی دوسری عادتیں جن سے آپ نجات چاہتے ہیں؟"
- "سگریٹ نوشی کی عادت سے نجات چاہتا ہوں اور کوئی ایسی بری عادت نہیں ہے۔"
- 7 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتے ہیں؟"
- "آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں اور جھوٹی تعریف ہی کرتا ہوں۔ کہ ہر فارمنس اچھی تھی۔"
- 8 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر غصہ آجاتا ہے؟"
- "اگر کوئی کہے کہ آپ وقت کے پابند نہیں ہیں۔ جبکہ میں وقت کی پابندی کرتا ہوں اور یہ کہ آپ اپنے کام سے committed نہیں ہے۔ جبکہ ایسا بھی نہیں ہے۔"
- 9 "کن دو باتوں سے آپ کا دل ٹوٹ جاتا ہے؟"
- "کوئی میرے اعتبار کو توڑے اور میرے قریبی لوگ مجھ سے جھوٹ بولیں یا مجھ سے غلط بیانی کریں تو۔"
- 10 "مارنگ شو کے دو بہترین ایٹکرو آپ کی نظر میں؟"
- "صرف مارنگ شو کے نہ پوچھیں بلکہ عام طور پر جو شووز ہوتے ہیں اگر ان کی بات کریں تو مجھے عمر شریف صاحب اور غزل سلام بہت پسند ہیں۔"
- 11 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں۔"
- "ایک دوست "میزان" اور "دیگا" جس کا پورا نام سنی احمد ہے۔"
- 12 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتے ہیں؟"
- "نہیں نہیں۔ کسی کے ساتھ نہیں سونے اپنی بیگم اور بیٹی کے دہی میرے لیے مشہور بھی ہیں اور اچھی بھی ہیں۔"



13 ”دنیا کی دو اہم شخصیات جن کی قسمت پر آپ کو رشک آتا ہے؟“

○ ”کوئی ایسی خاص نہیں ہیں۔ بہت سی ہیں۔ جیسے شعیب ملک کی شادی ثانیہ مرزا سے ہو گئی ان کی قسمت پر رشک آتا ہے اور دوسری شخصیت علی ظفر ہیں جنہوں نے فلم اینڈسٹری میں برنامہ پیدا کیا ہے۔“

14 ”دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتے ہیں؟“

○ ”تہوار تو سارے ہی اہتمام سے مناتا ہوں لیکن عید اور محرم الحرام بھی اہتمام سے مناتا ہوں۔ ان میں تقدس بہت ہے۔“

15 ”دن کے چار پہر میں سے کوئی سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟“

○ ”شام کا پہر اور بہت صبح کا وقت جب سورج طلوع ہو رہا ہوتا ہے۔“

16 ”پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتے ہیں؟“

○ ”آپ کیسے ہیں؟ اور خیریت سے ہیں۔“

17 ”دو کھانے جنہیں کھا کر کبھی پور نہیں ہوتے؟“

○ ”بران بریانی اور دال گوشت جو کہ بچپن سے کھایا کرتا تھا آج بھی اچھا پکا ہوا ہو تو اسے چھوڑ نہیں سکتا۔“

18 ”دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی؟“

○ ”اپنی ماں سے اور اگر میری غلطی ہو چاہے کسی کے ساتھ بھی تو معافی مانگ لیتا ہوں۔“

19 ”دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے کرکٹ میچ دیکھتے ہیں؟“

○ ”بہت سارے ہیں۔ لیکن ہمیشہ سے مجھے برائن لارا کی کرکٹ بہت پسند ہے اور سچن ٹنڈولکر بھی بہت پسند ہے۔ محمد حفیظ اور شاہد آفریدی بھی اچھے لگتے ہیں۔ کرکٹ تو بے شمار ہیں۔“

○ ”ویسے تو اللہ نے سب خواہشات پوری کی ہیں لیکن فن کے حوالے سے میں چاہتا ہوں کہ میں ملک سے باہر بھی کام کروں۔“

20 ”ہالی ووڈ“ اور ”ہالی ووڈ“ کے لیے کام کرنے کی خواہش ہے۔“

21 ”دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟“

○ ”نظر کا چشمہ“ والٹ اور موبائل۔“

22 ”دو الفاظ جو آپ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں؟“

○ ”یہ میں نہیں بتا سکتا۔ یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں۔“

23 ”شوز میں جگہ بنانے کے دو کُر؟“

○ ”میرا خیال ہے کہ لوگوں کے درمیان ویسے ہی ہو جائیں جیسا ماحول ہے اور اگر آپ ہنس مکھ ہیں اور دوسروں کو خوش کرنے کا فن جانتے ہیں تو بہت جلدی جگہ بنا سکتے ہیں۔“

24 ”سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟“

○ ”پیر کا دن کہ نئے ہفتے کا آغاز ہوتا ہے اور ہفتہ کا دن کہ ویک اینڈ شروع ہو رہا ہوتا ہے۔“

25 ”بارہ مہینوں میں سے کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟“

○ ”اپریل کا مہینہ کہ اس میں میری بھی سالگرہ ہوتی ہے۔ میری شادی کی سالگرہ بھی ہوتی ہے اور ستمبر کا مہینہ کہ اس میں میری بیٹی کی سالگرہ ہوتی ہے۔“

26 ”اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟“

○ ”اینا اینڈ روم اور گھر کی چھت۔“

27 ”گھر کے دو کام جن کو نہ کرنے پر بیگم سے ڈانٹ پڑتی ہے؟“

○ ”تقبہ“ اکثر و بیشتر بہت سے کام نہ کرنے پر بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔“

29 ”سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟“

○ ”بہت سارے ہیں۔ کس کس کا نام لیں۔“

30 ”کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟“

○ ”چین اور سنگھ دیش۔“

31 ”کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟“

○ ”بلبلہ اور وائٹ۔“

32 ”اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟“

○ ”کراچی اور لاہور۔“

33 ”اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو کیا دو چیزیں لینا چاہیں گے؟“

○ ”نہیں جی۔۔۔ میں بھی سب کے ساتھ سونا پسند کروں گا۔“

34 ”کن دو تاریخی شخصیات سے ملنے کی خواہش ہے؟“

○ ”یونائیٹڈ نیشن کے صدر باکی مون سے ملنا چاہتا ہوں اور موجودہ کوئی بھی امریکی صدر۔“

35 ”لوگوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟“

○ ”خیالوں میں نہ رہا کریں حقیقت میں زندہ رہنے کی کوشش کریں اور جذباتیت سے پرہیز کریں اور حقیقت پسندی کو اپنائیں۔“

36 ”سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسموں میں؟“

○ ”سرمدی کا بہت پسند ہے اور خزاں کا جو سرمدی کے قریب ہوتا ہے۔“

37 ”لوگوں کی دو نا پسندیدہ عادتیں؟“

○ ”لوگوں مجھے ساری اچھی لگتی ہیں تو نا پسندیدہ عادتیں بھی پسندیدہ ہو جاتی ہیں۔“

38 ”صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام سب سے پہلے کرتے ہیں؟“

○ ”چائے پیتا ہوں اور پھر ایک سرساز کرتا ہوں۔“

39 ”دو خواتین جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟“

○ ”چائے پیتا ہوں اور پھر ایک سرساز کرتا ہوں۔“

40 ”اپنے دو ڈرامے جو بھول نہیں سکتے؟“

○ ”بہت سے ڈرامے ہیں جن کو بھولنا نہیں ہوں۔ پھر بھی ایک ڈرامہ ہے ”گلو استار“ اس میں مجھے ایوارڈ ملا تھا اور ”رام چند پاستانی“ اس میں بھی مجھے ایوارڈ ملا تھا۔“

41 ”دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟“

○ ”دو افکار علی بھٹو تھے اور بے نظیر بھٹو۔“

42 ”دو چیزیں جن پر آپ بہت متخیر کرتے ہیں؟“

○ ”چیزیں تو نہیں بلکہ میں تو اپنی بیگم اور بیٹی پر بہت متخیر کرتا ہوں۔“

43 ”اپنے دو ڈرامے جو بھول نہیں سکتے؟“

○ ”بہت سے ڈرامے ہیں جن کو بھولنا نہیں ہوں۔ پھر بھی ایک ڈرامہ ہے ”گلو استار“ اس میں مجھے ایوارڈ ملا تھا اور ”رام چند پاستانی“ اس میں بھی مجھے ایوارڈ ملا تھا۔“

44 ”دو کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟“

○ ”کرنا تو میں کر چکا ہوں اور پھر ایک سرساز کرتا ہوں۔“



- 56 ”اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟“
- ”صاف ستھرا اور فیشن کے مطابق ہو۔“
- 57 ”کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟“
- ”بیگم اور بیٹی ان کے سوا زندگی میں کوئی نہیں ہے۔“
- 58 ”کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟“
- ”بچھو سے بہت ڈر لگتا ہے اور پھپھلی سے۔“
- 59 ”دو ریٹائرمنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟“
- ”جہاں کھانا اچھا مل جائے وہیں مڑا آجاتا ہے۔“
- 60 ”اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتے ہیں؟“
- ”شاپنگ کا شعبہ میرا نہیں ہے۔ مجھے پکڑ کر لے جایا جاتا ہے اور جہاں لے جاتے ہیں وہاں سے شاپنگ کر لیتے ہیں۔“
- 61 ”دو چیزیں جو آپ شوق سے دیکھتے ہیں؟“
- ”سارے ہی شوق سے دیکھتا ہوں لیکن ہم اور جو زیادہ شوق سے دیکھتا ہوں۔“
- 62 ”دو تبدیلیاں جو اپنی شخصیت میں لانا چاہتے ہیں؟“
- ”میرا دل چاہتا ہے کہ میرا جسم متناسب ہو۔ بے ڈول نہ ہو۔“
- 63 ”دو چیزیں جو آپ کے والٹ میں لازمی ہوتی ہیں؟“
- ”شناختی کارڈ اور اسٹیٹ ایمر کارڈ۔“
- 64 ”کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟“
- ”کھانے کا اتنا کریز نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے کھاتا ہوں تو بھوک کے وقت جو بھی مل جاتا ہے کھا لیتا ہوں۔“
- 65 ”کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کر سگے؟“
- ”تقصد۔“ ”گرمینل نہیں ہوں۔ اس لیے ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔“
- 45 ”دو قیمتی چیزیں جو آپ خریدنا چاہتے ہیں؟“
- ”کار جو کہ پلو جو کو شش کے نہیں خرید سکا اور گھر خریدنا چاہتا ہوں وہ بھی نہیں خرید پایا۔“
- 46 ”اپنے کسے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے؟“
- ”نہیں ایسا کوئی فیصلہ نہیں ہے۔“
- 47 ”پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتے ہیں؟“
- ”ایک وقت کی بھی نہیں پڑھتا۔“
- 48 ”بیرون ملک شاپنگ میں کیا دو چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟“
- ”بجوں اور بیگم کے لیے کپڑے اور دیگر چیزیں۔ اگر ایسا نہیں کروں گا تو قتل کر دیا جاؤں گا۔“ ”تقصہ۔“
- 49 ”دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟“
- ”بیوی اور ماں کے غصے سے۔“
- 50 ”کن دو لوگوں کی تعریف میں بجل سے کام نہیں لیتے؟“
- ”میں کسی کی بھی تعریف میں بجل سے کام نہیں لیتا۔“
- 51 ”دو پسندیدہ مشروب جب کے بغیر نہیں رو سکتے؟“
- ”مشروبات کے بغیر تو رو سکتے ہیں البتہ پانی کے بغیر نہیں رو سکتے۔“
- 52 ”دھنک کے سات رنگوں میں سے کون سے دو رنگ پسند ہیں؟“
- ”دھنک کے 50 رنگ ہوتے تو وہ بھی بہت پسند ہوتے۔“
- 53 ”شادی کی دو رسمیں جو آپ انجوائے کرتے ہیں؟“
- ”میں شادی کی رسمیں انجوائے نہیں کرتا۔“
- 54 ”دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟“
- ”جھوٹ بولے یا مجھے بھگانے کی کوشش کرے تب۔“
- 55 ”انٹرویو میں کن دو لوگوں کے ساتھ دکھ بانٹنا اچھا لگتا ہے؟“
- ”وہی دو دوست میزبان اور ٹریکا۔“



## میں پہلا روزہ

شاہین رشید

زندگی میں کیا کیا پہلا کام انسان کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ خواہ وہ کام چالی میں ہو، لڑکھن میں — بچپن میں انتہائی کم عمری میں ہو اور جو کام اللہ تعالیٰ اور ماں باپ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے وہ تو ہمیشہ یاد رہتا ہے اور آج ہم مسلمانوں میں نماز روزے کی جو عادت ہے وہ ہمارے والدین کی بہترین تربیت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی زندگی کا پہلا روزہ آج تک یاد ہے۔ عید سروے میں ہم نے اس مرتبہ شہزادی مصروف شخصیات سے ان کے پہلے روزے کے بارے میں پوچھا کہ انہوں نے پہلا روزہ کس عمر میں رکھا تھا اور کیا اہتمام ہوا تھا۔

فاطمہ آفندی

☆ مجھے یاد ہے میں نے پہلا روزہ سات سال کی عمر میں رکھا تھا اور پہلا روزہ میں نے گھر والوں سے خبر کر



عاصم بشیر FM-101

☆ پہلا روزہ میں نے نو سال کی عمر میں رکھا اور باقاعدہ روزہ کشائی ہوئی تھی اور بہت اہتمام ہوا تھا بہت کفٹس ملے تھے۔ پیسے بھی ملے تھے اور سب نے مجھے پھولوں کے ہار پہنائے تھے جن کو پسینہ کر میں بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اور یہ میری زندگی کی پہلی تقریب تھی اور واحد بھی کہ جس میں میرے والد

مرحوم شریک ہوئے تھے۔ اس لیے زندگی میں آنے والی ہر خوشی میں ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔



کنور ارسلان

☆ جی بالکل یاد ہے مجھے میں نے پہلا روزہ سات سال کی عمر میں رکھا تھا اور بہت اہتمام ہوا تھا۔ سحری میں بھی کسی کو اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی میں خود ہی اٹھ گیا تھا اس خوشی کے ساتھ کہ آج میں نے روزہ رکھنا ہے۔ شام کو افطار میں بہت اہتمام ہوا تھا اور کافی سارے کفٹس ملے تھے اور کھانے پینے سے زیادہ مجھے کفٹ کی — خوشی تھی اور پچ بتاؤں پہلا روزہ بھی اسی خوشی میں رکھا تھا کہ شام کو کفٹ ملیں گے۔ روزہ رکھ کر سارا دن پوچھتا رہا کہ افطاری میں کتنا وقت رہ گیا ہے۔ بچپن میں روزہ رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پھر آپ کو روزہ رکھنے کی عادت ہو جاتی ہے اور گھر کا جو ماحول ہوتا ہے بچوں کے اندر وہی آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں پورے روزے رکھتا ہوں عبادت کے ساتھ اور پھر عید بھی بہت اہتمام سے مناتا ہوں۔

طاہر کاظمی

☆ پہلا روزہ تیرہ سال کی عمر میں رکھا تھا۔ سحری تو

اتنے اہتمام سے نہیں ہوئی تھی لیکن افطار میں بہت اہتمام ہوا تھا۔ روزہ گزرنے کا بالکل پتا نہیں چلا تھا کیونکہ سردیاں تھیں اور روزہ کافی چھوٹا تھا۔ میری روزہ کشائی میں کافی رشتے دار آئے تھے۔ تحفے لائے تھے یا نہیں۔ یہ یاد نہیں ہے۔ ہاں افطار کا وقت یاد ہے کیونکہ بھوک بہت نہیں لگی مگر پاس بہت لگی تھی۔ حالانکہ سردیاں تھیں لیکن مزا بہت آیا تھا۔

عدنان شاہ ٹیپو

☆ پہلا روزہ — شاید آٹھ یا نو سال کا تھا جب میں نے پہلا روزہ رکھا تھا اور فیصل آباد کی سخت گرمی میں رکھا تھا۔ اب سوچیں کہ میرا کیا حشر ہوا ہوگا۔ میرے پہلے روزہ سے میری والدہ بہت خوش تھیں اور وہ خوش



تھیں اس بات پر کہ میرے بیٹے نے روزہ رکھا ہے کافی لوگ آئے تھے میری روزہ کشائی میں اور میرے لیے تحفے تحائف بھی لے کر آئے تھے۔ اب بھی روزے رکھتا ہوں اور عید بھی اہتمام سے مناتا ہوں۔

عمیر لغاری

☆ میں نے پہلا روزہ سات سال کی عمر میں رکھا تھا اور میرے لیے سحر اور افطار دونوں میں بہت اہتمام ہوا تھا۔ سحری میں میں نے اپنی پسند کا قیمہ چکویا تھا اور افطاری میں آکو کے پکڑے، فروٹ چٹ اور بہت سارا شربت فرمائش کر کے بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی





کیونکہ میں نے گھر والوں سے لڑجھک کر رکھا تھا۔ میرے گھر والے راضی نہیں تھے اس بات پر کہ میں روزہ رکھوں شاید میں دس یا گیارہ سال کی تھی کہ میں نے روزہ رکھا اور سارا دن گھر والوں کی ڈانٹ کھائی۔ افطار میں بھی مزا نہیں آیا۔ گھر والوں کو روزہ رکھنے کی اتنی پختہ عادت نہیں ہے۔ لیکن مجھے روزہ رکھنے میں مزا آتا ہے۔ عبادت کرنے میں سکون ملتا ہے اس لیے میں روزے ضرور رکھتی ہوں اور ہر دن انجہ اے کرتی ہوں۔

ای نے بہت ساری چیزیں بنائی تھیں اور اچھا خاصا اہتمام کروا لیا تھا۔ کم عمری میں روزہ رکھا تھا اس لیے گھر والوں نے ناز بھی بہت اٹھائے تھے اور خاندان کے تقریباً سارے ہی رشتے داروں کو بلایا تھا۔ خاصی بڑی روزہ کشانی ہو گئی تھی اور جب اتنے سارے لوگ مدعو ہوں اور وہ خالی ہاتھ آئیں یہ کیسے ممکن ہے تو جناب کلفشیں بھی ملے اور دعائیں بھی عید بھی اہتمام سے منائی تھی اور آج بھی عید اہتمام سے مناتا ہوں اور روزے بھی رکھتا ہوں۔

جگن کاظم

☆ مجھے تو اپنا پہلا روزہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔



### سبحان اسدی FM-101

☆ جی میں بارہ سال کا تھا جب میں نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ امی نے جب سحری کے لیے اٹھایا تو میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور اس نیند میں میری امی نے زبردستی مجھے کھلایا بلایا۔ سحری میں بھی انہوں نے میری پسند کی چیزیں پکائی ہوئی تھیں۔ سارا دن لاڈ لٹھوانے میں گزر گیا کہ بیٹے نے روزہ رکھا ہے۔ شام کو افطار کے وقت کافی لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ زبردست قسم کی افطاری بنی تھی۔ جو لوگ آئے وہ پھولوں کے ہار لے کر بھی آئے تھے اور مجھے اسی وقت بہت اچھا لگ رہا تھا کہ آج میرے روزہ

رکھنے سے سب لوگ کتنے خوش ہیں۔ لوگ تجھے بھی لے کر آئے تھے زیادہ تر لوگوں نے پیسے دیے تھے۔ میرے روزے کا زیادہ وقت پلے لینڈ میں گزرا تھا۔ شاید اس لیے روزے نے پریشان بھی نہیں کیا اور وقت اچھا گزر گیا۔



### آغا فیضان FM-101

☆ میں نے پہلا روزہ گیارہ سال کی عمر میں رکھا۔ سحر اور افطار کا بہت زیادہ اہتمام ہوا تھا اور رشتے داروں کی ایک بڑی تعداد نے افطاری میں شرکت کی تھی۔ افطار کے ساتھ ساتھ دُزر کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ گفت میں زیادہ تر شلوار قمیض اور پیسے ملے تھے۔ اور دلچسپ بات بتاؤں کہ میری روزہ کشانی کا فیصلہ اچانک ہوا تھا اور میں خود حیران تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیونکہ اچانک ہی سب کی مبارک بادوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور گھر والوں نے اس دن میرا بہت زیادہ خیال رکھا اور مجھ پر گہری نظر رکھی کہ کہیں میں ادھر ادھر جا کر کچھ کھا پی نہ لوں۔ دن بہت اچھا گزرا اور لوگوں کی اسے ساتھ یہ محبت دیکھ کر بہت خوشی بھی ہوئی۔ اب بھی سوچتا ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے۔

### عروج نانا FM-101

☆ پہلا روزہ دس سال کی عمر میں رکھا تھا اور آپ یقین کریں کہ سحری میں بھی بہت اہتمام ہوا تھا جبکہ

ہوا۔ لوگ سحری میں اہتمام نہیں کرتے۔ مگر میرے لیے بہت اہتمام ہوا تھا۔ سحری میں دبی، کھجلا پھینی کھائی تھی تاکہ دن میں پیاس نہ لگے اور کھانے میں برائیاں اور چکن کا سالن کھایا تھا۔ افطاری میں بہت مہمانوں کو بلایا گیا تھا اور اچھی خاصی پر کلف افطاری تھی۔ آنے والوں میں کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا تھا سب ہی گفت لے کر آئے تھے اور بہت مزا آیا تھا اور ہاں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ سردی کے دنوں میں میری روزہ کشانی ہوئی تھی۔ صبح چھ بجے روزہ بند ہوا تھا اور شام چھ بجے افطار۔ ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ رمضان المبارک کے پہلے جمعہ کو روزہ کشانی ہوئی تھی تاکہ میں زیادہ سے زیادہ روزے رکھ سکوں۔ ورنہ عموماً لوگ جمعۃ الوداع کو اپنے بچوں کی روزہ کشانی کرواتے ہیں۔

صائمہ قریشی

☆ بہت چھوٹی عمر میں روزہ رکھا تھا۔ یہی کوئی





سات سال کی عمر میں اور اس میں بہت اہتمام کیا تھا۔ سحری تو سادگی کے ساتھ نیند بھری آنکھوں میں گری تھی مگر افطار کے وقت بہت اہتمام ہوا تھا اور بہت لوگوں کو امی نے بلایا تھا بہت بڑی روزہ کشائی تھی میری ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی کی شادی ہو رہی ہو اور جب اتنے سارے لوگ آپس کے تو اتنے ہی ہمارے گفتگو بھی ملیں گے۔ تو جناب ایسے شمار گفتگو ملے تھے۔ جنہیں کھولنے میں بھی خاصا نام لگ گیا تھا۔

ابن آس (رائٹر)

☆ جی۔ میں نے پہلا روزہ سات سال کی عمر میں رکھا اور اسی دن میری آئین بھی ہوئی تھی یعنی قرآن پاک مکمل کیا تھا میں نے۔ ہم لوگ مالی طور پر بہت غریب تھے اس لیے کسی تقریب کا یا اہتمام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور جب کوئی تقریب نہیں تو گفتگوں لا تا میرے لیے اور میرے گھر والوں کے لیے میرا پہلا روزہ ہی بہت بڑا گفت تھا۔ امی ابو کی محبت اور چھوٹی بہنوں کا پیار اور جوش و خروش یہ سب چیزیں میرے لیے اہم تھیں۔ یہ اسی طرح کا پہلا روزہ اور پہلی افطار تھی جس طرح پاکستان کے لاکھوں غریب بچوں کی ہوتی ہے۔

خاص بات یہ تھی کہ دن میں کئی بار پانی پینے کو دل چاہا، مگر بہت نہیں ہوئی بس اس دن کے بعد سے آج تک روزہ چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ حالانکہ میں دل کا مرض ہوں اور ڈاکٹر نے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے مگر پہلے روزہ کی لذت اور سرور ایسا ہے کہ آج وہی لذت اور سرور محسوس ہوتا ہے۔ ایک اور اہم بات بتانا چاہوں گا، میری امی مجھے روزہ نہیں رکھنے دیتی تھیں کہ میں ابھی بہت چھوٹا ہوں۔ مگر میں نے ضد کر کے روزہ رکھا اور اسی رمضان میں یعنی سات سال کی عمر میں ”روزے کی خوشبو“ کے عنوان سے ایک کہانی لکھی اور جب یہ کہانی ماہانہ ”ساتھی“ میں شائع ہوئی تو اس کہانی پر مجھے ایوارڈ ملا تھا بہترین کہانی نویس کا۔ اور ج بات تو یہ ہے کہ یہ کہانی میں نے اپنی فیلنگز اپنے احساسات کے حوالے سے لکھی تھی۔

### فضیلہ قیصر

☆ پہلا روزہ کب رکھا یاد نہیں یقیناً ”کم عمری میں ہی رکھا ہو گا اسی لیے یاد نہیں ہے۔ ورنہ بڑی عمر میں رکھا ہوتا تو یاد دہاتا اور اہتمام بھی ہوا ہو گا۔ ہمارے ہاں تو ویسے ہی افطار کے وقت امی کے گھر میں بہت اہتمام ہوتا ہے تو پھر پہلا میری روزہ کشائی میں کیوں نہ ہوا ہو گا۔ سچ بتاؤں مجھے ٹھیک طرح سے یاد ہی نہیں ہے روزہ رکھنے کی عادت بچپن سے ہے جو آج تک چلی آ رہی ہے۔

### نوشین شاہ

☆ پہلا روزہ رکھا ہو گا یہ کوئی آٹھ نو سال کی عمر میں



سحری تو نارمل ہی ہوئی تھی اور میرے خیال میں سحری میں کوئی اہتمام ہوتا بھی نہیں ہے۔ بس سلا سا کھانا تھا جو عام طور پر ہوتا ہے۔ ہاں البتہ افطاری میں خاصا اہتمام تھا سب ہی گھر میں خوش تھے کہ ان کی ملائی بیٹی نے روزہ رکھا ہے۔ دوستوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور خاندان کے لوگوں کو بھی۔ افطاری کے ساتھ ساتھ رات کے کھانے کا بھی اہتمام تھا اور جب اہتمام ہو تو لوگ خالی ہاتھ نہیں آتے۔ میرے لیے بھی کافی سارے گفتگو آئے تھے۔ مگر اس وقت گفتگو کے بارے میں اتنی زیادہ عقل نہیں تھی۔ جو چیز میرے مطلب کی تھی میں نے رکھی باقی امی نے سنبھال میں۔ پہلے روزہ کے بعد سے آج تک کو شش کرتی ہوں کہ باقاعدگی کے ساتھ روزے رکھوں۔

### شہرہ بزرگوار

☆ شاید آٹھ سال کی عمر میں۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے بہت لاڈ اٹھوائے ہیں مگر والدین کی بہترین تربیت نے بگڑنے نہیں دیا۔ دین اور دنیا کی ساری باتوں کا درس دیا۔ اس لیے کم عمری میں روزہ رکھا۔ مجھے شوق بھی بہت تھا روزہ رکھنے کا۔ سحری



میں بھی اپنی پسند کی چیزیں کھاتی تھیں اور افطاری میں بھی۔ افطاری میں خاصا اہتمام تھا۔ بہت لوگ آئے تھے خاندان سے باہر کے بھی اور خاندان کے بھی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ دونوں ماموں ماشاء اللہ کتنی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ گفتگو بھی بہت اچھے اور قیمتی ملے تھے۔ نیاؤ ریس بھی ہوا تھا۔ تحفوں میں پیسے، کپڑے اور بہت سی چیزیں ملیں۔ ہمارے یہاں روزوں کا بہت اہتمام ہوتا ہے۔ بہت جوش و خروش ہوتا ہے اور میری امی اپنے ہاتھوں سے سب کچھ پکاتی ہیں۔



### نیپو شریف

☆ پہلا روزہ بہت کم عمری میں نہیں رکھا تھا اس لیے یاد ہے۔ شاید آٹھ سال کی عمر میں۔ سحری میں کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ البتہ افطاری میں اہتمام تھا اور میری پسند کی چیزیں بنی تھیں۔ بھولوں کے بار بھی پہنائے گئے تھے۔ کچھ مہمان بھی بلائے گئے تھے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ پھر اس دن کے بعد میں مسلسل روزے رکھنے لگا جس سال پہلا روزہ رکھا اس سال دو تین اور پھر چودہ سال کی عمر تک چھوڑ چھوڑ کر روزے رکھے۔ البتہ چودہ سال کے بعد پھر باقاعدگی کے ساتھ روزے رکھنے شروع کیے اور اللہ کا شکر ہے ہر سال پورے روزے رکھتا ہوں۔

☆ ☆

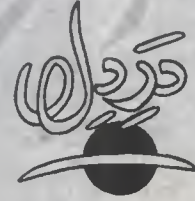


کبھی بار بار نہیں سیکھا اس کی ماں بچل شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۳  
تیسویں قسط



نبیلہ عزیز



بڑی حوصلی کے تمام کلین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیلہ جیات دو ہی بہن بھائی ہیں مدھیہ انسانی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلنڈ کی رنگینوں میں مکمل حویہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنب رہا ہے۔

عزیز کا کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے بس اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باز اقبال مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آوی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حوصلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت یکا آوی ہے اس نے





اس کی نظریں زری کے چہرے پر تھیں اور زری پر نزع کا عالم تھا۔

اس کی قوت گویائی سلب کرنے کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا روال روال دل اور شاہ کی نظروں کی خوشبو سے ممک اٹھا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کھڑے کھڑے اس کا پورا بدن خوشبودار ہو گیا ہو وہ صندل کی طرح مہکنے لگی تھی۔

لیکن خود اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ایک سیکنڈ سے بھی زیادہ اس کے چہرے کی سمت دیکھ پاتی۔ دل اور شاہ کی آنکھوں کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کی دیوار جال کی طرح اس کی پلکیں بھی لہر زہی تھیں۔ وہ موسم تھی۔ سرتاپا موسم، اور دل اور شاہ کی نظروں کی گرمی سے اس کے سامنے کھڑی پھل رہی تھی۔ یوں ہی قطرہ قطرہ پھٹنے ہوئے شاید اس کی پوری ذات پھل جاتی۔ اگر درمیان میں نیل حیات نہ آجاتا۔

”السلام علیکم۔ ایسی ہیں آپ؟“ نیل نے قریب آتے ہی سلام کیا تھا۔ جس پہ زری کے ساتھ دل اور شاہ بھی چونک گیا تھا اور اپنے اس طرح چونکنے سے خود دل اور کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ کیا وہ زری کو اتنی محبت سے دیکھ رہا تھا کہ پل بھر کے لیے سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا؟ یہاں تک کہ عبد اللہ اور نیل کو بھی؟ ان سے یہ کیا کر بیٹھا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی تھی اور سرکوری طرح جھٹکا تھا۔ اس کی ذات پہ دے پاؤں اک بے اختیاری کا لمحہ آیا تھا۔ سویت گیا تھا۔ اب پھر وہ مشتاق تھی اور وہ بے زار۔ اسے لعل سے لا تعلق ہوتے ہوئے محض چند سیکنڈ لگے تھے۔ زری نے اسے نظریں اور قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پاس آکے اسے خوشبوؤں میں بسا کے بنا کچھ کسے واپس مڑ گیا تھا اور اس کا یوں واپس مڑنا زری کی تڑپ اور پاس کو اور بھی بڑھا گیا تھا۔ وہ بھلا کب سے اسے پہچانی تھی؟ دل اور شاہ صدیوں بھی اس کے سامنے کھڑا رہتا تو اس کی پیاس نہیں بجھ سکتی تھی۔ وہ عشق کا صحرا تھی۔ اتنی جلدی سیراب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی تشنگی مٹانا آسان نہیں تھا۔ وہ اس پہ سالوں کی طرح ٹوٹ کر سناٹا کوئی بات بھی تھی۔

اور ادھر نیل حیات تھا۔ دل کے شکل میں محبوب کی نظر عنایت کے چند کے اور فقیر راضی۔ زری اگر کبھی نہیں دیکھی تھی کہ نیل حیات اسے دیکھتا ہے تو نیل حیات بھی کبھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ کسے دیکھتی ہے۔ دیکھ لیتا تو شاید شکل اس کے قدموں میں ہی تو ڈوبتا۔

”لگتا ہے آپ ذہنی طور پہ ابھی تک انکلیڈ میں ہی ہیں؟“ نیل نے اس کی طرف سے جواب نہ پا کر دلچسپی سے کہا تھا اور زری نے ایک بار پھر چونک کر دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟“ اس کے انداز میں نا سمجھی سی تھی۔

”مطلب کہ نہ سلام کا جواب نہ خیریت کی تسلی یہاں ہو کر بھی یہاں نہیں لگ رہیں آپ؟“ نیل نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ سادگی میں بھی بلا کا وقار تھا۔ نیل کا دل چاہا وقت گھر جائے اور وہ یوں ہی کھڑا سب سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتا رہے۔

”تو پھر کہاں لگ رہی ہوں آپ کو؟“ زری نے بھی جواب دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”میرے دل میں۔“ نیل کا دل چاہا کہ وہ لے لیکن وقت اور جگہ مناسب نہیں تھی۔

”زری۔!“ مدیحہ نگارش اور عبد اللہ سے مل کر لپک کے اس کے پاس آئی اور اس سے پٹ مٹی تھی۔

”مدیحہ تم؟“ زری اس کے اتنے شوخ اور فریش انداز پہ حیران رہ گئی تھی۔

”ہاں میں۔ کیوں کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا؟“ مدیحہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

”ارے یقین کیسے آئے؟ کہاں تو تمہارا پاکستان آئے؟ خوش ہی نہیں تھیں اور کہاں پاکستان آخر اتنی خوش ہو کر

مسکراہٹ ہی نہیں رک رہی۔“ زری نے اپنی حیرت کا برابر اظہار کیا تھا جس پہ مدیحہ اور بھی ہنسی تھی۔

”ڈونٹ وری۔ تم آگئی ہو تو یقین بھی آجائے گا۔“ مدیحہ نے مزید شرارت سے اس کا ہاتھ تھپکا تھا اور اس کی اس شرارت پہ نیل بھی بے ساختہ ہنسا تھا۔

”دیکھا آپ لوگوں نے میں کھڑے رہتا ہے؟“ نگارش دل اور کے پاس سے ہٹ کے ان لوگوں کے پاس آگئی تھی اور دل اور عبد اللہ کے ساتھ اس کے سامان کی طرف بڑھ گیا۔

”ارادہ تو یہی ہے۔“ نیل نے نگارش کی بات پہ کافی دلچسپی سے جواب دیا تھا۔

”لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ آپ کے گھر کا لان نہیں ہے جہاں آپ کا مزید کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔ یہ پبلک ٹیس ہے۔ یہاں کھڑے رہنا کافی معیوب لگتا ہے۔“ نگارش کے ٹوکنے پہ نیل نے حیرت اور حلقی سے دیکھا تھا۔

”ارادہ اچھا۔ تو آپ نے بھی بھابھیوں والے طور طریقے سیکھ لیے ہیں؟“ نیل کے انداز پہ نگارش بے ساختہ ہنسی تھی۔

”ظاہر ہے۔ بھی! بھابھی ہوں تو بھابھیوں والے طور طریقے بھی تو سیکھوں گی نا؟ میں بچ راتے میں کھڑے ہونا بھی کوئی اچھی بات ہے بھلا؟ جس سے آپ لوگوں کو شائبہ دوں؟“ نگارش کے لہجے میں مصنوعی حلقی تھی۔

”اف تو۔۔۔ آپ تو واقعی بھابھی بن گئی ہیں۔“ نیل نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے اور نگارش کے ساتھ ساتھ زری اور مدیحہ بھی ہنس پڑی تھیں۔

”نیل۔!“ عبد اللہ کی آواز پہ نیل نے فوراً پلٹ کر دیکھا تھا۔

”چلیں اب؟“ سامان کیلٹر ہو کے باہر آچکا تھا۔ اس لیے اب وہ یہاں سے جانے کے لیے تیار تھا۔

”چلیں بھابھی۔۔۔ آپ کے سر تاج“ آپ کے ملک صاحب بلا رہے ہیں۔“ نیل نے نگارش وغیرہ کو چلنے کا اشارہ دیا۔

”ن کے بلانے تو میں کیس بھی جاسکتی ہوں۔“ نگارش بھی اس وقت کافی شرارتی اور فریش موڈ میں تھی۔

”اوہو بہت خوب۔“ نیل نے بھی جواباً چھیڑا اور یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے وہ لوگ ایر پورٹ کے مرکزی حصے سے پارنگ ایریا کی سمت بڑھتے تھے۔

”کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“ دل اور نے عبد اللہ کے ساتھ چلتے ہوئے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ سامان کافی زیادہ تھا۔ تین ٹرائیاں سامان سے لدی ہوئی تھیں اور وہ تینوں سامان کی یہ ٹرائیاں دھکیلے ہوئے تقریباً ایک ساتھ ہی چل رہے تھے۔ اس لیے دل اور کو پوچھنے پہ نیل کو اچنبھا ہوا تھا۔

”کیا مطلب؟ کہاں جانا ہے اس نے؟“

”مے گھر اپنی حویلی؟“ دل اور نے اپنا سوال واضح کیا تھا۔

”وہ اچھا۔ تو پوچھ رہے ہو تم؟“ نیل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہو؟“ عبد اللہ کو چپ دیکھ کر دل اور کو الجھن ہوئی تھی۔

”میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ میں کیا کروں؟ اپنے گھر جاؤں یا حویلی۔“ عبد اللہ بھی اس معاملے پہ آکر کافی الجھا ہوا تھا۔

”فیصلہ اتنا مشکل تو نہیں ہے۔“ دل اور نے نارمل سے لہجے میں کہا تھا۔

”یہ تم کہہ سکتے ہو، مگر میں نہیں۔ یہ فیصلہ میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ مگر زری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ ایک رسک ثابت ہو گا۔ زری کو لے کر سیدھا اپنے گھر جاؤں تو تب بھی بابا جان کو غصہ آئے گا کہ میں



میں جو بی بیوں میں کیا؟ اور اگر یہاں سے سیدھا حویلی جاؤں تو تب بھی ان کا غصہ کہ میں نگارش کو حویلی لے کر  
 نکال آیا ہوں؟ اس لیے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟" عبداللہ واقعہ پریشان اور کشمکش کا شکار تھا اور نیل  
 کو سن کر حیرت ہوئی تھی کہ زری کا کیا معاملہ ہے۔ آخر ایسا کون سا مسئلہ ہے جس کی اسے خبر ہی نہیں؟  
 "میں کچھ کہہ سکتا ہوں اس معاملے میں؟" دل اور کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ معاملہ سنگین تھا۔ نیل کو بے  
 چینی ہونے لگی تھی۔

"ہوں۔ گویا میں تم سے ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا کروں؟" عبداللہ نے فوراً "اثبات میں جواب دیا تھا۔  
 "میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے حویلی جاؤ وہاں سب سے اچھے طریقے سے ملو، صلہ جو انداز اپناؤ۔ تمہاری بی بی جان  
 نے اتنے سالوں سے تمہیں نہیں دیکھا۔ وہ تم سے ملیں گی، تمہیں دیکھیں گی، تمہارے ساتھ ساتھ بچا بھی کو  
 دیکھیں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس دیکھنے اور ملنے ملانے کے چکر میں ان کا دل کچھ نرم ہو جائے اور معاملہ سلجھ جائے  
 اور جب تمہارا اپنا معاملہ سلجھ گیا تو تم بعد میں دوسرا معاملہ بھی سلجھا سکتے ہو۔" دل اور شاہ کا مشورہ وہ کبھی نظر  
 انداز نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن عبداللہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا خاندان اور اس کی فیملی کیسی ہے؟ اس فیملی میں  
 نرمی نام کو نہیں تھی۔ بس جو بھی وہ عبداللہ اور زری میں تھی۔ اسی لیے وہ اپنے گھر والوں سے بالکل مختلف تھے۔  
 "تمہاری بات ٹھیک ہے دل اور! لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اگر میں وہاں رہ نہ سکا تو وہاں سے نکل بھی نہیں سکوں  
 گا۔ کیونکہ میں زری کو وہاں نہیں چھوڑنا چاہتا اور وہ دوبارہ زری کو میرے ساتھ بیٹھنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ اس  
 بات پر خون خرابا بھی ہو سکتا ہے۔" عبداللہ نے اسے پہلے سے آگاہ کرنا چاہا تھا۔

"اس کا انتظام بھی ہے میرے پاس، تم فکر مت کرو، بس حویلی جاؤ، تاکہ بعد میں وہ لوگ تم پر یہ اعتراض نہ  
 کریں کہ تم حویلی نہیں گئے۔" دل اور اسے آئندہ کے لیے ایک پوائنٹ سمجھا رہا تھا۔  
 "دل اور! میں وہاں زری کو ایک بل کے لیے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ راتوں رات  
 زبردستی زری کا نکال پڑھوائے گا۔" زری گریز نہیں کریں گے۔ "عبداللہ کو صرف اور صرف زری کی فکر تھی اور  
 اس فکر کے بارے میں جان کر نیل جیسے ملک سا ہو گیا تھا۔

"زری کا نکال؟ مگر کس سے؟" نیل کی حیرانی عروج پر تھی۔ اس کا داغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے اب واقعی سمجھ  
 نہیں آرہی تھی کہ وہ دونوں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اور یہ سب کیا چکر ہے؟ بات زری کے متعلق تھی۔ اس لیے  
 عبداللہ کے سامنے وہ کھل کے استفسار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دل اور ایک نظر میں اس کے چہرے پر اڑتی  
 ہوئیاں ہو چکی تھیں۔ وہ نیل کی کیفیت محض ایک نظر میں ہی بھانپ گیا تھا۔

"میں نے کہا تھا تم فکر نہ کرو، تم لوگ جیسے جاؤ گے، ویسے ہی واپس آؤ گے، تم گاڑی میں بیٹھو، تمہیں ساری  
 تفصیل سمجھا دیتا ہوں۔" وہ لوگ گاڑیوں کے پاس آکر ٹھہر گئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی گلاب خان گاڑی سے نکل  
 آیا۔

"اسلام علیکم صاحب۔" گلاب خان نے عبداللہ کو سلام کیا تھا۔  
 "وعلیکم السلام اکیسے ہو گلاب خان؟" عبداللہ دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ دل اور کا ملازم گلاب خان ہے۔  
 "ٹھیک ہوں صاحب! اللہ کا کرم ہے۔ لائیں سامان گاڑی میں رکھ دوں۔" اب سامان رکھنے کی ذمہ داری  
 گلاب خان کی تھی۔ وہ ذمہ داری پوری کرنے لگا۔

"ملک عبداللہ، ہم سے نہیں ملو گے کیا؟" دل اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ جب اس آواز پر ٹھہر گیا وہ  
 جو بھی تھا عبداللہ سے مخاطب تھا۔ لیکن اس کی زبردستی نظر ان سب سے تھی۔ زری بھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رک  
 گئی تھی۔ اس نے بھی جب پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تو پھر کی ہوئی تھی۔ ملک عبداللہ کے پہلو میں زری کی موت کا فرشتہ

کہہ رہا تھا، جسے دیکھ کر وہ زبردستی تھی اور اس پر سر تپا کچلی طاری ہو گئی تھی۔  
 "ملوں گا، ضرور ملوں گا، آپ سے ملنے کے لیے ہی تو آیا ہوں۔" عبداللہ گاڑی سے پاؤں نیچے اتارتا ہوا ان کے  
 قریب آ گیا تھا اور پھر خود ہاتھ آگے بڑھا کے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔  
 "آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں۔" دل اور نے مدیہ اور نگارش کو اشارہ کیا تھا۔  
 "دل اور بھائی۔" نگارش سہم گئی۔

"ڈونٹ وری ایچم نہیں ہوتا، آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں، یہاں کھڑے ہونا ٹھیک نہیں ہے۔" دل اور کالجہ  
 سخت تھا۔ اس لیے مجبوراً "ان تینوں کو گاڑی میں بیٹھنا پڑا اور دل اور نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔  
 "مجھے ملک حق نواز کہتے ہیں۔" یہ جملہ دل اور کی سامعین نے کسی چابک کی طرح پڑا تھا۔ وہ ایک دم دوبارہ پلٹا  
 تھا۔ ملک حق نواز، نیل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔  
 "ملک حق نواز؟" اس نے زیر لب دہرایا اور پھر نیل سے ہاتھ ملاتے ملک حق نواز کو ایک قبر بھری نظر سے  
 دیکھا تھا اور مضبوط قدم اٹھاتا ان کے قریب آ گیا۔

"اور مجھے دل اور شاہ کہتے ہیں۔" اس نے بھی ملک حق نواز کے سے انداز میں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اپنا  
 تعارف کروا دیا تھا۔ جس نے ملک حق نواز نے بری طرح ٹھک کے دیکھا تھا۔ ملک حق نواز کے چہرے کی بدلتی کیفیت  
 دیکھ کر عبداللہ اور نیل کو بیک وقت حیرت ہوئی تھی۔ دل اور کے تعارف نے اس کے چہرے کے تاثرات بدل  
 کے رکھ دیے تھے۔ سارا اتفاقاً سرور دیکھا تھا۔

"مجھے امید نہیں تھی ملک صاحب کہ آپ میرے تعارف کو یوں دل پہ لے لیں گے۔" دل اور ملک حق نواز  
 کو کافی گہری اور کاٹدار نظروں سے دیکھتا چوٹ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"جو لوگ ہمارے داغ میں گھڑی کی سویلوں کی طرح ٹک ٹک کرتے رہتے ہیں وہ اگر سامنے آجائیں تو ان کے  
 تعارف کو دل پہ لیتا ہی پڑتا ہے۔" ملک حق نواز نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا اور دل اور سے ہاتھ ملایا تھا۔  
 "چلیں، یہی جہان گر خوشی ہوئی کہ میں آپ کے داغ میں ٹک ٹک کرتا رہتا ہوں یعنی ہر دم آپ کے ساتھ ہی  
 رہتا ہوں؟" دل اور کا انداز استہزاء تھا۔ جو ملک حق نواز کو کافی ناگوار گزارا۔

"اور میں آج کل اس ٹک ٹک کو بند کرنے کی کوشش میں ہوں، امید ہے جلدی بند ہو جائے گی۔" ملک حق  
 نواز کافی چبا کے بولا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے یہ ٹک ٹک بند نہیں ہوگی اور بڑھ گئی؟" اتنی کہ ملک صاحب نیند کو ترسیں گے۔" دل اور کا  
 لہجہ مضبوط اور مستحکم تھا۔

"یہ تو وقت آنے کی بات ہے شاہ صاحب؟" ملک حق نواز کچھ جتا رہا تھا۔  
 "وقت آچکا ہے ملک صاحب اور کس وقت کا انتظار ہے آپ کو؟ اپنا بندوبست کر رکھیں، بلاؤ اسی وقت بھی  
 آسکتا ہے۔" دل اور نے بھی اسے اشارہ دے دیا تھا۔

"یہ بلاؤ جتنا میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا، اتنا آپ کے لیے بھی ہو گا۔" ملک حق نواز نے دھمکی چھپی  
 دھمکی دی تھی۔

"میں قائل، زانی اور شرابی نہیں ہوں۔ میں غریبوں کا گوشت کھانے والا بھیڑیا نہیں ہوں، بلکہ میں تم جیسے  
 بھیڑیوں کو دنیا کے سامنے لانے والا آؤں ہوں۔ تم جیسے دس بھی آجائیں تو میرا نقصان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اوپر  
 والا جانتا ہے، کون کتنا غلط ہے۔" دل اور کے چہرے پر غصہ اتر آیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا ملک حق نواز کے  
 گلے کو کڑے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر تو اس کا پارہ ویسے ہی ہائی ہو جاتا تھا اور ملک حق نواز تھا کہ الٹا اسے دھمکی



وے کر اور عجب حکایت کرتا تھا اور دل آور کا خون کھول اٹھا تھا۔

”دل آور۔ پلیز لکول ڈاؤن! کیا مسئلہ ہے آخر؟“ عبداللہ نے دل آور کا غصہ اٹھتے دیکھا تو فوراً اس کا بازو تھام لیا تھا۔

”مسئلہ تم ان ہی سے پوچھنا کہ ان کے کروت اور کارنامے کیا ہیں؟“ دل آور نے انتہائی غضب اور حقارت سے ملک حق نواز کو دیکھتے ہوئے عبداللہ کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔

”حق نواز چلو تم گاڑی میں بیٹھو بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ ملک اسد اللہ نے ملک حق نواز کو وہاں سے ہٹانا چاہا۔

”چلو! تم بھی گاڑی میں بیٹھو۔“ عبداللہ نے دل آور کو اشارہ کیا تھا۔

”جارا ہوں میں بھی فی الحال کوئی بد مزگی نہیں چاہتا، لیکن ملک حق نواز اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری گردن اور انصاف کا پھندا ایک دوسرے سے دور نہیں ہیں۔“ اس نے جاتے جاتے ملک حق نواز کو وارننگ دی تھی اور پھر پلٹ کر دوبارہ گاڑی تک آیا۔

”دل آور پلیز یا۔ کچھ بتاؤ تو سہی؟ آخر آپ لوگوں کے درمیان کیا مسئلہ چل رہا ہے؟“ عبداللہ کو تجسس ہو رہا تھا۔

”بعد میں بتاؤں گا، ابھی تم گاؤں جاؤ۔“ اس نے بتانے سے گریز کیا تھا۔

”اے نہیں یار! تم سمجھ نہیں رہے، میں صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ملک حق نواز کے حوالے سے کوئی اور ویک وائٹ ہے تو کم از کم مجھے حویلی جانے سے پہلے بتاؤ ہو؟ تاکہ میں اس پر کچھ بول تو سکوں۔“ عبداللہ ملک حق نواز کے بارے میں کچھ اور معلومات چاہتا تھا۔ دل آور نے اس کی بات پر پہلے نیل کو پھر دوبارہ عبداللہ کو دیکھا اور کمری سانس کھینچی تھی۔

”اس نے ایک لڑکی مومنہ بی بی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ آج سے تقریباً دوں گیارہ ماہ پہلے کی بات ہے۔ مومنہ بی بی انصاف چاہتی ہے۔ اس کا کیس میرے ہاتھ میں ہے اور مومنہ بی بی آج کل نیل کے گھر میں رہ رہی ہے۔ اس ٹھٹھا انسان سے چھپ چھپ کے جی رہی ہے کہ کہیں یہ اس کے الزام سے بچنے کے لیے اس کا قتل ہی نہ کر دے۔“ دل آور نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے بتایا تھا اور عبداللہ اور نیل ششدر رہ گئے تھے۔

نیل کے دماغ کو ایک اور جھکا لگا تھا کہ یہ وہی ملک حق نواز ہے جس کے بارے میں اس روز انکسٹر شمناز بتا رہی تھی اور جو مومنہ بی بی کا بچرم تھا۔ جس نے مومنہ بی بی کی زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔ وہ کتنے دھڑلے سے دندنا پھر رہا تھا؟ لیکن ایک بات اور تکلیف دہ تھی کہ وہ عبداللہ کا رشتہ دار تھا، بلکہ زری کا بھی۔

”دل آور۔ تم سچ کہہ رہے ہو؟“ عبداللہ تو جیسے شرمندگی سے مر گیا تھا۔

”میرے سچ کی تصدیق کرنی ہے تو مومنہ بی بی کے پاس جاؤ، نیل کے گھر پہ ملے گی۔“ دل آور نے تلخی سے اشارہ کیا۔

”اف خدا! میرے خاندان میں ذلالت اب اس حد تک بڑھ گئی ہے۔“ عبداللہ کا دماغ چھٹنے کے قریب تھا۔ اس نے سر تھام لیا۔

”تم خاندان کی بات کرتے ہو، میرے تو اپنے گھر میں ہی ذلالت پائی گئی ہے۔“ نیل کا خیال اپنے باپ کی طرف چلا گیا تھا اور دل میں اس اذیت کا بال سا اٹھا تھا۔

”خیر چھوٹا اس مسئلے کو۔ میں نبٹ لوں گا، تم جاؤ اب۔“ دل آور نے اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لاتے ہوئے

عبداللہ کا کندھا تھپکا تھا۔

”لیکن یا۔ میں ان ظالم اور بے حس لوگوں میں زری کو لے کر کیسے جاؤں؟“ اس نندی میں پیری نہیں ڈال رہا تھا۔

”یہ لوہ۔ یہ اپنے پاس رکھ لو، کام آئیں گے۔“ دل آور نے ایک موبائل فون اور ایک ریو اور عبداللہ کو تھمایا تھا۔

”اس موبائل میں میرے نمبر کے علاوہ گلاب خان، نیل، انکسٹر شمناز اور ایس بی کامران اور پولیس اسٹیشن کا نمبر بھی سیو ہے۔ ہمیں فوری طور پر جس کی بھی مدد کی ضرورت ہو تم کال کر سکتے ہو اور یہ بھی نوڈ ہے اس کو استعمال کرنے کی نوبت آئے تو کسی کے سینے پر مت استعمال کرنا، سیدھا سیدھا قتل کا کیس ہو گا اس لیے استعمال کرنا پڑا تو کسی کی ٹانگ یا بازو پر استعمال کرنا، تاکہ کسی کی جان نہ جائے، ہوش و خواہش بے تحاشہ چلے جائیں۔“ دل آور نے اسے ہر طرح سے سمجھانا ضروری سمجھا تھا اور عبداللہ اس کا مشکور ہو گیا تھا۔

”تھینک یو یا۔ تھینک یو سوچو۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ سب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔“ عبداللہ نے اسے بغل گیر ہو گیا اور دل آور نے غصہ جھٹک کر اس کو تسلی دی اور گلاب خان کو اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

اور گاڑی میں بیٹھی زری کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے آنے والے وقت سے خوف آ رہا تھا کہ نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ دل آور، عبداللہ اور نیل گاڑی سے باہر کھڑے نہ جانے کیا کیا پلان بنا رہے تھے کہ نگارش کو بھی پریشانی اور بے چینی ہونے لگی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دل آور ان کو گاڑی میں بٹھا کے گیا تھا۔ اس لیے نہ تو وہ گاڑی سے نکل سکتی تھیں اور نہ ہی ان کو اپنے پاس بلا سکتی تھیں۔ لیکن شاید اللہ کو ہی ان کی حالت پر رحم آگیا تھا کہ وہ تینوں گاڑی کے قریب آگئے اور نیل نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا۔

”مدحیہ۔ تم اپنی گاڑی میں آ جاؤ، ان لوگوں نے گاؤں جانا ہے۔“ نیل کے کہنے پر زری نے ایک دم ہراساں سے انداز میں نگارش کو دیکھا تھا۔

”گاؤں؟“ اس کی سانسیں اٹکنے لگی تھیں۔

”کچھ نہیں ہو گا ابوں سمجھ لیں کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ ہی ہیں۔“ نیل نے تسلی دی تھی اور مدحیہ زری اور نگارش سے مل کر گاڑی سے اتر آئی تھی۔

زری نے بے اختیار گاڑی سے باہر کھڑے عبداللہ سے بات کرتے دل آور کو دیکھا تھا۔ زری کے دل کی تو پیاس بھی نہیں بجھی تھی اور وہ لوگ گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے؟ زری کے دیکھتے دیکھتے ہی نیل نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر ڈرائیونگ سیٹ گلاب خان نے نبھال لی تھی اور دل آور سے رخصت ہو کر عبداللہ بھی فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ دل آور اور نیل وہیں کھڑے تھے اور گلاب خان گاڑی نکال لے گیا تھا۔ اس کے پیچھے مدحیہ بھی گاڑی نکال لے گئی تھی اور رفتہ رفتہ دونوں بھی وہاں سے نکل آئے تھے۔



وہ نماز نکلا اور تویلیے سے بال رگڑتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا تھا جہاں مریم پہلے سے موجود کمرے کی صفائی کرنے میں مصروف تھی۔ عدیل کو گنگنائے دیکھ کر اس کے ہاتھ تھر گئے تھے۔ وہ کل سے کافی خوش اور فریض لگ رہا تھا۔

”یہ گانا آپ نے سنا پہلی بار ہے؟ یا اچھا پہلی بار لگا ہے؟“ مریم کے سوال پر عدیل گنگنائے ہوئے رک گیا۔



”کیا مطلب؟“ عدیل نے تکیہ کھوٹی سے لٹکا کے اپنی شرٹ — پہنتے ہوئے مریم کو نا سمجھی سے دیکھا تھا۔

”مطلب کہ آپ کل سے جب سے کام سے واپس آئے ہیں مسلسل یہی گانا گنگنا رہے ہیں؟ کیا یہ گانا زیادہ اچھا لگ گیا ہے آپ کو؟“ مریم کے کہنے پر عدیل یک دم اک بے ساختہ سا تکیہ لگا کے ہنسا تھا۔ تو گویا مریم کل سے اسے نوٹس کر رہی تھی؟

”یہی سمجھ لو کہ اچھا پہلی بار لگا ہے۔ ورنہ سنا تو پہلے بھی تھا۔“ عدیل نے بھی دلچسپی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”وہ اچھا اچھا۔ تو جس کی وجہ سے اچھا لگا ہے اس کا نام ہتا سکتے ہیں؟“ مریم جاننا چاہتی تھی۔  
”میرے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود جانتی ہو اسے۔ بلکہ مل بھی چکی ہو۔“ عدیل اپنی خوشی اپنے دل کی کیفیت مریم سے نہیں چھپا سکتا تھا۔

”یعنی مدیہ حیات؟“ مریم نے بستری چادر سے سلوٹیں دور کرتے ہوئے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔  
”ہوں۔۔۔ دی۔“ عدیل اثبات میں جواب دیتا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرنے لگا۔  
”ج؟ مجھے یقین نہیں آ رہا؟“ مریم چادر کا کونا چھوڑ کے پوری طرح سے عدیل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔  
”کیوں؟ اس میں ناقابل یقین کیا ہے؟ کیا اپنے بھائی کی پر سنالٹی پہ کوئی شک ہے؟“ عدیل نے مریم کو چھیڑا تھا۔  
”ارے نہیں، نہیں! مجھے اپنے بھائی کی پر سنالٹی پہ پورا یقین ہے۔ بس اس لیے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تو شاید لندن پلٹ ہے اور تھوڑی اکھڑ مزاج بھی ہے۔ آپ کا اور اس کا یہ جوڑ سیل؟“ مریم بات اور حوری چھوڑ کے چپ ہو گئی تھی۔

”لندن پلٹ ہے تو کیا ہوا؟ کیا اس کے پاس دو آنکھیں اور ایک دل نہیں ہے؟ کیا وہ دیکھ کر محسوس نہیں کر سکتی؟ کیا وہ لڑکی نہیں ہے؟ اور ہاں وہ اکھڑ مزاج اور ضدی ضروری ہے، لیکن اندر سے بہت حساس اور نرم ہے۔ اس کو آئینے کی طرح دیکھ چکا ہوں میں۔ اتنی شفاف بھی کہ مجھے اس میں اپنا آپ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ناریل کی طرح ہے، باہر کا خول بہت سخت سہی، لیکن اندر سے کچی گرمی (کچے ناریل) کی طرح ہے نرم اور میٹھی۔“  
عدیل نے مدیہ کے حوالے سے دل کھول کے اظہار کیا تھا اور مریم اس کے اظہار پہ مسکرا اٹھی تھی۔  
”یعنی آپ مجھے کام سے؟“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”ہاں۔۔۔ کہہ سکتی ہو۔“ عدیل نے بھی جواباً ”شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اپنے بال سسلانے

تھے۔  
”تو کیا یہ گلاسز بھی اسی کے ہیں؟“ مریم نے عدیل کے تنکے کے نیچے رکھے گلاسز نکالے، جو کافی عرصے سے عدیل کے تنکے کے نیچے ہی پائے جاتے تھے۔  
”آف کورس۔۔۔ اور گس کے ہو سکتے ہیں بھلا؟“ عدیل یوں لاپرواہی سے کہہ رہا تھا جیسے اس کا مدیہ کے ساتھ صدیوں سے کوئی ریلیشن چلا آ رہا تھا۔

”او۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ خیر آپ یہ بتائیں کہ آپ ان سے ہماری ایک پر اپر طریقے سے مذہب اور پر تکلف سی ملاقات کب کر رہے ہیں؟“ مریم نے فرمائش کی تھی۔  
”جب مجھے سیلری ملے گی۔“ عدیل کے چہرے سے ابھی تک مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔

”اوہو ہنس۔۔۔ سیلری ملنے میں تو ابھی دس بارہ دن باقی ہیں؟“ مریم نے بد مزہ ہوتے ہوئے ہراساں نہ بنایا۔  
”تو کیا یوں ہی خالی گھر میں لے آؤں؟ آج کل کے دنوں میں تو گھر میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے،“



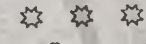
کسی مہمان کو کیا کھلائیں گے؟ عدیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور مریم زرا دیر کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔ پھر ذرا توقف سے گویا ہوئی۔

”میں کوشش کروں گی کہ مجھے جلدی سیلری مل جائے، پھر انہیں انوائٹ کر دوں گی۔“ مریم کے لہجے میں اک عجیب سی چاہ تھی۔ وہ مدیحہ سے جس رشتے کے حوالے سے ملنا چاہتی تھی اس کو سمجھتے ہوئے عدیل کے چہرے پر نرمی بکھری اور پھر مریم کے قریب آتے ہوئے اس کا سر تھکا تھا۔

”ان شاء اللہ۔ اللہ بہت بہتر کرے گا۔ کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب مہمان جس وقت بھی آئے گا، ہمیں پریشانی نہیں ہوگی کہ ہمارے پاس خاطر مدارات کے لیے جائے اور کولڈ ڈرنک کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ جب ہمیں تمہارے لیے لایا ہوا برگر کسی اور کو نہیں دینا پڑے گا۔“ عدیل اس کا سر تھکتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا۔ اور مریم اپنے آنسو ضبط کرنے کے لیے سر جھکا گئی تھی۔

”عدیل۔ تمہارے بابا کو تیار کر دیا ہے میں نے۔“ برآمدے سے امی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے آج اباجی کے چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ اس لیے عدیل نے آج ورکشاپ سے چھٹی کی تو مریم بھی اکٹدی جانے کی بجائے گھر پر رہ گئی تھی۔ تاکہ عدیل کے ساتھ اسپتال جاسکے، کیونکہ عدیل اکلا ان کے ساتھ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا تھا۔ سرکاری اسپتالوں میں ڈاکٹرز کے پیچھے بھاگنا، چیک اپ کے لیے نمبر لگوانا اور ساتھ ساتھ مریض کو سنبھالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے مریم عدیل کی مدد کے خیال سے گھر پر ہی رک گئی تھی اور اب ان دونوں بہن بھائی نے ساتھ ہی جانا تھا۔

”چلو۔ جلدی کرو، تم بھی تیار ہو جاؤ تب تک میں ٹیکسی لے آتا ہوں۔“ وہ نرمی سے اس کا سر تھک کے باہر نکل گیا تھا اور مریم ہاتھ میں پکڑے گلاسز دوبارہ اس کے۔ ٹیکسی کے نیچے رکھ کے بستر کی چادر درست کر کے باہر نکل آئی تھی۔ اور چادر اوڑھ کے تیار ہو گئی تھی۔ اتنے میں عدیل واپس بھی آگیا۔ ٹیکسی کٹی کی ٹکڑی بکھری تھی۔ عدیل اکاباجی کو بازوؤں میں اٹھائے گاڑی تک لے گیا اور اس کے پیچھے پیچھے مریم بھی ٹیکسی میں آ بیٹھی تھی۔



اس کی گاڑی اپنے آفس کے سامنے ایک جگہ سے روکی تھی اور اس کے پیچھے نیل کی۔  
دل اور گاڑی سے اترتا تو اس کے پیچھے نیل بھی اتر آیا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آفس روم میں داخل ہوئے تھے۔

”بہنو! اب کیا مسئلہ ہے؟“ دل آور نے موبائل اور چابیاں نیل پر ڈالتے ہوئے نیل کو دیکھا۔ نیل کرسی کے ہتھوڑے پر بے چینی سے ہاتھ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے سوال پر فوراً ہی بے چینی سے کھڑا بھی ہو گیا۔

”مسئلہ میں نے بتانا ہے یا تم نے بتانا ہے؟“ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ملک حق نواز کا کیا سلسلہ ہے؟ اور وہ نکاح کی کیا بات کر رہے تھے تم لوگ؟“ نیل بے چینی سے شلٹے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”آرام سے بیٹھو گے تو بتاؤں گا؟“ دل اور اپنی چیر خو کھیل کر بیٹھ گیا تھا اور بے چین اور بے کل سے شلٹے نیل کو سر پام دیکھا تھا۔ نیل یہ کیا کر رہی تھی دل اور بخوبی جانتا تھا۔ اسی لیے تو اس نے اپنی بے چینوں کو سینے کے سب سے سروخانے میں وطن کر دیا تھا۔ صرف ایک کابے چین رہتا ہی اچھا تھا۔ کیونکہ اگر دونوں ہی بے چین رہتے تو شاید ایک دوسرے کے دوست ہی نہ رہتے۔

اور اس وقت ان دونوں کے درمیان جو ٹینشن اور کنڈیشن کچھ اور ہوتی اور یقیناً ایک دوسرے سے نظر بھی نہ ملتا پاتے۔ شاید اسی لیے دل اور شاہ بہت پیلے ہی ان بے چین اور بے کل کردینے والی راہوں سے قدم واپس موڑ

چکا تھا۔ وہ اس منزل کو نہیں پانا چاہتا تھا۔ جس کو پانے کے لیے نیل کے قدم بھی رواں ہواں تھے۔ جس کو پانے کی چاہ نیل کے دل میں بھی بھٹی تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا کہ خود وہ منزل پالیتا اور نیل کو نامراد ٹھہرا دیتا۔ اس کی مسافت رائیگاں کر دیتا، اسے مایوس لوٹنے پر مجبور کر دیتا؟ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ دل اور شاہ جیسا بھی تھا لیکن خود غرض نہیں تھا۔ یہ سچ تھا کہ اسے یہ سارے رشتے اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز تھے۔

”ہوں۔ بتاؤ؟“ نیل اپنی بے چینی کٹر کرنا ہوا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور دل اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کمری سانس خارج کرنا خود بھی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

”ملک حق نواز کو جانتے ہو۔ وہ کون ہے؟“ دل آور نے آغاز سوال کرنے سے کیا تھا۔

”نہیں۔“ نیل کا جواب حسب توقع تھا۔

”وہ ملک شرافت علی کا چچا زاد کزن ہے۔“

”ملک شرافت علی۔؟“ نیل کا دل اس وقت آدھا حاضر۔ آدھا غیر حاضر تھا۔

”عبداللہ کے بابا جان۔“

”واٹ۔؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ دل آور کے انکشاف یہ نیل دنگ رہ گیا تھا۔

”مجھے بھی اسی طرح شک لگا تھا۔ خیر آگے سنو۔“ دل آور نے بات کا سلسلہ جاری رکھا۔

”ملک حق نواز، ملک شرافت علی کا سب سے چھوٹا کزن ہے عبداللہ سے آٹھ دس سال بڑا اور ملک اسد کا تقریباً ہم عمر ہی ہو گا۔ ملک حق نواز ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس کے چاؤ چونچلے بھی کچھ زیادہ ہی تھے اور ان چاؤ چونچلوں میں بڑے بزرگوں نے بنا سوچے سمجھے عبداللہ کی بڑی بہن شہین کو ملک حق نواز کے ساتھ منسوب کر دیا۔ لیکن ملک حق نواز شروع سے ہی ایک غیبی انسان ثابت ہوا ہے اس نے جوانی کے منہ زور گھوڑے پر سوار ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ شہین کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ دیا، پتا نہیں یہ شہین کی خوش قسمتی تھی کہ بد قسمتی۔ البتہ ملک حق نواز اپنے چچا زاد۔ کی بیٹی کے ساتھ بندھ کے نہیں رہنا چاہتا تھا حالانکہ بہت لوگوں نے اسے

مٹانے کی کوشش بھی کی تھی یہاں تک کہ ملک شرافت علی نے خود بھی اسے راضی کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ ملک شرافت علی کی ملک حق نواز یہ نہیں اس کی جاگیر اس کی جائیداد یہ نظر تھی، کیونکہ وہ اکلوتا جو تھا۔ مگر اکلوتا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ضدی، بد لحاظ اور ایک نمبر کا کھٹیا آدمی تھا، وہ نہیں مانا اور اپنی من مانی کرتا رہا، شراب اور حرام کاری اس کا شوق بن چکے ہیں، وہ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتا، اس پاس کے گاؤں والے اور اس کے اپنے گاؤں والے ہر وقت اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

دوبارہ ایکشن میں بھی حصہ لے چکا ہے اور دونوں بار جیت بھی چکا ہے۔ ملک شرافت علی کی بیٹی کو ٹھکرانے کے بعد بھی وہ ان کا منظور نظر ہے اور اب زری سے شادی کا خواہش مند ہے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے شہین کو ٹھکرانے کا ازالہ کرنا چاہتا ہے اور عبداللہ مسلسل احتجاج کر رہا ہے کہ یہ ازالہ ہے یا ظلم۔؟ وہ اپنے گھروالوں کے اس فیصلے کے خلاف ہے۔ وہ زری کی شادی زری کی پسند سے کرنا چاہتا ہے، اس لیے یوں سمجھو کہ عبداللہ آج اپنے گاؤں اپنی حویلی میں جنگ لڑنے گیا ہے۔ اب یہ جنگ کیا نتائج سامنے لائی ہے یہ تو رات کو پتا چلے گا۔ یا پھر کل۔؟“ دل آور نے نیل کو ساری تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور نیل دم بخود سا بیٹھا سب سن رہا تھا۔

”ملک حق نواز، زری سے شادی کا خواہش مند ہے۔؟“ یہ سوچ ہی نیل کی رگوں کو کاٹ دینے کے لیے کافی تھی نیل کا دل چاہ رہا تھا ملک حق نواز دوبارہ اس کے سامنے آجائے تو وہ اسے کوئی سے ارادے اس کے دماغ کی رکیں پھٹنے کو کہیں۔



”وہ سدہ کیا کرتی ہے اس بارے میں۔“ نیل کو زری کا خیال آیا تھا جس پہ دل اور کے دل و دماغ کا سکون منتشر ہو گیا تھا وہ اپنی کرسی چھوڑ کے اٹھ گیا۔  
 ”مجھے کیا پتا کہ وہ کیا کرتی ہے؟ میں کون سا اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔؟ یا پھر اس کے دل کی خبریں رکھتا ہوں۔؟“ دل اور کہتے ہوئے رخ موڑ گیا تھا۔  
 ”لیکن دل اور! تم جانتے ہو نا کہ میں۔“ نیل کافی بے بسی سے بولا تھا لیکن بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ دل اور کا مٹی قادر روزا سے دستک دے کر اندر آ گیا تھا۔  
 ”سرلوہ آپ کے یا لکوت والے کلائٹ آئے ہیں، قتل کے کیس والے۔ آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔“ قادر اس کی اجازت طلب کر رہا تھا۔  
 ”ناچ منٹ لیڈا نہیں اندر بھیج دو۔“ دل اور نے قادر کو جانے کا اشارہ کیا اور نیل کے قریب آکر ہوا۔  
 ”مجھے پورا یقین ہے کہ عبداللہ کچھ نہیں ہونے دے گا۔ اس لیے تم بھی یہ یقین اپنے ساتھ رکھو۔ ان شاء اللہ سب بہتری ہو گا۔“ دل اور نے اپنا مضبوط ہاتھ نیل کے کندھے پر جماتے ہوئے اسے تسکین دی تھی۔ اور دل اور کے ایسے مضبوط ہاتھ اور اندازہ نیل کو کافی حد تک تسلی ہوئی تھی اسی لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے ہاتھ ملا کر چلا گیا تھا یہی نیکو دل اور کے کلائٹ اس کے انتظار میں تھے۔



وقار آندھی پوری طرح سے ہوش و حواس میں آچکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ساکت و صامت سے لگ رہے تھے۔  
 ان کی آنکھوں کے سامنے سارے ہی چہرے موجود آؤر وانیال بخود محمد امجد زین عون عدید ۴ سردار آندھی ۴ ظہار آندھی سب چہرے باری باری ان سے ملنے کے لیے ان کے سامنے آتے رہے۔ لیکن جس چہرے کو ان کی پتھری ہوئی آنکھیں دیکھنا چاہتی تھیں وہ سامنے ہی نہیں آ رہا تھا وہ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے وجود کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی پتھر ہو گئی تھیں۔  
 ”وقا! ان کے قریب سے گلو گے اور آنسوؤں کے بوجھ سے بھیگی اور بوجھل آواز ابھری تھی اور اس آواز کو سنتے ہی ان کے دل پہ لرز طاری ہو گیا تھا۔

”آئیہ۔! ان کا دل زور سے دھڑا رہا تھا اور پھر حائز مار مار کے روتا تھا۔ زبان سے وہ پکار نہیں سکتے تھے اور دل سے پکارنے آئیہ آندھی سن نہیں سکتی تھی۔ وقار آندھی کا دل بھر آیا تھا۔  
 ”وقا! مجھے دیکھیں نا۔ میں ہوں آپ کی آئیہ۔ آپ مجھ سے منہ موڑے یہاں ہسپتال میں کیوں پڑے ہیں؟ آپ کو نہیں پتا آپ کے بغیر میرا کیا حال ہو گیا ہے؟ آپ کی آئیہ چار دن میں ہی بوڑھی بننے لگی ہے۔ لیکن کریں وقار آئیہ آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے میں تو سب کچھ آپ سے وار چکی ہوں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہے گا؟ کیا کروں گی میں۔؟ یہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ میرا کون ہو گا؟ آئیہ آندھی وقار آندھی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے بے تحاشا رو رہی تھیں اور ان کے اس طرح رونے پہ وقار آندھی کی پتھر آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ ان کا پورا جسم بے جان تھا اور بے جان جسم کی پتھر آنکھوں سے آنسو بہہ کر خود بخود ہی ان کی کنپٹیوں سے لڑھک کر بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

”وقا۔ آپ کو میرا خیال کیوں نہیں آتا؟ آپ ٹھیک کیوں نہیں ہو رہے؟ آپ۔ آپ میرے لیے نہ سہی میرے بچوں کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ میرے عون اور عدید کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ میری۔ میری علیزے

کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ وقار آپ سن رہے ہیں نا ہمیں آپ سے کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ کو ہم سب کی خاطر ٹھیک ہونا ہے۔ آئیہ آندھی تڑپ تڑپ کے کہہ رہی تھیں اور وقار آندھی کے آنسو خاموشی سے بہتے جا رہے تھے۔ وقار آندھی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ان کے سوالوں کا ان کے پاس صرف خاموشی تھی۔ لہجی اور گہری خاموشی سوال کرنے والوں کو بڑھال کر دینے والی خاموشی۔ عمر بھر کی خاموشی۔  
 ”آئی پلےز! آپ باہر آجائیں۔“ وانیال آئیہ آندھی کو دونوں کندھوں سے تھام کے ان کے روم سے باہر لے آیا تھا جو بچکیوں سے رو رہی تھیں۔

”ہم تم کو اس لیے ساتھ لے کر آئے تھے کہ آپ ان کو تسلی دیں، دلا سادیں ان کی ہمت برہائیں نا کہ ان کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب کر دیں۔“ وانیال خفا ہو رہا تھا۔  
 ”وانیال۔! عون اور عدید کو بھی تسلی کے ساتھ واپس گھر بھیج دو۔“ احمد نے عون اور عدید کو وانیال کی طرف بھیجا وانیال تھوڑی دیر آئی کو تسلی دلا سادینے کے بعد مبارک خان کے ہمراہ واپس گھر بھیج کر دوبارہ روم میں آیا تو وقار آندھی کی حالت کافی تشویشناک پائی تھی ڈاکٹر ایک دم سے پریشان نظر آنے لگے تھے۔ اور ان کا ٹریٹ منٹ نئے سرے سے شروع ہو گیا تھا۔  
 ”یہ اچانک کیا ہوا ہے ان کو؟“ ڈاکٹر پریشانی سے آگے بڑھا تھا۔

”۲ نموں نے کوئی گہری ٹینشن لی ہے، دل بہت کمزور ہو چکا ہے، سبہ نہیں پارہا۔“ ڈاکٹر پریشانی سے جواب دے رہا تھا۔

”یہ میڈیسن فوراً آجائیں۔“ ڈاکٹر نے تیزی سے کاغذ قلم تھام کے نسخہ لکھا اور کاغذ آؤر کی سمت بڑھا دیا تھا۔  
 ”ہسپتال کی ڈسپنری سے یہ میڈیسن ختم ہو چکی ہیں اس لیے آپ کو کسی اور جگہ سے تلاش کرنا پڑیں گی۔“ ساتھ ساتھ ڈاکٹر نے بتا بھی دیا تھا اور آؤرہ نسخہ ہاتھ میں تھامے براؤنٹ روم سے باہر نکل آیا تھا۔  
 ”لایئے! یہ میڈیسن میں لے آنا ہوں۔“ بخود نے آؤر کو روک دیا تھا اور وہ نسخہ خود تھام لیا تھا۔  
 ”لیکن تم۔؟“ آؤر نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”میرے پاس بانیک ہے۔ میں جلدی لے کر آ جاؤں گا۔“ بخود نے اسے یقین دلایا تھا۔  
 ”اوکے! لے آؤ لیکن پھر وہی بات کہ جلدی پہنچنا ڈیڈ کی کنڈیشن خاصی سیریس ہے۔“ آؤر نے پھر بھی اسے تاکید کرنا ضروری سمجھا تھا۔

”اوکے! جلدی پہنچوں گا۔“ بخود اسے تسلی دے کر پلٹ گیا تھا۔  
 ”چلو میں بھی ساتھ چلا ہوں۔“ بخود کا دوست کامی بھی ڈیڈ کی عیادت کے لیے ہسپتال آیا ہوا تھا بخود کو میڈیسن لانے کے لیے تیار رکھا تو وہ بھی ساتھ ہی آ گیا تھا۔



”ڈاکٹر نے یہ میڈیسن اور انجکشن لکھ کر دیے ہیں تم اباجی کے پاس ٹھہرو میں یہ سب لے آؤں۔“ عدیل ڈاکٹر کے روم سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سفید پرچی تھی وہ مریم کو تار میڈیکل اسٹور پہ جانے والا تھا کہ مریم نے اسے روک دیا تھا۔  
 ”ٹھہرس! آپ ایسا کریں کہ اباجی کو کچھ دیر کے لیے کسی وارڈ کے بیڈ پہ لٹا دیں، وہ زیادہ دیر اس ویل چیئر پہ نہیں بیٹھ سکتے ٹھک جائیں گے۔“  
 ”لیکن مریم! کوئی خالی بیڈ ڈھونڈنے میں ٹائم لگے گا ڈاکٹر نے یہ انجکشن فوری منگوائے ہیں۔“ عدیل پریشانی



سے بولا۔

”لائیں! یہ میڈسن اور انجکشن میں لے آتی ہوں۔“ اس نے عدیل کے ہاتھ سے پرچی تھام لی تھی اور پھر پلٹ کر ہسپتال کے اندرونی حصے سے باہر نکل آئی اور اپنی بے دھیانی میں وہ عدیل سے دو ایوں کے لیے پیسے لینا بھی بھول گئی تھی۔

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ ہسپتال کے باہر بنے میڈیکل اسٹورز میں سے ایک اسٹور کی طرف بڑھی تھی۔

”پلیز! یہ میڈسن دے دیں۔“

اس نے سفید پرچی پہ لکھا نسخہ میڈیکل اسٹور کے سامنے والے کاؤنٹر پر رکھا اور سٹالز میں کو جلدی دوایاں نکالنے کا کہا تھا وہ اپنے دھیان میں تھی اپنے قریب کھڑے جود کو بھی نہ دیکھ سکی البتہ جود کے ساتھ کھڑے کامی نے اسے ضرور دیکھ لیا تھا۔

”جود تھ!“ اس نے جود کو ٹوک دیا۔

”ہوں؟“ پریشانی میں جود کو بھی اس پاس کا کوئی دھیان نہیں تھا۔

”اُور دیکھو؟“ کامی نے اشارہ کیا تھا۔

اور جود نے اپنی سائڈ پر دیکھا اس سے تین قدم کے فاصلے پر مریم کھڑی تھی جود اس کو دیکھتے ہی چونک گیا تھا۔

”مریم؟“ اس نے خود کامی کے سے انداز میں اس کا نام لیا تھا۔

”بات کرو گے؟“ کامی کو پتا تھا کہ یہ لڑکی جود کی کمزوری ہے وہ اپنی فہلنگز کا کئی بار سرعام اظہار کر چکا تھا۔

”نہیں! ناگم نہیں ہے مجھے میڈسن لے کر جلدی پہنچنا ہے۔“ جود کو پتا تھا کہ اگر ذرا بھی لیٹ ہو گیا تو آؤر کے ہاتھوں اس کی شامت آجائے گی۔

”کتنا بل ہے ان کا۔“ مریم دو ایوں کا شمار دیکھتی ہوئی بولی۔

”دو ہزار۔“ سٹالز میں نے ذرا لاروائی سے بتایا تھا۔

”دو ہزار؟“ مریم ہری طرح حشکی تھی۔

اس کے پاس تو پیسے ہی نہیں تھے اس نے ذرا پریشانی اور جھلٹ میں اپنا پرس کھنگالا پرس میں صرف پندرہ سو روپے تھے جو اس نے اپنے اکیڈمی آنے جانے کے گرائے کے لیے رکھے ہوئے تھے ان میں سے بھی پانچ سو روپے کم تھے میڈسن دو ہزار کی تھیں۔

”سو ری سرا میں پیسے بھول آئی ہوں، آپ یہ میڈسن سیور رکھیں میں ابھی آکر لے لیتی ہوں؟“ مریم جھلٹ سے کہتی ہوئی پلٹ کر میڈیکل اسٹور سے نکل آئی تھی۔

”آپ میڈسن لے جائیں بل میں پیسے کر دیتا ہوں؟“ جود اچانک اس کے راستے میں آگیا تھا مریم جہاں اسے دیکھ کر حشکی تھی وہیں چکر ابھی گئی تھی وہ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا؟

”دیکھیں۔ میں اس وقت خود پریشانی میں ہوں، آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتا میں آپ کی ہیلپ کرنا چاہتا ہوں، آپ پلیز میڈسن لے جائیں۔“

جود کافی مذہب طریقے سے بات کر رہا تھا لیکن مریم اس کی کسی بھی ہیلپ کے چکر میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”جینک پو سوچ! مجھے آپ کی کسی بھی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے، مجھے بھائی کے پاس ہیں اس لیے زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے یہ میڈسن میں خود ہی آکر لے جاؤ گی۔“ مریم نے کافی سختی اور بے گامی سے اس کی آفر

مسترد کر دی تھی اور وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے جود مزید کچھ کہنے بغیر اس کے راستے سے ہٹ گیا تھا، مریم تیزی سے سڑک کر اس کر کے ہسپتال کے اندر چلی گئی اور جود پلٹ کر میڈیکل اسٹور کے اندر آگیا تھا ان کی مطلوبہ میڈسن بھی مل چکی تھیں میڈسن کا بل سیکر کروا کے وہ کامی کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا لیکن مریم جب پیسے لے کر وہاں پہنچی تو سر تھام کے رہ گئی تھی جود اس کی میڈسن کا بھی بل پے کر گیا تھا اور مریم کو لگا وہ اسے مقروض کر گیا ہے۔ لیکن وہ کسی بھی صورت اس کا یہ احسان نہیں رکھ سکتی تھی۔



گاڑی میں روٹے گاؤں کی چھوٹی سڑک کی سمت مڑی تو زری کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک شان دار سا ڈیرہ نظر آتا تھا یہ ڈیرہ ملک شرافت علی کا ہی ڈیرہ تھا یہاں ہر وقت پنچائیت لگی رہتی تھی، اس پاس کے علاقے والوں ملنے ملائے والوں اور دوست احباب کا ہر وقت یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا گاؤں کا غریب طبقہ بھی اپنے مسائل حل کروانے، زمینوں اور لڑائی جھگڑوں کے معاملات طے کروانے کے لیے یہاں ہی پایا جاتا تھا۔ اس لیے اس ڈیرے سے لوگوں کی محفل کبھی ختم نہیں ہوتی تھی۔ آئے روز دروازے کے علاقوں سے ان کے مہمان آتے رہتے تھے اور مہمانوں کی خاطر مدارات کا انتظام بھی یہیں پہ ہوتا تھا رات گئے تک محفلیں جعتی تھیں اور اس وقت بھی یہی حال تھا گاڑی ڈیرے کے قریب سے گزری تو عبداللہ نے ڈیرے کے اندر نظر دوڑائی تھی۔

ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ یہاں ہی تھے اور یقیناً ابھی ابھی ہی پہنچے تھے۔ عبداللہ کمری سانس کھینچتا ہوا بل بھینچ کر سیدھا ہو بیٹھا تھا وہ اکیلا ہوتا تو یقیناً پہلے اس ڈیرے پہ ہی اترتا۔ لیکن فی الحال زری اور نگار ش اس کے ساتھ تھیں وہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا گاڑی اگلے پانچ منٹ میں ان کی حویلی کے سامنے موجود تھی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ عبداللہ کو دیکھتے ہی حویلی کے دونوں چوکیداروں نے بڑا سا لکڑی کا تھانک واکر دیا تھا۔ گلاب خان عبداللہ کے اشارے پہ گاڑی اندر لے آیا تھا کشادہ اور طویل ترین ڈرائیو پہ سلو اپڈ سے چلتی گاڑی حویلی کے مرکزی برآمدے کے عین سامنے آرکی تھی اور عبداللہ گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا اور ساتھ ہی اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ بھی کھول دیا تھا عبداللہ سب کے سامنے ہر طرح سے ڈٹ جانے کے لیے تیار تھا جبکہ زری اور نگار ش اپنی اپنی جگہ پہ دونوں سہمی بیٹھی تھیں زری کی حالت تو کچھ زیادہ ہی خراب تھی کہ اپنے ہی گھر میں قدم رکھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

”زری۔! زری کو کسی سوچ میں کم پا کر عبداللہ نے متوجہ کیا تھا۔

”جج جی؟“ وہ چونک کر متوجہ ہوئی اور عبداللہ کو انتظار میں کھڑے دیکھ کر فوراً ”نیچے اتر آئی تھی۔

یہاں سب کو خبر تھی کہ عبداللہ اور زری دونوں بہن بھائی آج واپس پاکستان آ رہے ہیں لیکن پھر بھی حویلی یوں نظر آ رہی تھی جیسے صدیوں سے ویران بڑی ہو، ہر طرف گراناٹا تھا۔ حالانکہ شام سے پہلے کا وقت تھا شام بس ڈھلنے کو تھی، چٹکے پکھیرو اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے وہ بھی اپنے آشیانے میں لوٹ کر آئے تھے مگر یہاں شاید کسی کو بھی ان کا انتظار نہیں تھا شام کے وقت حویلی میں خاصی چل پھل ہوتی تھی لیکن آج ایسا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور عبداللہ اس خاموش ”وکیلک“ کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی سر جھٹک کر قدم آگے بڑھا دیا تھا۔

”عبداللہ۔! نگار ش کی آواز پہ عبداللہ نے چونک کر نگار ش کو دیکھا اور قدم ٹھہر گئے تھے۔

نگار ش کی آنکھوں اور چہرے پہ ایک عجیب سا خوف ہلکوارے لے رہا تھا اور یہ خوف عبداللہ کی نظروں سے



پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور بے ساختہ ایسے حالات میں بھی مسکرا رہا تھا۔ زری نہ ہوتی تو شاید وہ نگارش کے اس انداز اس خوف زدہ سی ادایہ اسے بانہوں میں بھر لیتا لیکن فی الحال اس کا ہاتھ ٹھیکنے پہ اکٹھا کیا تھا۔  
 ”پاگل۔! محبت کرتا ہوں تم سے اور محبت انسان کے قدم اکھڑنے نہیں دیتی۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ کہیں میں تمہیں چھوڑ نہ دوں؟“

عبداللہ کے انداز میں سرزنش تھی وہ کافی آسکتی سے اس سے مخاطب ہوا تھا اس لیے ذرا فاصلے پہ رخ پھیر کے کھڑی زری نہیں جان سکی تھی کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی ہے؟

”بی بی بی جان! چھوٹے ملک صاحب آگے سا ہر دیکھیں۔ چھوٹے ملک صاحب آگے۔“

ایک نو عمر ملازمہ برآمدے کی بائیں طرف سے نکل کر اپنے دھیان میں ادھر ہی آ رہی تھی جب عبداللہ اور زری کو دیکھتے ہی اس کے وجود میں بجلی سی بھج گئی تھی۔ اور بی بی جان کو اطلاع دینے کی غرض سے زور زور سے چلاتی ہوئی ان سے پہلے ہی راہداری میں گم ہو گئی تھی۔

”صاحب! تم بھی چھوٹے ملک صاحب کی ملکانی صاحبہ ہوا اندر جانا ہے؟“ عبداللہ نگارش کو مینشن فری کرنے کی خاطر کافی شرارت سے کہا تھا اور پھر تینوں اندر آگئے تھے۔

”میں بسم اللہ۔ میں بسم اللہ! میں صدقے میں واری۔ میرے کلیجے دی ٹھنڈک۔ میری اکھیاں برا چاچن۔“

بی بی جان بے تحاشہ ممتا سے مغلوب اپنے خالص سار کا خالص پنجابی میں اظہار کرتیں اپنے شاہانہ تخت سے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور قریب آتے عبداللہ کو آگے بڑھ کے سینے سے لگا لیا تھا۔

”کیسی ہیں بی بی جان؟“ عبداللہ کالجہ بھی ماں کی ممتا کے سامنے نرم ہو گیا تھا۔  
 ”خوبو لیا ہے تو سمجھو کہ میں ٹھیک ہی ہوں۔“ وہ عبداللہ کی پیشانی پہ بوسہ دیتی ہوئی بولی تھیں۔

”بی بی جان!“ عبداللہ کے عقب سے زری کی آواز سنائی دی تھی اور بی بی جان نے اپنی بیٹی کی آنکھیں پونچھتے ہوئے بازو اکڑیے تھے اور زری بچوں کی طرح چپک کے ان کے سینے سے لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی

وہ آج اپنی ماں سے پانچ سال بعد مل رہی تھی اور ان پانچ سالوں میں یوں لگ رہا تھا جیسے بہت کچھ بدل گیا تھا اپنے بھی اپنے نہیں رہے تھے اور اپنوں کے پرانے ہونے کا دکھ ہی اسے یوں بے پناہ لارہا تھا۔

”زری۔! کسی اور کو بھی ملنے دو گی یا نہیں؟“ عبداللہ نے مصنوعی خشکی سے کہا تھا اور پھر بی بی جان کو کندھوں سے تھام کے زری سے الگ کیا تھا۔

”بی بی جان۔! یہ آپ کی ہو ہے نگارش۔“ عبداللہ نے نگارش کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اور بی بی جان اتنی خوبصورت اور بہاری سی لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر ٹھٹھک گئی تھیں۔ کافی باوقار سی لڑکی تھی عبداللہ کے پہلو میں کھڑی راج رہی تھی۔

”سلام علیکم بی بی جان۔! نگارش نے کافی جھجکے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔

بی بی جان نے ایک نظر عبداللہ کو دیکھا اور پھر دوبارہ نگارش کو دیکھا تھا وہ اپنے دل کو پھر نہیں بتا سکی تھیں انہوں نے نگارش کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بھی سینے سے لگا لیا تھا۔

”جتنی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ سدا سا گن رکھے۔“ انہوں نے اسے دعاؤں سے نوازا تھا اور نگارش کی پچلیں بھیک گئی تھیں۔ عبداللہ کے حوالے سے زری کے بعد یہ دوسرا رشتہ تھا جو اس سے اس طرح محبت سے پیش آیا تھا اور اسے بہت اچھا لگا تھا دل کو سکون محسوس ہوا تھا۔

”آؤ بیٹھو تم لوگ۔ تمک گئے ہو گے؟“ بی بی جان نے تخت پہ رکھی تسبیح دوبارہ تھام لی تھی اور — صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”ان کے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے یہاں۔“ ملک شرافت علی کی کرخت آواز پہ صوفے کی سمت اٹھتے عبداللہ کے قدم یکدم ٹھہر گئے تھے اس نے فوراً ”پچھتے پلٹ کے کو دیکھا تھا۔

”بابا جان۔! عبداللہ بے ساختہ ان کی طرف بڑھا تھا۔  
 ”بس۔! اس کی ضرورت نہیں ہے جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔“

انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا اور عبداللہ دم بخود سا کھڑا رہ گیا تھا اسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ بابا جان نے اسے اس طرح کہا ہے؟

بے شک ان لوگوں میں ہزاروں اختلافات سہی ہزاروں رنجشیں اور گلے شکوے ہی سہی لیکن پھر بھی وہ ان کا بیٹا تو تھا؟ اتنے عرصے بعد واپس آیا تھا۔ کم از کم ان کو اس سے ایک بار ملنا تو چاہیے تھا؟ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی لیکن انہوں نے تو کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ چہرے پہ جاہ جلال لیے دو ٹول ہاتھ پشت پہ باندھے وہ عبداللہ کو بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”ملک صاحب۔! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میرا بچہ اتنے سالوں بعد آیا ہے آپ اسے دم تولینے دیں۔“ بی بی جان تڑپ گئی تھیں۔

”اتنے سالوں بعد آیا ہے تو اسی طرح آتا جس طرح ہم نے کہا تھا؟“ ملک شرافت علی کا اشارہ نگارش کی طرف تھا ان کی شرط تھی کہ عبداللہ جب بھی واپس آئے نگارش کو طلاق دے کر واپس آئے ورنہ اس حویلی میں عبداللہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

”چھوٹے ملک صاحب نے پہلے کب آپ کی کوئی بات مانی ہے جواب مانیں گے؟“ ملک اسد اللہ کی آواز بھی داخل دروازے کی سمت سے ابھری تھی آواز میں طنز اور مسخر تھا۔ عبداللہ نے چونک کر دیکھا تھا دونوں باپ بیٹا برابر کھڑے تھے دونوں کی طرز زندگی اور قول و فعل ایک سے ہی تھے انیس بیس کا بھی فرق نہیں تھا دونوں میں اور کسی ایک سے بھی کسی قسم کی گنجائش کی امید رکھنا فضول تھا۔ یہاں کوئی بھی عبداللہ کا طرفدار نہیں تھا کیونکہ بی بی جان بھلا کہ شوہر کے سامنے ٹھہر سکتی تھیں۔ اس لیے عبداللہ نے اس میدان میں اکیلے ہی اترنا تھا۔

”چلیں۔! آج ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ جو میں منوانا چاہتا ہوں وہ آپ مان لیں جو آپ منوانا چاہتے ہیں وہ میں مان لیتا ہوں جو اپنی بات سے ہٹ جائے وہ مرد نہیں کہلائے گا؟“ عبداللہ کالجہ بھی ان جیسا ہی کرخت ہو چکا تھا اور آنکھوں کا رنگ بھی سنگین تیوروں میں بدل گیا تھا۔

”کیسا فیصلہ؟“ اب کی بار ملک اسد اللہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

”بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ؟“ عبداللہ کالجہ کا شوار اور دو ٹوک تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟“ بابا جان سمجھ نہیں پاتے تھے۔

”مطلب کہ اسی قدموں پہ کھڑے کھڑے ملک اسد اللہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو میں بھی ابھی بیس کھڑے کھڑے اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا اور وہی کر دوں گا جو آپ کہیں گے۔“ عبداللہ نے گویا ملک اسد اللہ کے گلے میں پھندا ڈالا تھا۔ بابا جان ملک اسد اللہ اور بی بی جان کے ساتھ ساتھ زری اور نگارش بھی دنگ رہ گئی تھیں۔

”یہ کیسی شرط ہے بھلا؟“ ملک اسد اللہ کو غصہ آیا تھا۔  
 ”جیسے میری بیوی کو طلاق دلانے کے لیے میری یہی شرط ہے؟“ عبداللہ کا انداز استہزائیہ تھا۔

”اس کا مطلب ہے تم طلاق دینے کے لیے تیار نہیں ہو؟“ وہ کافی چبا کے بولے تھے۔  
 ”میں تو تیار ہوں۔ بس آپ کے تیار ہونے کا انتظار ہے؟ کیا خیال ہے پھر گاؤں کے نکاح خواں سے دو طلاق



ناموں کے پیچھے منگواؤں؟“ عبداللہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”نکو اس بند کردانی۔ اور زبان سنبھال کے بات کرو۔ تم اپنی بیوی سے میری بیوی کا مقابلہ کر رہے ہو؟“ ملک اسد اللہ بھڑک اٹھے تھے ان کے لہجے میں واضح حقارت تھی۔

”مگر نام نہاد رشتے کو دیکھا جائے تو آپ کی بیوی میری بھابھی ہوتی ہیں اس لیے میں ان کے لیے کوئی غیر منذب الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اتنا ضرور پوچھوں گا کہ کیا آپ کی بیوی کسی اعلا قسم کے میز نزل سے تیار ہوتی ہیں جن کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں ہے؟ جتنا اعلا حسب نسب ہے ان کا وہ میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔“

عبداللہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

”خبردار! میری بیوی کے بارے میں کچھ کہنا تو۔“ ملک اسد اللہ یکدم دھاڑے تھے۔

”تو پھر آپ کون ہوتے ہیں میری بیوی کے لیے کچھ کہنے والے؟ جس روز میرے کہنے پر آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دی اس روز مجھ سے کوئی بات کیجئے گا کوئی حق نہیں ہے آپ کو میری بیوی کے بارے میں کچھ کہنے کا۔ اب ایک لفظ بھی کہنا تو بہت برا ہوگا آپ کے لیے۔“ عبداللہ نے رنگ بدل کے بات کی تھی اور ملک اسد اللہ اور بابا جان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

”تم اس لڑکی کی خاطر ہم کو چھوڑ رہے ہو؟“ بابا جان کے لہجے کی کڑھکی، ہنوز تھی۔

”آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس لڑکی کی وجہ سے آپ مجھے چھوڑ رہے ہیں؟“ عبداللہ کے جواب دہ دہو تے تھے۔

”ہم نے ہمیشہ اس لڑکی کی جگہ وجاہت علی کی بیٹی کو دیکھا ہے تمہاری دلسن وہی بنے تو اچھا ہے۔“

انہوں نے اپنے مرحوم بھائی وجاہت علی کا ذکر کیا تھا۔

”جانتا ہوں! بڑی اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ آپ کی بھتیجی ہے اسی لیے تو آپ اسے یہاں لانا چاہتے ہیں لیکن بابا جان آپ کو اس معاملے میں بھی مجھ سے مابوسی ہوگی۔ میں اتنا ظالم نہیں ہوں کہ کسی کی اچھی بھلی زندگی تباہ کر کے رکھ دوں۔ مجھے یقین ہے کہ بچا وجاہت علی کی بیٹی جہاں بھی ہوگی خوش ہوگی اور خوشحال زندگی گزار رہی ہوگی میں اس کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرنا ہی ہوتا تو آج سے پانچ سال پہلے کر لیتا۔“ عبداللہ کا نظر اور خنی بابا جان کو پیش دلا گئے تھے۔

”تو پھر تم یہ بھی بھول جاؤ کہ ہم تمہاری لائی ہوئی اس دھنگے کی لڑکی کو قبول کریں گے۔ ہمارے گھر میں نہ تمہارے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہی اس لڑکی کے لیے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جن قدموں پہ کھڑے ہو انہی قدموں پہ واپس لوٹ جاؤ۔ تمہارے لیے مرگئے، ہم تمہارے لیے مر گئے۔“ انہوں نے توانہما کر دی تھی۔

”جو انسان آپ کا مطلب پورا نہیں کرتا وہ آپ کے لیے مری جاتا ہے یہ بات بھی بڑی اچھی طرح جانتا ہوں میں۔“ عبداللہ تلخ سا ہنسا تھا۔

”سے کوسہ! ہماری نظروں سے دور ہو جائے، چلا جائے یہاں سے، نکل جائے اس حویلی سے۔“ بابا جان غصے سے بی بی جان کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز سے دھاڑے تھے اور ان کی اتنی بلند آواز پہ حویلی کے دیگر ملین بھی ڈرا تنگ روم میں آگئے تھے جن میں ملک اسد اللہ کے بیوی اور بچے بھی تھے۔

”جارہا ہوں! اور اس ظلم کدے میں میں رہنا بھی نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی میں یہاں رہنے کا ارادے سے آیا تھا۔ یہ یقین گاہ آپ کو مبارک۔“

وہ بھلا کب ہمارے نالہ تھا بابا جان کا بایں محوم گیا تھا۔

”یعنی تمہارا پلان تھا کہ تم نے یہاں نہیں رہنا؟“ بابا جان سے پہلے ملک اسد اللہ بول رہے تھے۔

”بے شک میرا پلان تھا۔ لیکن آپ میں دم ہے تو آپ میرا پلان بدل بھی سکتے ہیں میرے پلان کو ناکام بھی بنا سکتے ہیں بس ذرا سی ہمت اور حوصلے کا کام ہے آپ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں میں اپنی بیوی کو دے دیتا ہوں پھر آپ کی پسند کی بیوی ملاؤں گا اور ہمیں ڈٹ کے رہوں گا آپ کے ساتھ آپ کے شانہ بہ شانہ۔“

عبداللہ کہتے ہوئے اپنی بھابھی کو ایک نظریہ دکھا تھا وہ عبداللہ کی بات پہ سنبھائی تھیں۔

”دور ہاں! میں جانتا ہوں کہ آپ کی ایک بیوی نہیں کئی بیویاں ہیں کچھ ایسی جن سے آپ نے شادیاں کر رکھی ہیں اور کچھ ایسی جن سے شادیاں نہیں کیں لیکن میں نے ان کو طلاق دینے کا نہیں کہا میں نے تو آپ کی اعلا حسب نسب والی بیوی کو طلاق دینے کا کہا ہے تاکہ آپ کو بتا دوں کہ آپ نے کس کو طلاق دی ہے؟“

اب پٹانے کی باری ملک اسد اللہ کی تھی وہ عبداللہ کو دکھا جانے والی خو خوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”ملک عبداللہ! بہت غلط کر رہے ہو تم بھائی، بھائی کا شریک ہوتا ہے اور تم شریک کو اور شریک (دشمن) بنارہے ہو۔“ ملک اسد اللہ کے لہجے میں عجیب سی دھمکی تھی۔

”میں برٹش ایمپرسی میں کھلیں لکھوا کے آیا ہوں کہ پاکستان میں قیام کے دوران مجھے میری بیوی کو اور میری بہن کو اگر ذرا سماجی نقصان پہنچے تو ذمہ دار ملک شرافت علی، ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز ہوں گے۔ اس لیے میرا شریک بننے سے پہلے سوچ پیچھے گا کہ آپ نے اگر شریک بننا ہے تو کس حد تک بننا ہے؟ کیونکہ میں نے اپنے نقصان کی کوئی بھی معافی نہیں لکھوائی، سیدھی سزا کی درخواست کی ہے۔“ عبداللہ نے اسے وارن کر ہی دیا تھا کہ کہیں وہ اپنے ہی زعم اور غصے میں نہ رہیں۔ وہ سارا بندوبست کر کے آیا ہے ”بہن کے ساتھ اب تمہارا کیا علیک سلیک ہے۔ وہ گھر آگئی ہے بس بات ختم۔“ بابا جان چونک کے بولے تھے۔

”بات ختم کہاں ہوئی ہے بابا جان؟ جب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا تو میری بہن بھی نہیں رہ سکتی مجھے آپ سب یہ اب کوئی مجھ سے نہیں ہے۔ آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں آپ راتوں رات اس کی شادی بھی کر سکتے ہیں اور بربادی بھی۔ آپ کے لیے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔“ عبداللہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا جبکہ ان کا سکون منتشر ہو گیا تھا اور زری کی جان بھی جیسے ٹھٹھی میں آگئی تھی۔

”یہ میری بیٹی ہے۔“ بابا جان نے دانت پس کر دیا تھا۔

”آپ کی بیٹی ہے تو کیا آپ کو قتل کا اختیار دے دیا جائے؟“ وہ زیادہ سنگین لہجے میں بولا تھا۔

”میں اس کا قتل بھی کروں تو مجھے کسی کے اختیار کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ آپ خدا بن بیٹھے ہیں جس کو کسی کے اختیار کی ضرورت نہیں ہے جو خود ہی اتنا اختیار ہے کہ کچھ بھی کر دیتا ہے؟“ اس کے جواب دہ لا جواب ہو گئے تھے مگر پیچھے تو کسی نے بھی نہیں ہٹا تھا۔

”زری! تم اندر جاؤ۔“ ملک اسد اللہ نے اشارہ کیا۔

”زری! اندر نہیں جائے گی بلکہ میرے ساتھ میرے گھر جائے گی۔“ عبداللہ نے روک دیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ وہ دونوں باپ بیٹا تو اور زیادہ بھڑک اٹھے تھے۔

”یہ بھی بڑے اچھے طریقے سے ہو گا کیونکہ میرے ساتھ اس وقت پولیس فورس ہے اور پولیس فورس کے ساتھ ایک دم الرٹ میڈیا۔ جو آپ کے ذرا سے ہنگامے اور میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ اور اگلے دس منٹ میں آپ کے یہ سفاک اور بے رحم چہرے پوری دنیا کے سامنے ہوں گے اور آپ لوگوں کے کہہ کر قوت بھی سامنے آئیں گے جو آج تک کسی کی بھی نظروں سے نہیں گزرے۔“ عبداللہ کی دھمکی پہ ان کے رنگ بدل گئے تھے۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ بابا جان پھر کر رہے تھے۔



”ہاں! ہاگل ہو گیا ہوں۔ جب آپ کے پاس میرے لیے کوئی گنجائش کوئی رعایت نہیں ہے تو میرے پاس بھی نہیں ہے جو انسان اپنوں کا اپنا نہیں بن سکتا وہ بے چاری غریب عوام کا اپنا کیسے ہو سکتا ہے؟“ عبداللہ جمعی مکمل اجنبیت اتر آیا تھا۔

”ملک عبداللہ! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔“ ملک اسد اللہ کا پس چلتا تو عبداللہ کو گولی مار دیتا۔

”آپ نے مجبور کیا ہے مجھے۔“ وہ کندھے اچکے کے بولا تھا۔

”اسد اللہ! گاؤں کی باہر والی سڑک پہ پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں کیا تمہیں پتا ہے کہ پولیس کی گاڑیاں یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

ملک حق نواز کہتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور ان سب پہ نظر پڑتے ہی خاموش ہو گیا تھا زری غیر محسوس طریقے سے نگارش کی اوٹ میں ہو گئی تھی کہ ملک حق نواز کی غلیظ اور گندی نظریں اس پہ نہ پڑے جبکہ اوہ رہا جان اور ملک اسد اللہ حیرت زدہ سے رہ گئے تھے کہ عبداللہ انہیں محض دھمکی نہیں دے رہا تھا بلکہ سچ کہہ رہا تھا پولیس اور میڈیا ساتھ لے کر آیا تھا۔

”یہ پولیس کی گاڑیاں تو فی الحال ہماری سیکیورٹی کے لیے یہاں آئی ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں جس روز آپ کو گرفتار کرنے آئیں گی اس روز وہ نہیں بلکہ چار گاڑیاں آئیں گی۔ آخر اللہ نے ایک روز مومنہ بی بی کا بھی تو انصاف کرنا ہے۔“ عبداللہ کا رخ اب ملک حق نواز کی طرف تھا بابا جان ٹھٹک گئے تھے کہ عبداللہ کو مومنہ بی بی کے معاملے کا بھی علم ہے؟

”میں جانتا ہوں کہ تم یہ سب بدل اور شاہ کی شہ پہ کر رہے ہو۔ اور دیکھو لیتا مومنہ بی بی کے اس چکر میں کسی روز میری گولی سے دل اور شاہ مارا جائے گا۔“

”آہ! ملک حق نواز کی بے رحم دھمکی پہ نہ جانے کیسے زری کے منہ سے ایک ہچکی نما آہ نکل گئی تھی کہ نگارش نے یکدم گھبرا کر دیکھا تھا۔

”اور اس روز میری گولی سے ملک حق نواز مارا جائے گا۔ کیونکہ آپ لوگ خود کہتے ہیں قتل کے بدلے قتل اور عزت کے بدلے عزت۔ اور بی بی الحال تو آپ کے کسی کی عزت کا قرض ہے جو آپ سے دل اور شاہ ہی وصول کرے گا اور ایسا وصول کرے گا کہ کبھی کسی عورت کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے بلکہ اپنی بیوی کو بھی بہن سمجھو گے آپ۔“ عبداللہ نے تسخیرانہ انداز میں کہا تھا۔

”ملک عبداللہ! اس کی بات پہ ملک اسد اللہ یکدم غرا کے اس کی طرف بڑھا تھا لیکن ملک حق نواز نے اسے دبوچ کر روک لیا تھا۔

”چھوڑو بس انہیں! دیکھتا ہوں میں کہ کیا کرتے ہیں یہ؟“ عبداللہ نے جیب سے ریو اور نکالتے ہوئے اس کا بولٹ چڑھایا تھا۔

اور اس کو ریو اور تانے دیکھ کر بی بی جان زری، نگارش کے ساتھ ساتھ ملک اسد اللہ کے بیوی بچے بھی چیخ اٹھے تھے۔

”ملک حق نواز! چھوڑو مجھے۔“

ملک اسد اللہ غرا ہوا تھا۔

”عبداللہ! پلیز چلیں یہاں سے۔ پلیز عبداللہ! ہم لوگ اگر اور یہاں ٹھہرے تو اور زیادہ ہنگامہ ہو گا۔“ نگارش نے روتے ہوئے لپک کر عبداللہ کا پاؤں تھام لیا تھا۔

”جاؤ بیٹا! چلے جاؤ یہاں سے۔ تمہارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔“ بی بی جان بھی رو پڑی تھیں۔

اور بی بی جان کو روتے دیکھ کر عبداللہ کے اشتعال و صیبا بڑھ گیا تھا اس نے ریو اور والا ہاتھ نیچے کر لیا تھا۔

”ٹھیک ہے جا رہا ہوں۔ لیکن آپ سب لوگ ایک بات کان کھول کے سن لیں کہ زری کی شادی اس درندے سے کبھی مرے بھی نہیں ہوگی اس کے ساتھ شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں زری کو خود گولی مار دوں اس لیے آپ لوگ اس شادی کا خیال دل سے نکال دیں تو اچھا ہے باقی آپ کی مرضی۔“

عبداللہ نے جاتے جاتے ایک بار پھر وارن کیا تھا۔

”چلو! اس نے زری اور نگارش کو گلے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں اور زری کو یوں لگا جیسے ملک حق نواز کی چنبیٹی ہوئی نظریں اس کے ساتھ اس کے پیچھے تک آگئی ہوں۔

”تم زری کو دنیا کے کسی بھی کونے میں لے جاؤ لیکن شادی اس کی ملک حق نواز سے ہی ہوگی یہ ملک حق نواز کا دعو ہے یاد رکھنا۔“

ملک حق نواز کی آواز نہ داخلی وروازے کی سمت بڑھتے عبداللہ کے قدم یکدم رک گئے تھے۔

”اور جس دن ایسا ہو گا وہ دن یا تو آپ کی زندگی کا آخری دن ہو گا یا میری زندگی کا یا پھر زری کی زندگی کا۔ یہ بھی یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔“ وہ کہتا ہوا سب سے ایک طائرانہ سی نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا تھا زری اور نگارش پہلے ہی گاڑی میں چبھی ہوئی تھیں عبداللہ کے آتے ہی گلاب خان نے گاڑی اشارت کر دی تھی۔

ہر سواندیرا پھیل چکا تھا شام سے رات ہو چکی تھی۔ وہ لوگ مسلسل سفر میں تھے۔ انگلینڈ سے لاہور اور لاہور سے اپنے گاؤں اور اب پھر گاؤں سے لاہور کا سفر جاری تھا۔ نیند، تھکن اور ذہنی دباؤ سے برا حال ہو رہا تھا۔ عبداللہ نے تھکے تھکے انداز میں سریٹ کی بیک سے نکال دیا تھا۔

گلاب خان ان کے آتے ہی ایس بی کامران کو اطلاع دے چکا تھا کہ وہ لوگ باخیریت حویلی سے نکل آئے ہیں تب ایس بی کامران نے پولیس فورس کو واپسی کا آرڈر دے دیا تھا۔ یہ کام انہیں دل اور شاہ نے کہا تھا اور وہ دل اور شاہ کی بات ٹال نہیں سکتے تھے کیونکہ دل اور شاہ بھی ان کے ایسے ایسے لنگو اور تھاکو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا اس لیے یہ لیکن دین و دنیا تو چلتا ہی رہتا تھا لیکن آج عبداللہ کو دل اور کی وجہ سے خاصی بیک سپورٹ حاصل ہوئی تھی وہ اس کی ذہانت اور داؤ چھ کا معترف ہو گیا تھا۔

\*\*\*

وہ آج کافی لیٹ گھر آیا تھا۔

گاڑی کے بارن پہ زلفی نے گیت کھولا تھا اور وہ گاڑی اندر لے آیا تھا زلفی گیت بند کر کے بھاگتا ہوا اس کی گاڑی کے قریب آیا تھا۔

”سلام صاحب! زلفی کے انداز کی طرح اس کا سلام بھی بڑا پر جوش قسم کا ہوا تھا۔

”وا سلام! ایسے ہو خیریت؟“ دل اور گاڑی سے اتر آیا تھا۔

”جی صاحب! خیریت ہی ہے وہ گلاب خان نہیں آیا آپ کے ساتھ؟“ زلفی نے دل اور کو اکیلے دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

”گلاب خان کسی کام سے گیا ہوا ہے اس نے فون پہ بتایا نہیں تھا تم لوگوں کو؟“ وہ اپنا برف کیس نکال کے اندر کی طرف بڑھا۔

”بتایا تو تھا لیکن میں سمجھا کہ آپ کے ساتھ ہی کام سے گیا ہو گا۔“ زلفی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔



”نہیں! میرے ساتھ نہیں میرے دوست کے ساتھ گیا ہوا ہے۔“  
 ”آپ کا دوست جو آج انگلینڈ سے آیا ہے؟“ زلفی کو دل اور سے باتیں کرنے کا شوق تھا اسی لیے بات کو طول دیتا تھا۔

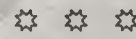
”ہاں ویسے! دل اور کہہ کے بیڑھیوں کی سست بردھا تھا۔  
 ”کھانا کھا میں گے؟ گل کو بلاؤں؟“ اس کے پوچھنے پر دل اور بیڑھیاں ملے کرتے ہوئے ٹھہر گیا تھا اور پلٹ کر زلفی کو دیکھا جو بیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔  
 ”گل تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”جی! سن۔“  
 ”تم سے بڑی ہے کہ چھوٹی؟“  
 ”جی! بڑی ہے۔“  
 ”تو تمہیں اس کو کیا کتنا چاہیے؟“  
 ”جی! جی۔“ زلفی نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔  
 ”تو مجھ سے؟“

”معافی چاہتا ہوں صاحب! غلطی ہو گئی ہے، میں انہیں گل باجی ہی کہتا ہوں بس ویسے ہی منہ سے پھسل گیا تھا۔“ اس کے انداز پر دل اور مسکرا دیا تھا۔

”اوکے! لیکن وہاں سے رہا کرو یا رہا۔ اتنے بد خواص کیوں ہو جاتے ہو؟“  
 ”چاہا نہیں صاحب! مجھے کیا ہو جاتا ہے؟“ زلفی سر کھچا کے رہ گیا۔  
 ”تھوڑے اور ذمہ دار ہو جاؤ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھا کروں گا؟“  
 دل اور پلٹ کے دوبارہ بیڑھیاں ملے کرنے لگا۔  
 ”سچ کہہ رہے ہیں صاحب؟“ وہ پیچھے سے چکا تھا۔

”دل نے سوائس کسی کو جھوٹی تسلیاں نہیں دیتا۔“ وہ سر جھٹک کر کتا بیڑھیاں ملے کر گیا تھا اور زلفی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا گل سامنے ہوئی تو وہ اسے بھی ضرورتاً تا۔



میرے باپ کا اونچا محل  
 میرے ساجن کی گلیاں تنگ  
 میں بھولوں کی رہنے والی  
 مجھے ماہے کانٹوں کا تنگ

وہ اپنے گھنٹوں کے اور گردنوں بازو لیے دیوار سے نیک لگائے بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی اور اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھی گل اسے چپ کرانے اور تسلیاں دلا دینے میں مصروف تھی۔ گل آج ذرا فارغ تھی اس لیے شام سے ہی علیزے کے پاس آکر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے بیٹھے میں کتنا غامز گزر گیا تھا اس کی دونوں کوئی خبر نہیں تھی۔

”دیکھو بی بی جی! یہ وقت اللہ نے شروع سے ہی آپ کی قسمت میں لکھ دیا تھا یہ وقت آپ نے دیکھا ہی تھا اس لیے اس طرح رونے دھونے سے کیا ہو گا؟ ہوتا تو ویسے جو ازل سے لکھا جا چکا ہے۔“ گل بار بار اسے سمجھا

رہی تھی۔  
 ”لیکن مجھے کم از کم پتا تو چلے کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟ یہ سزا کس گناہ کی سزا ہے؟ مجھے کیوں اس قبر میں اتار دیا گیا ہے؟ وہ مجھے پتا کیوں نہیں؟“ علیزے روتے روتے اچانک جھانپ گئی تھی اور پھر اچانک ہی اس کی بیخ حلق میں ہی ٹھنسن گئی تھی اور وہ ایک بل کے لیے خوف سے کانپ کے رہ گئی تھی بمسبٹ کی بیڑھیوں کے پاس ہی دل اور شاہ کھڑا تھا جس کو دیکھ کر قہقہے کے ہاتھوں کے توڑے بھی اڑ گئے تھے وہ بھی لرزا تھی کیونکہ اس کے تیور بہت سنجیدہ تھے۔

”سلام صاحب! گل بمسبٹ ہمت جمع کرتی ہوئی اٹھی اور اسے سلام کرتے ہوئے بیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی دل اور نے شخص سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا اور گل دل ہی دل میں علیزے کی خیریت کی دعا مانگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔

دل اور خاموشی سے اسے دیکھا ہوا ذرا فاصلے پر رکھی کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے لے آیا تھا اور اس کے سامنے کرسی رکھ کے اس کے رو برو بیٹھ گیا۔ وہ اس کے سامنے دیوار سے نیک لگائے نیچے زمین پر بیٹھی ہوئی تھی دل اور کی کاٹ دار آنکھیں اسی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں اور علیزے سے سر سے پاؤں تک جل اٹھی تھی۔

اس کے چہرے کے ناگوار تیور دیکھتے ہوئے دل اور نے اپنی نظریں پھیر لی تھیں اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لاٹر نکالتے ہوئے سگریٹ نکال لیا تھا۔

”مگر میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟ یہ سزا کس گناہ کی سزا ہے؟ اور تمہیں کیوں اس قبر میں اتار دیا گیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ تم جس زمین پر بیٹھی ہو اسی زمین میں ساجاؤ کی جوازیت میں سہہ رہا ہوں وہی اذیت تم سہہ لویہ بھی ہوئی نہیں سکتا سونو کی عمر جاؤ کی اور میں تمہیں وقت سے پہلے نہیں مارنا چاہتا تھا۔“  
 دل اور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں چھوڑا اور نظروں کا زاویہ دوبارہ علیزے کی سمت بدل لیا تھا۔

”لیکن میرا کیا گناہ ہے آخر؟“ اس کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔  
 ”ہو نہ ہو! اس کے سوال پر دل اور غصے سے ہنسا تھا۔  
 ”اس دنیا میں تمہارا صرف ایک ہی گناہ ہے کہ تم وقار آئندی کی بیٹی ہو۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“  
 اس کا فیصلہ دو ٹوک تھا کافی سکون اور اطمینان بھرا۔

## ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہوئے ہیں

خوبصورت رورٹی  
 خوبصورت ہیرا پتی  
 منہ بولا جلد  
 آئینہ بچی

- ☆ تملیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیانی نہیں ہے لہجہ جدون قیمت: 250 روپے

مکتبہ کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



# دوستوں کا ریلن



”تمہاری میرے پیار کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟“ وہ اس سے ڈری ہوئی تھی اتنی کہ دل اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھانے کے لیے سیدھا ہوا تو اس کی چیخ نکل گئی وہ اس کے ایک پھڑپھڑے ہی خوف زدہ ہو چکی تھی۔  
”وہ سوال نہ کرو کہ جن سے تمہارا اور میرا یوں آنے سامنے بیٹھنا بھی محال ہو جائے“ دل آور نے اسے ٹوکا تھا۔

”پلیز ڈرائیو! میں۔۔۔ میں۔۔۔ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز مجھے یہاں سے جانے دو۔ مجھے میرے گھر جانے دو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں سو نہیں پاتی۔ پلیز مجھے جانے دو۔“ علیزے کہتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ دل آور نے اس کے اس طرح رونے پر خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

”تو چلی جاؤ۔ تمہیں روکا کس نے ہے؟ سارے دروازے کھلے ہیں تم جب چاہے جا سکتی ہو میں نے تمہارے پیروں میں زنجیریں تو نہیں ڈال رکھیں؟“ دل آور نے بڑی لاپرواہی کا اظہار کیا تھا۔  
لیکن علیزے اس کی لاپرواہی کا مغموم بھی اچھی طرح سمجھتی تھی اسی لیے تو اپنی بے بسی پہ اور زیادہ رونا آیا تھا۔ وہ اور زیادہ روئی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مزید کچھ کہتے اچانک دل آور کے سیل پہ وائبریشن ہونا شروع ہو گئی تھی یہ کال گلاب خان کے نمبر سے تھی۔  
”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام صاحب! کافی دیر سے فون کر رہا ہوں مگر کال ہی نہیں مل رہی تھی۔“ گلاب خان شاید ساتھ ساتھ ڈرائیو بھی کر رہا تھا۔

”میں ہسپتال میں ہوں شاید اس لیے۔“

”آپ کی آواز نہیں آرہی صاحب؟“

”مجھے تمہاری آواز صاف سنائی دے رہی ہے تم کو کیا کہتا ہے۔“

دل آور سگریٹ بوٹوں تلے مسل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ہم لوگ واپس آ رہے ہیں۔“

”اچھا!۔۔۔ کون کون آ رہے ہو؟ سب خیریت ہے نا؟“

”صاحب! کچھ سنائی نہیں دے رہا۔“ گلاب خان خاصی اور بچی آواز میں بولا تھا۔

”آپ سے کیا!۔۔۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ عبداللہ اور زری وغیرہ ٹھیک ہیں؟ سب خیریت ہے نا؟ کوئی گزیر تو نہیں ہوئی؟“ اس نے اب باقاعدہ نام لے کر اور دہرا کے پوچھا تھا۔ جس پر علیزے نے روتے روتے چونک کر دیکھا تھا۔

”عبداللہ اور زری؟“ علیزے کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھے یہ نام تو آسیہ آفندی کی زبان سے اس نے کئی بار سنے تھے۔

”سمجھو! میں ہسپتال سے باہر جاتا ہوں۔“ دل آور کستا ہوا سیرٹھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا اور علیزے یکدم کسی کتے سے باہر آئی تھی۔

”ڈرائیو! رکو میری بات سنو ڈرائیو پلیز۔“ علیزے بمشکل گرتے پڑتے انٹھی اور اس کے پیچھے بھاگی تھی لیکن اتنے میں وہ باہر جا چکا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)



توسیع شان سے نیازی سے کار میں آئیشی۔ آج وہ قدر سے پرسکون تھی۔ اس نے اشارے سے ڈرائیور کو زسری اسکول کا راستہ بتایا۔ وہاں پارک میں بیچے کھیل رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا اپنا بچپن کھیل میں شامل ہو کر بے فکری اور لاپرواہی بن ظاہر کر رہا ہو۔ پھر وہ اپنے اسکول کی جانب بڑھ گئی۔ وہاں لڑکھن کی شرارتیں اور بچپن کی الوداعی نظروں نے استقبال کیا۔ وہ اس منظر سے لطف اندوز ہوتی ہوئی اپنے کانچ بچ گئی۔ جہاں بچوں اور بھوپور اسکول کے ساتھ براجمانی تھی۔ وہ بیٹے ہوئے حسین لٹحوں کی یاد میں جھوم اٹھی۔ ایک ایک لمحہ خوب صورتی میں ڈوبا ہوا معلوم ہوا۔

ان کان مٹ یا دلوں کو دامن میں بھرے وہ اپنی ذات کے ہونے کے احساس میں یونورشی پہنچی۔ ذہن و قلب میں زندگی سے انصاف کا فربہاں بڑھتا جا رہا تھا اور لطافت کے جذبے سے سرشار آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ جب گھر واپس پہنچی تو اس کی پیشانی پر طمانیت اور تسکین کی چھاپ لگی ہوئی تھی اس نے ماں کو یہاں کیا۔ سوئے ہوئے منے کو یہاں بھری نظروں سے دیکھ کر نکلے لگا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور اسے کات میں لٹا کر ماسٹا بھری نگاہ اس پر جمادی۔ اسی انشاء میں پوریج میں کوئی گاڑی آکر رکی۔ گاڑی کی آواز اور دروازے کے بند کرنے کے انداز سے وہ چونک کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ عرفان چہرے پر شرمندگی اور ندامت کا احساس لیے نظریں جھٹکائے کھڑا تھا۔ گہری سوچ اور اضطراب سے وہ ہاتھوں کو رگڑ رہا تھا۔ سچ تھا کہ وہ کس منہ سے اس گھر کے اندر آتا اور سب سے کیسے نظریں چار کرتا۔ توبیہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ دور بہت دور ماضی کے وعدہ لکوں میں کھو گئی۔

\*\*\*

وہ خوبصورت تھی، تعلیم یافتہ، ذہین و فطین تھی۔ خوش مزاج، منہدار ایسی کہ کانچ کی جان اور ہر ایک کا دل سہو کر اس پر کھل کر کیا کرتی تھی۔ اس بچہ پرانے ہویا

گنا، تقریر ہویا قرات یا مشاعرہ ہر چیز میں شامل ہوتی۔ گراؤنڈ میں بیٹھ نمایاں اسٹڈی میں نام سر فرسٹ۔ لپوں پر کلیوں کی سی پاکیزہ مسکان سجائے، آنکھوں میں نجس آمیز چمک لیے، دل و دماغ میں آگے بڑھنے کی لگن سموئے، آتش کی وسعتوں اور رفعتوں کو چھو لینے کا جذبہ لیے وہ منزل بہ منزل کامزن تھی کہ ایک دم اس کی تقدیر کے فیصلے کا وقت آگیا۔ اس کی ذہانت و فطانت کو سیکنڈری قرار دینے پر والدہ نے والد سے طولانی ٹل و قتل کے بعد اسے کنوئس کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور توبیہ کا رشتہ اس کی رضامندی و ریافت کے بغیر عرفان سے ملے کر دیا گیا۔

عرفان لائٹوں میں ایک تھا۔ برسر روزگار، مہترہ گریڈ کا افسر جس کی ترقی کے چاند سو بہت روشن تھے، کھانا پیتا گھر نہ باعزت و پار سوخ خاندان اور شکل و صورت میں بھی بے مثل سب ہی خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ گو کہ توبیہ بھی کسی لحاظ سے ان سے کم نہ تھی۔ وہ بھی لاجواب تھی۔ باقی رہا بیٹی کی پسندیدگی اور ریحان کا مسئلہ۔ اس کا کیا ہے؟ تھوڑا بہت تو لڑکیوں کو خود بخود دل پر جبر کر کے نئے لوگوں اور ان کے تشکیل شدہ ماحول اور قوانین کے دھانچے میں ایڈجسٹ کرنا ہی ہوتا ہے۔ خود کو اس سانچے میں ڈھال کر اپنی جگہ تو بتانی ہی ہوتی ہے۔ نا۔ کیا ہوا اگر بیٹی کی ساری استغیثیں ڈچسپیاں اور خواہشیں ذرا اب بھی گئیں تو قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ تعلیم کی تمنا کو بالائے طاق رکھنا کون سا گناہ عظیم ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہوگی کہ بیٹی کا ہاتھ جو مہر سے سج اٹھے گا اور والدین اپنے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں گے۔ توبیہ بھی فرماں برداری کا ثبوت دیتے ہوئے راضی یہ رضامندی اور ان کو بھی زندگی کے لیے کمر بستہ ہو کر اپنی تمام اہمکتیوں کو خیر باد کہہ کر شادی کی تیاریوں میں مل کا ساتھ دینے لگی۔

وہ عرفان کو پارک خوش و خرم ہو گئی تھی۔ آج کے بعد وہ اس کا محرم اور جیون بھر کا سہا می اس کا وارث اور محسن و مل ہو گئے۔ یہ سوچ کر ہی وہ چھوٹی دھن کی بیل

بن گئی۔ وہ آغوش جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی، باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ راتوں کو چوری چھپے بہن بھائیوں کے کمروں میں جا کر رات گئے تک ڈرائیو کمانیاں سنا کر سب کو دہلایا تھا۔ وہ گھر جہاں ماں باپ کی بے لوث محبت اور شفقت تھی کا ڈوا چوٹ چٹلے تھے۔ اس نے آنسو بہائے بغیر وہ جنت و گلزار چھوڑ دیا۔

اسے یوں لگا جیسے اس کی پر موشن ہو گئی ہو۔ وہ ایک بلند و بالا اسٹیشن میں پہنچ کر خود مختار اور آزاد ہو گئی ہو۔ اسے شادی کیلئے بھی تو لگ رہا تھا اسے کیا معلوم کہ وہ نئے ماحول میں نئے رشتوں کے سنگ بنی زندگی گزارنے کی کبھی نہ قسم ہونے والی آزمائش میں گرفتار ہو گئی ہے۔

ماں جانتی تھی کہ اس معصوم اور نا سمجھ بچی کو کیا معلوم کہ یہاں شادیاں پھولوں کی بیج نہیں ہوتیں۔ سسرال والے چار سو پھول ہی پھول پھجوا کر کے بیج کو نرم و گداز اور معطوب و فریب بنا کر دس کو اس ملن کی حقیقت اور سچائی سے نا آشنا کر رکھ کر فقط شادی خانہ آبادی کا تعین دلانے میں قہر جاتے ہیں۔ لیکن فریب کی عمر دراز نہیں ہوتی۔ دیر پا پائیداری ہوتی ہے نہ اسے بیٹھکی نصیب ہوتی ہے۔ جلد ہی اس رشتے کی سچائی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان سچے ہوئے لائق اور پھولوں کی نرمی سے ان نوکیلے کانٹوں کو چھپا تو دیا جاتا ہے جو صبح تک نمودار ہو کر اپنی اصلیت کا منہ بولنا ثبوت بننے کو تیار کھڑے ہوتے ہیں جہاں پھول وہاں کانٹا کے مترادف جتنے پھول اتنے ہی کانٹے چنے پڑتے ہیں۔ اوھر پھول مر جھائے اوھر کانٹوں نے سر نکالا۔

کتنا حسین مذاق ہے کہ بعض اوقات کانٹے جتنے چٹنے عرس بیت جاتی ہیں۔ کامیابی نصیب والیوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو غلط فہمی بہر مندگی اور قربانی بھی بے کار اور رائیگاں جاتی ہے اور کہیں بے وقوفی، نادانی اور بدسلوکی بھی فاجر بن جاتی ہے۔ سب کچھ جاننے کے یہاں خود دل کی بیٹی کو رخصت کرنے کی

تمنائیں سب سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ وہ آہ بھر کر پھر سوچنے لگی کہ کما جاتا ہے شوہر بیوی کا مجازی خدا ہوتا ہے۔ رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں اس کی رضا میں۔

میں نے تمہارے ساتھ زندگی بتانے کے حسین سنے دیکھے تھے۔ تمہیں بن دیکھے آئیڈل تصور کر کے خوشی اپنے پاروں کی جدائی کو سنے سے لگا کر تمہاری ہو گئی تھی کیونکہ میرے سامنے تمہاری رفاقت میں گزرنے والا پہل شائد اور خوش آئند تھا۔ تمہاری قوت، لگاؤ اور توجہ میں میری فرماں برداری، اطاعت گزارگی اور خدمت گزارگی کی چاشنی کی آمیزش سے اپنا گھر بسانے کی چاہ تھی۔ لگتا تھا ہر سو شادمانی اور کامرانی ہم دونوں پر مہیاں تھی۔ یہ میرے تصورات کے حلات تھے۔ حقیقت تو اس کے برعکس تھی۔ تم تو میرے ذہن میں تراشے ہوئے صم سے بالکل ہی مختلف نکلے۔ تمہارے لیے بیوی کا تمہاری زندگی میں آجانا اک عام اور معمولی سا حادثہ تھا جو ہر مرد اور عورت کی زندگی میں رونما ہو کر رہتا ہے۔ میرے لیے تمہاری طبیعت میں بلا کی سنجیدگی اور گھبراہٹ تھا جبکہ تم اپنے گھر کے تمام افراد سے کھل مل کر رہنے کو اولیت دیتے تھے۔ تمہیں میرے علاوہ ہر ایک کو خوش و مطمئن رکھنے کی فکر لگی رہتی تھی۔ کیونکہ ماں کا ہر وقت برین واش کرنا کہ تم میرے اکلوتے ناز و نعم میں لیے ہوئے بیٹے اور چار بہنوں کے واحد بھائی ہو۔ جن کی ذمہ داری تم پر تاحیات لاگو ہے۔ تم اپنی دراندیشی سے یہ حقیقت بہت جلد جان گئے تھے کہ بیوی کو نظر انداز کرنے میں دوسروں کی بے شمار خوشیوں کے ہمراہ اس کی ذہنی و قلبی سکون کی سلامتی کا بھی گہرا تعلق ہے۔ اگر ایک کے زخم سے اتنے سارے لوگوں کے گھاؤ بھر سکتے ہیں یا ایک کو پیاسا رکھنے سے اتنے سارے لوگوں کی پیاس بجھ سکتی ہے تو ایک کو بھی قربان کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ تمہاری یہ سوچ تمہیں مجھ سے کوسوں دور کر گئی۔ تم ہر وقت مجھ سے اکڑے اکڑے رہتے۔ بات



بات پر ڈانٹتے سب کے سامنے تذلیل کرتے اور میں سب کچھ ہنس کر برداشت کر جاتی۔ لیکن کسی کو مجھ پر رحم نہ آیا کسی نے تمہیں یہ سمجھانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ بیوی کے کیا حقوق ہوتے ہیں اور ایک گھر آباد کرنے اور صحیح معنوں میں جنت بنانے میں جہاں بیوی کا کردار بہت اہم ہوتا ہے وہاں شوہر کا بھی رول بہت حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن تمہارے گھر میں تو معاملہ ہی بہت گنبد تھا۔ تمہیں مردانہ خودداری کا شہکار اور نہایت ثابت قدم سمجھ کر پرستش کی جاتی کہ تم بیوی کے آنے سے رتی بھر بدلے جو نہ تھے۔

\*\*\*

ثوبیہ جن حسین سبزیوں کے مرغزاروں میں اس کی زندگی میں آئی تھی۔ حقیقی جہاں میں کھڑی ہر ایک کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے لیے بڑے دکھ کی بات تھی کہ عرفان کا اس سے شادی کرنا گویا خاندان کے ہر بچے کو بوزے اور جوان کا اس پر احسان عظیم تھا۔ وہ اکلوتا بیٹا چار بہنوں کا لاڈلا بھائی کسی صورت شادی کے قائل نہ تھا۔ اس لیے تو عرفان کو مطلب تھا صرف اور صرف خود سے وابستہ تمام رشتوں باتوں سے اور ان کے سامنے سرخرو ہونے کا۔ اسے صرف ایک فرماں بردار ہو گئی، دلی خواہشات سے بے بہرہ اور ذہنی سوچ سے مفلوج بیوی چاہیے تھی۔ خاوند کے اس بے جا رویے کے اثرات خاصے بھیا تک نکلے۔ وہ کسی کے لیے اہم اور قاتل محبت نہ رہی۔ ہر فرد اپنی اہمیت اپنا رعب دکھانے میں اپنی مثال آپ تھا۔ ماں غرور و تکبر کی جیتی جاگتی منہ بولتی تصویر۔ جنہیں اپنی جگہ لا تعداد خواہشات اور کاہنہ ذہنیت کی مالک۔ عزیز واقارب، نوکر چاکر سب کے سب اس پر حکمران تھے مگر ثوبیہ جانتے ہوئے بھی اس چیلنج کو قبول کیے ہوئے تھی کہ وہ عرفان اور اس کے گھر والوں کی ذہنیت کو اپنے مصروف شکر سے بدل کر چھوڑے گی اور وہ بھی اپنے رشتے اور موجودگی کی اہمیت کا ادھار نہ کرے گی۔

اس نے سانس کی خوشی کی خاطر۔ والدین

سے ملنا کم کر دیا۔ جسے والدین نے برانہ سمجھا۔ مندوں اپنانے کے لیے بہنوں سے منہ موڑ لیا اور عرفان کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس کی ہستی میں کل مل گئی۔ اس کی نہ تو اپنی سوچ رہی نہ اپنی پسند اب وہ زندہ لاش تھی۔ وہ دوبارہ جنم لینا چاہتی تھی مگر ان تمام ہستیوں کو حیات کرا سی دھن میں پس پس کر سرمہ بنی سب کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان بنی شاک میں چلی گئی۔ جب ساس عرفان کی دوسری شادی پر جانے کے خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے بیان کرنے لگیں۔ سار بننے کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا۔ اسی عالم بے بسی میں خوش جہل اور خوش رو ثوبیہ بدلتی چلی گئی۔ اسے ہر ایک سے ڈر لگنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے سائے سے بھی خوفزدہ ہو کر چونک اٹھتی۔ رفتہ رفتہ تلاطم خیز شباب پر سکوت چھانے لگا۔ تمام شوق اور ولولے پہلے ہی دم توڑ چکے تھے۔ شوخیاں شرارتیں لٹ گئی تھیں۔ اب تو اس کی ہمت و حوصلے پر مدنی کی کیفیت چھا چکی تھی۔ چار سال کے عرصے میں دیو ناؤسی کی ہوجا کو بے معنی اور لا حاصل قرار دیتے ہوئے اسے بجز زمین سے مشابہہ کرتے ہوئے وقت کے زیاں پر تاسف کرنے لگا۔

وہ ذہنی روکد میں اپنے خواص کھونے لگی تھی۔ سوتے میں چیخیں مارتے ہوئے عرفان سے لپٹ جاتی۔ ہلکی سی آہٹ پر بے ہوش ہو کر گر جاتی اور ہوش آنے پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی۔ اس کے والدین کو ان حالات کی خبر ہو چکی تھی۔ مگر منہ کھولنے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بیٹی کا ساگ چھین کر تھپتھپ کر کلک کا ٹیکہ لگا سکتا تھا۔ نہ جانے یہ کیسی آزمائش تھی کہ جس کا اختتام ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ یوں کہنا بجا ہو گا کہ والدین بیٹی پیدا کرنے کا خمیازہ اور بیٹی اس معاشرے سے تعاون کرنے کا مزاج رکھ رہی تھی۔ آخر وہ دن بھی آئی گیا جب عرفان ماں کی رضا کی خاطر طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔ ثوبیہ کا دل چاہا زہر کھا کر اپنی زندگی ختم کر لے اور تاحیات عرفان کو احساس جرم

کی سزا دے۔ لیکن ایسا کرنا حرام تھا۔ برداشت کا حوصلہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں نہ چرے پر غم و فکر کے گمرے اور سیاہ بادلوں کا وحند لگا۔ اسے دیکھ کر عرفان ہلا سے بولا۔

”پی یہ سب کیا ہو گیا؟“ عرفان چونک اٹھا۔ رحم اور ترس اس کی رگ رگ میں سرایت کرنے لگا۔ وہ اسے سینے سے لگا کر التجائی انداز میں بولا۔

”تو بی! ٹھیک ہو جاؤ۔ میں کچھ بھی کرنے والا نہیں۔ جو بھی ہوا اور جو میں نے کہا۔ سب مذاق سمجھ کر بھول جاؤ۔“

”عرفان حوصلہ رکھو۔ مریو۔ تم نہیں جانتے عورتیں بڑے ڈھونگ رہا لیتی ہیں۔ خاوند کو اپنی گرفت میں کرنے کے لیے کچھ بھی کر لیتی ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس کے باپ کو فون کرتی ہوں اگر اس بلی کو لے جائے۔ سارا ناٹک ختم ہو جائے گا۔“ ساس حقارت سے بولیں۔

”پی! اپنے باپ کے گھر اس حالت میں نہیں جائے گی۔“ عرفان کے تجزیے میں بے پناہ ترس تھا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے تم نارمل نہیں رہے۔ اس کے ساتھ تمہارا بھی دماغ چل گیا ہے۔ جاؤ جاکر آرام کرو۔ اس بانجھ کے ساتھ رہو گے تو تمہارا مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔“ وہ چپکارتے ہوئے بولیں۔

”ہاں ای شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ شاید میں اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر نارمل نہیں رہا۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔

”بیٹے تم اس ذات کو سمجھنا چاہو تو واقعہ کھلاؤ گے۔ کم بخت نامہ او نہیں جو تک کی پانڈ چپک گئی ہے۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو ہول اٹھنے لگتا ہے، میرا اتنا ہنڈ کم بیٹا ویل ایجو کیشنل ڈولٹ جس کی لوتھی ہے شہرت جس کا مقدر ہے اس جہاں کی ذہنیت سے محروم رہ جائے جس کا نام اور نسل ہی باقی نہ رہے۔ تم اس کی

چال بازی اور مکاری میں نہ آنا دیکھنا تمہارے لیے چاند سی دلہن لاؤں گی۔ تم نہ کھو گے تو ناش کراٹھو گے۔ مگر پہلے اس کا یہاں سے باپ کے گھر جانا ضروری ہے۔“ ماں سختی سے بولیں۔

”اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔“ عرفان کے دل میں ہمدردی کا طوفان موجزن تھا۔

”چلو یوں کر لیتے ہیں۔ اسے طلاق جیسی ذلالت سے بچا لیتے ہیں۔ بڑی رہے ایک کوئی نہیں خدمت گزار کی کے لیے ملازمہ بھی تو رہی جاتی ہے۔ یہ روتی کپڑے پر بھاری نہیں۔“ ماں نے نیا بیٹرا لایا۔

”تمہارے بچوں کی آیا گیری تو کرسی سکتی ہے۔ تا۔ فی الحال اسے باپ کے گھر آرام کرنے کو چھوڑ دو۔ جب تک نارمل ہوئی ہے تمہاری دلہن کا انتظام کیے دیتی ہوں۔ میری بات یاد رکھنا عورت بہت دانش مند اور زیرک ہوتی ہے صرف ماں بہن کے روپ میں۔ تمہارے باپ کو اللہ جنت نصیب کرے میری سمجھ پر اور میری دور اندیشی پر بھی یقین نہ آیا۔ بیمار ہوئی بھی تو اسے خرہ قرار دے کر بھی ڈاکٹر کے پاس نہ لے گئے۔ ماں بہنیں دل میں بستی تھیں۔ بات بھی درست تھی۔ آخر ماں نے تو میٹھے اپنا خون بیچ کر پالا تھا۔ درد میں مرتے مرتے پتی اور راتوں کی نیندیں اور دن کا قرار قیام کر کے اسے پروان چڑھایا۔ میری جرات نہیں تھی کہ ان سے آنکھ ملا کر بات بھی کر جاؤں۔“

”تو بی! تو ایسی ہی ہے ای! چار سال میں ایک دفعہ بھی میری کسی بات کو انکار نہیں کیا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”مگر میں اپنی بہنوں سے اس کا مقابلہ کروں تو تو بی بے مثل بیوی ہے۔“

”تم تو زن مردوں والی گھٹیا اور بے وقوفانہ باتیں کرنے لگے ہو۔ مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ اس کا یہ ناٹک جاو کر گیا ہے تم پر۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میرے معاملے میں



وہ اصل انداز کی زندگی کو پیش کی تو بیس دھاریں نہ بخشوں گی۔

”اسی غلطیوں نہ ہوں۔ آپ میرے لیے ہر جہی فیصلہ کریں گی۔ آخر اولاد ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ٹوٹی کو آرام کے بھانے اس کے میکے بھیج دیتے ہیں۔ مگر میں اسے طلاق دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ اس کے صبر و تحمل کا یہ پھل نہیں۔“ وہ سوہانہ انداز میں بولا۔

”مندرست ہو کر اس گھر میں آئے گی۔“ ٹھیک ہے۔ بھئی۔ میں بابا گل بیٹی کا خود خیال رکھیں۔ ہمیں کسی باؤلے گئے نے کاٹا ہے کہ اسپتالوں میں مارے مارے پھریں۔“ وہ بے دردی سے بولیں۔

”میں آج ہی اس کی ماں سے بات کرتی ہوں کہ اپنی بیٹی کو اگر لے جائیں۔ ماں تم ہمارے درمیان ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کرنا میں جانتی ہوں۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے فیصلہ کرنے والی تمہاری ماں موجود ہے۔ مروا دینی سے کام لیتا۔ مرووں کو بزدلی اور کم ہمتی نہ ب نہیں دیتی۔“ وہ اسے سمجھاتی رہیں اور وہ سوہانہ انداز میں سر جھکائے بیٹھارہ۔

فون کل پر والدین بھلا کیسے نہ جان چاہتے کہ وال میں کالا ہے۔ حالات سے وہ خبردار تو تھے۔ مگر نئے منصوبے کا انہیں اندازہ نہ تھا۔ اب شک اور وہم یقین میں بدل رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے بل دھوپ میں سفید کیے تھے نہ ہی اس معاشرے میں بہو اور بیوی کے مقام پر نا آشنا تھے۔ بیٹی کی حالت پر سکتے میں آگئے کہ آج بیٹی کے صبر و شکر اور ان کی برداشت کا یہ اجر ملا تھا کہ بیٹی کو باگلوں کی حالت میں اپنے گھر لے آئے تھے۔ ساس کی زہریلی باتیں اور شوہر کی خاموشی نے ان کا سکون عارت کر دیا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود دل تھا کہ سنبھلے کا نام نہ لے رہا تھا۔

توبہ کا فوری طور پر ماہر نفسیات سے علاج ہونے لگا۔ اس علاج کے دوران یہ سچائی خوشی بن کر ان کے آرزو دلوں کو خوشیوں سے ہمکنار کر گئی کہ توبہ یہاں بننے والی ہے۔ توبہ کے تو جیسے تمام غموں اور دکھوں کا

مداوا ہو گیا ہو۔ علاج معالجہ جیسے مکمل ہو چکا ہو۔ اس نے خلاؤں میں گھورتا اور ابھی تھا سمجھانا چھوڑ دیا۔ اکیلے میں باتیں کرنا، کبھی رونا اور کبھی قہقہے لگا سب ہی بھول گیا تھا۔ اب وہ بدحواس ہوئی نہ خوفزدہ ہو کر چلائی۔ نہ کسی قسم کی پشیمانی اور احساس محرومی اسے تنگ کرتی۔ معمولی سے ذہنی اثرات کی وجہ سے کہ وہ کبھی کبھی بالکل خاموش ہو جاتی اور گھنٹوں اسی عالم میں بیٹھی سب کی باتیں سنا کرتی۔ اس لیے علاج اس نوعیت کا جاری تھا۔

والدین اور توبہ نے سسرال میں یہ خبر دینے پر میٹنگ کی اور آخر یہ مرض میرا دور سمجھ کر پی لیا۔ اس کے وجود میں ملنے والا بچہ اس کی ہر محرومی و ناگہانی کو ختم کرنے کے لیے بہت کارگر ثابت ہوا اور اس نے اپنی توجہ کتابوں کی طرف مبذول کر لی۔

اسی عالم میں وقت بیت رہا تھا سب کا سمجھنا بھلانا ایسا کام آیا کہ خاموشی کو زبان مل گئی۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنے وجود کے قریب ہو کر زندگی کی دوچپیوں میں حصہ لینے لگی۔ بچے کی آمد کی تیاریوں میں ماں کے ساتھ شامل ہوئی۔ اب اسے اپنی زندگی نہایت کار آمد اور لازم لگنے لگی تھی۔ عرفان کی طرف سے نہ ٹوٹنے والی خاموشی اسے مضطرب کرتی نہ ہی پشیمانی کرتی وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں اپنے کردار پر فخر سے تھی ہوتی تھی۔

توبہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا اور وہ میسٹ کی تیاری کرنے لگی۔ اب اس میں اتنی بہت آگئی تھی کہ وہ اپنی اور بچے کی زندگی کے فیصلے خود کر سکتی تھی۔ ماضی کو ذہن سے کھرچ کر نکالنا اور حال میں رہ کر آگے قدم بڑھانا زندگی کا مقصد بن گیا تھا۔ وہ جو خوبیوں اور اچھائیوں کا مجسمہ تھی۔ اپنی شوخ و شنگ فطرت کے ساتھ اپنے بچے کو جسم میں پالنے پر متوجہ ہو چکی تھی۔ اسے ایک صحت مند اور نارمل اولاد چاہیے تھی۔ پھر وہ کیونکر مایوسیوں اور اداسیوں میں گھری رہتی۔

وہ صبح کس قدر مبارک اور بے پناہ خوشیوں کے

براہِ خلق ہوئی تھی جب توبہ نے ایک خوبصورت صحت مند اور توانا بچے کو جنم دیا تھا۔ دو وہیل کوکانوں کاں خبر نہ تھی۔ کیونکہ عرفان بھی دوسری شادی کر چکا تھا۔ وہ بھی اپنی پسند اور بھرپور آزادی کے ساتھ اپنے نئے ساتھی کے ساتھ زندگی گزارنے کے حق میں تھی۔ والدین نے جائیداد میں شریعت کے پیش نظر اسے حصے دار ٹھہرایا اور توبہ کی سیوری لے کر خوشی سے پھولنے نہ ساری تھی۔ اعتدال کا یہ زمانہ تھا اور ہمہ گیر تھا کہ جو اس کی شخصیت میں نظر آتا تھا۔

”ہائے میرے بچے کاش میں تیری قسمت اپنے ان ہاتھوں سے لکھ پاتی۔“ عرفان کی ماں نے ہلکتے ہوئے عرفان سے کہا۔

”پہلی شادی کس چاؤ سے کی۔ دوسری میں بھی کوئی کسے اٹھانہ رکھی۔ پہلی ہی راضی تو دوسری پولکی سے کم نہ تھی۔ مگر تمہارے مقدر کہ دونوں ہی اس جنت میں رہنے پر اعتراض اور انکار ہی کرتی رہیں۔“

”آپ غلط بیانی سے کام مت لیں۔ توبہ کو تو ہم نے خود دیکھ نکالا تھا اور پھر پلٹ کر اس کی خبر تک نہ لی۔ بھلا کوئی انسان اتنا بھی بے حس اور لاپرواہ ہو سکتا ہے جیسے ہم ننگ۔“ وہ تنہی سے بولا۔

”ہم نے اس پر کیا ظلم کیا ہے بیٹا؟ اب میں باگل ہو کو تو گھر رکھنے سے رہی۔“ وہ بھی ہرجت ہو گئیں۔

”چلیں ایک نارمل بہو کا مزا تو آپ نے خوب چکھ لیا ہے۔ اب رونا دھونا کیوں؟“ وہ طنز بہنا۔

”تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ہمارے اپنے نصیب۔“ وہ روپائی ہو گئیں۔

”ماں اب آپ کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہوگی کہ بہو کو ملازمہ کا اسٹیکس دینے والا سسرال ہمیشہ منہ کی کھاتا ہے۔ توبہ ایک شریف خاندان کی بہت سلیبی ہوئی لڑکی تھی۔ آپ نے اس کی قدر ہی نہیں۔ اس گھر میں سسک کر اور ترپ کر دن گزارے ہیں اس نے۔ مگر کیا بچال اف تک کی ہو۔ ہمارے سامنے رکھ رکھاؤ اور اخلاقیات کی دیوی بن کر مشکل وقت کاٹ گئی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے صبر کا پھل بچے کی صورت میں بخشا

یونیورسٹی وہ جاتے ہیں ہے ایک دن اپنے قدموں پر کھڑی ہو کر ہمارا سمخراڑا رہی ہوگی کہ روتی کے بد کے تم لوگوں نے مجھ سے کتنی مشقت کرائی۔ کتنی تذلیل کی۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”ماں کی فریاد برداری اس کی تذلیل تھی تو تم بھی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو گئے ہو۔ آج کی لڑکیوں کو فقط شوہر چاہیے تاکہ اسے اکیلا دیکھ کر اس پر اپنا رعب جما کر من بنائیں کر سکیں۔ باقی رشتے تو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ بنایا تو کج بات کرنے کی بھی روادار نہیں ہو میں ماں تو بھری چغڑ جس نے ایک بچے کو پالنے میں کیا کیا قربانیاں نہیں دیں۔“ وہ نفرت و حقارت سے بلند آواز میں بول رہی تھیں۔

”اور دوسری بہو کو دیکھو۔ کہ آؤ دیکھانہ تاؤ مینے بھر میں ہی خلع لینے پر تل گئی۔ بتاؤ اس گھر میں اسے بھلا تکلیف کیا تھی؟ اب بوڑھی ساس اس کی بی حضوری سے تو رہی اور سندس مٹھی چالی کیونکر کریں۔ وہ اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی۔ ہمارے اصولوں پر چلتی۔ نہ کہ ہم اس کے خاندانی طرز زندگی کو اپنا لیتے۔“

”ماں جی جب برائی بیٹی کو بہو بنا کر گھر کا فرد بناتے ہیں تو اسے کچھ تو حق دینا چاہیے۔ قصور دونوں کا نہیں ہے۔ ذرا خود کا بھی احتساب کریں۔ شاید آپ کو اپنے سینے میں چھپی سیای شگونی اور بے دردی نظر آئے۔ عظیم تو توبہ بھی چار سال گزار مگر انجام کیا ہوا کہ ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ عقلمند اور دوراندیش حنا ثابت ہوئی کہ ایک مینے میں معاملے کی تہ تک پہنچ کر ہمارے جسم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ معصوم آپ کے عتاب میں آکر پاگل ہونے سے پہلے ہی میکے سدھار گئی۔“

”کیسی بات نہیں۔“ ماں گویا ہوئی۔

”سے والدین نے شہ دی ہے۔ اس کے نام جاوید اور بھی کی اور بینک بیلنس بھی دے ڈالا۔ دھالکھا کر قدموں پر کھڑا بھی کر دیا وہ اس گھر میں کیونکر ایڈجسٹ ہوئی۔ بگاڑا تو اس کے والدین کا ہے۔“

”آپ کی بات سو فیصدی درست ہے امی! ہمارے



معا کرے لیکن ان کے ہاں سبب والدین کو کرنا چاہیے۔ ورنہ حشر ٹویہ جیسا ہو گا۔ وہ مضحکہ خیز انداز میں بولا۔

”اب ایک عدد بیٹے کے لیے تیسری ہولانے کا کیا خیال ہے۔ بہت راحت افزا اور خوش کن ہے نا ای۔“

”تیسری بھی آئے گی۔ ناک پر نہ بیٹھی تو چوتھی آجائے گی۔ اس میں قباحت ہی کیا ہے؟“ وہ ڈھٹائی سے بولیں۔

”یہ سنا ہے کہ جس ماں کی اپنی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ وہ ساس بے مثال ہوتی ہے۔ مگر آپ“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔

”بد تمیزی سے باز آؤ گے کہ تھپڑ رسید کروں۔“ وہ غصے سے چیخیں۔

”تھپڑ ایک چھوڑ کے میسوں رسید کر لیں۔ بس میری ریکوٹ مان لیں۔ دل میں نرمی پیدا کریں دوسروں کی بچیوں کے لیے ورنہ اس کا انجام بہت عبرت ناک ہو گا۔

آج اپنے تمام غصے اور ناراضی کو یکجا کر کے اس کی وجہ کے بارے میں سوچیں۔ شاید ماضی میں آپ پر ہونے والی تمام زیادتیوں اور بے انصافیوں کی تلافی کا انتقام مجھ پر چھڑیوں کی بارش میں دھل جائے اور آپ کے من میں اٹھنے والی جنگ و جدل اور بدلے کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔ ای آپ کو تو اس کرب اور دکھ کا اندازہ ہے جس کا آپ نے ماضی میں سامنا کیا تھا۔ پھر اتنا نیکی و ایثار کیوں؟ آپ کو اپنی ہمو کے ساتھ وہ سلوک روا رکھنا چاہیے تھا۔ جس کی آپ نے تمنا کی تھی۔ جس کو آپ نے کاش کی گردان میں حسرت ویاس کا لبادہ اوڑھا دیا تھا۔ ای انتقام کی آگ کبھی بجھتی نہیں۔ مدھم پڑنے پر بھی چنگاریاں سلکتی رہتی ہیں۔

آپ اس دنیا سے نکل آئیں ای۔ مجھے آپ کو ہر وقت اس حالت میں دیکھ کر ہلکا سا ہوتا ہے۔“

”اپنی ہمدردیاں اپنے پاس رکھو۔ چلا ہے مجھے سبق سکھائے۔“ وہ ہنچ کر بولیں۔

”آپ بے پناہ پیار اور ہمدردی میں ہی تو تنو میں تک آئی۔ امی آئی لویو۔“ وہ انہیں گلے لگا بولا۔

”ہنو خوشامدی کہیں کا۔ اپنے مطلب کی خاطر اس وقت کچھ بھی کرنے کو تیار ہو ہے نا۔“ وہ قدرے مدھم پڑ گئیں۔

”کون سا لالچ اور کیا مطلب؟“ وہ بظاہر حیرت سے بولا۔

”یہی ناکہ جا کر ٹویہ کو لے آؤں۔ مگر ایسا نہیں ہو گا۔ میں ایک دفعہ تمہاری وادی کی حرکت سے متکثر آکر سیکے چلی گئی تھی۔ تین سال تک مجھے تمہارے بارے میں نہیں پوچھا۔ تمہاری پھوپھی ہر دوسرے دن مجھے طلاق کی دھمکی دے کر خوفزدہ رکھتی تھیں۔ میں اس گھوڑی کو کوکر لینے جاؤں۔ خود آنا چاہتی ہے تو دروازہ کھلا ہے۔“ وہ طنز سے بولیں۔

”یہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اور صرف آپ کو خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ عقیدت مندانہ لہجے میں بولا۔

”دیکھیں امی میری جنت تو آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔“

”بیٹے اب دنیا کے اصولوں کے ساتھ یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ شوہر کی جنت بیوی کی چالپوسی خاطر واری سے اس کی آغوش میں ہے۔ ذرا زمانہ بدلے دو۔ کل کلاں اس کا حصول قدموں کی بوسہ بازی میں نخل ہو جائے گا۔“ وہ طنز کے نشتر چلا رہی تھی۔

”یہ! آپ مجھے نہیں خود کو ہرٹ کرنے پر تلی ہیں۔ آتش انتقام میں آپ نے اپنے گھر کو جنم دیا رکھا ہے۔ جو اصول اپنی بیٹیوں کے لیے مناسب سمجھتی ہیں۔ وہی طریقہ ہوسے روار میں تو یہ گھر اس روئے زمین پر جنت کا ٹکڑا ہو گا۔“ وہ التجا سے لہجے میں بولا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب میں سمجھ گئی ہوں۔ بچے! عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ دراصل میں ہوں فسادی جڑ۔ مجھے زہریلا کرار کیوں نہیں دیتے۔“ وہ تہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے بولیں۔ تو وہ خاموشی

سے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بولیں۔

”خدا ایا معاف کرنا۔ تو اپنی فطرت رکھنے والی ماں کو اولاد نرینہ دے کر کتنی ہی بے گناہ معصوم زندگیوں کو جنم رسید کیوں کرتا ہے؟ تیرے بھید تو ہی جانے۔“

ٹویہ کی ہر سوچ منے کے ارد گرد گھومتی رہتی۔ خود کو ہشاش بشاش رکھ کر اس نے ماضی کے دکھ درد اور بچپن کے پیکر بھلا دیے تھے۔ زندگی اپنے مزاج اور اپنے معمول سے ہمکنار تھی۔ لیکن پھر جمی تاریک راتوں میں عرفان کی بے وفائی لا پرواہی کا خیال آتا تو سینے میں کچھ ٹوٹ سا جاتا۔ آنکھوں کے گوشے بھگ جاتے اور منے پر بے پناہ ترس آ جاتا۔ جس نے ابھی تک باپ کے شفقت بھرے ہاتھوں کے لمس کو محسوس ہی نہ کیا تھا۔ کیا وہ بن باپ ایک مکمل انسان بن سکے گا۔ ”ہائے منام ہم دونوں کی محبت اور شفقت میں پروان چڑھتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔“ وہ حسرت ویاس سے سوچ کر ترپ اٹھتی۔

ٹویہ اس دن جب گھر پہنچی تو عرفان کی آمد پر خوشی کے ساتھ پریشانی اور فکر مندی بھی عود کر آئی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹ کر سانس مندوں اور شوہر کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ یونیورسٹی جانا واپس آکر بچے کو ٹائم دینا اسے تھا کرتا تھا۔ کمزوری اور نفاہت سے چہرے کی زردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عرفان کو دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں ایسے پھولے کہ وہ بیڈ پر ڈھے گئی تھی۔ ماں گرم لادھ کا کلاس لے کر اندر داخل ہوئیں تو اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ بس چٹا تو کان بھی بند کر لیں۔ وہ سائڈ ٹیبل پر لادھ رکھتے ہوئے پاس بیٹھ گئی اور نہایت ملامت بھری آواز میں بولیں۔

”عرفان آیا ہے۔ تمہیں اور بچے کو لینے بیٹا کچھ سدھرا ہوا لگ رہا ہے۔ بس تمہارا یونیورسٹی جانا پسند نہیں۔ اور تو کوئی اعتراض نہیں کر لیا۔“

”بہت خوب۔ میں دوسروں کے ٹکڑوں کی محتاج رہوں تو تب درست ہے۔ اس بزدل مرد کو اندک سیکورٹی مارے جا رہی ہے۔“ وہ قدرے خفگی سے

بولیں۔

”نہیں میری جان! ایسے نہیں سوچتے۔ اپنی سوچ ثبت رکھو گی کہ تو تمام محاطات کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو گا۔ عورت برداشت کرنے، درگزر کرنے اور خطا کار کو ہنس کر سینے سے لگانے کا دوسرا نام ہے۔“

”امی آج آپ نرم پڑ گئی ہیں۔ لیکن میں نے جو فیصلہ کیا ہے بالکل اٹل ہے۔ میں عرفان کے ساتھ ایک پل بھی گزارنے میں اپنی ہنک اور توہین سمجھتی ہوں۔ یہ کیا اصول ہیں شوہر کے کہ جب بیل چاہا دھنکار دیا جب چاہا گلے سے لگایا۔ شادی نہ ہوئی مذاق اور تماشا ہو گئی جس مرد کی قربت مجھے تحفظ نہ دے سکی وہ اپنے بیٹے کے لیے کیا کرے گا۔ میں اس کے قدموں کی دھول بن کر زندگی گزارنے کا تہیہ کر چکی تھی اس نے مجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ میں نے بشکل خود کو بحال کیا ہے۔ یہ لوگ پھر سے مجھے تو بچوڑ کر گلیوں اور بازاروں کی نذر گردیں گے اب ایسے نہیں ہونے دوں گی۔ میری اچھی ماں آپ کو میرا ساتھ دینا ہو گا۔“

وہاں کے پاؤں پڑ گئی۔

”میری بچی! تم ہم پر بار نہیں ہو۔ ہمارے لیے رحمت ہو سراسر۔ مگر ہماری بجدوری تو مجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے ابا عمر رسیدہ ہو گئے ہیں۔ میں اکیلی تمہارا کب تک ساتھ دے سکتی ہوں۔ یہ دنیا پہاڑی جوالی کو داغ دار کیے بغیر نہیں رہتی۔ بیٹی کی عزت و تحریم اس کی شوہر کے دم سے ہوتی ہے۔ اگر تمہاری کوئی شرط ہے تو عرفان کو بتاؤ۔ مجھے امید ہے اس وقت وہ ہر بات پر آمادہ ہو جائے گا۔ کافی پشیمان نظر آ رہا ہے۔“ وہ سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”میری کوئی شرط نہیں۔ میری زندگی شرطوں کی غلام نہیں ہے۔ عرفان خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو یہ ان کی بد قسمتی ہے۔ اپنی زندگی کو خوش گوار اور دلربا بنانے کے لیے کسی راستے کا تعین نہیں کر سکتے تو ان کی بزدلی ہے۔ بس میرے چند دلائل کو زیادہ سمجھیں اور مجھے مت چھیڑیے۔ جو چنگاریاں دلی ہوئی ہیں انہیں ہوا دی تو بہتر نہ ہو گا۔ امی آپ



میری فکر مت کریں۔ جو صلے سے کام لیں۔ آپ کی بیٹی کے مقدر اس دن بدل گئے تھے جب عرفان نے اسے زندگی سے نکال دیا تھا اور میری رضامندی لیے بغیر دوسری شادی رچالی تھی۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ جب تک اس کی ماں کا بیٹے پر ہولڈر رہے گا۔ اس کی کوئی شادی کامیاب نہ ہوگی۔ آج کی تاریخ میں میری یہ ہیشن کوئی اپنی ڈائری میں درج کر لیں۔“ وہ محسوس دلائل دے کر ماں کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

”آپ خوا خواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ آپ کی یہ بیٹی راج کرے گی، مگر اپنے بازوؤں کے زور پر اور اپنے نبل بوتے پر۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”بیٹا ہمیشہ باپ کی شفقت اور اس کے ڈر و لحاظ سے راہ راست پر رہتا ہے۔ تم اسے کنٹرول نہیں کر پاؤ گی۔ عرفان کا ساتھ تم دونوں کے لیے بے حد اہم ہے۔“ ماں بھی ہار ماننے والی نہ تھی۔

”ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں ای۔ ہم ایک دوسرے کے عزم بلند رکھیں گے۔ دیکھیے سوتے میں بھی ہنس رہا ہے۔ میرے اس فیصلے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر رہا ہے۔ میری ہمت کو بتدریج بڑھانے والی یہ معصوم ہستی ہے۔“ وہ خوشی و غم کے ملے جلے جذبات سے مضطرب ہو کر رو پڑی۔

عرفان دروازے سے باہر کھڑا تمام گفتگو سن چکا تھا۔ وہ بے قدموں سے واپس ڈرائنگ روم کی جانب چلا گیا۔ حیرت و اشتیاق سے اس کی زبان گنگ تھی۔ ذہن اور دل کو ایسی چوٹ لگی تھی کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا تھا۔

ٹوہیہ جسے اس نے ہمیشہ بے جان تصور کر کے اہمیت نہیں دی۔ آج کس قدر جان دار اور براعتاواگ رہی تھی۔ آج اس کے ہر لفظ میں ہمت تھی اور پختہ عزم نمایاں تھا۔ کسی پچھتاوے کی بلک سی رقت نہ تھی۔ اب تو وہ خود اکی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں بے پناہ فکریں، غدشے اور خوف تھے۔ جان لیوا خلش تھی اور لاتعداد پچھتاوے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس بھری دنیا میں تنہا کھڑا ہے۔ کوئی اس کا غمگسار

نہیں۔ سب ہی اس کے دشمن ہیں۔ اس کی خوشی اور راحتوں کے تو پھر ان تمام رشتہوں میں اس کا حق اور ابدی غمگسار اور ہمدرد کون ہو سکتا ہے۔ وہ سر میں ڈوب گیا۔ آج اسے فیصلہ خود کرنا تھا۔

ٹوہیہ اپنی جگہ بے حد مطمئن تھی۔ زندگی کا مشکل ترین فیصلہ اس نے بڑی آسانی سے کر لیا تھا۔ اس کے سامنے باعزت زندگی بائیس پھیلائے اس کی منتظر تھی۔ جس میں مٹا تھا۔ اس کے قہقہے اور شرارتیں تھیں اور ذہن کے ایک گوشے میں عرفان کے تعاون کا موہوم سی امید تھی۔

اس نے اپنے ذہن کو پر آگندہ خیالات سے دور رکھنے کے لیے اپنی بچپن سے جوانی تک کے تمام حسین لمحوں کو اپنے دل میں سمو دیا اور آنکھ لگ گئی۔ دروازہ اندر سے کسی نے لاک کیا تو وہ چونک کر بیٹھ گئی۔ سامنے عرفان کھڑا تھا۔ تمام تر رعنائیوں اور تکلف کی جگہ پچھتاوے نے لے رکھی تھی۔ نگاہیں نادام اور حرکات میں تذبذب تھا۔

”ٹوہی۔ حقیقت تم ہو اور یہ مٹا ہے۔ باقی تمام سراب دھوکہ اور جھوٹ میری بات پر یقین کرو۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”مجھے معاف نہیں کرو گی۔“ وہ بے قراری سے بولا۔

”صرف مجھے ہی نہیں، میرے گھر کا ہر فرد تم سے معافی کا خواست گار ہے۔“

اس نے آگے بڑھ کر منے کو گود میں اٹھالیا۔

”اسی وقت چلو، سونا گھر تمہارا منتظر ہے۔ ماں سجدے میں گر کر تمہاری واپسی کے لیے دعا گو ہے۔ پلیز مسکرا دو۔ اس منے کی خاطر سی۔ کتنی عیدیں تمہارے بن بیت گئیں۔ گھر چلو اور اس ملن کی خوشی میں عید کی تیاری کرو۔ دستور اور موقع کے مطابق میرا دامن خوشیوں سے بھر دو میری جان۔“ ٹوہیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ صبح کا بھولا شام کو لوٹ آیا تھا۔ ٹوہیہ نے اس کے ساتھ جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔



# شری شادی کی شام

مکمل ڈال

”اچھا... تو تم لوگوں نے ابھی تک ڈیڑھ گھنٹہ نہیں کیا کہ سونیا کی شادی میں کون کون جانے والا ہے۔“ وہ تینوں ہی اپنی اپنی دلچسپیوں میں گم تھیں جب آپلی نے اندر داخل ہوتے ہوئے پرجوش آواز میں انہیں مخاطب کیا۔ ہمہ وقت ہنسنے بولنے والی سامعہ کہیں بھی خاموشی اور اداسی باقی نہیں رہنے دیتی تھیں اور اب بھی تین تین لڑکیوں کی موجودگی کے باوجود کمرے میں جو بوجھل پن چھایا ہوا تھا اسے ان کی ایک آواز نے دور کر دیا۔

”امی اور ابو...! اربانے کانوں سے ایئر فون ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

”جی نہیں، وہ نہیں جارہے۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور ابو کو چٹھیاں نہیں مل سکتیں۔“ آپلی نے اس کی غلط فہمی دور کی۔

”اسی لیے اب تم تینوں میں سے کسی دو کو تو میرے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔“

”دو کو کیوں... ایک کو کیوں نہیں؟“ اربا چونک کر پوچھنے لگی۔

”ظاہر ہے یہاں سے صرف ایک بندہ جائے گا شادی بھگتانے تو میری سسرال میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔“ آپلی کچھ ناگوار سی ہو گئیں۔

”پھر تو انہی دونوں سے کہیے، میری تو نئی نئی کلاسز اشارت ہوئی ہیں۔ میں تو کہیں جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ پہلے ہی اپنی پوری کلاسز میں نالائق مشہور ہو چکی ہوں کم از کم اس سال میں اپنا

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ تم لوگوں کو گاؤں کے نام اتنی وحشت کیوں ہوتی ہے۔“

”مجھے گاؤں دیکھنے کا شوق ہے آپلی مگر صرف گاؤں

دیکھنے کا۔“ اربا سنجیدگی سے بولی۔

”سنوکل رات و سیم کا فون آیا تھا بائی ایئر واپس آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ میں نے کہہ دیا اگر اربا



ریکارڈ صاف رکھنا چاہتی ہوں۔“ تم نے مونٹا سا تانور کشن کے نیچے چھپاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”تم اور تمہاری پڑھائی۔“ آپلی نے اسے کھور اتو دھکیا مٹی۔

”تو آپ کیا چاہتی ہیں۔ میں اپنی پڑھائی یہ چھوڑ کر محض آپ کی جیمنی مندی کی شادی کے لیے اتنی دور کاسٹر کروں۔ یہ دونوں تو ویسے بھی زمانے بھر کی فارغ ہیں لے جائیے انہیں گاؤں کی شادی دیکھ لیں گی۔ انجوائے کر لیں گی اور ان کا دل بھری فریش ہو جائے گا۔“

”گاؤں کی شادی کا تو یوں کہہ رہی ہے جیسے شہزادہ و سیم کی شادی میں شرکت کرنی ہو۔“ میل پاش لگانے میں مصروف ارفع اس بات پر طنز کیے بنانہ رہ سکی۔

”کیا کہتی ہو تم دونوں؟“ آپلی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میری طرف مت دیکھیے۔ موتیا کی شادی چھوڑ کر اگر میں آپ کا وہ دہائی میلہ دیکھنے جاؤں گی تو وہ میری جان نہیں لے لے گی۔“ ارفع کے لہجے میں ایک بار پھر طنز گھلا تھا۔

”جھولی۔ موتیا کی شادی تو اگلے مہینے کی پانچ کو ہے۔“ اربانے فوراً ہی اسے ٹوک۔ شاگنک پنک نیل پاش ناخن کے بجائے ارفع کی انگلی کو رنگ دار کر گئی تھی وہ دانت کچکا کر اسے دیکھنے لگی۔

”نکواس کرنے کے لیے کس نے کہا تھا تم سے، آپلی! ایسا کریں اربا کو لے جائیں۔ اسے ویسے بھی پڑا شین ہو رہا ہے جانے کا۔“ ارفع اسے گھورے جارہی تھی اس کے ہونٹوں پر شری سی مسکراہٹ آگئی۔



اور ارباب ساتھ ہوئیں تو پھر میں بڑی سے اولیٰ کی۔  
 ”کیوں؟“ حیرت سے ارباب کی آواز بلند ہوئی۔  
 ”یہ ہمارے ساتھ جانے کا انعام ہے یا سزا۔“  
 ”ہمارے جانے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں  
 کہیں نہیں جا رہی۔“  
 ”نہیں۔۔۔ جانا تو میں نے بھی نہیں ہے۔“ وہ  
 دھیمی پڑ گئی۔  
 ”مصیبت کیا ہے تم دونوں کو۔“ آپنی زچ ہو گئیں۔  
 ”مصیبت یہ ہے کہ آپ جا رہی ہیں ابھی سے اور  
 شادی ہے دس پندرہ دنوں بعد۔ جبکہ میرے پاس  
 ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے پہننے کے لیے۔  
 شادی کے لیے تو می لے بھی دیں مگر اتنے دن میں کیا  
 کروں گی۔“ ارباب نے بالا خراپا مسئلہ بیان کیا۔  
 ”بس اتنی سی بات۔۔۔ تم آج ہی میرے ساتھ چل  
 کر جتنی شاپنگ کرنا چاہو کر لو۔“ اس کا اتنا سا مسئلہ سن  
 کر آپنی پر جوش ہوئیں اور ارباب کھل اٹھی اس آفر پر۔  
 ”ہاں بھی! ہماری آپنی اب چودھری کی بیگم ہیں۔  
 پیسہ کہاں مسئلہ رہا ہے ان کا۔“ ارباب ہنسی گئی۔  
 ”پھر تو آپنی۔۔۔ میں بھی چلوں گی۔“ شمر نے فوراً  
 اپنا فیصلہ بدلا۔  
 ”اور ارباب تم بھی اپنی بیکنگ کر لو۔ پرسوں تک نکلتا  
 ہے۔ گھر کی شادی ہے اور میں اتنے دنوں سے یہاں  
 بیٹھی ہوں کل تو وہیم اچھا خاصا غصہ ہو گئے تھے مجھ پر یہ  
 ”کیا میرا جانا ضروری ہے۔“ ارباب نے بے زاری  
 سے انہیں دیکھا۔  
 ”اور نہیں تو کیا۔۔۔ اہل نے تو آتے ہوئے کہا تھا  
 مجھ سے۔ اپنی دونوں بہنوں کو ضرور لے کر آنا“ شمر تو پھر  
 بھی میری شادی میں ہو آئی تھی۔ مگر تم دونوں تو ایک  
 بھی بار وہاں نہیں گئیں۔“  
 ”ہاں واقعی!“ شمر نے سر ہلایا۔  
 ”ویسے ان کا گاؤں ہے بہت خوب صورت۔۔۔  
 کھیت کھلیاں مہر س، باغات، کچے کچے گھر۔۔۔ دھور  
 ڈگر، پائے جملے لڑکے۔“  
 ”تو ہے تمہارے بہت بے شرم ہو گئی ہو۔“ آپنی

نے ملامت کرنے والی نظروں سے اسے گھورا۔  
 ”مذاق کر رہی تھی۔“ وہ خفیف سا ہرکرمنا آئی۔  
 ”اگر ارباب نہیں جا رہی۔۔۔ تو پھر میں بھی نہیں  
 جاؤں گی۔“ ارباب میرے سے بولی۔  
 ”بس تو طے ہو گیا میں موتیا کی شادی مس نہیں کر  
 سکتی اور ارباب میرے بغیر جا نہیں سکتی تو ہمارا جانا کینسل  
 رہی آپ کی سسرال والوں کی بات تو آپ کی ساس اتنی  
 بھولی اور سادہ ہیں کہ آپ کوئی بھی بہانہ بنا میں ہمارے  
 نہ جانے کا وہ بتا طے تھے دیے آپ کی بات پر یقین کر  
 لیں گی۔“ ارباب ہاتھ اٹھاتے ہوئے یکدم قطعی انداز  
 میں بولی۔  
 ”ٹھیک ہے تم لوگوں سے تو اب امی ہی بات کریں  
 گی۔“ چند لمحوں میں دیکھتے رہنے کے بعد وہ کافی غصے  
 میں کمرے سے نکل گئیں۔  
 ”کیا کر رہے ہو تم لوگ۔۔۔ آپنی کو ناراض کر دیا۔“  
 شمر نے سانس بھرے لہجے میں کہا۔  
 ان چاروں بہنوں کی آپس کی انڈر اسٹینڈنگ مثالی  
 تھی۔ سامعہ کو کہ بڑی بھی مگر اپنے بے تکلفانہ مزاج  
 کے سبب اس نے بھی اپنی بہنوں پر اپنے بڑے پن کا  
 بے جا رعب نہیں جمایا تھا۔ وہ ہمیشہ گرمی سہیلوں کی  
 طرح ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہہ جاتی  
 تھیں۔ مگر جب ظاہر صاحب نے سامعہ کا رشتہ اپنے  
 کرزن کے بڑے بیٹے سے طے کیا جو جدی پشتی زمیندار  
 تھے اور اپنے گاؤں کی بااثر شخصیت مانے جاتے تھے  
 تب ان سبھی کو بے طرح جھڑکا لگا تھا اور پھر سامعہ سے  
 زیادہ اس رشتے کی مخالفت ارباب نے کی تھی ویسے بھی وہ  
 مزاج کی ٹھوڑی ہنڈر واقع ہوئی تھی اور بلا جھجک اپنی ہر  
 بات اور ہر اعتراض پایا تک پہنچا دیتی تھی اور اگر وہ  
 قائل بھی ہو جاتے۔ مگر اس بار ایسا نہ ہو سکا۔ ان کے  
 نزدیک تو یہ اعتراض سرے سے کوئی اعتراض ہی نہیں  
 تھا۔ کیا گاؤں میں رہنے والے انسان نہیں ہوتے جو وہ  
 محض اس بنا پر اتنا شاندار رشتہ ٹھکرا دیتے۔  
 اسی لیے محض چند ماہ بعد ہی سامعہ ولسن بن کر  
 رخصت ہو گئی اور جاتے ہوئے اس نے خوب ہی رونا

دھوا جھپایا تھا۔ مگر ارباب اور ارباب تب حیرت سے لنگ رہ  
 گئیں جب چھ ماہ بعد وہ اپنے وجہ و شکیل دولہا کے  
 سبک ان سے ملنے آئی تھی اور خوشی کے اتنے رنگ  
 اس کے حسین چہرے پر بکھرے ہوئے تھے کہ نگاہ ہی  
 نہیں ٹھہرا رہی تھی۔  
 ”آپنی تو بہت خوش لگ رہی ہیں۔“ ارباب حیرت سے  
 پڑ رہا تھا۔  
 ”چلو یہ خوش خوش تو ہم بھی خوش۔“ ارباب نے خود کو  
 اطمینان دلایا تھا۔  
 ارباب اور ارباب میں ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ صورتوں  
 میں مماثلت تھی قد کاٹھ بھی ایک جیسا تھا۔ اکثر پہلی  
 بار ملنے پر لوگ انہیں جڑواں ہی سمجھتے مزاجوں میں  
 البتہ زمین آسمان کا فرق تھا۔ نازک سے نین نقش والی  
 ارباب جیسے مزاج کی مالک تھی۔ جس بات پر ترمز اور ارباب  
 پانچ منٹ لمبی تقریر کر سکتی تھیں۔ وہاں ارباب صرف ایک  
 منٹ سے کام چلا لیتی۔ بولتی تو کان لگا کر سننا پڑتا۔ جبکہ  
 اس کے برعکس ارباب کے مزاج میں تندہی تھی کسی  
 ایک جگہ تک کر بیٹھا اور جب رماناؤں سے سیکھا ہی  
 نہیں تھا اور شمر بھی اسی کار تو تھی وہ ایف ایس سی کی  
 اسٹوڈنٹ تھی اور یہ دونوں گریجویشن کرنے کے بعد  
 فراغت کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ اسی لیے اب آپنی  
 کو اپنی زندگی شادی میں شرکت کرنے کے لیے انہیں  
 تیار کرنا پڑ رہا تھا۔  
 ”سنو ارباب“ میں کپڑے پیک کر رہی ہوں تم لپٹا  
 پوتی کے تمام تر آئینے یاد سے رکھ لیتا ایسا نہ ہو وہاں  
 میک اپ کے بجائے چہرے پر صرف شرمندگی ہی نظر  
 آئے۔“ اس نے ارباب کو مخاطب کیا جو ہاتھوں میں سر  
 گرائے بے زار سی بیٹھی تھی۔ آپنی نے انہیں امی  
 سے اچھی خاصی جھاڑ پھونانے کے بعد پھر اس کا اثر  
 زائل کرنے کے لیے انہیں شاپنگ بھی کروائی تھی  
 اور اب وہ بڑی شرافت سے جانے کی تیاریوں میں لگ  
 گئی تھیں ارباب کا موڈ لیکن بحال نہیں ہو رہا تھا۔  
 ”اب اس طرح منہ بنائے کیوں بیٹھی ہو کیا پتا وہاں  
 جا کر تمہارا نصیب ہی کھل جائے گاؤں کا کوئی سوہنا

گھو جو ان تمہارے عشق میں رانا بھانے اور۔۔۔ پھر تم  
 کھیتوں میں اس کے آگے پیچھے کد کرنے لگاتے کوئی  
 پنجابی گانا گاتی پھو۔“ کمرے میں داخل ہوتی شمر نے  
 اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ وہ سر سے پیر تک  
 سلک اٹھی۔  
 ”منہ بند رکھو ارباب۔۔۔“  
 ”اٹھو ارباب! کیا کچڑ میں پھنسی پھنسی کی طرح  
 بیٹھی ہو۔“ ارباب بھنبلائی اسے اپنی جگہ سے ہٹنے دیکھ  
 کر اور شمر جیسے ہنسی کا وہ بڑا ٹیکا۔  
 ”اف ارباب! یاد دھوند کے مثال نکالی ہے۔“  
 ”تمہیں کوئی اور محاورہ نہیں ملا تھا کہنے کو۔“ ارباب  
 نے قبر بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔  
 ”نہیں! اب اس سے پہلے کہ میں ایسے ہی تین چار  
 محاورے اور سناؤں۔ اٹھ جاؤ ہمیں وقت پر پھر مت ہر  
 چیز دھوندتی رہنا۔“  
 ”ایک تو یہ ٹرین کا سفر بھی مجھے زہر لگتا ہے۔“ وہ  
 ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”مجھے تو بہت پسند ہے۔ ان لپکٹ مجھے بہت  
 ایکسٹینشن ہو رہی ہے سوچ سوچ کے۔“ ارباب  
 مسکرائی۔  
 ”نہیں کوئی چیز بڑی بھی لگتی ہے بائی ایر جاتے تو  
 چند گھنٹوں میں پہنچ جاتے۔ اب تو یہ اگنا دینے والا سفر۔“  
 ”اف میرا تو سوچ سوچ کر ہی دماغ خراب ہو رہا ہے  
 بڑا برا کرکتے ہوئے وہ چھوٹے بیگ کی زپ کھول کر  
 اس میں شیپو لوشنز اور کمرز وغیرہ رکھنے لگی۔  
 اسٹیشن پر انہیں لینے کے لیے وہیم بھائی آئے تھے  
 نغمہ احمد انہیں دیکھتے ہی خوشی سے بابا بابا چلاتے ان  
 کی گود میں چڑھ گیا۔ وہیم بھائی انہیں دیکھ کر کافی خوش  
 ہوئے۔  
 ”شکر ہے کسی بہانے سے ہی سہی، تم لوگوں کو بھی  
 بہن کے گھر آنے کا خیال آیا۔“ وہ بیگ جیب میں  
 رکھتے ہوئے بولے۔  
 ”خیال آیا نہیں ہے۔ خیال دلویا ہے میں نے نہ



جائے گی سون کے بعد اسے پرانی ہوئی  
ہیں۔“ آپنی نے بتایا تھا گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ارفع  
نے بیک یو پر مریں دیکھا اور ایسے کہا۔  
”بھوتی لگ رہی ہوں۔ کیا گھر پہنچنے سے پہلے  
بھائی جان کسی نہر کے کنارے گاڑی نہیں روک سکتے  
تاکہ ہم اپنا منہ دھو لیں۔“

”تمہیں ہمیشہ انوکھی سی سوجھتی ہے۔ چپ رہو۔“  
ارباب نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا وہ منہ تار لہر  
مٹی۔ سفر کی دھول، مٹی، تھکاؤ اور اضمحلال نے  
واقعی ان کے چہروں کی رنگت اڑا دی تھی۔ ارفع کو  
اپنے ایشیج کی فکر بھی جو شہری لڑکی ہونے کی حیثیت  
سے آپنی کی سرال والوں کی نظر میں ان کا بننا ہوا تھا۔  
اب ایسے بے حال چلے میں وہ ان کے سامنے جاتیں تو  
یقیناً ”وہ انہیں شہر کے بجائے کسی خانہ بدوش بستی کی  
لڑکیاں سمجھتے۔“

شام دھلنے کو تھی، سورج اپنی تمام تر تمازت سمیت  
ڈوب چکا تھا۔ مگر شام کی تاریکی مدھم پڑتی روشنی تاحد  
نگاہ تک لہلہاتی ان کھڑی فصلوں کو جھلکاتی آنکھوں کو  
عجیب سی نظارہ پیش رہی تھی۔ پرندے اڑائیں، بھرتے  
ٹھونسوں کو لوٹ رہے تھے اور مویشی اپنے گلے میں  
پڑی گھنٹیوں کو بجاتے اپنی اپنی پناہوں کی جانب دور  
سے نظر آتے کپے کے گھروں سے اٹھنے والا دھواں بتا  
ریا تھا کہ وہاں رات کے کھانے کی تیاری شروع ہو گئی  
تھی۔ وہی مخصوص اجلا پن، سدا کی اور تراوت جو دیر  
ماحول کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ ارباب گاڑی کے اندر کی فضا  
سے بے نیاز باہر کے مناظر میں گم تھی۔ ہوا کے سبک  
آتی کھیتوں کی خوشبو سانسوں میں اتارتے اسے یکایک  
ہی ایک عجیب سا احساس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے  
چونک کر اس نے اندر دیکھا وہ سیم بھائی شاید آس پاس  
کی زمینوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اس نے  
اپنے اندر اٹھتی بے چینی سے دامن چھڑا کر توجہ ان  
کی باتوں پر مرکوز کر دی مگر من میں رہ رہ کے ایک چہرے  
سی اٹھتی رہی۔  
وسیم بھائی نے زراعت کی تعلیم حاصل کی تھی اور

اب آپنی عظیم کا تمام تر فائدہ اپنی زمینوں کو پہنچانے  
ہوئے بڑی سنجیدگی سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے  
تھے۔ تاحد نگاہ تک پہلے سرسبز لہلہات کھیت جو ہر  
سال بہت شاندار فصل دیتے تھے ان کی ملکیت تھے  
اس کے علاوہ پھلوں کے باغ بھی تھے جن کے بہترین  
پھل منڈیوں میں منگے داموں بک کر ان کی آمدنی کو  
مزید چار چاند لگا دیتے تھے۔ ان کی مالی حیثیت اس گاؤں  
میں سب سے زیادہ مستحکم تھی جس کا احساس پھر ان  
کے لمحے میں بول رہا تھا۔ اصل حیرت انہیں تب ہوئی  
جب انہیں یہ پتا چلا کہ ان کے چھوٹے بھائی زعمین نے  
بھی آئی آر میں ماسٹر کرنے کے باوجود گاؤں میں رہنے  
اور زمینداری کرنے کو ہی ترجیح دی تھی۔

گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی مخصوص چل پہل  
نظر آنے لگی اور نزدیک ہی کسی مسجد سے مغرب کی  
اذان بلند ہوئی تھی۔ گھر کے سامنے جیب رکھتے ہی  
وسیم بھائی گاڑی سے اتر کر اندر لگے تھے پیچھے کسی  
کو آواز بھی دی تھی۔  
”اوئے مجید آکر یہ سالن اندر لے جا، میں نماز  
پڑھنے جا رہا ہوں۔“ پھر ان کی طرف کا دروازہ کھولتے  
ہوئے بولے۔

”اوئے۔ تم لوگ۔“ جیب کی آواز سن کر ہی شاید  
گھر سے کئی چھوٹے بڑے نیچے نکل کر  
اشتیاق بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔  
”یہ سارے نیچے آپ کے گھر کے ہیں؟“ ارفع نے  
کچھ حیرت سے آپنی سے سوال کیا۔

”ارے نہیں ہمارے گھر میں صمد کے علاوہ کوئی بچہ  
نہیں ہے۔ یہ تو آج ہماری وجہ سے اور تھوڑی دیر میں  
تباہ بھی آجائے گا۔ اسی لیے تانی اور ان کی بہو اور  
گلشوم خالہ آئی ہوئی ہیں۔ یہ انہی کے بچے ہیں اور کچھ  
آس پڑوس کے۔“ آپنی نے لمبی وضاحت دی ان کے  
گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ خبر اندر پہنچ گئی تھی  
کہ بھائی کے ساتھ دو کڑیاں بھی آئی ہیں اور اسی لیے  
اندر جاتے ہی عجیب سی ہلچل کا احساس ہوا۔  
”نی سامعہ تو نے بتایا نہیں تیری بہنیں بھی آ رہی

ہیں ساتھ۔“ ایک بھاری مگر نرم لہری رحمت والی  
خاتون نے مسکراتے ہوئے ارباب کو بڑے پر جوش انداز  
میں گلے لگایا اور آپنی سے مخاطب ہوئیں۔

”جی حاجی! بالکل آخری وقت میں بنائے ان کے  
آنے کا پروگرام۔“ بڑی عمر کی خاتونیں گلے لگاتے  
ہوئے ہاتھ پر بوسے دے رہی تھیں اور پر جوش  
لڑکیوں نے بھی معافہ جیسے خود پر فرض کر لیا تھا۔ خدا  
خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا تو انہیں صحن میں کچھی  
چارپائیوں بیٹھنے کی اجازت ملی تھی ارفع بے دہم سی  
ہوئی کر سی گئی اور ارباب تفصیل سے گھر کا جائزہ لینے لگی  
درو دیوار پر نیارنگ و روشن ہوا تھا۔ وسیع و عریض صحن  
جس میں دو بے حد گھٹے اور چھتدار درخت سر اٹھائے  
کھڑے تھے ایک طرف پھولدار پودوں کی کیاریاں  
تھیں دوسری طرف تنور لگا ہوا تھا جس سے اٹھتا  
دھواں اور دیوٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو پورے  
آنگن میں پھیلی ہوئی تھی صحن کے آگے بڑھا کر آگے  
تھا اور پھر لاتعداد کمرے تھوڑی ہی دیر میں ان کے لیے  
پیش کے گنگ سائز کلاسوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ٹھار کی آگئی  
ارباب نے تولی نہیں پتی تھی مگر ٹھکن اور پیاس کے  
مارے ایک ہی سانس میں آٹھا گلاس خالی کر ڈالا۔

”ست بسم اللہ آج تو بہت سوہنے لوگ آئے  
ہیں۔“ شفیق چہرے اور مہربان سی مسکراہٹ لیے آپنی  
کی ساس نے انہیں باری باری لپٹا کر ڈھیروں دعا میں  
دے ڈالیں۔ سونیا الگ انہیں دیکھ کر کھل گئی تھی۔  
دھان پان سی گندی رحمت والی سونیا کافی طنسار اور  
پر جوش لڑکی تھی۔

”بہت اچھا کیا جو آپ دونوں بھائی کے ساتھ آ  
گئیں۔ مجھے اتنا شوق تھا آپ سے ملنے کا بھائی بھی بڑی  
باتیں کرتی رہتی تھیں آپ لوگوں کی۔“ وہ ان کے  
ساتھ ہی آکر بیٹھ گئی بلکہ صرف ایک وہی نہیں دو تین  
لڑکیاں اور بھی پیاس آکر بہت کچھ بولنے کے لیے بے  
چین نظر آ رہی تھیں۔

”ہمیں خود بھی آپ سے ملنے کا شوق تھا کیونکہ آپنی  
ہم سے بھی اکثر آپ کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔“ ارفع  
اس کی ایکساٹمنٹ دیکھ کر مسکرائی۔

”میں نے ابھی سنا تھا آپ دونوں کو ساتھ  
لانے کے لیے مگر پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ پتا نہیں آپ  
آئیں گی بھی کہ نہیں بھائی نے بتایا تھا آپ کو گاؤں  
نہیں پسند۔“

”ارے اب ایسی بھی کوئی بات نہیں آپ نے  
اتنے خلوص سے بلایا تھا تو تم کیسے نہ آتے۔“ ارباب کو یہ  
ساہو سی لڑکی بہت اچھی لگی۔  
سونیا کا بھی تعارف شاید ابھی رہتا تھا جب  
اس کی اماں نے اسے ٹوکا تھا۔

”سونی! یہ باتیں بعد میں کرتی رہنا پہلے کڑیوں کو  
نہا دو لینے دو لباس کر کے آئی ہیں تھک گئی ہوں گی۔“  
”او، تم لوگ میرے ساتھ آ جاؤ۔“ اماں کی اس  
بات پر سامنے کی چارپائی پر نیم دراز آپنی جو ٹھکن اتار  
رہی تھیں۔ اٹھ بیٹھیں پھر وہ انہیں لے کر اپنے  
کمرے میں آگئیں۔ آپنی تو اپنے اور صمد کے کپڑے  
لے کر نکل گئی تھیں ارفع بیڈ ریلٹ کر رہا کہ کھینے لگی  
جے شاید پینے کے لیے ڈریس کا انتخاب کرنا مشکل ہو  
رہا تھا۔

”آگ میں وسیم بھائی کی اس اطلاع کو ٹوک نہ دیکھوں  
تو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنے بیڈ روم میں بیٹھی  
ہوں۔“ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد ارفع بولی تو  
وہ چونک گئی۔

”اچھا۔ اور ایسا لگنے سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟“  
اس نے سوالیہ انداز میں ارباب کو اچکائے۔  
”تھوڑا سا اطمینان۔“

”تمہیں اطمینان حاصل ہو بھی گیا اور مجھے آتے  
ہی عجیب سی بے چینی ہونے لگی ہے۔“  
”کیسی بے چینی۔“ ارفع حیران ہو گئی۔

”پتا نہیں۔“ وہ بولی سے بولی۔  
”شاید میری جھمی حس مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔“  
شاید میں کسی مشکل میں پڑنے والی ہوں۔“ ارباب خود  
بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔ اسے اچانک یہ کیا ہو گیا

”مشکل میں تو تم واقعی پڑنے والی ہو، یہاں



تمہارے آرجین کے شوز ہوں گے اور نہ تمہارے  
فیورٹ ڈرائے ممبر کر لوں پر پتھر کھ لو۔ " اس کا انداز  
مذاق اڑانے والا تھا۔

دی۔ کہہ کر اپنے کپڑے اٹھا کر ہاتھ روم کی طرف چل  
"ارے! تم ایسے کیوں بیٹھی ہو؟" آپی آوے گھٹنے  
بعد کمرے میں آئیں تو اسے دیکھ کر چونک گئیں۔  
"تو کیا کروں وہ جو کھس گئی ہے مجھ سے پہلے اب  
ایک گھنٹے تک تو مجھے وٹ کرنا ہی پڑے گا۔" اس نے  
بے زاری سے جواب دیا۔

"اچھا تم زعمیم کا واش روم یوز کر لو۔" آپی نے اپنے  
دیوار کا نام لیا اور وہ اچھل پڑی۔

"کیا؟ آپی بلز؟ کچھ تو ہوش سے کام لیں۔"  
"تو کیا ہوا اربا۔۔۔ وہ دن سا اپنے کمرے میں بیٹھا  
ہے۔ وہ لاہور گیا ہے آیا کو لانے، جب تک وہ آئے گا  
تب تک تو تم نکل بھی چلی ہو گی۔" آپی نے اس کے  
اعتراف کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

"اور جو وہ آگیا تو۔۔۔ ان کی بات پر بھی وہ اپنی جگہ  
سے نہیں ہلی۔

"تو میں کہہ دوں گی کہ میری بہن تمہارے کمرے  
میں ہے۔ اسی لیے ابھی وہاں کاغذ نہ کو۔ ویسے بھی تم  
کون سا پیشہ کے لیے اس کے کمرے پر قبضہ کرنے جا  
رہی ہو، ٹھوڑی دیر کی ہی تو بات ہے۔ زعمیم کا کمرہ بالکل  
الگ تھلک ہے، کوئی وہاں آتا جا نا نہیں اور زعمیم کے  
آنے کا تو فی الحال کوئی امکان ہی نہیں ہے چلو اٹھو۔"

آپی نے اطمینان دلاتے ہوئے بالا خرا سے اٹھایا۔  
وینے تو وہ جانتی تھیں کہ زعمیم اپنے کمرے کو لے کر تنہا  
پوز نہ تھا، کسی غیر متعلقہ فرد کی تو وہ اپنے کمرے میں  
چھپ چھاڑ بدداشت ہی نہیں کر سکتا تھا مگر یہاں بھی  
بات ان کی بہن کی تھی سو انہوں نے اس بات کو بالکل  
ہی پس پشت ڈال دیا۔ اپنا سوپ اور شیپو اٹھاتے ہوئے  
اربا مسلسل الجھ رہی تھی۔

پھر آپی کے کمرے کے عین مطابق خیریت رہی۔  
شاہرے لے کر نکلنے کے بعد اربا نے اس بات پر شکر ادا کیا  
کہ وہ بنا کسی شرمندگی کے نکل آئی تھی، کمرے سے

باہر آتے ہوئے اس کی نظر ملارا راوہی ہی بڈ کے بالکل اوپر  
دیوار پر لگی اس کی تصویر پر پڑی تھی اور وہ ٹھنک کر رک  
گئی نجانے کتنے ہی لمحے چپ چاپ سرک گئے۔ پھر  
آپی کی آواز پر ہی وہ چونکی تھی۔ بمشکل اس کی سیاہ  
چمکدار مسکرائی آنکھوں سے نظرس چرائی وہ باہر نکل۔  
کھانے کے دوران اہل بڑی محبت سے اصرار کر  
کے ایک ایک چیز کھلانے پر کمر بستہ تھیں۔ کھانے کے  
بعد دوسری لڑکیاں بھی غالباً "اپنے کلام ختم کر چکی تھیں  
اور اب ان کے گرد آگئی تھیں باتیں کرنے کے لیے  
کہ تب ہی باہر سے شور مارتھا۔

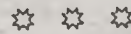
"گلتا ہے بھار زعمیم آگئے ہیں آپا کو لے کر۔" سونیا  
نے خیال ظاہر کیا اور زیدہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ  
کھڑی ہوئی۔ "میں دیکھ کے آؤں۔"

"بیٹھ جاؤ۔ اندر ہی آتا ہے ان لوگوں نے۔" سونیا  
نے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اسے بٹھالیا ایک بار اربا کا دل چاہا  
وہ بھی اٹھ جائے۔ اس کے بال بے حد لمبے اور گھٹنے  
تھے اور اب تو کیلے ہو کر اسے اور بھی ڈسٹرب کر رہے  
تھے۔ مگر وہ ارفع کی وجہ سے بیٹھی رہی۔

"گلتا ہے یہ لوگ اندر نہیں آنے والے۔ باہر ہی  
بیٹھ گئے ہیں۔" زیدہ شاید ان کے اندر آنے کے  
انتظار میں تھی اب باہر سے آتی آواز یہ کہنے لگی۔

"ہاں شاید۔" نانٹی نے سر ہلایا تو زیدہ مزید رکے بغیر  
باہر نکل گئی۔ اور اوپر اربا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
"کیا ہوا؟" ارفع نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میرے کیلے بال مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں انہیں  
سکھانے جا رہی ہوں۔" وہ دھیمے سے بولی تھی پھر بڑے  
کمرے سے نکل کر صحن کی طرف جانے کے بجائے  
جہاں دوسرے سرے پر وہ سب چارپائیوں پر بیٹھے  
باتیں کر رہے تھے۔ وہ آپی کے کمرے میں چلی آئی۔  
کیونکہ ان کا سامان ابھی تک یہیں رکھا ہوا تھا۔



صبح اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی، شاید یہ کل کے  
سفر کی تھکان کا اثر تھا۔ ورنہ وہ تو فجر کی پہلی آذان کے

ساتھ ہی بستر چھوڑ دیتا تھا۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے  
ہوئے اس نے سامنے دیوار گیر کھڑکی کی طرف دیکھا  
آنکھ بچ رہے تھے۔ یعنی آواہاں چڑھ آیا تھا۔ وہ بے  
اختیار اٹھ بیٹھا۔ کل رات تو اسے اتنی ٹھکن تھی کہ  
اہل کو اپنا چہرہ دکھاتے ہی وہ کمرے میں آکر بستر پر پڑ  
گیا کہ شاید لینے تک کی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔  
اس نے اٹھ کر الماری کھولی۔ اس کا استری شدہ  
سوٹ ہینک کیا رکھا تھا۔ کپڑے اٹھاتے ہوئے وہ واش  
روم کی طرف آیا اور پھر کچھ چونک سا گیا۔ اسے کچھ  
احساس ہوا تو تھا اور جلد ہی اسے اس کی وجہ بھی سمجھ  
میں آئی۔

اس کے نما کر نکلتے ہی بھابھی ناشتا لیے آگئی تھیں  
اور صبح جو ان کا دوش پکڑے کی بات پر ریس ریس کیے  
جا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی انہی تو کئی زبان میں چاچو کہتے  
ہوئے اس کے پیروں سے لپٹ گیا تھا۔

"آگیا میرا شیر۔" اس نے جھک کر اسے اٹھاتے  
ہوئے ہوا میں اچھالا اور وہ کھلکھلا اٹھا۔

"گلتا ہے کل رات بہت تھک گئے تھے۔ جیسی تو  
کسی سے سلام دعا کیے بغیر اپنے کمرے میں چلے آئے۔  
بھابھی نے ناشتے کی ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا وہ  
چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"لیکن میں۔ تو سب سے ملا تھا۔" انہیں بتاتے  
ہوئے اس نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی کہ کوئی  
رہ تو نہیں گیا۔ بھائی سے تو ذمہ پر ہی مل لیا تھا اور گھر  
میں سب استقبال کے لیے باہر ہی موجود تھے تو کون رہ  
گیا تھا۔

"شاید سونیا رہ گئی تھی۔" اس نے بھابھی کی طرف  
دیکھا اور وہ جھلا سی گئیں۔

"اوہو! میں صرف سونیا کی بات نہیں کر رہی،  
تمہارے جانے کے ٹھوڑی دیر بعد ارفع بھی آگئی تھی  
سلام کرنے مگر تم نہیں تھے۔"

"اچھا۔ آپ کی بہن آئی ہیں۔" ان کی بات  
سمجھتی ہی زعمیم کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"کوئی بات نہیں میں اب ان سے مل لوں گا اور

سلام دعا بھی کر لوں گا آپ مجھے یہ بتائیے میرے واش  
روم میں یہ شیپو کس کا ہے؟" اس نے وہ بات پوچھی  
جو کافی دیر سے اسے الجھا رہی۔

"شیپو! بھابھی نے کچھ حیرت سے دہرایا۔  
"شیپو کس کا ہو سکتا ہے بھلا۔" الناس سے  
پوچھتے وہ بہ بات قطعی بھول گئی تھیں کہ کل وہی تو اربا  
کو یہاں ملائی تھیں۔

"مجھے کیا پتا۔ میں تو یہاں تھا ہی نہیں۔" انہیں  
حیران دیکھ کر وہ اور بھی الجھ گیا۔

"اوہ! اچھا۔" انہیں اچانک یاد آیا۔  
"وہ اربا بھول گئی ہو گی۔"

"اربا۔" زعمیم نے زیر لب دہرایا۔  
"ہاں وہ بھی آئی ہے میرے ساتھ۔ خیر تم ناشتا کر لو

اس کے بعد باہر آؤ گے تو ان سے ملاقات ہو ہی جائے  
گی۔ آؤ صبح میں تمہیں چھینچ کر ادوں اک دن میں  
کپڑوں کا شہر کرواؤ۔"

"ویسے بھابھی۔ اس بار تب کی بہنوں کو کیا خیال آ  
گیا۔ ہمارے گاؤں کو رونق بخشنے کا۔" وہ کچھ حیرت  
سے دریافت کرنے لگا۔

"کل تمہارے بھائی نے یہ بات کہی تھی اور اب تم  
پوچھ رہے ہو۔" بھابی انہیں کیسے خیال آسکتا تھا میں ہی  
لے کر آئی ہوں انہیں۔ وہ بھی تقریباً زبردستی بتا نہیں  
انہیں گاؤں سے اس قدر ہیر کیوں ہے۔ جیسی بھی میں  
سوچتی ہوں اگر میری طرح ان میں سے بھی کسی کا  
نصیب کسی گاؤں والے سے جو گیا تب وہ کیا کریں گی۔  
وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔ زعمیم نے بغور  
ان کا چہرہ دیکھا۔

"ایڈ جسٹ کرنا پڑے گا پھر اور کیا کریں گی۔"  
کسی پر بیٹھتے ہوئے وہ بے ناز سی بولا۔

"ہاں! ایڈ جسٹ تو کریں گی مگر شاید خوش نہیں  
رہیں گی۔" "آپ تو خوش ہیں۔"

"میں تو بہت خوش ہوں۔" ان کی مطمئن سی ہنسی  
چھلکی تھی۔ وہ بھی مسکرایا۔

زیدہ ان کے لیے ناشتا لے آئی تھی۔ ارفع اپنے



بالوں میں پرش کر رہی تھی اور اربا اسی وقت منہ ہاتھ دھو کر آئی تھی۔

”اب تم بال بھی بناؤ گی۔“ اسے برش کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر ارفع کی آواز بلند ہوئی۔

”میں بال ناشتا بخند اہو رہا ہے۔“

”تو کر لو تم ناشتا۔ جب تک میں اپنے بال نہ سمیٹ لوں مجھے چمن نہیں آئے گا۔“ وہ جلدی جلدی بالوں میں برش چلانے لگی۔

”تو کس نے کہا ہے ناگن جیسی زلفیں رکھنے کو کسی دن سوتے میں تمہارے یہ بال کٹ ہی دوں گی دیکھ لیتا“ ارفع بری طرح چڑ گئی۔

”وہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا۔“ اس کے برعکس اربا اطمینان سے بولی تھی اور اب اپنے ریشمی بالوں کی چوٹی ہٹانے لگی۔

”آپ کی کہاں ہیں زبیدہ؟“ وہ زبیدہ سے مخاطب ہوئی جو کافی حیرت سے ان کے مکالمے سن رہی تھی۔

”وہ۔“ ابھی وہ جواب دینے بھی نہیں پائی تھی کہ اسی وقت آپلی چلی آئیں۔

”ماشاء اللہ بڑی لمبی عمر ہے آپ کی۔“ ارفع نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ آپلی اس کی بات پر دھیان دیے بغیر پیچھے مڑ کر کسی کو آواز دیتے ہوئے بولیں۔

”اندر آ جاؤ زعیم۔“ اربا نے یہ سنتے ہی جھپٹ کر بیڈ سے اٹھنا دوشہ اٹھایا اور شانوں پر پھیلا لیا۔ ارفع

الٹ ہو کر بیڈ پر آئی اور تب ہی وہ نظر آیا تھا۔ اپنے دروازے کے سبب قدرے جھک کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنے بھاری لب و لہجے میں سلام کیا اس نے اور

ارفع بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ دروازہ قامت اور مضبوط جسامت والے اس خوبصورت جوان کو دیکھ کر اسے

اچانک ہی شرم کی بات یاد آ گئی۔

”کیس اس کا اشارہ زعیم کی طرف ہی تو نہیں تھا۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

”زعیم! یہ ارفع ہے اور یہ اربا۔“ آپلی تعارف کروا رہی تھیں زعیم کی نظر ارفع سے ہوتی ہوئی اربا پر گئی

تھی اور پھر جیسے وہیں ٹھہر گئی صرف ایک لمحے کی بات تھی مگر اس ایک لمحے میں ہی اس کے ساتھ کچھ ہو گیا

جو اس سے پہلے اس کے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اربا بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں سے نظر ملتے ہی جو برق سی اس کے پورے وجود میں گونڈی تھی

اس نے اربا کو مزید اس کی آنکھوں میں دیکھنے نہیں دیا۔ وہ بے اختیار نگاہیں جھکا گئی۔ زعیم کو اپنے آپ میں آتے صرف ایک پل لگا۔ اس بے حد تیز سی

مدت میں ان کے ساتھ کیا واردات ہو گئی تھی۔ اس کی کمرے میں موجود باری نفوس کو خبر تک نہیں تھی۔

”خوش آمدید ہمارے گھر میں اور گاؤں میں، ایسا لگا

آپ کو۔“ وہ ارفع سے مخاطب ہوا۔

”کیا گاؤں گھر یا لوگ۔“ ارفع نے اٹھا اسی سے پوچھ لیا کچھ شرر سے لہجے میں زبیدہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

”چلیے لوگوں کے بارے میں ہی بتا دیجیے۔“ وہ مسکرا دیا اس کے انداز پر ارفع دل ہی دل میں اس کی دلکش مسکراہٹ کی معترف ہو گئی۔

”ابھی لوگوں سے واسطہ ہی کہاں پڑا ہے جو میں لوگوں کے بارے میں بتاؤں۔“ وہ بے نیازی سے بولی تو

زعیم کی سیاہ آنکھیں حیرت سے چمیل گئیں۔

”کمال ہے اتنے مضبوط تعلق کے پڑ جانے کے بعد بھی کسی اور واسطے کی ضرورت نہ جاتی ہے بھابھی

سن رہی ہیں آپ اپنی بہن کی باتیں انہوں نے تو ہمیں شرمندہ ہی کر دیا۔“ وہ مصنوعی تاسف سے بولا تو ارفع گڑبھا گئی۔

”شاید اس واسطے کی بات کر رہی ہے جو اس کا براہ راست کسی سے پڑے گا۔“ آپلی کی اس بات پر تو وہ

مزید جھل ہو گئی۔

”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں سمجھی شاید۔“ اس نے کہتے کہتے زعیم کی طرف دیکھا اور پھر ہنس پڑا۔

”آپ نے تو مجھے کھنڈو ڈھکی کر دیا۔ خیر آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھے نا۔“ اسے اچانک ہی خیال آیا تب ہی زبیدہ جو کم سمی کھڑی تھی۔ جلدی سے ایک

مڑھڑا زعیم کے قریب رکھ دیا۔ مگر وہ کھڑائی رہا۔

”مجھے اپنے کسی کام سے جانا ہے۔ میں بس آپ لوگوں سے ملنے آیا تھا۔ کل رات تو ملاقات ہو نہیں

پائی تھی۔ آپ لوگ غالباً ناشتا کر رہے تھے۔ میں نے ڈشرب کر دیا۔“ اس کی نظریں ناشتے کے لوازمات پر پڑیں تو ہنسا اٹھا۔

”میں چلتا ہوں۔ آپ لوگ ناشتا کیجیے۔“ وہ

پلٹ کر آئے کو تھا جانب ارفع بول اٹھی۔

”ہمیں اپنے گاؤں کی سیر ضرور کرائیے گا۔“

”ضرور۔“ ہنسا کر کہتے اس کی نظریں ایک بار پھر

اس کی جانب اٹھیں۔ دل میں پھونتی چنگاریوں سے شاید کوئی چنگاری آنکھوں ہی آنکھوں سے اس کے دل کو بھی جھونک گئی تھی۔ جیسی تو اس کے چہرے پر گلال بکھرا

تھا اور پلکیں لرزنے لگی تھیں۔ زعیم وہاں سے نکل آیا تھا مگر آتے ہوئے اپنی سب سے قیمتی چیز وہیں چھوڑ آیا تھا۔

بیری کے کھنے درخت کی چھاؤں میں وہ سب ایک ہی چارپائی میں بیٹھی تھیں۔ نہ جانے کیا باتیں ہو رہی

تھیں مگر برآمدے میں چاچی سے اپنے بالوں میں تیل

لگوانی اربا کے کانوں تک وقتاً فوقتاً ”کوئج اٹھنے والی

ان کی ہنسی ضرور پہنچ رہی تھی ارفع اپنے دوستانہ مزاج کے سبب بہت جلد ان سب سے کھل گئی تھی مگر

اربا کا تکلف ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔ آپا بھی پاس ہی بیٹھی جاتی ہے نہ جانے کدھر کدھر کے قصے چھیڑے ہوئے تھیں۔ وہ خاموشی سے محسن میں دوڑتے کھیلنے

بچوں کو دیکھنے لگی۔ آپا کے بیٹے شاید کہیں سے کوئی مینڈک پکڑ لائے تھے اور اب عمر کو اس سے ڈرا رہے

تھے وہ پہلے تو برجوش تھا اور اب خوف زدہ ہو کر چلانے لگا تھا۔ اسی وقت آپلی ٹرے میں لسی کے گلاس لیے چلی

آئیں۔

”تمہارے لیے چائے لا رہی ہوں اربا۔“ آپا اور چاچی کو گلاس پکڑا کے وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

”نہیں آپلی۔ مجھے بھی لسی ہی دے دیجیے۔“ وہ بولی تو آپلی نے کچھ حیران سا ہو کر اسے دیکھا وہ خواخواہ

ہی پٹپٹائی۔

”اچھا لے آتی ہوں نہ تم لسی نہیں چیتیں اس لیے میں نے۔“ آپلی کی نظر صبر پر پڑی تو بات اور صوری

چھوڑ کر چلا اٹھیں۔

”اف خدایا! احم۔ یہ کیا کیا تم نے۔“ اس کے سفید کپڑے مٹی میں لت پت ہو کر اپنی اصل رنگت کھو چکے تھے۔ آپلی کی ڈانٹ سے مشابہہ بیچ پر وہ ہراساں

ہو گیا۔

”یہ صبح سے تیسرا سوٹ ہے جو میں چینج کروا چکی

ہوں۔ کما تھا نا میں نے مٹی میں مت کھینا۔ پھر کیوں کیا کپڑوں کا یہ حال۔“ انہوں نے کڑے لہجے

میں دریافت کیا تھا۔ صبر روی پڑا۔

”حد کر دی ہے سامعہ۔ اتنا ڈانٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ صفائی کا خط تمہیں ہے۔ وہ تو بچہ ہے کھیلے گا تو

کپڑے گندے ہو ہی جائیں گے۔ کون کتا ہے تمہیں دن میں تین تین بار کپڑے بدلوانے کو۔“ آپا غصہ ہو لکھیں جیسے کی روفی صورت دیکھ کر اربا نے اسے

پاس آنے کا اشارہ کیا تو وہ روتا ہوا اس کے پاس دوڑا چلا آیا۔

”اتنی بار کپڑے چینج نہ کراؤں تو کہیں سے یہ انسان کا بچہ لگے ہی نہیں۔ جتنا شام مخ کرنی ہوں اتنا

ہی یہ مٹی میں لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے۔“ وہ دبی دبی

ناگوار سے بولیں۔ یہ کیا محسن تو ان کے لیے دوسرے

بن گیا تھا۔ جب صبر چھوڑنا تھا تب اسے مٹی کھانے کی

لت پڑی گئی تھی اور اب کھیلنے کی یہ آپلی کی نفاست پسند طبیعت ہی تھی کہ ہر وقت صبر کی شامت آتی رہتی تھی۔

”محسن پنڈتہ کروا لیں تو مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔“

صبر کے آنسو صاف کرتے ہوئے اربا نے دھیرے سے کہا۔

”اور اس کے لیے اہل کو منائے کون۔“ انہیں تو آج تک اس گھر کے بچے درو دیوار قلق میں مبتلا کیے

رہتے ہیں کجا کہ ان کے سامنے محسن پنڈتہ کرنے کی بات کی جائے۔“ آپا نے جواب دیا۔



”پچھلے سال و سیم نے اور دو تین کمرے ڈالوانے کی بات کی تھی اور پچانواز نے بھی تاکید کی مگر اس پر اتنا ناراض ہوئیں کہ اللہ ان سے۔ حالانکہ ایسے شادی کے موقع پر جتنا بڑا ہمارا خاندان ہے۔ مہمانوں کو ٹھہرانے کا مسئلہ تو ہو ہی جاتا ہے ابھی تو خیر سے زعمیم کی شادی بھی ہوئی ہے۔ مگر مال کی وہی ایک رٹ کہ جتنی تبدیلیاں اس گھر میں ہوئی ہیں۔ اب مزید کوئی تبدیلی وہ برداشت نہیں کرنے والیں۔“ تا شاید خاصی ٹالیں انھیں اپنی مال کی قدامت پرست طبیعت سے اربا کو حیرت ہوئی اتنا بڑا گھر تو تھا کیا اس کے باوجود مہمانوں کو ٹھہرانے کا کوئی مسئلہ ہو سکتا تھا وہ صرف یہ سوچ کر رہ گئی۔

آبی صبر کے چلانے کی پروا کیے بغیر اسے نسلانے لے گئی تھیں۔ مگر جاتے ہوئے تاہی کے ہاتھ اس کے لیے لسی کا گلاس ضرور بھجوا دیا تھا۔ وہ سیدھی ہو کر اپنے بال سینے لگی۔ تب ہی بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی تھی۔ اور پھر اس کی بھاری آواز۔

”بھابھی کہاں ہیں؟“  
”وہ تو کاکو کے نسلانے لے گئی ہے۔ کوئی کام تھا پتر۔“ چاچی نے پوچھا۔  
”ہاں وہ مہمان آئے ہیں ساتھ والے گاؤں سے“  
زرا چائے پانی کا انتظام کر لیں۔“ اربا اور نہیں دیکھ رہی تھی مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسی ہی دیکھ رہا ہو۔

”وہ زبیدہ کر لے گی۔ زبیدہ! اپنی کھی کھی بند کر اور ادھر آکر چائے پانی دیکھ لے۔ مہمان آئے ہیں۔“  
انہوں نے زبیدہ کو پکارا تھا۔ زبیدہ میں یہ سنتے ہی جیسے چالی بھر گئی تھی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر اس طرف چلی آئی۔

”کیا بتاؤں۔ چائے یا شربت۔“ وہ زعمیم سے پوچھ رہی تھی۔ زعمیم متذبذب سا ہو گیا۔  
”بھابھی یہاں لیں تو اچھا ہوتا۔“

”کیوں نہیں اچھی چائے نہیں بتائی۔“ وہ خفاسی ہو گئی۔ ہاتھ غیر ارادی طور پر پراندے میں الجھنے لگے۔

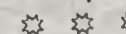
”سچ کہوں تو نہیں۔“ اس نے صاف کوئی سے کہا۔  
اربانے سر اٹھا کر اسے دیکھا وائٹ کائین کے قیص شلوار میں اس کی شاندار شخصیت کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی۔ گندی پیشانی پر بکھرے اس کے سیاہ جھیلے بال۔ مغزور سی ناگ اور بو جھل بو جھل سی اس کی گہری ساگر آنکھیں اس سے پہلے کہ یہ آنکھیں ایک بار پھر اس پر اٹھیں اربانے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

”دیکھ لیں بے بے انہیں تو میرے ہاتھ کی چائے پسندی نہیں اپنے ابوئیں ہی مجھے اٹھارہ۔“  
”چلنی۔ زیادہ خرے نہ کرو شانہ بنانے کی تو کے پسند آئے گا دودھ اور تیز ذال کے اچھی سی چائے بنالے جا۔“ چاچی نے اس کے شکوے پر دھیان دے کر بغیر گھر کا تھا۔ وہ منہ بنائے بیٹھے گئی۔

”ٹھیک ہے نہیں مجید کو بھیج دوں گا اور ایسا نہ ہو کہ صرف چائے بنا کر ہی جان چمڑا لیں۔“  
”فکر نہ کریں۔ میں حلوے بھی بنادوں گی۔“ زبیدہ اسے تسلی دے کر چکن کی طرف بڑھ گئی۔

”تپا! آپ بھی جا کر دیکھ لیں پلیز۔ میرے دوستوں کو جلدی ہے زیادہ دیر نہیں ٹھہرس گے۔“ زعمیم نے آپا کی طرف دیکھ کر کہا۔ مگر پھر اس کی نظر پلٹ نہیں سکی۔ وہ تپا کے ساتھ ہی تو بیٹھی تھی اسے نظر انداز کرنا نامکن ہی نہیں تھا۔ اربا جو پہلے ہی اس کو دیکھ رہی تھی۔ نظروں کے اس اچانک تصادم پر گھبرا سی تھی۔ وہ چند لمبے اسے دیکھتا رہا۔ پھر نکایک ہی گھٹی موچھوں تلے اس کے لبوں پر دلی دلی مسکراہٹ در آئی تھی۔ دوسرے ہی پل وہ جانے کے لیے پلٹ گیا اور ادھر اربا حیران رہ گئی۔

”یہ مجھے دیکھ کر مسکرایا کیوں؟“ وہ الجھ رہی تھی۔ اسی وقت تپا کا مینا دوڑتا ہوا آکر اس سے ٹکرایا اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا تھا۔ برآمدے کے فرش پر پھیلتی لسی دیکھ کر اسے لمحہ بھر کو افسوس ہوا اور تب ہی اسے اچانک زعمیم کی مسکراہٹ کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس کا چہرہ آپ ہی آپ خجالت سے سرخ پڑ گیا۔



مع صافق کے ہلکے سے دھندلے میں، صحن میں ایک طرف جہاں پختہ اینٹوں سے بنے برتن وغیرہ دھونے کے لیے ایک جگہ بتائی گئی تھی۔ ارفع جھکی نماز کے لیے وضو کر رہی تھی زعمیم اسی وقت مسجد سے لوٹا تھا اور اسے دیکھ کر اس کے ہاتھ کی بابت دریافت کرنے لگا۔

”نا ہے آپ کا ہاتھ جل گیا ہے۔“  
”آپ ہاتھ کی جلن کا پوچھ رہے ہیں۔ میرا تو کلیجہ جلا دیا ہے کل شام سے انہوں نے طعنے دے دے کر“  
ارفع فوراً ہی بول اٹھی اپنے بے تکلف انداز میں۔

”کون کس کی بات کر رہی ہیں۔“ زعمیم الجھ گیا۔  
”آپنی اور اربا۔ اور کون؟“ اس نے منہ بنا کر بتایا۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی جو میں نے اربا کے سامنے یہ کہہ دیا کہ میں تنور میں روٹیاں بنانا چاہ رہی ہوں۔ اس نے یہ سنتے ہی مجھے دے دیا پتھنچ اور بس اسی چکر میں میں نے اپنے ہاتھ کا یہ حال کر دیا۔ پہلے میں نے سوچا تھا خالہ سے دودھ دوتا بھی سیکھوں گی مگر ہاتھ کے جلنے کے بعد اب دو لٹیاں کھانے کی ہمت نہیں رہی بس جی بن گئی میں دسی کرل۔“ ارفع کا انداز ایسا تھا کہ زعمیم کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ اُٹھ آئی۔

”آپ یہ سب کیوں سیکھنا چاہ رہی ہیں۔ یہ تو آپ کی بہن کو سیکھنا چاہیے۔“ دوسرا جملہ اس نے دل میں سوچا تھا۔

”آج آپ جلدی جاگ گئیں یا یہ بھی سیکھنے سکھانے کا ہی کوئی سلسلہ ہے۔“

”ارے کہاں! اربانے ہی جگما ہے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے کہ اٹھ کے رسات کی سویر دیکھ لو دیکھ لیجئے گا خود نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ بستر میں گھس جائے گی اور میں۔ اف دیر ہو گئی۔“ اسے اچانک ہی احساس ہوا تھا۔ روشنی پھیلنے لگی تھی۔

”میں نے شیطان بن کر آپ کی راہ کھٹی کر دی۔“  
زعمیم نے ہنس کر کہا۔

”کوئی بات نہیں میرا وضو تو بس پانچ منٹ میں ہو جائے گا۔“

”آپ کے لیے ناشتالے آؤں؟“ زبیدہ جو مرغیوں اور ان کے چوزوں کو باہر کی راہ دکھانے کے بعد بلا مقصد ہی ادھر ادھر نکل رہی تھی زعمیم سے پوچھنے لگی۔

”اہاں کے کمرے میں لے آؤ۔ میں انہی کے ساتھ ناشتا کروں گا۔“ زعمیم نے کہا۔

”یہ زبیدہ دیکھتے ہی اتنی ہی مستعد ہے یا پھر زعمیم کو دیکھ کر ہی ایسی ہو جاتی ہے۔“ ارفع نے اسے دیکھ کر چند لمحے سوچا پھر سر جھٹک کر وضو کرنے لگی۔

”سامعہ! بچیوں نے ناشتا کر لیا؟“ وہ اہاں کے پاس ہی بیٹھا تھا جب بھابھی کے ناشتالانے پر انہوں نے پوچھا۔

”نہیں اہاں! ارفع تو نماز پڑھ رہی ہے اور اربا پھر سے سو گئی ہے۔“

”ہں۔۔۔ پھر سے سو گئی۔“ اہاں کو حیرت ہوئی۔ زعمیم کے ہونٹوں پر مہم سی مسکراہٹ آگئی ارفع نے بھی کچھ ایسا ہی کہا تھا۔

”یہ اربا تو پاگل ہے پیند کے پیچھے کوئی اسے جگانے نہ جائے تو یہ سارا دن سوئی ہی رہے۔“

”چھوٹی کر بڑی؟“ اہاں ان کے ناموں میں گزرد کر جاتی تھیں اکثر وہ ارفع کو اربا اور اربا کو ارفع کہہ کر پکار لیتی تھیں۔

”چھوٹی اہاں۔۔۔ بڑی ارفع ہے۔“ بھابھی نے بتایا حالانکہ وہ جانتی تھیں تھوڑی دیر بعد اہاں نے پھر سب بھول جانا ہے۔

”حسنہ سے کہہ وہ بھی ادھر ہی آکر ناشتا کر لے۔“ اہاں نے انہیں تاکید کی تو وہ سر ہلا کر ہار نکل گئیں۔ پھر آبا بھی آگئیں اور بیٹھتی ہی انہوں نے جو موضوع پھیرا زعمیم کی حیات بے وار ہو گئی تھیں۔

”اہاں! لڑکی تو گھر ہی کی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کیوں نہ۔۔۔ سو نیا کی شادی میں لگے ہاتھوں ہم زعمیم کی متفکری بھی کر دیں کیا خیال ہے آپ کا؟“ زعمیم



کئی مٹکی کی بات کر کے وہ اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے اہل کا خیال جانتا چاہا رہی تھیں۔ وہ حیرت زدہ سا انہیں دیکھتا رہا۔

”خیال تو چنگا ہے۔ پھر پہلے اس سے تو پوچھ لو۔ یہ جو بیٹا ہے لاث صاحب۔“ اہل کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

”کس لڑکی کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ وہ کشادہ پیشانی پر شکنیں ڈالے انہیں دیکھنے لگا۔

”زیدہ کو اور کس کی؟“ آپا کو اس کے انجان بننے پر حیرت ہوئی اور اس نے چاہتے ہوئے بھی غصہ آگیا۔

”کیا مصیبت ہے۔ جب میں ایکسبار آپ لوگوں کو اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں پھر کیوں بار بار بحث چھیڑی جاتی ہے۔“

”دیکھ لیا اس کے انہی تیوروں کے آگے تو میں چپ رہ جاتی ہوں۔“ اہل آپا کو مخاطب کر کے ناگواری سے بولیں۔

”پھر کیوں لیتی ہیں آپ زیدہ کا نام۔“ زعیم نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

”کیونکہ گھر کی بچی ہے۔ ہماری دیکھی بھائی ہے۔ بے چارے بھائی نواز نے تو کبھی منہ سے بھاپ نہیں نکالی مگر زینحہ تو شروع سے ہی اس لگائے بیٹھی ہے۔“

ان کے لہجے میں ہلکا سا مساف تھا۔

”آپ کو مجھ سے پوچھتے بغیر انہیں کوئی آس نہیں دلائی چاہیے تھی۔“

”لو اور دوسو۔ کیوں نہ دلائی میں انہیں آس مجھے تو ہمیشہ ہی زیدہ بڑی پیاری لگی ہے کل کلاں کو کوئی اور رشتہ ڈال جا تا تو ہاتھ تو میں نے ہی لئے تھے۔ مجھے کیا پتا تھا سولہ جماعتیں پڑھ کے تیرا دلغ آسمان تے چڑھ جائے گا۔“ انہیں اور غصہ آگیا۔

”ایسی بات نہیں ہے اہل۔ آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں۔“ وہ زنج ہو گیا۔ آپا یہ موضوع چھیڑ کر اطمینان سے ناشتا کرنے لگی تھیں اور یہاں زعیم کی جان بچھڑ گئی تھی۔

”تو پھر کیا بات ہے“ ناجتا خرابی کیا ہے زیدہ میں

صرف یہ کہ وہ بڑھی لکھی نہیں ہے پھر تو اس پنڈ کی کوئی بھی کڑی تیرے پاسے کی نہیں ہو گی میں کہیں سے ڈھونڈوں کی تیرے لیے ایسی سوہنی دوہنی جو بڑھی لکھی بھی ہو۔“ وہ ناراضی بھرے لہجے میں دریافت کرنے لگیں۔

”آپ کو ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے اہل اس نے اپنے لیے کوئی دیکھ ہی لی ہو گی جیسی تو اتنے شدید سے انکار کیے جا رہا ہے۔“ چائے کی چسکیں لیتے آپا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”خدا کے لیے آپا کم از کم آپ تو مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے میں نے زیدہ کے بارے میں کبھی اس طرح سے نہیں سوچا میرے اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے اور پھر۔۔۔ وہ مجھے ہمیشہ سونیا کی طرح لگی ہے۔“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے انہیں اپنی بات سمجھائے۔

”وہ تو پھر بھی تمہارے ساتھ اس گھر میں پلی بڑھی ہے۔ تمہارا مزاج بخوبی سمجھتی ہے۔ مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ جو انجان لڑکی تمہاری زندگی میں آئے گی۔ اسے بھی تمہارے مزاج سے آشنا ہو۔“ آپا نے نکتہ اٹھایا تھا وہ چند لمحے انہیں دیکھا رہا پھر قدرے توقف سے بولا۔

”آپ سے کس نے کہا میں کسی انجان“ ان دیکھی لڑکی سے شادی کروں گا۔“ آپا کا ایک ہی چونک کر بغور اسے دیکھنے لگیں۔

”تو لگتا ہے۔ واقعی تم نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے۔ شہر کی ہے یا بیس کی؟“

”شہر ہی ہو گی اسی لیے تو آئے دن دھڑکی رہتی ہے شہر کی طرف۔“ اہل بے زاری بولیں اور وہ جو کالی دیر سے ضبط کیے ہوئے تھا۔ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ لوگوں کو سمجھانے سے بہتر ہے۔ انسان دیواروں سے سر پھوڑ لے۔“ تلخ لہجے میں کہہ کر وہ ناشتا کے بغیر ہی کمرے سے نکل گیا۔ اہل اسے آوازیں دیتی رہ گئیں۔

”سوچ رہی ہوں زینحہ سے بات صاف کر ہی لوں۔“

اہل سوچ رہا تھا انداز میں بولیں تو آپا چونک گئیں۔

”مرضی ہے آپ کی ویسے بھی زعیم جیسے اوکے بندے کے ساتھ زبردستی تو کی نہیں جا سکتی دیکھ ہی لیا آپ نے کتنا غصہ ہو کر کیا ہے۔ چاہی کو جان کر دیکھ تو ہو گا مگر ہر حال یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔“ آپا نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ اہل سر ہلا کر رہ گئیں۔

”اف کتنی گرمی ہے۔ سورج نے شاید آج ہی اپنی تمام تر تپش ہم پر برساتنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔“ اس نے اپنے لان کے دوپٹے سے اپنا ہینڈ پوچھتے ہوئے کہہ رہی تھی آج وہ سونیا، زیدہ اور ناجتا کے سنگ گاؤں کی سیر کو نکل آئی تھی۔ حالانکہ ناجتا نے کہا بھی۔

”دوپر میں کچھ زیادہ ہی گرمی ہوئی ہے صبح میں چلیں گے۔“ مگر اس نے بے فکری سے اس کی بات اڑا دی اور اب اسے اپنا فیصلہ احقانہ گلنے کے ساتھ ساتھ سفاکانہ بھی لگ رہا تھا کیونکہ اس کے ساتھ وہ تینوں بھی تہتے ہوئے چروں کے ساتھ سورج کی یہ ناراضی جھیلنے پر مجبور تھیں۔ البتہ اربانے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ اس گرمی میں نکل کر تیار ہونے کا ریسک نہیں لے سکتی۔ سونیا کے آنے پر بھی آپا اور چاچی نے بڑا شور مچایا کہ دو دن بعد اس کی شادی ہے اور یہ پورے پنڈ میں اس طرح لور لور پھرے گی تو لوگ کیا کہیں گے مگر اس نے اس کی سائیڈ لی اور پھر اہل کی حمایت بھی شامل ہوئی تو انہیں چپ ہونا پڑا تھا۔

سنسان سی دوپہر گاؤں کے کلی کچوں کو گرما رہی تھی۔ سر پر روٹی کی چٹکیں رکھے کھیتوں سے واپس آئی جفا کشی مزارعوں کی عورتیں جب انہیں دیکھتیں تو آنکھوں میں خلوص کی چمک ابھر آتی۔ پھر وہ چند لمحے رک کر ان سے بات چیت ضرور کرتیں گاؤں کے واحد سیکنڈری اسکول کی چھٹی کی چھٹی بج چکی تھی اور بچے جیسے کسی قید سے رہائی پاتے اچھلتے کودتے گھروں کو پہنچنے کی جلدی میں تھے۔

”ہائے اللہ کی! ابیس آپ کو لوی نہ لگ جائے۔“ سونیا اس کے سر پر تیرے کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

”ڈونٹ وری۔ میں ٹھیک ہوں۔“ آپا تو اسے اپنی حماقت بھائی ہی تھی۔

”فکر نہ کریں۔ کچھ ہی دیر میں ہم ندی کے پاس پہنچنے والے ہیں۔ وہاں تو گرمی کا نام و نشان تک نہیں ہو گا۔“ ناجتا میں ناچتی کہہ رہی تھی یا پھر یہ اسے تسلی دینے کی ایک کوشش تھی۔

وہ لوگ گاؤں کی حدود سے نکل آئے تھے اور اب دور دور تک گندم کے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ زمین کے سینے پر بھر اسنو سنہری رنگ کا خوب صورت امتزاج جو آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا ہواؤں میں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی گرم مگر تیز ہوا جب گندم کی سنہری بیلوں پر ٹکرتی تو تاحہ نگاہ تک کھیتوں میں اٹھنے والی ہر نگاہ مبہوت کر دیتی۔

”کاش میں کیمرہ ہی لے آتی۔“ وہ یہ منظر دیکھ کر دم بخود تھی۔

”لو ان کھیتوں میں ایسا کیا ہے جو آپ نے ان کی فوٹو کھینچی تھی۔“ ناجتا کے لیے یہ منظر نیا نہیں تھا اس لیے کچھ بے زاری سے بولی۔ اس کھیت سے کچھ ہی آگے آنے کے بعد انہیں زعیم نظر آگیا۔ جس کھیت میں وہ کھڑا تھا وہاں کٹائی کا کام زوروں پر تھا۔ اور وہ مزارعوں کے ساتھ۔ گفت و شنید میں مصروف تھا گرمی نے شاید اس پر بھی برا اثر کیا تھا جیسی تو گرہاں کے اوپری دوپٹن کھولے آستینیں کمنیوں تک فولڈ کیے کھڑا تھا۔ اس کی گندمی رنگت دھوپ کی شدت سے سرخ ہو رہی تھی اور کپٹیوں پر پسینے کی دھاریں یوں بہہ رہی تھیں گویا پانی۔

”ہوں۔۔۔ تصویر کھینچنے کا اصل موقع تو اب آیا ہے۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے زرب لب مسکراتی۔ اس نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ اس کیسے ٹھوڑی ہی دیر میں ان کے پاس چلا آیا۔

”اس سے پہلے کہ آپ حیران ہوں اور میری داغی حالت پر شبہ کریں۔ میں آپ کو بتا دوں کہ میری طبیعت کے بے صبرے بن نے میرے ساتھ انہیں بھی اس جلتی دھیر میں جلتے پھننے پر مجبور کر دیا ہے اور



اب میں واجبی بہت پسیمان ہوں۔" اس کے قریب آتے ہی ارفع کی زبان چل پڑی۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

زیدہ نے اس لمحے بہت چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"آپ کو پسیمان ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ گرمی کا اثر تو ابھی کچھ ہی دیر میں زائل ہو جائے گا اور ان کے لیے آپ پریشان نہ ہوں یہ گاؤں کے لوگ ہیں عادی ہیں اس گرمی کے کیوں؟" اس نے گویا ان سے تائید چاہی۔

"اور نہیں تو کیا۔۔۔ مجھے تو ان کی فکر ہو رہی تھی۔ پہلی بار ہمارے گاؤں آئی ہیں کہیں بیمار ہی نہ پڑ جائیں۔" سونیا جھٹ بولی تو ارفع نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بے فکر ہو تمہاری شادی سے پہلے تو میں بیمار ہرگز نہیں پڑوں گی۔" سونیا بے تحاشا جھینپ گئی بھائی کے سامنے ایسی بات پر۔

"اربا نہیں آئیں آپ کے ساتھ؟" زعیم کا دل جس چہرے کو دیکھنے کا متنی تھا وہ نظر نہیں آیا تو مجھ سا گیا۔

"نہیں خود کو صحیح العمل ثابت کرنے کے لیے اس نے اس گرمی میں نکلنے سے صاف منع کر دیا۔" ارفع بولی تھی۔

"یعنی کافی نازک مزاج ہے آپ کی بہن۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"ہاں وہ تو ہے۔ لیکن اصل میں اسے شروع سے ہی بکری پرانہم ہے بہت زیادہ گرمی ہو تو وہ برداشت نہیں کر پاتی۔۔۔ بیمار پڑ جاتی ہے۔" اب کے ارفع نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تو ہو گا ہی۔" اس کے تصور میں اس کا نرم و نازک دلکش سر ہل رہا تو سیاہ آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی۔

"آپ لوگ آئیں میرے ساتھ۔" اسے یک بیک ہی احساس ہوا کہ وہ آگ اگلے سورج کے عین نیچے کھڑے تھے۔

زعیم کی ہر لہری میں وہ بلوغت آنے تو فضا میں ہر سو

پھیلی گئی آسمان کی مہک نے ان کا استقبال کیا بیڑوں کی ٹھنڈک اور نہایت بے لگہ بھر میں ان کے دل و دماغ کو تراوٹ بخش دی تھی وہاں موجود ایک ادھیڑ عمر شخص جو شاید یہاں کار کھولا تھا۔ زعیم کو دیکھتے ہی اس طرف چلا آیا۔

"مسلم زعیم بہتر۔۔۔ پروپے آئے ہیں۔"

"جی چاچا۔۔۔ ہمارے شہری مہمان ہیں۔ آپ ذرا طافوے کہہ کر شہرت کا انتظام تو کر دیا۔"

"آہو جی۔۔۔ ابھی کروا تا ہوں۔ آج تو گرمی بھی غضب کی پڑ رہی ہے۔" وہ موسم پر تبصرہ کرتے چلے گئے تو ارفع نے زعیم کی طرف دیکھا۔

"بہت خوب صورت جگہ ہے میں اپنی زندگی میں پہلی بار آم کا باغ دیکھ رہی ہوں اور شاید آخری بار بھی۔"

"کیوں۔۔۔ آخری بار کیوں؟" زعیم چونک گیا۔

تھوڑی دیر پہلے ندی کے ٹھنڈے پانی سے منہ دھوتے ہوئے اس نے اپنے گیلے ہاتھ بالوں میں پھیرے تھے اور اب اس کا گریبان بھی تر ہو رہا تھا۔

"نکل کس نے دیکھا ہے۔ کیا پتا دوبارہ میرا یہاں آنا ہونہ ہو۔" کچھ بے نیازی سے کہتی وہ ناچی اور سونیا کی تلاش میں نگاہیں اوپر اوپر دوڑانے لگی۔ مگر وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں جبکہ زیدہ پاس ہی ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

"یہ تو آپ پر ہے۔ آپ یہاں آنا چاہیں گی تو ہم سو بار بسم اللہ کہیں گے۔" وہ ہنسا۔

"نہیں" تفریح کے لیے تو ایک بار ہی کافی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ دوبارہ آنے کی نوبت آئے گی۔"

"اور جو آنے کی صورت بن گئی تو۔" بے اختیار زعیم کے لبوں سے پھسلا۔

"میں نے کہا نا کوئی چانس نہیں۔" وہ ہنس کر بولی اس کا اتنا قطعیت بھرا انداز دیکھ کر زعیم چاہ کر بھی یہ نہ پوچھ سکا۔

"دیکھا اربا ابھی گاؤں سے اتنی ہی الرجک ہے جتنی کہ آپ۔"

"مجھے تو آپ پر بھی حیرت ہوتی ہے زعیم آپ

اتنے بڑھے لکھے ہیں کہ شہریں کوئی بھی اچھی جانب با آسانی آپ کو مل سکتی ہے۔ آپ بہت آسان زندگی گزار سکتے ہیں۔ شہر اور گاؤں کا فرق تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہو گا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔" اپنی بات کر کے ارفع نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ نئی میں سر ملاتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں؟"

"جب میں نے وسیع بھائی کے بارے میں سنا تھا۔ مجھے تب بھی بہت حیرت ہوئی تھی۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ وہ اپنے گھر کے بڑے بیٹے ہیں۔ اپنی خاندانی زمینوں کی دیکھ بھال کرنا ان کی ذمہ داری ہے، ان کی مجبوری بھی ہے مگر زعیم۔ آپ نے تو مجھے ششدر کر دیا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اپنے گاؤں اور زمینوں سے دور نہ جانے کا فیصلہ آپ نے کسی مجبوری میں نہیں کیا بلکہ آپ خود ہی یہاں سے کہیں اور نہیں جانا چاہتے۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک انداز لگایا ہے ارفع۔ ہم یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتے کیونکہ ہم یہاں سے کہیں اور جانی نہیں سکتے اپنی مٹی سے محبت، ہم سہائی لوگوں کے خون میں رچی بسی ہوئی ہے۔" وہ سچائی سے کہہ رہا تھا۔ ارفع خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مردوش دوراں اگر ہمیں کسی اور جگہ بھیج دیے تو بھی ہماری روح گاؤں کی ان بچی کی نگاہوں میں جھکتی رہتی ہے ہمارے لمبوں میں شامل اس مٹی کی خوشبو ہمیں کہیں اور چھین سے جینے ہی نہیں دیتی، ہمیں یہیں لوٹ کے آنا پڑتا ہے میں نے شہری زندگی کو بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اپنے تعلیمی دور کا ایک بڑا حصہ میں نے لاہور جیسے شہر میں گزارا ہے اور درحقیقت تب ہی مجھے اور اک ہوا کہ زندگی یہ نہیں ہے اس جگہ گاتی، بھائی دو ٹوٹی دنیا میں ہوا کے جھونکے کے مانند گزر جانے والی اور تیز رفتاری کا یہ عالم کہ پیچھے مڑ کر دیکھو تو ڈھونڈنے پر کسی خوب صورت یاد کی پرچھائیں تک نہ ملے۔ زندگی تو یہاں بخشی جاتی ہے جہاں فطرت اپنے تمام تر رنگوں میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔ جہاں بناوٹ

اور فضا کا تصور تک نہیں جہاں زندگی سادگی، سچائی اور خوب صورتی کا نام ہے۔ کسی درخت کی جڑیں کاٹ دیں اسے پانی دیتے رہنے سے وہ ہر بھر انہیں رہ سکتا۔ اسی طرح آسانکشت اور تعیشات کسی بھی انسان کی ذہنی و قلبی طہارت کا باعث نہیں بن سکتیں اگر اسے اس کی جڑوں سے الگ کر دیا جائے تو۔۔۔ اب تو آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی کہ میں نے شہری زندگی چھوڑ کر گاؤں کی سادہ زندگی کا انتخاب کیوں کیا۔" اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

"یقیناً سمجھ گئی۔" اسی اثناء میں چاچا کی ایک بڑی سی ٹرے میں شہرت کے گلاس لیے چلے آئے تھے۔

"لیجئے ارفع جی! تریز کا ٹھنڈا اٹھار شہرت لیجئے گرمی کے لیے اکسیر ہے۔"

"یہ تینوں کہاں گئیں؟" گلاس تھامتے ہوئے وہ کچھ حیرت سے بولی۔ کچھ دیر پہلے تک زیدہ سامنے کھڑی تھی۔ اب وہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"شاید کہیں آم توڑ رہی ہوں گی۔ ناچی کو بڑی پریشانی ہے۔" زعیم نے ہنس کر کہا اور پھر واقعی اس کی بات سچ ثابت ہوئی۔ ناچی واپس آئی تو اوڑھنی میں ڈھیر سارے کچے آم تھے۔

"بس زعیم بھائی ناچی نے آپ کے ایک بیڑ کا کام تو ہلکا کر دیا۔" سونیا ہنستے ہوئے بولی۔ زعیم مسکرا کر رہ گیا۔

واپسی میں ناچی نے سامنے نہروالے راستے سے لے جانے کی بات کی تھی سونیا نے تائید کی البتہ زیدہ چپ چاپ سی تھی گرمی سے بے حال نیچے قمیص انارے سیوے دل کے پانی میں نہانے میں مصروف تھے انہیں دیکھا تو شرانے اور جھینپنے لگے ارفع کا دل تو اس ٹھنڈے سے بیٹھے پانی کو دیکھتے ہی چل اٹھا۔

پہلے تو پچھتی رہی پھر خود بھی اس کھیل میں شامل ہو گئی۔

"بس کرو۔ کپڑے کیلے ہو گئے تو گھر کیسے جائیں گے۔" ناچی نے بالا خرا سے روکا وہ ہنستے ہوئے اٹھ



کھڑی ہوئی۔ رات کو اربا باہر آئی تو نامی کو صحن میں بستر لگاتے دیکھا۔ آپا نے آنے کے بعد اپنا بستر صحن میں ہی لگوا دیا تھا اور اب ان کی دیکھا دیکھی سو نیا اور زیدہ بھی باہر ہی سوئے لگی تھیں۔ اربا کو یہ سب بہت اذکھا اور خوشگوار لگا۔ کھلی فضا میں آروں بھرے آسمان تلے سونا۔ گرامن کھلے میں سونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مجبوراً "اسے بھی اپنی خواہش دہانی پڑی۔

"آئیں ناربا۔ بیٹھیں۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟" نامی نے اسے کھڑے دیکھ کر کہا۔ وہ صبر کو گود میں اٹھائے ایک چارپائی پر آکر بیٹھ گئی۔

"آپ کو تو در تک جاننے کی عادت ہو گی۔ یہاں نیند آجاتی ہے اتنی جلدی۔" وہ پوچھنے لگی۔

صحن میں اس وقت ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ آپا اندر چاچی اور زیدہ کے ساتھ سو نیا کے چیز کے کپڑے پیک کرنے میں مصروف تھیں۔ اہل شاید نماز پڑھ رہی تھیں اور آپا بوسیم بھائی کے کپڑے رہیں کر رہی تھیں اسی لیے وہ انہیں تنگ کرتے صبر کو گمانی کالا لچ دے کر باہر لے آئی۔ سو نیا اور اربا کا والدہ کوئی پتا نہیں تھا پھر اسے نامی نے بتایا کہ سو نیا اربا کو چھت پر لے گئی ہے۔

"سچ کہوں تو نہیں آتی نہ جانے کتنی دیر کو نہیں بدلتی رہتی ہوں کراچی میں ہمیں سوتے سوتے بارہ ایک تو بج ہی جاتا ہے۔" اربا نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"نامی؟" کچن میں موجود نوری خالہ نے اسے آواز دی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ابھی آئی ہوں۔"

"آئی! کہانی سناؤ۔" صبر نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔

"ابھی سنا ہی ہوں اتنی کی جان۔" اربا نے اسے چوما اس کی معصوم آنکھوں میں نیند چھلکنے لگی تھی۔ اپنی چوٹی کو شانے پر آگے کرتے دیکھ کر کے اسے بانو میں لے کر لیٹ گئی جنگل کے جانوروں کی کہانی

سنا تے وہ اس کے نرم بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اربا نے احتیاط سے اس کے سر کے نیچے سے اپنا بازو ہٹایا تھا اور ایک گہری سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

جہاں تک نظر جاتی تھی سیاہ آسمان پر تارے ہی تارے بکھرے پڑے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان اس کے بے حد نزدیک ہو۔ یہاں وہ ہاتھ بڑھائے گی اور کئی ستارے اس کی مٹھی میں سٹ آئیں گے۔ دن کا یہ نسبت اس وقت موسم کافی خوشگوار ہو گیا تھا۔ ہولے ہولے چلتی ٹھنڈی ہوا گرمی کا رہا سا احساس بھی ختم کر گئی تھی ساحل میں رچی نم سی ٹھنڈک کو اپنی سانسوں میں اتارتے اس نے میری کے درختوں کی طرف دیکھا جو رات کی تاریکی میں کسی آسیب کا ممکن معلوم ہو رہا تھا۔

اسے یہ سب کچھ بہت دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ پتا نہیں یہ گاؤں کی اس روحان پرور فضا کا اثر تھا یا چہرل کو اچانک ہی جکڑ لینے والے جذبے کا انوکھا اور نو خیز احساس کہ اسے کراچی جیسے شہر میں گزارے گئے اپنے شب و روز ایک خواب گننے لگے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی جسے وہ اب جی رہی تھی اور جسے اس نے اب جینا تھا۔ دل۔ اس یقین پر دھڑک رہا تھا اور کبھی جو وہ اپنے اندر سے اٹھتی اس آواز کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تو اس کا دل اس کے وجود میں طوفان اٹھا کر اپنی ناراضی جتنا شروع کر دیتا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔ کیا یہ اچھا نہ ہو تاکہ میں اس بار بھی یہاں نہ آئی۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا تھا اور تب وہ بوجھل بوجھل سی آنکھیں اپنی تمام تر نفسوں خیزی سمیت جلوہ گر ہوئیں۔ اس نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں دل کی دھڑکنیں تیز ہو چلی تھیں۔ اس کے ساتھ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا جب سے وہ آنکھیں پہلی بار اس پر اٹھی تھیں تب سے ہی ان کا نفس اسے سر نہا اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور اب تو یہ عالم تھا کہ جذلوں سے وہ کتنی یہ بوتی ہوئی

آنکھیں اسے اکیلے میں بھی چونکا دیتیں۔ خود میں سینے پر مجبور کر دیتیں۔ اس کے اندر باہر ایسا پروگ کیا تھا کہ اب وہ اپنے آپ کی بھی نہیں رہی تھی حالانکہ وہ نظریں چراتا چاہتی تھی واسی بچانا چاہتی تھی۔ خود کو کتنا سمجھایا تھا اس نے کہ شخص کسی کی نظروں سے جھلکتے ایک ان کے، آوے اوہو رے پیغام جذبہ شوق کی ایک مختصر تحریر پر اپنے دل و جان دان کر دینا کہاں کی غفلندی ہے۔ مگر دل نے جیسے سارے اختیارات اس سے چھین کر اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے اور وہ بے بسی سے اپنے لٹ جانے کا تماشا دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ سو تو نہیں گئی ہو۔" اربا کی آواز اس کے کانوں میں آئی تھی اور پھر اس کا ہاتھ کافی زور سے اس کے بازو پر پڑا۔ اس نے کراہ کر آنکھیں کھولیں۔

"کیا مصیبت ہے؟" بازو سہلاتے ہوئے وہ اسے گھورنے لگی۔

"میں سونے کا موڑ ہے؟" اربا نے بغور اس کی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھا۔

"نہیں۔" اس نے نظریں پھیر لیں مگر اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

"صبر کہاں ہے؟" اسے اچانک ہی اس کا خیال آیا۔

"آئی اسے لے گئی ہیں۔" اربا نے ٹانگ کریم سے ہاتھوں کا مساج کر رہی تھی۔

"اچھا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" وہ حقیقتاً ہیران ہوئی۔

"تم سو جو رہی نہیں۔ پتا کیسے چلا۔" اس کی مسخ آنکھوں سے اربا نے یہی انداز لگایا۔

"میں سو نہیں رہی تھی۔ بلکہ شاید ہاں میں سو ہی رہی تھی۔" اس کی بڑبڑاوت واضح تھی۔ اس بے ربط بات پر اربا نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہاں اگر تم پوری پاگل ہو گئی ہو پتا نہیں کیا کرتی رہتی ہو سارا دن۔ اس طرح بے زار ہو کر یہ دن گزارنے سے تو یہاں آتا ہی نہیں تھا۔ اگر ان لوگوں کی مہنٹلی تمہیں اپنے لیول کی نہیں لگتی تو موت میں

یہ دو چار باہر کر لیا کرو۔" اربا کو بولنے کا موقع مل گیا اور اپنی چوٹی کے بالوں سے کھیتی خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

"خیر جھوٹو۔" اسے کوئی رد عمل ظاہر نہ کرتے دیکھ کر اربا نے خود ہی بات بدلی۔

"آئی بتا رہی تھیں مگر قانون آیا تھا۔ کیا کہہ رہی تھی؟" وہ تکیہ ذرا سا بچ کر اس کے برابر میں ہی لیٹ گئی۔

"کچھ خاص نہیں تمہارے بارے میں پوچھا اس نے تو میں نے کہہ دیا جو کچھ کچھ عقل اس کے پاس ہے اسے بھی گاؤں کے دھوڑ غلوں میں بانٹنے لگی ہے۔

سہ پہر میں آئے کی تو بات کر لیتا۔"

"دیری فنی؟" اس کے ساتھ لہجے میں چھپے طنز پر وہ بری طرح تپ گئی۔

"بائی لوگ کہاں ہیں؟" اربا نے اس پاس کی خاموشی محسوس کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"بڑے کمرے میں۔۔۔ سو نیا کی شادی پر دستکش چل رہی ہے۔" اس نے بتایا پھر اچانک ہی کچھ خیال آنے پر پرچوش ہو کر اس کا کندھا ہلایا۔

"پتا ہے اربا۔۔۔ میں نے ایک بات نوٹ کی ہے۔۔۔ یہ جو زیدہ ہے نا۔۔۔ یہ زعم کو پسند کرتی ہے۔" اس کا لہجہ دھیمہ ہوا تھا بتاتے بتاتے۔

"نہ پسند کرتی تو حیرت کی بات ہوتی۔" کروش بدلتے ہوئے اس نے سوچا مگر کچھ اور۔

"تمہیں کیسے پتا؟"

"کہہ تو رہی ہوں نوٹ کیا ہے اور تم۔۔۔ میری طرف دیکھو نا میں تمہارے اثرات نہیں دیکھوں گی تو مجھے بت کرنے کا مزہ نہیں آئے گا۔" اربا نے جھٹائی۔

"یہی تو میں چاہتی نہیں ہوں کہ تم میرے اثرات دیکھو۔" وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

"ہٹاؤ۔۔۔ تمہاری اس بات کی بنیاد کیا ہے؟" اس کے اصرار پر اربا نے اس کی طرف دیکھا اور دلچسپی بھی ظاہر کی۔

"بنیاد بنیاد کا تو مجھے نہیں پتا۔" وہ اپنے اڑی لا پڑا



”لیکن اتنے دنوں سے ہم یہاں ہیں تو میں کوئی بے وقوف، بھونڈا یا چنڈ تو ہوں نہیں تمہاری طرح کہ اتنی سی بات نہ محسوس کر پاؤں۔“

”تمہاری مشاہداتی صلاحیت پر مجھے کبھی بھروسہ نہیں رہا، اسی لیے جانے دو۔“ ارباب نے پھر اس کی بات طعنی میں اڑائی مگر اس نے ان کی سی کر کے کہنے لگی۔

”مگر مجھے نہیں لگتا کہ زعیم کو بھی اس میں کوئی دلچسپی ہے آج اس سے رسمی باتوں سے ہٹ کر باتیں ہو میں تو مجھے اندازہ ہوا کہ درحقیقت زعیم کتنا نفیس اور سلجھا ہوا انسان ہے، میں تو بہت متاثر ہو گئی ہوں اس سے زیدہ بھی پیاری ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کی ذہنی سطح بالکل بھی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتی“ بات کرتے کرتے اس کی نظر ارباب کے چہرے پر پڑی تو کہا۔

”تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ کبھی زیدہ کے سامنے زعیم کا نام لو پھر دیکھو۔ وہ کیسے بلش کر رہی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ اس کا انداز اب بھی نہ ماننے والا تھا مگر اس سے پہلے کہ ارفع اس کا ٹکڑا کرنے کے لیے پھر کوئی دلیل دیتی ناجی چائے لیے چلی آئی۔

”تھنک یو ناچی! میرے سر میں برادور ہو رہا تھا۔“ چائے کا کپ پتی ارفع نے ممنونیت سے کہا۔ وہ بھی اٹھ بیٹھی پھر زیدہ اور سونیا بھی آگئی تھیں اور ارفع ان کے پاس بیٹھ کر حسب معمول اپنے قفسے سانے لگی تھی جبکہ وہ الگ تھلک سی بیٹھی چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے نجانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی کہ چائے ٹھنڈی ہونے کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ اس کا وہ بیان تب بنا جب دور کہیں سے سرسراہی ہوا کے سنگ آتی وہ مدھر سی دھن اس کے کانوں تک پہنچی وہ ایک دم سے چونک گئی۔

”یہ۔۔۔ یہ بارسہ کی آواز ہے نا۔۔۔ کہاں سے آ رہی ہے؟“ اس بات پر خوش گھنچوں میں مصروف ان کبھی نے اس کی طرف نہ دیکھا۔

”مجھے تو کوئی آواز نہیں آرہی۔ یقیناً تمہارے

کان بچ رہے ہیں۔“ ارفع نے یوں مٹھکوں نظروں سے اسے دیکھا گویا وہ نیند میں بول اٹھی ہو۔

”آ رہی ہے۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں تم غور سے سنو تو سہی۔“ اس کے لہجے میں اصرار تھا کیونکہ وہ نامعلوم مگر بے حد خوب صورت پر سوزی دھن تو اسے ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔

”اچھا یہاں۔“ باجی نے سر ہلایا شاید اسے بھی سنائی دے گئی تھی۔

”یہ دنو دچا چا کا بیٹا ہے۔ بڑی خوب صورت دھنیں بجاتا ہے بارسہ پر چوپال میں جب رات کو سب اکٹھے ہوتے ہیں تو اکثر اس سے فرمائش کر کے کوئی دھن سنی جاتی ہے۔“ ناجی اسے جواب دے کر پھر سے اپنی باتوں میں مصروف ہو گئی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا پورا دھیان اس دھن پر لگا دیا۔ ان لمحات میں اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بارسہ پر یہ تان صرف اسی کے لیے چھیڑی ہو۔ اس کے رگ دے میں ”دڑنا اضطراب حیرت انگیز طور پر ختم ہونے لگا تھا۔“

آج پٹواری دین محمد کے اکھوتے بیٹے کی شادی تھی جو زعیم کا جگر کی دوست بھی تھا اس کی شادی کی تمام تر تیاریوں میں زعیم نے ایک بھائی کی طرح حصہ لیا تھا اور آج بارات کے دن بھی تمام انتظامات اسی نے سنبھالنے تھے۔ مگر اسے تیار ہونے ہوتے دیر ہو گئی۔

اس وقت وہ کچھ غلط سے خود پر پریزوم اسپرے کر رہا تھا جب اسے زیدہ کی آواز سنائی دی۔

”بھابھی کو پوچھ رہی ہیں آپ کے لیے ناشتا لے آؤں؟“ اس کا بچہ جھجکا ہوا تھا۔

”ہوں!“ وہ چونکا تھا پھر گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں۔۔۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ بیک شلوار اور نیوی بلیو کمرے کرتے میں اس کی مصبور کن شخصیت کچھ اور بھی نکھری نکھری لگ رہی تھی گھنے سیاہ بالوں کو سلیقے سے جمائے۔ وجہ یہ چہرے پر تانہ شیوکی

نیلا بیٹس لیے وہ ہمیشہ کی طرح اتنا بے نیاز لگ رہا تھا گویا نہ اسے اپنی سحر انگیزی کا اور نہ راک ہوا اور نہ کسی کے تغیر ہونے کی پروا کون مسکور ہوتا ہے اور کون مفتوح ہے۔ شاید کوئی خبری نہیں تھی۔ یک ننگ اسے دیکھتے ہوئے زیدہ کو بے اختیار اس کی ہنسی یاد آئی ہمیشہ لیے دیے رہنے والا زعیم اس دن ارفع کی بات پر کتنا کھل کر ہنسا تھا اور کتنی باتیں کی تھیں ارفع نے آتے ہی اس مضحور شہزادے کی چپ توڑ ڈالی تھی اور ایسا کیوں ہوا زیدہ نے یہ سوچا تو اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ہوا۔

”کچھ اور بھی کہتا ہے؟“ زعیم نے پلٹ کر اسے ہنوز دروازے میں کھڑا دیکھا تو پوچھ لیا۔

”نہیں۔۔۔“ وہ ہنر بازی لگائی تھی اور پھر تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

”ارفع یہاں دیکھو۔“ کرے سے نکلتے ہی اس کی میٹھی مدھر آواز نے زعیم کے قدم روک دیے۔ وہ مہینے کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ زعیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”ارے یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“ ارفع نے دیکھتے ہی حیرت سے دریافت کیا۔

”ذرا ادھر لانا تو؟“ ارفع نے آگے بڑھ کر اس کے کان پکڑے۔

”دور ہو ارفع! اسے کانوں سے پکڑنے پر یہ برا ماننا ہے۔“ وہ جلدی سے پیچھے ہٹی۔

”ادو! اتنا جان گئی ہو اسے۔“ اس نے ہنس کر مذاق اڑایا۔

”جی ہاں! یہ میرا کاوالا دوست بن گیا ہے۔“ زعیم انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ہولے سے کھٹکا اور دونوں نے بیک وقت چونک کر اسے دیکھا مگر اس کی نظریں تو صرف اس کے خوشنما چہرے کا طواف کر رہی تھیں جو اسے دیکھتے ہی گلابی ہو گیا تھا۔

”اچھا ہونٹ دانٹوں میں دبائے اس نے جھک کر مہینے کو پچھوڑا۔ ٹی پنک کمرے لباس میں اس کی دلکشی و رعنائی کے سامنے زعیم کو گلاب کی تشبیہ بھی بچ



مرد سوار نہیں ہوا ورنہ اس وقت وہ آپ کو یہاں نظر نہ آتی۔  
”پھر تو اس بات پر مجھے شکر ادا کرنا چاہیے۔“ وہ دھیرے سے بڑھایا تھا مگر ارفع سن نہیں پائی تھی۔

☆☆☆

”اربا! تمہارے لیے کون سے کپڑے نکالوں پر یہیں کرنے کے لیے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھی صدمہ کو گدگدا رہی تھی جب آپ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا تھا۔  
”میرے لیے کپڑے۔۔۔ لیکن میں نے تو ابھی ہی چیخ کیا ہے۔“ اربا نے کچھ حیرت سے انہیں اکاہ کیا۔  
”میں آج شام کے لیے پوچھ رہی ہوں۔۔۔ ناکی کے ہاں نہیں جانا۔“ آپ پاس ہی آکر بیٹھ گئیں۔  
”نہیں! میرا دل نہیں چاہ رہا میں کمرہ میں ہی ٹھیک ہوں۔“ نظریں اپنے ناخنوں پر جمائے وہ بے دلی سے بولی۔

”کیا مطلب ہے اربا۔ گھر میں کیا کرو گی۔ تم یہاں کچھ تفریح کرنے آئی تھیں نا کہ قید ہونے کے لیے اور پھر انہوں نے اتنے پیار سے بلایا ہے۔ نہیں جاؤ گی تو انہیں برا لگے گا نا۔“ وہ سمجھانے لگی تھیں۔

”نہیں لگے گا برا۔۔۔ ارفع تو جا ہی رہی ہے آپ کہہ دیجئے گا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔

”تو گھر میں اکیلے رہ کر تم کیا کرو گی؟“ انہیں پریشانی ہونے لگی اس کی خند پر۔

”اکیلے کیوں۔۔۔؟ اہل اور خالہ کے علاوہ آپا بھی نہیں جا رہیں نا؟“ اربا نے ان سے تصدیق چاہی۔

”ہاں کیونکہ وہ اور تاجی شادی میں جا رہی ہیں بلکہ جا چکی ہیں شام سے پہلے تو واپس نہیں آئیں گی اور تھوڑی دیر میں ہم بھی چلے جائیں گے۔ پھر صرف خالہ چاچی اور اہل ہی رہ جائیں گی جو تمہیں کہنی دے سکتی ہیں نہ تمہارے ساتھ کپ شپ کر سکتی ہیں کیا کرو گی تم اکیلی ہو رہو جاؤ گی۔“

”میں رہ لوں گی آپ! آپ فکر نہ کریں یہ جانتیں

ہمارے جانے کا کیا برو کرام ہے؟“ اس نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا تو آپ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔  
”پاکل ہو گئی ہو اربا۔۔۔ تمہیں یہاں آئے دن ہی کہتے ہوئے ہیں تمہیں جانے کی بھی سمجھنے لگی۔“

”آٹھ دن ہو چکے ہیں آپ! آپ کا حسب کتب کافی کمزور ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”تمہیں ہو کیا گیا ہے اربا۔۔۔ آتے ہوئے تو تم بالکل ٹھیک تھیں مجھے بلکہ ارفع کی فکر ہو رہی تھی کہ وہ یہاں زیادہ دن تک نہیں رہ پائے گی مگر اب وہ تو ٹھیک ہے اور تمہیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔“ انہیں غصہ آ گیا تھا۔

”ابھی سونیا کی شادی ہو جانے دو۔ اس کے بعد ہی تمہارے جانے کا سلسلہ بنے گا کافی اچل تو بھول ہی جاؤ۔ وہ صدمہ کو گد میں اٹھائے باہر نکل گئیں۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر تکیے پر سر کر اربا۔

”کاش! ایسا ہو کہ آج جب تم گھر آؤ تو میں تمہیں کہیں نظریں آؤں۔۔۔ تمہاری نظریں مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ٹھک جائیں اور تب تمہیں پتا چلے میرے جانے کا شاید تب ہی تم میرے بارے میں پوچھ لو۔ میرا نام لے لو۔“ وہ تکیے میں منہ دیے بے قراری سے سوچ رہی تھی اسے احساس بھی نہیں تھا اور تکیہ تر ہو نا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

گھر سے نکلنے تک انہوں نے جتنی افزائش اور جتنا ہنگامہ بچایا تھا۔ ان کے نکلنے کے بعد اس قدر سکون ہو گیا تھا۔ تاجی اور آپا ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں۔ وہ چند لمحے تو برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے صحن میں ادھر سے ادھر پھرتی چڑیوں کو دیکھتی رہی جو میدان خالی پا کر ہمت کرتے ہوئے بیڑ سے اتر آئی تھیں اور اب ان کے چچھانے میں ایک عجیب سی سرخوشی اور آزادی کا اظہار تھا کیونکہ وہ اس پورے صحن کو اپنی راجد حالی تصور کر رہی ہوں۔ اس نے پلٹ کر

پڑے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی خاندانی بحث چل رہی تھی۔ پہلے اس نے وہاں جانے کا سوچا پھر پور ہونے کے خیال سے دوسرے کمرے میں چل آئی۔ باہر سے آئی ڈھول تاشوں کی آوازوں نے اسے چونکا دیا تھا۔

”لگتا ہے بارات واپس آگئی۔“ وہ باہر آئی تو چاچی اور خالہ کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔

”آپ کو سن دیکھنے جاری ہیں؟“ اس نے دیکھتے ہی بھانپ لیا۔

”ہاں۔۔۔! تو بھی چل ہمارے ساتھ۔“ چاچی نے بھجوت پیروں میں چپل کھسائے۔

”نہیں۔۔۔ میں کمرہ میں ہی ٹھیک ہوں۔“ اس نے معذرت کر لی اگر جانائی ہو تا تو جتنی چلی جاتی۔ انہوں نے زیادہ بحث نہیں کی ان کے جانے کے بعد وہ روانہ بند کر کے اہل کے پاس آگئی۔ ان کے کھنٹوں میں درد رہتا تھا اور اس خیال سے کہ اگر انہیں کچھ چاہیے ہو تو وہ بروقت انہیں دے سکے۔ اربا ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر پہلے تک انسانی آواز میں ماحول کو گماتے ہوئی تھیں اب خالہ اور چاچی کے جانے کے بعد مزید پرہول سناٹا چھا گیا تھا۔ ڈھول، تاشوں اور پٹاخوں کی آوازیں بھی معدوم ہو گئی تھیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اسے اچانک ہی تاریکی چھانے کا احساس ہوا حالانکہ ابھی صرف چار ہی بجے تھے اور تھے بھی گرمیوں کے دن۔ وہ بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور صحن پورے کے قریب آکر لائٹ آن کرنے کی کوشش کی تب ہی اس پر بجلی کی عدم موجودگی کا انکشاف ہوا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی کھرباٹ پر قابو پایا۔ اسے ہمیشہ ہی تاریکی اور خاموشی سے وحشت ہوتی تھی اور شرمی قسمت کہ اب یہ دونوں ہی اس کے سامنے بن گئے تھے اہل گہری غنیمت میں تھیں۔ ابھی وہ اضطراب کے عالم میں کھڑی تھی کہ باہر سے آئی بوندوں کی ٹاپ نے اس کے رے سے اوسان بھی خطا کر دیے۔

”اف خدا! اف!“ وہ بے اختیار رباہی اس نے جلدی سے باہر آکر نہ کھا۔

آسمان گھنگور گھٹاؤں سے اٹ گیا تھا بارش کی منہی منہی بوندوں نے دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی۔ وہ ساکت کھڑی اس دھواں دھار بارش کو دیکھ رہی تھی اور نہ جانے کب تک دیکھتی رہتی اگر جو بکری کے میاں نے کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچتی۔ اگر کوئی اور وقت ہو تا تو وہ ہرگز بھی اس طوفانی بارش میں نکلنے کا ریسک نہ لیتی۔ مگر اس وقت اسے صرف اس معصوم بکری اور اس کے مہمنوں کا خیال تھا۔ مہمنوں کے احاطے پر تو چھپر ڈلا ہوا تھا صرف بکری ہی کھلے میں باندھی جاتی تھی اسی لیے وہ تقریباً بھاگتے ہوئے عقبی سمت آئی تھی۔ سب سے پہلے تو اس نے دونوں بچوں کو اس چھوٹے کمرے میں پھنپایا اور پھر وہ بکری کی رسی کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن زیادہ کامیاب نہیں ہوئی نجانے وہ کاٹھ کس انداز میں باندھی گئی تھی کہ اسے کھولنے کی کوشش میں وہ ناکام ہو گئی۔

”یہ کیا مصیبت ہے۔“ وہ روپائی ہو گئی۔ ایک طرف تو وہ پانی میں شرابور ہو رہی تھی اور اس پر بکری کا گھبراٹا سے مزید پریشان کیے دے رہا تھا۔

”اربا۔۔۔ اربا۔۔۔ آپ یہاں ہیں۔“ ز عیم کی آواز بڑی واضح سنائی دی تھی اور پھر وہ خود بھی نظر آ گیا۔ کچھ پریشان سے تاثرات لیے۔ بارش میں بھگا ہوا۔ وہ اسے پکار رہا تھا اربا کو بے اختیار اپنی منج کی ہانگی کی دھواں آئی۔ ”آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

”وہ بارش کے ہوتے ہی بکری کے چلانے کی آواز آئی تو مجھے خیال آیا کہ بکری کو پانی سے ڈر لگتا ہے اور اسی لیے میں۔۔۔“ وہ دھیرے سے کتے بات ادھوری پھوڑ کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

”مجھے تو لگتا ہے۔۔۔ بکری سے زیادہ آپ کو پانی سے ڈر لگتا ہے۔“ اس کی اڑی ہوئی رنگت، ڈر اسسا بھگا روپ دیکھ کر ز عیم کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوئی تھی دل میں دلی خواہشیں لگا ایک ہی چل اٹھیں۔



اب وہاں پہنچا جائے۔ اسے میں نے آماہوں۔  
اس کے ہوش رہا سر پہ سے نظریں چرا کر اس  
نے کہا اور وہ جلدی سے بھاگ کر اس دوسرے کمرے  
میں چلی آئی۔ زعیم نے لمحوں میں بکری کھول کر کمرے  
تک پہنچا دی تھی۔

”آپ نکل آئیے بارش کے رکنے کا تو کوئی امکان  
نہیں ہے۔“ وہ دروازے کے کچھ گھر اس سے مخاطب  
ہوا مگر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے۔  
ایک تو پہلے ہی اندھیرا تھا اور جو تھوڑی بہت دھندلی سی  
دوستی دروازے سے آ رہی تھی۔ اس میں بھی زعیم کا  
لسا چوڑا وجود حاکی ہو گیا تھا۔ نتیجتاً خطاط قدموں  
سے دروازے کی جانب بڑھنے کے باوجود اس کا پیر کسی  
چیز سے ٹکرایا تھا اور اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔  
”کیا ہوا۔“ تشویش سے پوچھتے ہوئے اسے اندر آنا

ہی پڑا۔

”میرا پیر۔ مجھے چوٹ لگ گئی ہے۔“ مگر اس کی آواز  
بھرا گئی۔ اگوتھے کا درد ناقابل برداشت تھا۔  
”ایک منٹ۔ آپ رکیے۔“ اسے بھوسے کے  
ڈھیر پر بٹھاتے زعیم نے جیب سے لاسٹر نکال کے  
جلایا۔

”آپ کے پاس لاسٹر تھا تو پہلے کیوں نہیں جلایا۔“  
وہ چیخ کر بولی۔

”مجھے خیال نہیں رہا۔“ وہ اس کے منگے پیروں کو  
دیکھ رہا تھا اس کے سفید گداز پیر مٹی میں لٹھڑے  
ہوئے تھے اور زخم کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

زعیم نے غیر ارادی طور پر ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا  
کہ اربا نے جلدی سے پیروں ہٹائے۔ وہ حیران سی اسے  
دیکھنے لگی تھی تب ہی زعیم نے بھی نظریں اٹھا کر اسے  
دیکھا تھا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جو اس کے ضبط کی حد ہوئی  
تھی۔ اس کی گہری ساکر آنکھوں کی جھلکناٹ کے  
سامنے اربا کو لاسٹر کا شعلہ مدھم پڑا محسوس ہوا۔

دل کی تمام تر شدتیں تمام تر گمراہیاں خود میں بیٹھ  
زعیم کی بے تاب نگاہیں دوبارہ دار اس کا چہرہ چوم رہی  
تھیں۔ اس کا جوہر سے اختیار اٹھ گیا تھا۔ زعیم کو لگ

رہا تھا کہ اگر اب بھی اس نے اپنے جذلوں پر بند  
باندھے رکھا تو کہیں۔۔۔ کوئی طوفان ہی نہ آجائے  
ہو نٹوں پر چپ کے تالے تھے اور آنکھیں ان غمت  
واستائیں گھٹی ہوئی اس کی سیاہ بو جھل آنکھیں اربا کے  
پور پور میں شرارے بھرتے اسے باطل کرنے کے  
دور پہ تھیں اس کے وجود میں گویا آتش کدہ دھک اٹھ  
تھا۔ درد کا احساس تو مٹ ہی گیا تھا اور پھر۔۔۔ نہ جانے  
کیا ہوا کہ وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر کے  
جس درد کی وجہ سے اسے بیٹھنا تھا۔ اب اسے کمر  
بھولے وہ اس کے پیلو سے ہو کر باہر نکل آئی تھی۔  
بارش زوروں پر تھی مگر اس کے جلنے جسم و جان پر بالکل  
بے اثر رہی کمرے تک وہ کیسے آئی اسے بالکل اندازہ  
نہیں ہو سکا تھا۔



”اربا! کیسی ہو میری جان طبیعت کیسی ہے تمہاری  
آپ کی آواز اسے بہت دور سے آتی سنائی دیتی تھی۔  
اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر انہیں دیکھنے کی  
کوشش کی وہ اس کے بالکل قریب بیٹھی تھیں۔  
اسے اپنے اتھارے پر ٹھنڈک اور کمی کا احساس ہوا۔ گریہ  
بخ اور غم احساس اس جلن کے مقابلے میں کچھ بھی  
نہیں تھا جو اس کے پورے جسم کو اپنی پیٹ میں لیے  
ہوئے تھی۔

”کب سے ہوئی اس کی یہ حالت؟“ اسے ویسے  
بھائی کی بھاری آواز سنائی دی۔ اس کا مطلب تھا اس  
کے ارد گرد صرف آپ ہی نہیں گھر کے باقی لوگ بھی  
تھے۔

”ہم تو بارش رکنے کے بعد ہی گھر آئے تھے اور  
جب میں اسے پلانے کے لیے کمرے میں آئی تو یہ بخار  
میں پھنک رہی تھی۔“ آپ نے بتایا۔

”رب خیر کرے۔۔۔ جوان لڑکی ہے اور پھر اتنی  
سوہنی۔۔۔ کوئی ہوائی چیز ہی نہ چٹ گئی ہو۔“ امل کی  
لجھ پر تشویش تھا۔ آپ کی دہائی ہو گئیں۔

”گما بھی تھا میں نے اس سے ہمارے ساتھ چلو۔

اسکے کیا کوئی گریہ سنتی ہے کسی کی۔“ امل کی بات پر  
وہ کھرا تھی تھیں۔ اتنا عرصہ گاؤں میں رہنے کے بعد وہ  
بھی کچھ تو ہم پرست ہو گئی تھیں۔

”تو سننے لگا تھا اسے اکیلا چھوڑنے کو۔۔۔ اگر  
اس کے جانے کا سوڈ نہیں تھا تو تم ہی اس کے ساتھ رہ  
جائیں تمہارا جانا کیا ضروری تھا۔“ ویسے بھائی آپ پر خفا  
ہونے لگے۔

”یہ اکیلی نہیں تھی پتہ۔ ہم تو تھے ہی اس کے  
ساتھ یہ تو دین محمد کے لڑکے کی بارات آئی تو ہم دہلی  
دیکھنے وہاں چلے گئے اور پھر بارش نے ہمیں وہیں روک  
دیا۔“ چاچی نے ان کا غصہ دیکھ کر وضاحت دی۔

کچھ لمحے پہلے ہی ڈاکٹر ضمیر جو ویسے بھائی کے دوست  
بھی تھے اسے چپک کر کے گئے تھے۔ بخار کی وجہ سے  
اس پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔ انہوں نے اپنے  
پاس ہی سے ٹیبلٹس دے کر ٹھنڈی پٹیاں رکھنے کے  
لیے کہا تھا اب اس کی مدد ہوشی کم ہوئی تو اسے دوبارہ دی  
جاتی مگر اس سے تو اپنی جلتی ہوئی آنکھیں ہی نہیں  
کھولی جارہی تھیں۔

اسے سب کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کافی  
دیر سے وہ اپنے باپوں میں کسی کے سرسراتی انگلیاں  
بھی محسوس کر رہی تھی پھر جب اربا نے اسے خود پر  
جھکتے محسوس کیا تو اس کے وجود کی خصوصیات خوشبو اس  
کی آنکھوں میں آنسو بھر گئی تھی۔ ارنج نے اس کی  
جلیبی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

”جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ میری بہن۔“ وہ دھیرے  
سے بڑبڑائی۔ اس کی گود میں منہ چھپاتے ہوئے اربا  
ایک بار پھر ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

زعیم تب کا ٹکڑا اب گھر آیا تھا۔ اس وقت تک  
عموماً سب سونے کے لیے لیٹ چکے ہوتے تھے۔ مگر  
آج تا صاف سب جاگ رہے تھے بلکہ اسے کچھ عجیب  
کی پچھل بھی محسوس ہوئی تھی۔

”کیا ہوا۔۔۔ سب ابھی تک جاگ رہے ہیں خیریت  
ہے!“ اس کا پہلا سامنا زیدہ سے ہوا جو نچلت میں  
بڑے کمرے سے نکل رہی تھی۔ وہ ٹھنک کر اسے

دیکھنے لگی۔

”میں نے پوچھا۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔“ اس کے  
جواب نہ دینے پر اس نے دوبارہ پوچھا تو وہ بے ساختہ  
نفی میں سر ہلا گئی۔

”اربا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا اسے؟“ اس کے دل کی بے چینی اس  
کے لہجے اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی اور زیدہ کے  
پورے وجود میں اضطراب بھر گئی۔ زعیم کی بے تابی  
بلاوجہ تو نہیں ہو سکتی تھی۔

”پتا نہیں۔۔۔ اسیں کسی وقت اتنا تیز بخار چڑھا کہ  
اب وہ بالکل بے سدھ پڑی ہیں۔“ اس نے ہلکی آواز  
میں بتایا۔ زعیم نے بے اختیار ہی لب بچھتے خود کو  
سرزنش کی تھی۔ پھر وہ مزید رکے بنا اس کمرے کی  
طرف چلا آیا تھا اور پیچھے زیدہ دوت سی بی کھڑی رہ گئی۔  
وہ ہلکی سی چادر اوڑھے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔  
اس کی سفید ہمد وقت دکتی رنگت اس وقت بخار کی  
حدت سے گھلائی ہو گئی تھی۔

”یہ تم نے کیا کیا زعیم۔ اپنے دل کو سلگاتے  
سارے انگارے تم نے اس کو مل لڑکی کو سونپ  
دیے۔“ شدید دھشت سے اس کے اندر عجیب ہی اٹھا  
بخ محسوس ہو گئی تھی۔ اب اسے اپنی بے چینی اپنے  
اضطراب کا سبب سمجھ میں آ رہا تھا کہ کیوں اس کی بے  
کلی حد سے سوا تھی۔

زعیم سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا بھلا اسے اس حال میں  
کیسے دیکھ سکتا تھا۔ مگر اپنا چین، اپنی فینڈ اس کے  
سرہانے ہی چھوڑ آیا تھا۔ بستر پر جیسے کانٹے لگ آئے  
تھے اور کمرے کی فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس  
لیے باقی کی ساری رات اس نے چھت پر کھلے آسمان  
کے نیچے سرٹ پھونکتے ہوئے گزار دی تھی۔



تین چار دن اس اداس اور بے زار سی کیفیت میں  
مگر رکنے بخار تو اتر گیا تھا مگر زور و آہنی شدید تھی  
کہ اربا محسوس تک کھلی فضا میں جانے کی بہت بھی خود



میں نہیں پائی تھی۔ اسے پہننے دینے کے لیے ہمہ وقت کوئی نہ کوئی اس کے پاس موجود رہتا تھا۔ زعمیم دوبارہ اسے دیکھنے نہیں آیا تھا یا شاید اس کے سونے کے کسی وقت میں آیا ہو۔ دیئے بھی آواہان تو وہ سو کر ہی گزار دیتی تھی۔ ارفع نے اس سے کہا تھا کہ ایسی کوئی بات ضرور ہے جو اسے پریشان کر رہی ہے مگر وہ بتانا نہیں چاہ رہی۔ اربانے اسے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب تو واقعی میں اربا کے پاس اسے بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سوائے ایک ان کے ان سے ان قرار کے جو آنکھیں کرتی تھیں اور آنکھیں ہی سمجھتی تھیں۔ یا پھر یہ جذبہ ہی ایسا تھا کہ اس میں زبانی کلامی اظہار کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ پھر گھر میں شادی کی وہ روایتی پھل اور چل پھل شروع ہو گئی۔ دور پاس کے رشتے داروں نے جو رونق بکیری سو بکیری روزی رات کو سونیا کی سکھی سہیلیاں ڈھولک بیتی، سنے پرانے گانوں کی ٹانگیں توڑنے پر کر سہ رشتیں اور خواتین نے اور ماہر سے گاتے ہوئے سر تان لگائیں لڑکیوں نے تو ارفع کو ہی اپنا لیزر مان لیا تھا۔ اس کی خوب صورت اور پراگندہ شخصیت سے تو وہ سب ویسے بھی بہت متاثر تھیں۔ اس پر اس کی فیشن سینس اہلٹھی اس کی شری لڑکی ہونے کا ٹیلل سونے پر سہاگہ کا کام کرتا تھا۔ جبکہ اربانے تو کمرے سے لکنا ہی خود پر حرام کر لیا تھا اور اس شام بھی وہ کمرے میں بیٹھی باہر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھی جب ارفع تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

”چلو اربا اٹھو۔ تیار ہو جاؤ فائنٹ!“

”کہاں...؟“ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اسے دیکھنے لگی۔

”باہر آ کر نہ کھو تو۔ کتنی رونق لگی ہوئی ہے۔ اس اکیلے کمرے میں تمہارا دم نہیں گھٹتا۔“

”نہیں ارفع۔ میری طبیعت پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی، زیادہ دیر بیٹھنے سے مجھے چکر آنے لگتے ہیں۔“

”تو بیٹھنا مت۔ لیٹ جانا۔ سونیا کی فریڈ ز تم سے

ملنا چاہ رہی ہیں وہ تو کمرے میں آنے پر مصر تھیں۔ نے ہی انہیں روک لیا کہ کہیں تمہارا یہ سر جھانڈا ہوا ہمارے حلیہ و کمرے کے ڈر کے لئے قدموں واپس بھاگ جائیں۔“ اس کے کپڑے نکالتی تیز سے لے میں بولتی جا رہی تھی۔

”چلو اب جلدی سے نما کر فریش ہو لو۔“ اپنے ریشمی کرلی بالوں کو سمیٹتی ارفع اس کے پاس آئی۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ چند لمحے اسے سنا کر بھری نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد اربانے کہا۔ ارفع کو ہنسی آگئی۔

”محنت بھی تو بہت کی ہے خود پر۔ اب دیکھا تمہیں تیار کر دوں گی تو سب مجھے بھول کر تمہیں دیکھنے لگیں گے چلو اٹھو۔“ ارفع نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اٹھاندا۔

آج انہیں کی رسم تھی۔ اربا کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے کمرے سے نکلنے تک اتنے لوگ آئے ہوں گے۔ جب وہ ارفع کے ساتھ تیار ہو کر باہر آئی تو سب کو اپنی جانب متوجہ پا کر نروس سی ہو گئی۔ پھر آئی نے ہی سب سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ وہ ڈھولک بجاتی لڑکیوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ان کی باتوں کا جواب دیتے دیتے اس کی نظر پلا ارادہ ہی آسمان پر گئی تھی۔

آسمان کی وسط میں منگا دھورا سا چاند۔ جو شاید اپنے احوال پر پن پر کچھ افسردہ اور اواس سا لگ رہا تھا۔

”کب تک یہ یونیورسٹی رہے گا نانا اور دیر ان۔ شاید وہ چیز جو آؤمھی ہو۔ اس کا وجود بے معنی ہوتا ہے۔ پھر پھر تو میرا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔ میں بھی تو آؤمھی ہوں اور میرا آؤما حصہ۔“

”اربا۔“ ارفع نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے شرمٹ کاگلاس اسے تھمایا۔

”اگر تھک جاؤ تو اس ٹیکے سے ٹیک لگا لینا ٹھیک ہے۔“ اس کا گلہ چھپتا کر چلی گئی۔

اس نے مری سانس لے کر اپنے اس لباس کو دیکھا۔ خودی دیر کے لیے وہ اس پر رونق ماحول سے کٹ گئی تھی سونیا کو باہر لایا جا رہا تھا۔ رسم کے لیے وہ رخ موڑ کر درجہ تک پہنچ کر بیٹھتی ہوئی اس طرف دیکھنے لگی۔

زعمیم عزیز کے ساتھ بیٹھک سے نکل رہا تھا جب اس کی نظر سامنے پڑی تو جیسے اس کے اندر تنگ روشنی پھیل گئی تھی۔ دھاتی رنگ کے لباس جھانکنا اس کا چاندی سا بدن۔ دونوں کلائیوں میں بھر بھر کے لباس کے ہم رنگ جوڑیاں بنے وہ چہرے پر آنے والے بال سمیٹ رہی تھی۔ زعمیم پہلی بار ان گھنگور گھٹاؤں جیسی زلفوں کو بکھرتے دیکھ رہا تھا۔ جب ہوا کی شرارت سے اس کے ریشمی بال اس کے خوب صورت چہرے کو چھوئے تو اوہ زعمیم کی ہتیلیوں میں سنناہٹ ہوئے لگتی۔

”یہ تم کیا بات بنے کھڑے ہو۔ یہ لڑکیوں کو تاڑنے کا نام نہیں ہے میرے بھائی۔“ عزیز جو فون سننے واپس اندر چلا گیا۔ اسے دروازے میں اہستہ دیکھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا تو زعمیم گھور کر اسے دیکھنے لگا۔

”تمہارا خیال ہے میں لڑکیوں کو تاڑ رہا ہوں۔ اتنا نظریا زعمیم رکھا ہے مجھے۔“

”اب کیا کہوں۔ آج کل تمہارے انداز کچھ بدلے بدلے لگ رہے ہیں۔“ اس نے شرارت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات تو ہوگی۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے مسکراہٹ چھپائی۔

”دیکھ۔ کون ہو سکتی ہے وہ۔“ عزیز نے کہہ کر نگاہیں اوہر اوہر دوڑانے لگا۔

”اس بہانے تم اپنی آنکھیں مت سینکو۔“

”کہیں وہ تو نہیں۔“ عزیز نے اس کی بات ان سنی کر کے ایک طرف اشارہ کیا اور وہ حیران ہو گیا۔

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”وہی جو سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ خوب

میں نہ کوئی اس کے پاس موجود رہتا تھا۔ زعمیم دوبارہ اسے دیکھنے نہیں آیا تھا یا شاید اس کے سونے کے کسی وقت میں آیا ہو۔ دیئے بھی آواہان تو وہ سو کر ہی گزار دیتی تھی۔ ارفع نے اس سے کہا تھا کہ ایسی کوئی بات ضرور ہے جو اسے پریشان کر رہی ہے مگر وہ بتانا نہیں چاہ رہی۔ اربانے اسے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب تو واقعی میں اربا کے پاس اسے بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سوائے ایک ان کے ان سے ان قرار کے جو آنکھیں کرتی تھیں اور آنکھیں ہی سمجھتی تھیں۔ یا پھر یہ جذبہ ہی ایسا تھا کہ اس میں زبانی کلامی اظہار کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ پھر گھر میں شادی کی وہ روایتی پھل اور چل پھل شروع ہو گئی۔ دور پاس کے رشتے داروں نے جو رونق بکیری سو بکیری روزی رات کو سونیا کی سکھی سہیلیاں ڈھولک بیتی، سنے پرانے گانوں کی ٹانگیں توڑنے پر کر سہ رشتیں اور خواتین نے اور ماہر سے گاتے ہوئے سر تان لگائیں لڑکیوں نے تو ارفع کو ہی اپنا لیزر مان لیا تھا۔ اس کی خوب صورت اور پراگندہ شخصیت سے تو وہ سب ویسے بھی بہت متاثر تھیں۔ اس پر اس کی فیشن سینس اہلٹھی اس کی شری لڑکی ہونے کا ٹیلل سونے پر سہاگہ کا کام کرتا تھا۔ جبکہ اربانے تو کمرے سے لکنا ہی خود پر حرام کر لیا تھا اور اس شام بھی وہ کمرے میں بیٹھی باہر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھی جب ارفع تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

”چلو اربا اٹھو۔ تیار ہو جاؤ فائنٹ!“

”کہاں...؟“ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اسے دیکھنے لگی۔

”باہر آ کر نہ کھو تو۔ کتنی رونق لگی ہوئی ہے۔ اس اکیلے کمرے میں تمہارا دم نہیں گھٹتا۔“

”نہیں ارفع۔ میری طبیعت پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی، زیادہ دیر بیٹھنے سے مجھے چکر آنے لگتے ہیں۔“

”تو بیٹھنا مت۔ لیٹ جانا۔ سونیا کی فریڈ ز تم سے



دہانے دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی۔  
 ”تو یہ تم ہی تھے۔ یعنی میرے دل کی پکار غلط نہیں  
 تھی جب جب بھی تم اپنی آنکھوں سے میرا نام لیتے ہو  
 میری ہر روح زکین لبیک کہہ اٹھتی ہے۔ تم یہ کیسے  
 سوچ سکتے ہو کہ تم مجھے دکھو گے اور مجھے کچھ پتا نہیں  
 چلے گا۔“

\*\*\*

”ارفع۔ اپنے کپڑے مت نکالو۔ تم لوگ آج  
 یہ کپڑے پہنو گے۔“ آج مندی تھی اور ارفع اپنے  
 کپڑے پریس کرنے کے لیے نکل رہی تھی۔ جب  
 آپنی نے آکر ایک شاپر اس کے سامنے رکھا اور دور  
 بیٹھی اربابہ بھی چونک گئی۔

”یہ والے کپڑے۔“ ارفع نے جلدی سے شاپر  
 اٹھا کر کھولا اور چرے پر پاؤسی سی چھائی۔  
 ”کس کے ہیں یہ کپڑے؟“ اب وہ کپڑے الٹ  
 پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ ایک گلابی رنگ کا سوٹ تھا اور  
 ایک سبز رنگ کا جس پر گونٹا کناری کا کام تھا۔

”کس کے ہیں مطلب۔۔۔ تم دونوں کے ہیں اور  
 کس کے ہوں گے۔“ آپنی نے کچھ ناراضی بھری  
 حیرت سے کہا۔

”اماں نے دیے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ آج  
 تم یہ پہنو۔“

”اُمّ سوری۔“ ارفع نے اسے ایک طرف رکھتے  
 ہوئے کہا۔

”یہ میری پسند کے نہیں ہیں۔“  
 اربابہ نے اسے دیکھا اور پھر پاس آکر سبز رنگ کا  
 سوٹ اٹھا لیا۔

”تم اسے پہنو گی۔۔۔ ارفع حیرت چلا اٹھی۔

”تو کیا ہوا۔ اب انہوں نے اتنے غلوں سے دیے  
 ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے پہننے میں کیا حرج ہے۔“

”تم ہر کسی کو اپنے جیسا مت سمجھا کرو۔ بے ہودہ  
 بے لحاظ۔“ آپنی نے طنزاً کہا اور اس کا منہ بن گیا۔

”اپنے آپ کو بالفاظ ثابت کرنے کے لیے میں یہ  
 ”اچھا۔۔۔“ ارفع کے ساتھ ساتھ اربابہ کو بھی حیرت کا

ذوق برق لباس نہیں پہن سکتی اربابہ تو بالکل ہے۔“  
 ”ہاں ہوش مند تو ایک تم ہی ہو جسے نہ تو کسی کا  
 رکھنا آتا ہے اور نہ ہی کسی کے احساسات کی کوئی  
 ہے۔“

”اوہ آپنی پلزیز ایموشنل ڈانیا لکزنہ بولیں آپ  
 ان کے سامنے کچھ مت کہیے گا اگر انہوں نے مجھے  
 کچھ پوچھ لیا تو میں ہمانہ بتا دوں گی۔“ اس کا لہجہ قتل  
 تھا۔ آپنی چند لمحے تو اسے گھورتی رہیں پھر کسی نتیجے  
 پہنچ کر سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

”چلو ٹھیک ہے اس طرح اماں کو بھی آسانی ہو  
 جائے گی۔“

”کیا مطلب۔۔۔ کیا آسانی ہو جائے گی۔“ ارفع  
 اچنبھا ہوا۔ ہنسا اٹھی۔

”اصل میں اماں کو تم دونوں بہت پسند آتی ہو اور وہ  
 تمہارے رشتے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔“ اربابہ  
 دل دھڑک اٹھا۔

”لیکن وہ ہم دونوں کے بارے میں ایسا کیسے سوچ  
 سکتی ہیں۔ وہ بہنوں کا تو ایک بندے سے نکاح جانتی  
 نہیں اور اگر بات ایک کی ہے تو پھر میں اربابہ کے حق میں  
 دستبردار ہوتی ہوں۔“

”تمہاری تو زبان کے آگے خندق ہے ارفع۔ کچھ  
 تو سوچ سمجھ کر منہ سے نکال کرو۔“ آپنی کو شدید غصہ تھا  
 اس کی بات پر۔

”اور جتنی یہ خوش فہمی کس بات کی ہے وہ براہ  
 راست بھی اربابہ کے بارے میں سوچ سکتی ہیں۔“

”میں تو پوچھناٹھ۔۔۔ ہم ہی کیوں ایں ایں اپنے  
 میں موجود ایک لڑکی نظر نہیں آتی۔“

”زبیدہ کی بات کر رہی ہو؟“ آپنی نے سوالیہ نظروں  
 سے اسے دیکھا تو اس نے انہی میں سر ہلادیا۔

”یہ تو چاچی کی بھی خواہش تھی اور اماں کی بھی۔  
 زبیدہ بہت پیاری لڑکی ہے اور اچھا ہی ہے اگر وہ  
 میں رہے مگر اس بارے میں جب اماں نے زعمیم سے  
 بات کی تو اس نے انکار کر دیا۔“

”اچھا۔۔۔“ ارفع کے ساتھ ساتھ اربابہ کو بھی حیرت کا

جھٹکا لگا۔  
 ”یہ کب کی بات ہے۔“

”جب زعمیم اپنی پرہائی پوری کر کے واپس آیا اور  
 جب اماں کو لگا کہ اب اس کی شادی ہو جانی چاہیے تب  
 کی۔“

”کیا کہہ کر انکار کیا تھا اس نے؟“ کچھ جھجھکتے  
 ہوئے اربابہ نے ہلکی بار زبان کھولی۔

”اس نے کہا تھا کہ ابھی وہ شادی نہیں کرنا چاہتا اور  
 پھر اس خیال سے کہ کہیں یہ لوگ زبیدہ کو اس کے لیے  
 بٹھانے نہ رہیں اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا۔ ضروری  
 نہیں کہ جس لڑکی سے وہ شادی کرے گا وہ زبیدہ ہی  
 ہو۔ اماں سمجھ گئی تھیں کہ زعمیم صاحب الفاظ میں تو  
 نہیں کہہ رہا مگر ڈھکے چھے الفاظ میں یہ جتنا چاہ رہا ہے  
 کہ اسے زبیدہ میں کوئی روچھی نہیں ہے۔ پھر بھی اماں

نے زعمیم کو کنوینس کرنے کی ٹھان لی۔ یہ الگ بات کہ  
 جیسے جیسے ان کا امراد بڑھتا گیا۔ ویسے ویسے زعمیم کے  
 انکار میں اور شدت آتی گئی اور اب تو وہ زبیدہ کا نام سنتے  
 ہی ہاتھ ہونے لگتا ہے۔“ آپنی نے تفصیل بتائی۔ اربابہ  
 نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ تھوڑی دیر پہلے  
 یکنفرت ہی جو بھاری بوجھ دل پر آ رہا تھا۔ فوراً ہی اتر  
 بھی گیا تھا حالانکہ وہ نہیں جانتی تھی۔ ابھی ایک جھٹکا  
 باقی تھا۔

”کیا زبیدہ کو یہ بات پتا ہے۔۔۔ ارفع نے پوچھا۔  
 ”یقیناً پتا ہوگی اور نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟“  
 وہ اربابہ سے بولیں۔

”بہت فرق پڑتا ہے آپنی کیونکہ وہ معصوم سی لڑکی  
 صرف زعمیم کے خواب دیکھتی ہے۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔“ آپنی ششدر رہ گئیں۔  
 ”اس نے خود بتایا ہے مجھے بتایا ہے وہ ہمارے آنے  
 کے بعد کتنا ان سیکور فیل کر رہی تھی اسے لگ رہا تھا  
 کہ زعمیم مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔ پھر میں نے اس کی غلط  
 فہمی دور کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ٹینشن نہ

لے۔“  
 ”تو تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو۔“ آپنی کو تعجب  
 لگا۔

”اچھا۔۔۔“ ارفع کے ساتھ ساتھ اربابہ کو بھی حیرت کا

ہو اور ابانے نے جین ہو کر پہلو بٹھا لیا تھا۔  
 ”اس لیے کہ آپ اپنے دیور کو سمجھائیں وہ اتنی  
 پیاری لڑکی کو کیوں سمجھ کر رہا ہے بلا وجہ۔ نہ وہ  
 کسی کو پسند کرتا ہے۔ نہ اسے کسی سے محبت ہوئی ہے  
 تو وہ اس لڑکی کا ہاتھ تمام کیوں نہیں لیتا جو اسے اتنا  
 چاہتی ہے۔۔۔ رہے ہم۔۔۔ تو یہ تو ممکن ہی نہیں ہے  
 ہم میں سے کسی نے بھی گاؤں میں رہنے کا تصور بھی  
 نہیں کیا۔۔۔ آج ہیں کل چلے جائیں گے۔“ اس  
 نے بات کرتے کرتے اربابہ کی طرف دیکھا گویا تائید چاہ  
 رہی ہو یہ نظریں جھکائے بیڈ شیٹ کے ڈیزائن پر اٹکی  
 پھیر رہی تھی۔ ارفع نے اپنی بات جاری رکھی۔

”زعمیم کو زبیدہ سے شادی کر لینی چاہیے آپنی۔ وہ  
 اس سے پیار کرتی ہے۔“ اربابہ کا دل چاہا وہ اٹھ کر اس  
 کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔

”زعمیم کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے  
 ۔۔۔ یہ تمہیں ڈیٹائیڈ کرنے کی ضرورت نہیں ہے  
 ارفع۔“ آپنی نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”اپنے خیالات و نظریات دوسروں پر تو ہوتا تمہاری  
 پرانی عادت ہے۔ مگر یہ اس کی زندگی ہے اور اسے کیسے  
 گزارنا ہے یہ وہ طے کرے گا نہ کہ تم۔“

”میں صرف مشورہ دے رہی تھی۔“ اس کا لہجہ  
 براحتی تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ زعمیم خود سمجھ دار  
 ہے اگر اس کا دل نہیں مانتا تو وہ کیوں ایک ان چاہے  
 رشتے کا طوق اپنے گلے میں ڈالے جس سے تا صرف  
 اس کا بلکہ زبیدہ کا بھی جینا حرام ہو جائے ویسے بھی  
 یہاں ایسی کئی شادیوں کے منطقی انجام دیکھ چکی ہوں  
 میں۔“

آپنی نے بہت تلخ حقیقت سے روشناس کروایا تھا۔  
 ارفع جیپ سی رہ گئی وہ بھول گئی تھی۔ زبانی بیج خراج  
 سے زندگی نہیں بنتی اور جن فیملوں میں جذبات اور  
 احساسات سے زیادہ سمجھنا شامل ہو جائے پھر وہ  
 پوری عمر کا آزار بن جاتے ہیں۔

”اچھا۔۔۔“ ارفع کے ساتھ ساتھ اربابہ کو بھی حیرت کا



منہدی آنے میں دیر تھی اربانے پہنچ کر کے بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا بنائی۔ آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر پچھل طرکی لب اسٹک لگا کے کانوں میں بڑے بڑے بالے ڈالے وہ باہر نکلنے کو تھی جب آپا کی آواز پر اسے رک جانا پڑا۔

”ارے اربا یہ کیا تمہاری تیاری بس اتنی سی۔ کم از کم میک اپ تو ارفع سے کروائیں۔“

”نہیں آپ۔ میرا دل نہیں چاہ رہا اور ویسے بھی اس وقت ارفع بہت مصروف ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”اچھا پھر ایک منڈر اٹھ جاؤ۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئیں اربا کچھ ابھی سی دیہیں کھڑی رہ گئی۔ پھر ذرا ہی دیر میں وہاپس آگئیں۔

”تمہارے بل اتنے خوب صورت ہیں۔ میں نے سوچا اس میں موتیا کی کلیاں لگا دوں۔“ وہ اس کی پشت پر آکر اس کے ریشمی بالوں میں گجرا لگنے لگیں۔

”تھنک یو آپ۔“ وہ منونیت سے بولی۔

لوٹنے والوں کی آمد کا غلطہ اٹھا تو لڑکیاں اپنی تاریاں اودھوری چھوڑ کر باہر نکل آئی تھیں۔ بے ششام میک اپ اور زیورات میں لدی پھنڈی خواتین کافی غرور اور استحقاق کے ساتھ اتر ہوئی تھیں خود کو ہیرو سمجھتے، ہاتھوں میں موبائل فون پکڑے لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر خواخوہشوں سے بھرے تھے۔ بچے الگ بم اور پٹانے پھوڑتے اس کاٹن پھاڑ شور میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے اربا ایک طرف کھڑی دیکھی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ارفع اسے کہیں نظر نہیں آئی شاید وہ ابھی تک کمرے میں ہی تھی۔ لڑکیوں نے آتے ہی سب سے پہلے مہکن کے بیچوں بیچ لکڑی ڈالی تھی۔ شاید یہ لڑکے کی نہیں اور کرنزدیہ وہیں اور ڈالس کی کافی شوٹیں لگ رہی تھیں۔

آپا نے اسے بلا کر کوئلڈرنک کی رے تھمائی تھی۔ مہمانوں کو سرو کرنے کے لیے اس کے ساتھ تابلی بھی تھی۔ جب وہ شروت سرو کر کے چکن کی طرف آ رہی تھی۔ تب ہی پیچھے سے کسی نے اس کا دھڑ پکڑ کر کھینچا۔

تھا۔ اس نے مرکزہ دکھا تو وہ ایک چھ سات سالہ سا بچہ تھا جو یقیناً ان مہمانوں میں سے ہی کسی ساتھ تھا۔

”آپ کو وہ بلار ہے ہیں۔“ اس نے ہینک اودھ کھلے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ اربا الجھ کر ہوا اور اوازہ تو کی تیار تھا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔

”کون بلار ہے؟“ اس نے جھک کر اس کے چھوٹے

”وہ۔“ اس نے دوبارہ اس طرف اشارہ کیا۔ اپنے ارد گرد دیکھا اس شور و غوغا میں کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس سمت بڑھتی چلی آئی کچھ جھکے ہوئے وہ دروازہ کھلی کر اندر داخل ہوئی تھی اور سامنے کھڑے ز کو دیکھ کر وہیں جم گئی۔ ز عظیم بھی اسے دیکھ کر سرخرو ہو گیا۔

اس کی محویت دیکھ کر اسے تھوڑی دیر پہلے ارفع کی گئی بات یاد آئی۔

”تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو میں تو ویسے لگ رہی ہوں۔ جیسے اس سے پہلے لگتی آئی ہوں۔ سنہری گولے کناری سے سجاوہ سبز رنگ کالباس کے حسین سرابے برج کر جیسے اپنی خوش بختی پر ہوا جا رہا تھا چمکتی آنکھوں میں کلچ کی ہری چوڑیاں آنکھوں میں کاجل کی دھاریاں میں مہکتے بھرے سرپا خوشبو تھی۔ دھنک تھی روشنی تھی اور ز اسے دیکھ کر دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

”آپ مجھے بلار ہے تھے؟“ اربا کو لگا اگر کچھ دیر گزری تو کہیں وہ اس کی پاگل نگاہوں کے سامنے ہی نہ جائے۔

”مجھے بھابھی کو کچھ کھلوانا تھا۔ سامنے آپ نہ آئیں تو میں نے آپ ہی کو بلوایا۔“

”اوہ سرز عظیم! تمہیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔“ وہ اپنے ہاتھوں پر نظریں جماتے اس کی بات دل ہی دل میں نہیں۔

”تو تم خود ہی آکر ان سے کہہ دیتے۔“ اس نے

ہے کہا۔

”ہو جاتا۔“ مگر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ خواتین یا بچوں کی محفل میں یوں منہ اٹھائے چلے آئے۔“ وہ کچھ دیر سے بولا اربا نے کچھ تعجب سے اسے دیکھا یہ واقعی حیران کن تھی اس نے خود دیکھا تھا لوگ نے پہلے کس طرح سے اندر کے چکر لگا رہے تھے ان ز عظیم کو اس نے ایک بار بھی ان۔ دونوں میں

بچوں کی موجودگی میں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”کیا کہنا تھا آپ نے؟“ اس نے ہنسنے کی بجائے اس کی آنکھوں سے آنکھیں چرائیں۔

”بھابھی سے کہیے گا مہمانوں کے لیے شروت کے

تھے چائے بھی بھجوا دیں۔“

”بس اتنی سی بات۔“ اربا باپوس سی ہو گئی۔

”تم کچھ اور کیوں نہیں کہتے تمہارا پاس کہنے کے

بے موقع ہے اور میرا دل رواں روایں سننے کا شہر۔“

مرکز عظیم نے مزید کچھ نہیں کہا بلکہ اس نے عجیب

حرکت کی وہ اس کے قریب آ گیا تھا اتنے قریب کہ

اس کے پاس سے اشتعلی کلون کی منک محسوس کرتی

وہیں منتہی چھوٹی موتی بن گئی تھی۔ تب ہی اس نے

اٹھ بڑھا کر اس کے شانے کو ہلکے سے چھوا۔ اربا کا دل

بے تحاشہ دھڑکتے سینے کا بچو توڑنے کو بیتاب ہوا تھا۔

اس کی چھوٹے اربا نے چونک کر اس کی طرف

دیکھا۔ وہ اس کے گلہائی بڑتے تہمتاتے ہوئے روپ کو

سایاں روکے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں موتیا کی

گلی تھی۔ جو اس کے بالوں سے بھر کر اس کے شانے

پر گری تھی اسے اٹھانے کے لیے ہی ز عظیم اس کے

عجب آیا تھا۔ وہ اپنی چڑھتی ہوئی سانسوں کو قابو کرتی

تھی سے باہر نکل آئی۔

”تم مجھے پاگل کر کے ہی چھوڑو گے۔“

☆ ☆ ☆

لگے دن بارات تھی پورا دن کافی ہنگامے اور

مہمانوں کے ہمارا تھا اور شاید اسی لیے اربا کو ز عظیم کہیں نظر

نہیں آیا تھا اربا بہت بے دلی سے تقریب میں شریک

رہی۔ ایک عجیب سا خالی پن محسوس ہو رہا تھا اسے

اپنے اندر اور ارد گرد کو ایک بے نامی سی دیرانی۔

”سونیا بہت خوب صورت لگ رہی ہے نا!“ وہ

پنڈال کے ایک کونے میں کھڑی تھی جب ارفع نے

پاس آکر اس سے کہا تھا اس نے اثبات میں سر ہلا

دیا۔ ایک تو سونیا پہلے ہی بہت دلکش نفوس کی مالک

لڑکی تھی اور اس پر ارفع کے ماہر ہاتھوں نے اس کے

حسن کو اور بھی دو آتشہ کر دیا تھا۔ ننڈیں آتے جاتے

صدقہ اتار رہی تھیں اور وہاں مایاں چھپ چھپ کے

دیکھے جا رہے تھے۔

”اس کی ننڈیں بہت پیار کرتی ہیں اس سے۔“

اس کی ننڈوں کو اس طرح سونیا کے لاڈ اٹھاتے دیکھ کر

اربا نامعلوم سے احساسات میں گھر گئی۔

”نئی نوبی ہے اس لیے ویسے یہ لڑکیاں ہیں بہت تیز

طرار۔“ سونیا تو اتنی سیدھی سادی ہے مجھے تو ابھی سے

اس کی فکر ہونے لگی ہے۔“ ارفع کا لہجہ کچھ تشویش

لیے ہوئے تھا۔

”نہیں خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“

وہ اس کی سمت جانے کا سوچ رہی تھی کہ اس کی

نظر پنڈال کے آخری سرے پر کھڑے ز عظیم پر پڑی۔ وہ

شاید اسی وقت وہاں آیا تھا اور اہل سے کچھ بات کر رہا

تھا۔ بادامی رنگ کے کرتا شلوار میں اس کی وجہ سے

شخصیت دور سے ہی نمایاں تھی۔ اپنے بالوں میں

انگلیاں پھیلتے ہوئے اس نے اپنی مضبوط گلانی پر

بندھی کھڑی پر نگاہ ڈالی اور کئی مونچھوں تلے اس کے

لب بچھ گئے وہ جانے کے لیے پلٹ گیا اور دھر اربا بے

یقین سی کھڑی رہ گئی۔

”تم نے مجھے دیکھا نہیں۔ میں تمہارے سامنے

ہی کھڑی تھی اور تم نے مجھے ایک بار بھی نہیں دیکھا۔

کیا تم نہیں جانتے جب تم مجھے نہیں دیکھتے تو مجھے

میرا ہونہ نہ ہونا ایک برابر لگتا ہے۔ صرف ایک نظری

سی تم مجھے میرے ہونے کا احساس تو دلا جاتے۔“

اس کا بچی انتہا برا ہوا کہ وہ سب کچھ نظر انداز کر کے

گھر کے اندر دینی جے میں چلی آئی تھی اور پھر اس وقت



نگلی جب سونیا کی رخصتی کا وقت آیا تھا۔

\*\*\*

”آج زیدہ کی خالہ آئی تھیں۔ زیدہ کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگتے۔“ کل انہیں جانا تھا اور اس وقت وہ اپنی بیکنگ کر رہی تھیں جب آپنی نے آکر انہیں بتایا۔ ارفع چونک گئی جبکہ اربا خاموشی سے لگی رہی تھی۔

”لیکن یہ بتانے والی بات نہیں ہے بات یہ ہے کہ اس اتوار کو وہ باقاعدہ رسم کرنے والے ہیں منگنی کی۔“ ”کیا؟“ اس طرح اچانک ارفع حیرت سے منگ گئی۔

”اچانک سے کیا مطلب سوچ بچار تو غیروں میں کی جاتی ہے۔ وہ اس کی سگی خالہ ہے۔ مالی لحاظ سے کافی مضبوط ہیں اور خود پرویز بھی بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔“ آپنی نے ناواوی سے جتایا۔

”یہ ساری باتیں ایک طرف، زیدہ سے پوچھا ان لوگوں نے؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ آپنی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”لیکن بانی گھر والے تو بہت خوش ہیں خصوصاً چاچی تم کہتی ہو وہ تمہیں دل کی بات بتاتی ہے تو تم ہی جا کر اس سے پوچھ لو کہ وہ خوش ہے یا نہیں۔“ انہوں نے ارفع کی طرف دیکھا وہ چند لمحے تو کچھ سوچتی رہی پھر باہر نکل گئی شاید واقعی زیدہ سے بات کرنے۔

”کیا زیدہ خوش نہیں ہوگی۔“ اربانے کسی اندیشے کے تحت ان سے پوچھا۔

”بظاہر تو ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہی ہے، لیکن یہ ارفع نہ جانے کیا خطبہ ہے اسے دوسروں کی فکر میں رکھنے کا بھیغے تو زہر لگتا ہے اس کا یہ جذباتی پن۔“ وہ ناراضی سے کہتی چلی گئیں۔

اربا مضطرب سی انگلیاں چٹکانے لگی۔ اسے حیرت ہوئی جب تھوڑی دیر بعد ہی ارفع ہنسمائے ہوئے چہرے کے ساتھ واپس آئی تھی۔ ”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”بھل گئی یہ یہ زیدہ۔“ وہ مترنم گویا اربا ج اسے دیکھنے لگی۔

”لیکن کیوں۔ کیا کہا اس نے؟“ ”کہنا کیا تھا میں نے پوچھا تم خوش ہو تو کہنے آہو جی میں تو بہت خوش ہوں۔“ ارفع نے ایسے میں کہا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اربا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”تو تمہیں اتنی تپ کیوں چڑھ رہی ہے؟“ ”مجھے تپ کیوں نہ چڑھے۔ کل وہ کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا، تم تو زعیم کی کتنی کتنی باتوں سے لگی۔ ہل کر رہی تھی۔ لیکن زعیم مجھے پسند نہیں کرتے ان کی پسند تو کوئی اور ہی ہے میں کیوں زبردستی گلے پڑوں۔“

”سمجھ دار ہو گئی ہے وہ۔“ اربا دھیرے سے پھر ارفع کو جانے کیوں غصہ آ رہا تھا کہ ایک معصوم زعیم سے محبت کرتی ہے مگر اسے احساس تک نہیں ہے کہ وہ بہت حساس بھی مگر بے حس تو اربا بھی نہیں۔ اسے بھی بہت افسوس تھا مگر ساتھ ہی یہ اطمینان تھا کہ زعیم کے انکار کا سبب اس کی ذات ہرگز نہ ہے۔ وہ تو اس کے یہاں آنے سے پہلے ہی سبب موقف واضح کر چکا تھا۔ اسے اپنا آپ مجرم مت سمجھو ہوتا جب اس کے یہاں آنے کے بعد ہی زعیم خیالات اس کے فیصلے میں تبدیلی آئی ہوتی۔

\*\*\*

وہ ندی کے ٹھنڈے پانی میں پیر ڈالے بیٹھی تھی ندی کے کنارے کی پچی زمین پر کچھ لکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا اچھل سنبھال رہی تھی جو چنانچہ رو سے آنے والی ہوا بار بار اڑا کر ندی کے پانی میں جھگوٹے پر تلی ہوئی تھی زعیم درخت کے تنے تک نیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھے ایک تک اسے دیکھتا تھا۔ آج ان کی روانگی تھی اور ارفع جانے پہلے ایک بار پھر گاؤں کی سیر کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اربا بھی ان کے ساتھ چلی آئی اب وہ لوگ آگے جا رہے تھے۔

سمت چلے گئے تھے اور اربا نے ندی کے کنارے ہی بیٹھے کو ترجیح دی تھی۔ دھیمی دھیمی چلتی ہو ا پوڑیوں اور پتوں کی سرسراہٹ مختلف پرندوں کی بولیاں۔ سو فلفلفے سے بھرا گئے والی اس کی چوڑیوں کی جلتنگ اور ہوا کے دوش پر دور کہیں سے آتے کسی گانے کے بول زعیم چاہ کر بھی کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔

آؤ چپ کی زبان میں خادر اتنی باتیں کریں کہ تھک جائیں وہ دونوں ہی چپ تھے مگر یہ چپ بھی اپنے اندر ہزاروں داستانیں سمیٹے ہوئی تھی زعیم جانتا تھا کہ یہ اس کے پاس آخری موقع ہے کہ وہ اس طرح سے اس کے سامنے بیٹھی ہے اسے جی بھر کے دیکھنے کا۔ اس سے باتیں کرنے کا یہ خوب صورت چانس پھر کبھی نہیں ملے گا اور اسی لیے ضبط اور مصلحت کے سارے اصولوں کو طاق پر رکھتے ہوئے وہ اس کے قریب آیا تھا اربانے اس کا پاس آنا محسوس کر لیا تھا مگر سرخ موڑے ہی رہی وہ اس کے پاس بیٹھا تب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

زعیم اس کا گریز بھانپ کر مسکرا دیا۔ اس کی نظریں پانی میں ڈالے اس کے گلابی پیروں پر پڑیں پھر اس کے ہاتھوں پر، پھر اس کے ہونٹوں اور پلوں پر وہ اسے دیکھتا تھا تو بس دیکھتا ہی چلا جاتا تھا۔ پھر ایسے بے خودی کے عالم میں اسے کچھ کہنے کا ہوش ہی کمال رہتا تھا۔

زعیم نے اس کا ہاتھ تھا تا تو اس کے مضبوط ہاتھ کے لمس کی گری اربا کے جسم میں برقی روی دوڑا گئی اس کے وجود کی خفیف سی لرزش زعیم سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ اس کی خنٹوٹی انگلیوں والی خوب صورت موی ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑنے اس کی نہایت محسوس کرتے بغور اسے دیکھ رہا تھا جس پر مندی کے تیل بوسے ابھی تک کھلتی ہوئی رنگت میں تھے اور بے حد بھلے لگ رہے تھے پھر اس کی سبک کلاہیوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیلنے ہوئے بے زبان خاموشی اس سے غائب ہوا۔

”تمہیں تو اندازہ بھی نہیں ہو گا اربا کہ مجھے ان چوڑیوں سے کتنی جلم ہوئی ہے۔ جب یہ کھلتی ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ میرا منہ چڑھا رہی ہوں اور مجھے بتا رہی ہوں کہ دیکھو۔ تمہاری اربا تم سے زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔ ہمیں دیکھتی ہے، ہمیں سنتی ہے، ہمیں اپنے وجود کا حصہ بنائے رکھتی ہے۔ تم تو اسے جی بھر کے دیکھ بھی نہیں سکتے اور ہم۔ ہمیں ہر وقت اس کی قرب کی خوشبو گن گناتے رہتے پر مجبور کرتی ہے۔“

اربانے ایک بار بھی اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہرگز نابل اس کا انتظار شدید کر رہا تھا۔ وہ منتظر بھی کہ زعیم کب اسے حکایت دل سنا تا ہے۔ اپنی آنکھوں سے جھلکتی بے تابیوں اور بے قرار یوں کو اپنے کبھی لہجے میں سمو کر اس کی ساعتوں میں امارتا ہے۔ اس کی شور مچاتی آنکھوں نے تو اس کے دل کا سکون چھین ہی لیا تھا اب اسے قرار تب ہی ملتا جب اس کے دل کی بات وہ اس کے منہ سے سنی۔

”مجھے تو یہ سوچ سوچ کر وحشت ہو رہی ہے کہ جب۔ تم چلی جاؤ گی تو میرا کیا ہو گا میں تمہیں دیکھنے بنا رہوں گا کیسے۔ تم تو ان چند دنوں میں ہی مجھ میں یوں سما گئی ہو کہ تم سے دوری کا صرف تصور ہی میری دھڑکنیں تھما رہا ہے۔ میرا دل ضد کرنے لگا ہے۔ کہ میں تمہیں کہیں جانے نہ دوں۔ ڈرنے لگا ہے کہ کہیں تمہیں مجھ سے کوئی اور نہ چھین لے میں سمجھ نہیں پاؤں گا اربا، میں تو تم پر کسی اور کا سایہ تک برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں چھو کر گزرنے والی ہوا بھی مجھے اپنی دشمن نظر آتی ہے۔“ اس کی گرفت لاشعوری طور پر ہی اربا کے ہاتھ پر سخت ہو گئی اربانے چونک کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں جذبوں کی آگ سی دھب اٹھی تھی۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

”ہوش چھیننے کے لیے تو تمہاری یہ آنکھیں ہی کافی ہیں۔ بولو گے تو تجھانے کیا عالم ہو گا۔“ اسی لمحے ارفع



اور تابی کی باتوں کی آواز آتی تھی۔ سو ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑائی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر ہاتھ چھڑانے کے اس عمل میں اس کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر زخمی کی مضبوط ہتھیلی میں کھب گئی تھیں۔

”ارے یہ دونوں ابھی تک بیس بیٹھے ہیں۔“ ارفع پاس آگئی۔ اور انہیں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ زعمیم نے ایک نظر ان چوڑیوں کے ٹکڑوں پر ڈالی پھر اسے غیر محسوس انداز میں جیب میں ڈال لیا اس کی ہتھیلی پر کہیں کہیں خون کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

”تو آپ کے خیال میں ہمیں کہیں جانا چاہیے تھا۔“ زعمیم اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”میرا تو خیال تھا آپ اسے بلغ دکھانے آئیں گے باتیں کریں گے ناموں کے علاوہ بھی آپ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں بہت سی باتیں جان جائیں گے۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں مجھے نہیں لگا آپ لوگوں نے کبھی ایک دوسرے کی خیریت و عافیت بھی دریافت کی ہوگی۔“

”ابھی یہ مرحلہ طے ہو ہی جاتا اگر تھوڑی دیر اور آپ نہ آتیں تو۔۔۔“ زعمیم نے مسکرا کر کہا تھا۔

”کیا۔۔۔“ ارفع حیرت سے چیخ اٹھی۔

”ابھی تک آپ سے یہ کام بھی نہیں ہوا مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے دو گولوں کو بٹھا دیا ہے آٹنے سامنے بیٹھتے اتنی دیر تک کیا واقعی آپ لوگ خاموش بیٹھے بس ان بیڑیوں کو گھورتے رہے۔“

زعمیم ہنس پڑا اس کی نظر بے اختیار ہی اربا کی طرف گئی۔ وہ سپر زینس بیڑی ڈال رہی تھی۔

”کم از کم میں اتنا بدفق ہرگز نہیں ہوں ہاں آپ کی بہن نے پوری کوشش کی مجھے ان بیڑیوں سے جیلس کرنے کی۔“

”تو آپ ہو گئے؟“ ارفع نے اس کی شرارت آمیز بات سمجھ کر شخ نے لمبے میں پوچھا۔

”مجھے تو ہر وہ چیز اپنی رقیب لگتی ہے جسے مجھ سے زیادہ توجہ ملے۔“ اس کی گہری نگاہیں اربا پر جمی تھیں وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

”اب کیا مطلب ہے ان فضول باتوں کو نے کچھ جھنجھلا کر سوچا۔

”بڑے تنگ دل ہیں آپ۔۔۔ میں تو آپ براڈمانڈز سمجھی تھی۔“ ارفع نے کہا۔

”اسے تنگدلی نہیں شدت پسندی کہتے جی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”اچھا۔۔۔ مجھے پہلے پتا نہیں تھا آپ کی خصوصیت کا۔“

”جنہیں پتا ہونا چاہیے انہیں بھی نہیں تھا۔“ کا انداز ایسا تھا ارفع بھی قہقہے اور اربا سمجھ کے پھیر گئی۔

”چھوٹے یہ بتائیے آپ کو ہم یاد تو رہیں گے اس کا مخاطب ارفع تھی مگر اربا تو لگا جسے وہ اسے اور شاید ایسا ہی تھا۔

”ارے کیسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔ ہم بھلا بھول سکتے ہیں۔“ ارفع جلدی سے بولی۔

”آپ کی طرف سے تو مجھے کوئی خدشہ نہیں لیکن۔۔۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اچھا۔۔۔ یعنی یہ بے یقینی میری طرف سے ہے۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟“ ارفع اس کی ادھوری بات پر سی گئی پھر قدرے توقف سے بولی۔

”ویسے اربا سے آپ کوئی توقع نہ رکھیں۔۔۔ کو زیادہ عرصہ اپنی یادداشت میں محفوظ نہیں رکھتی آپ ہفتے بعد بھی اس سے ملیں اور یہ آپ کو مجھ جائے تو آپ کو اس پر شکرا دار کر لینا چاہیے۔

میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔“ اب وہ ہنسنے ہو۔

شرارت آمیز لمبے میں اس سے تائید چاہ رہی تھی۔

”کیا واقعی؟“ زعمیم نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”بالکل ٹھیک۔۔۔ اب چلیں ارفع۔“ چہرے لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑتے وہ کچھ بے زاری۔

اس کی بات سے زیادہ اس کے انداز نے زعمیم کو

”ایک منٹ اربا۔۔۔ ذرا اپنا ہاتھ دکھانا تو۔۔۔!“ ارفع نے اچانک کمانوہ جیران ہو گئی۔

”کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟“ وہ اپنے ہاتھ کا جائزہ لینے لگی۔

”خون نکل رہا ہے۔۔۔ شاید کوئی چوڑی ٹوٹ کے چپھ گئی ہے۔“ ارفع نے اس کی کلائی دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو زعمیم نے اپنا ردال برضا دیا۔

”یہ لے لیجیے۔“

”ضرورت نہیں۔“ اربا نے جلدی سے ارفع سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”معمولی سی کھوٹ ہے اور زرا سا رستا ہوا خون ٹھیک ہو جائے گا خود ہی! اس کا لہجہ بے حد خشک تھا اور سیاہ آنکھوں میں عجیب سا تازہ زعمیم کے دل کو بے

طرز و چوکا کا ارفع کو الگ غصہ آیا اس کے روکے انداز پر۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے ٹوکتی زعمیم اس کے قریب آتا تھا۔ چند لمحوں سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اس کی کلائی پر ردال باندھ دیا۔ وہ بھونچکی سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میری وجہ سے آپ کا ذرا سا بھی خون بہسے یہ مجھے بالکل گوارا نہیں۔“ بھاری لمبے میں کہتے ہوئے

زعمیم نے اس کی کلائی سے مزید دو تین نوکیلی سروں والی چوڑیاں توڑ کر پھینک دیں ارفع جو عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے یکایک ہی کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہوا مگر یہ صرف وقتی کیفیت تھی۔ جسے اس نے اپنا وہم قرار دے کر فوراً ہی ذہن سے جھٹک بھی دیا۔ جبکہ زعمیم اس سے کہہ رہا تھا۔

”ابھی آپ بھولنے بھلانے کی بات کر رہی تھیں۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں کچھ دنوں میں ہمارا بھی

کراچی آئے گا پروگرام ہے اگر تب تک آپ ہمیں بھول بھی چکی ہوں تو ہم خود آپ کو اپنی یاد دلانے آجائیں گے۔“

”کیا! آپ واقعی کراچی آنے والے ہیں؟“ ارفع نے بے یقینی سے پوچھا۔

”جی ہاں اب اپنی امانت لینے کے لیے تو آنا ہی

بڑے گا۔“ اس نے اربا کی طرف دیکھا اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

”کیسی امانت۔“

”آپ کی بہن ہماری ایک چیز جو ساتھ لیے جا رہی ہیں۔“ وہ دھیرے سے ہنس۔

”وہ! آپ ردال کی بات کر رہے ہیں۔“ ارفع نے اس کی بات سمجھ کر گہری سانس لی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں کھرا آدمی ہوں ارفع وعدوں کا بھی سچا ہوں اور جڑیوں کا بھی۔“ اس نے کہا ہے تو ضرور اس کا آپ بس شکر رہے گا۔“

اربا کو یہ پیغام کوئی تسلی نہیں دے پایا۔ وہ ارفع کو وہیں چھوڑ کر تابی کے ساتھ چلی آئی تھی۔ زعمیم کی پریش نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

\*\*\*

اربا کے اندر کی تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے لگا تھا کہ آج جب ان کی روائی ہے تو زعمیم لازماً اپنی چپ

کار وہ نہ توڑے گا وہ پورے آدمی گھسنے اس کے سامنے بیٹھی رہی افراد کے چند خوب صورت پل سمیٹنے کے انتظار میں دل کو دھڑکاتے اس کے گنبد گچے میں

جھڑوں اور شدتوں سے منکس کسی اظہار کی تمنا میں۔۔۔ مگر اس نے کیا کیا۔ اس کی ساری خواہشوں پر بخ ٹھنڈا

یانی ڈال دیا اور پھر ارفع کے آنے کے بعد جو دفعہ معنی گفتگو شروع کی۔ اس نے مزید اربا کو سرسے لے کر

ہاؤں تک سلگا کر رکھ دیا تھا۔ مگر آنے کے بعد وہ سرور

کے بہانے سیدھی کمرے میں چلی آئی۔ زعمیم تھوڑی دیر بعد ہی گھر آگیا تھا اور اربا سمجھ گئی تھی کہ وہ آج اپنی

جلدی گھر کیوں آیا تھا۔ مگر اس نے بھی قسم کھالی تھی جانے کے آخری لمحے تک اسے اپنی صورت نہ

دکھانے کی اسی لیے اس نے دہرے کھانے کے لیے بھی منع کر دیا۔

”ٹھیک ہے زعمیم اگر تم سمجھتے ہو کہ اربا تمہاری ہر

ان کی بات بھی سمجھ جائے گی تو آج میں تمہاری یہ غلط



نہی دور کر دی دیتی ہوں۔ اگر تم اپنی اس خاموشی میں خوش ہو تو اب میں بھی تمہیں انجان بن کر دکھاؤں گی کوستے رہنا پھر ساری زندگی اپنے اس گونگے بن کو۔ اس کا غصہ شدید تھا۔ انہیں دوسیم بھائی کے ساتھ لاہور جانا تھا اور پھر وہاں سے کراچی کے لیے فلائی کر جانا تھا۔ بالاخر ان کے جانے کا لمحہ بھی آ ہی گیا تھا۔ سب کافی اداس تھے۔ سونیا بھی اپنے شوہر کے ساتھ ملنے آئی تھی۔ ارفع نے ان سے کراچی آنے کا وعدہ بھی لیا تھا۔

اس وقت جب سب انہیں رخصت کرنے کے لیے باہر ہی موجود تھے اس کی نظریں زعیم کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پھر ایک ایک سے گلے ملتے، دعا مانگتے وہ دونوں باہر نکل آئی تھیں۔ سامنے ہی گاڑی کے ساتھ دوسیم بھائی موجود تھے اور زعیم ان سے کچھ بات کر رہا تھا۔ ان کی آمد دونوں ہی ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس سے ملی چلی نظر غیر ارادی تھی حالانکہ اربا نے تہہ کیا ہوا تھا اسے نہ دیکھنے کا اور اسے دیکھنے ہی زعیم کی آنکھوں میں جو بے پناہ شگوا بھر آیا تھا۔ وہ گڑبڑا کر نظریں جھکاتے اپنی چادر درست کرنے لگی تھی۔

سیاہ چادر کے ہالے میں اس کے گلابی روپ کو دار فکری سے نکتے وہ تقریباً گروڈ پیش سے غافل ہو گیا تھا۔ آج جب وہ ہر لمحہ اسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا اس سنگدل لڑکی نے اس کی یہ خواہش بھی پوری نہیں ہونے دی تھی۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ مگر کیوں؟ یہ سوال اسے پریشان کرنے لگا تھا۔ اس کے رویے میں آنے والی یہ واضح تبدیلی اس عجیب سے اضطراب میں مبتلا کر گئی تھی۔

پچھلا دروازہ کھولنے پر پہلے ارفع اندر بیٹھی پھر اس کی باری آئی وہ مسلسل اس کی ہر حرکت نظریں خود پر محسوس کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے ایک نظر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا حالانکہ دل چلا جا رہا تھا۔ لیکن دل غیر چھلایا غصہ اتنا شدید تھا کہ اس نے دل کی

ایک نہیں چلنے دی۔

”اللہ حافظ۔“ دروازہ بند کرتے اس کی بھاری بوجھل آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور اس بجائے جواب دینے کے اس کی سمت سے رخ ہی پھیر لیا۔ زعیم تڑپ گیا۔

”بہت بری ہو تم اربا۔ ایک تو دوریاں سونپ کر رہی ہو۔ اس پر یہ بے رحمی یہ دہراستم کس لیے؟“ اللہ حافظ زعیم۔ ہمیں آپ کا انتظار رہے گا۔ ارفع نے کہا تھا۔ وہ تو یوں لالعلقی بیٹھی تھی جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو۔

”اربا بد تمیز! اللہ حافظ تو کہہ دو۔“ ارفع نے اسے ایک دھبہ لگائی۔

وہ جانتی تھی زعیم کی جلتی ہوئی منتظر نگاہیں اس کی جہی ہیں مگر نہ تو اس نے زاویہ بدلانہ اسے دیکھنے کو بخش کی ”اللہ حافظ!“ سپاٹ لہجے میں کہتے اسے انداز ایسا تھا جیسے ارفع کو کہہ رہی ہو۔ زعیم خود پرست کھونے لگا تھا۔ دل چاہ رہا تھا ضبط کے سارے ضابطے احتیاطیں بھڑا میں جھونک کر وہ اسے سمجھوڑا اس رویے کی وجہ پوچھتے۔

”میں تو پہلے ہی مشکل میں ہوں۔ کیوں جانے جاتے مجھے وحشتوں میں دھکیل رہی ہو۔ کیوں میرا دیوانگی کو جنون کی راہ دکھا رہی ہو۔“ مگر کچھ کہنے کے بجائے وہ لب پیچھے کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔ اس کا یہ دل گرفتہ اور بار بار اندازا رہا ہے دیکھا اور اس کا دل ایک لمحے کے لیے ختم سا گیا تھا۔

”یہ کیا کیا تم نے۔۔۔ آتے آتے اسے اتنا ہٹ کر دیا۔“ تھوڑی دیر بعد ہی اسے شدت سے احساس تھا۔ اس کی شگوا کنار آئیں جیسے اس کے دل میں کھب گئی تھیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے کی خواہش ہر شکل بدلتے اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆  
ثمراتے جھٹے جھٹے پھرتے کھاتے مٹے گاؤں کا گھر نہ کوئی قصہ سنتے رہنا چاہتی تھی اور ارفع کے پاس

وقت ایک قصہ موجود رہتا تھا اسے سننے کو ان کے آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے تو یہی پوچھا تھا ”زعیم بھائی کو دیکھا تم لوگوں نے۔ کیسے لگے؟“ اس کے لہجے میں اس درجہ تابی تھی گویا وہ دونوں صرف اس مقصد کے لیے تو وہاں گئی تھیں۔

”گریس فل ڈشنگ اینڈ مینس ایبل!“ ارفع نے جواب دیا تھا۔

”اور تمہیں۔۔۔؟“ اس نے اربا کی طرف دیکھا۔ ”اس سے کیا پوچھتی ہو۔ اس نے تو کبھی اس سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی اور اتنی بے شرم ہے آتے ہوئے اس کو خدا حافظ تک نہیں کہہ رہی تھی میں نے زبردستی کہلویا۔“ ارفع کو ابھی تک اس بات پر غصہ تھا۔

”دل و جان تو سونپ کر آگئی ہوں اسے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔“ وہ اپنے زخم کے کھرنڈ پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”لیکن کیوں اربا۔۔۔ وہ تو اتنے نائس ہیں۔“ ثمر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اور ایک وہی کیا۔ اس نے تو وہاں کسی سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔۔۔ عجیب بے زار سی صورت بنا رکھی تھی اور سے خود کو بخار الگ چڑھا لیا۔ ارفع ایک ایک کر کے سارے کھاتے کھول رہی تھی۔ ”مجھے تو لگا تھا یہ وہاں جا کر سب سے زیادہ انجائے کرے گی۔“ ثمر نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”ہونہ انجوائے“ ارفع نے طنزیہ انداز میں دہرایا۔

”میرا تو خیال ہے وہاں جاتے ہی اس پر کوہ کاف کا کوئی جن عاشق ہو گیا تھا۔ سچ ممتی ہوں مگر۔۔۔ مجھے تو یہ ایسا بن لگ ہی نہیں رہی تھی۔“

”تو ابھی مجھے کون سالگ رہی ہے کیسے وہ جن اس کے پیچھے یہاں تک تو نہیں کھینچا چلا آیا۔“ ثمر نے۔

”تم لوگ اپنی یہ بکواس بند نہیں کر سکتے۔“ وہ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔ سچ کہہ رہی تھی اور وہ

دونوں ہی متحیر ہی اسے دیکھنے لگیں۔ اس کا انداز کہیں سے بھی نارمل نہیں تھا۔ اس کا ہنسا ہوا چہرہ اور سرخی چھلکانی آنکھیں ارفع کو لگا وہ اندر ہی اندر جل رہی ہو۔

”ہم۔۔۔ ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے اربا۔“ ارفع کا لہجہ دھیمہ ہوا تھا۔

”دیکھا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”کچھ نہیں۔!“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اعصاب بکھرنے لگے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ ان کے سامنے ہی اپنا بھرم کھولے۔ ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔

رات جب وہ بیوی لاؤنج میں کوئی مودی دیکھ رہی تھیں امی نے اگر ان کے سروں پر ہم پھوڑا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے سامعہ کا فون آیا تھا۔“

”اچھا۔۔۔ کیا کہہ رہی تھیں؟“ ارفع نے بیوی پر سے نگاہیں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

”سامعہ بتا رہی تھی کہ ان کی ساس آنا چاہ رہی ہیں کراچی۔“ امی نے اتنا ہی کہا تھا کہ ارفع اچھل پڑی اور اربا جھم گئی۔

”خدا خیر کرے کیوں آنا چاہ رہی ہیں کراچی۔“ کچھ کچھ معاملہ بھانپ کر ارفع کے چہرے پر ہوا سائیاں اڑنے لگیں۔ آپہ کی باتیں تو ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھیں اور اربا کا دل اس کی آنکھوں میں دھڑکا تھا اس لمحے کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا در نہ ضرور مشکوک ہو جاتا۔

”پہلے پوری بات سن لیا کہ ارفع بیچ میں ٹوک دینے کی تمہاری یہ عادت مجھے زہر لگتی ہے۔“ امی برہم ہو میں وہ چلی ہو رہی۔

”سامعہ کہہ رہی تھی کہ اس کی ساس کو تمہمت پسند آئی ہو اور اسی لیے وہ پہلے ہماری مرضی جانا چاہ رہی ہیں تاکہ بعد میں باقاعدہ طریقے سے رشتہ مانگنے یہاں آئیں۔“

اربا کا ذہن سائنس سائنس کرنے لگا۔ وہ پھرانی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ امی کو سننے میں غلطی



ہوئی تھی یا پھر سامعہ کو سمجھنے میں۔

”کیا کیا کہا آپ نے۔ انہیں میں پسند آئی ہوں میں۔“ ارفع نے اپنی جانب اشارہ کر کے بے یقین سے دریافت کیا۔

”ہاں سامعہ نے تو یہی کہا تھا، اصل میں اس کی ساس نہمارے ناموں میں گڑبڑ جاتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے کہا تھا کہ بڑی والی جب سامعہ نے ان سے پوچھا کہ ارفع؟ تب انہوں نے جلدی سے تائید کر دی تھی کہ ہاں وہی۔“ اسی نے پوری تفصیل بتادی۔ ارفع نے ہونٹ بھیج لے تھے۔ ابھی اس نے اربا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ جس کی رنگت سفید پڑ چکی تھی۔

”آپنی کو غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ ارفع دھیرے سے بڑبڑاتی پھر کمری خیال کے آتے ہی اس نے چونک کر اربا کی طرف دیکھا۔

”نہیں آپ نے ہاں تو نہیں کر دی؟“

”ارے ایسے کیسے ایک فون پہاں کر دیں۔ ابھی تو میں نے تمہارے ابو کو بھی نہیں بتایا سوچیں گے۔ غور کریں گے تب ہی کوئی فیصلہ ہو گا۔“ اسی کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔

”لگتا ہے ارفع کا دادو وہاں سرچڑھ کر بولا ہے جی تو تین دن بعد ہی رشتے کی کل آئی۔“ ثمر خوشی سے چکی تھی اور ارفع کا بارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

”کہا بھی تھا میں نے آپلی سے کہ مجھے گاؤں میں کوئی انٹرنٹ نہیں ہے۔ نہیں بننا ہے مجھے کسی پینڈو کی دوہٹی پھر بھی یہ آپلی دشمنی کرنے پر تلی بیٹھی ہیں میرے ساتھ۔“ وہ غصے اور بے بسی سے مٹھیاں بھیج رہی تھی۔ ثمر نے آنکھیں پھاڑا کر دیکھا۔

”خدا کا خوف کرو ارفع۔ تمہاری زبان نہیں کاہنی زعیم بھائی جیسے ڈسٹنٹ اور گریس فل شخص کو پینڈو کہتے ہوئے۔ بلکہ کل تو تم خود بھی یہی کہہ رہی تھیں۔“ ثمر کا انداز ملامت کرنے والا تھا وہ سچ سچ شرمندہ ہو گئی۔

”میں وہ سب نہیں کہنا چاہ رہی تھی۔ یہ تو آپلی نے مجھے غصہ دلایا۔ مجھے ان سے بات کرنی ہی پڑے گی

میرے اتنے واضح انکار کے بعد بھی کیا سوچ کر انہوں نے یہ بات کی۔“

”میں تو بہت خوش ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زعیم بھائی کی اہل کو کم اور انہیں تم نے زنا انسپہا کر دیا ہے کہ ان سے ایک ہفتے بھی انتظار نہیں ہوا۔“ ثمر ان دونوں کی کیفیتوں سے بے نیاز اپنی نر دھن میں لگے جا رہی تھی۔

اربا کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ اسے ڈر لگنے لگے کہ اس کی دماغی نس ہی نہ پھٹ جائے۔ اس نے تو ان چند دنوں میں ہی بھر کا ہر رنگ دیکھ لیا تھا۔ ہر دکھ جھیل لیا تھا اور اب اس سے ہمیشہ کے لیے جدائی کا سوچا تو اس کے جسم سے جان نکلنے لگی تھی۔

”تمہاری کون سے لائبرری لگی ہے۔ جو تم اتنے دانت نکال رہی ہو۔“ ارفع نے ثمر کو کافی خوشنوار نگاہوں سے گھورا۔

”کیا میں نے تم لوگوں کو کبھی بتایا نہیں کہ مجھے زعیم بھائی کتنے اچھے لگتے ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”اچھا“ میں کہہ دیتی ہوں اسی سے میرے بجائے تمہارا رشتہ طے کر دیں۔“

”اگر انہوں نے میرے لیے رشتہ بھیجنا ہوتا تو بھئی باری بھیج دیتے۔ اب تو انہوں نے تمہارے لیے رشتہ بھیجا ہے۔“ اس کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھیں۔

اربا مزید اپنا ضبط آزمانے کے بجائے اپنے کمرے میں چلی آئی ارفع اس وقت اپنی ہی پریشانی میں الجھی ہوئی تھی ورنہ اس کی اڑی ہوئی رنگت اور خاموشی سے کوئی نتیجہ اخذ کر ہی لیتی۔

”تم نے یہ کیا کیا زعیم۔ تم میرے ساتھ ایسا کسے کر سکتے ہو میں تو تمہاری محبت میں اتنا آگے نکل آئی ہوں کہ اب پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہیں رہا اور تم تمہیں اس طرح مجھے بچ راہ میں جھوڑو دے۔ تم اپنی خاموشی کا یوں فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ تم میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا نہیں کر سکتے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اتنے دنوں سے دل میں جو ٹھن کی بھری ہوئی تھی

اسے جیسے نکلنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ اربا کو تو یہی سوچ نہیم جان کر رہی تھی کہ اہل کی اتنا بڑا فیصلہ زعیم کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتیں اور اگر زعیم کی مرضی اس میں شامل ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اربا سے اس کی آنکھوں نے جتنے بھی اقرار کیے جو بیان باندھے وہ وعدے و وعید۔ وہ پاگل کرتے جذبے وہ بے قراریاں وہ دارفعلی سب جھوٹ تھا فریب تھا اور وہ اس کی جھوٹی آنکھوں کی باتوں میں آکر اپنا سب کچھ ہار گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”میں نے صبح آپلی سے بات کی تھی۔“ وہ کنگ بورڈ پر سہاواں کٹ رہی تھی اور ثمر اسی وقت کالج سے واپس آئی تھی۔ ارفع نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا اربا کا کتنے کوئی چاہا کہ اگر زعیم کی کوئی بات کرنی ہے تو بچن سے نکل کر کوہ پھر چپ رہ گئی۔

”اچھا۔ کس سلسلے میں؟“ فرزح سے پانی کی بوتل نکال کر ثمر سلپ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

”نیر رشتے کے سلسلے میں پتا ہے آپلی نے ایک عجیب بات بتائی آپلی نے کہا کہ اہل کو تو ہم دونوں ہی پسند تھیں مگر زعیم نے میرے لیے ان سے پسندیدگی کا اظہار کیا تو ان کا ذہن کلیئر ہو گیا کہ انہیں کسے اپنی ہو جاتا ہے۔“

چھری کا کٹ مٹا کر کے بجائے اس کی انگلی پر لگا تھا۔ خون بھل بھل بنے لگا۔ اس کا دا۔ چاہا وہ یہ چھری اپنی کھائی پر ہی پھیر دے۔

”تو اس میں عجیب کیا ہے۔ اب تم اتنی بھی مہمی گزری نہیں ہو کہ کوئی تمہیں پسند ہی نہ کر سکے۔“ ثمر نے بات کو شرارت کا رنگ دے دیا۔ ارفع کی آنکھوں میں برہمی جھلکی۔

”کیوں اس مت کرو۔ مجھے عجیب اس لیے لگ رہا ہے کہ زعیم بہت فہمن بندو ہے مگر جو بات اس کے دل میں ہوتی ہے وہی اس کی آنکھوں اس کی زبان پر بھی ہوتی ہے اور اتنے دنوں میں مجھے ایک بار بھی کبھی ایک لڑکے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ مجھ میں اس

لحاظ سے دلچسپی لے رہا ہے۔ پھر اس طرح اچانک سے اس نے میرے بارے میں ایسا کیسے کہہ دیا۔“ وہ شدید الجھن کا شکار لگ رہی تھی۔

”اب کہہ دیا تو کہہ دیا تم کیوں ہاں کی کھال اتار رہی ہو اتنے زبردست انسان ہیں زعیم بھائی تمہیں تو خود پر رشک کرنا چاہیے کہ انہوں نے تمہیں چٹا۔“ ثمر بات سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اربا کی آنکھوں کے سامنے چہرے دھندلانے لگی تھیں وہ سنک کے پاس آکر اپنی جلی ہوئی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

”ہاں یہ بات تو آپلی نے بھی کی۔“ ارفع نے سر ہلایا۔

”انہوں نے کہا کہ میں جانتی تھی تم بہت ہنگامہ کرو گی مگر جب مجھے پتا چلا کہ اہل کے علاوہ یہ زعیم کی بھی خواہش ہے تو میں جیسے ہریات بھول گئی۔ یہ خوشی ہی ایسی تھی زعیم جیسا بہتر انسان میری بہن کا فیصلہ بنے اس سے بڑی بات میرے لیے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ آپلی نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ بتا سوچے سمجھے میں کوئی بھی فیصلہ نہ کروں۔ یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں کہ زعیم بہت اچھا انسان ہے مگر تم دونوں ہی جانتی ہو کہ میں نے کبھی گاؤں میں رہنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ اگر زعیم کے ساتھ گاؤں کا حوالہ نہ ہوتا تو میں سوچ لیتی۔ اچھا ہوتا یہ رشتہ اس کے لیے آتا۔“ ارفع نے بات ختم کر کے کمری سانس لی۔

”مگر زعیم بھائی نے تو تمہارے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔“ ثمر نے اسے یاد دلایا۔

”مجھے یہ بات بھی کلک رہی ہے اور اس لیے میں نے زعیم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”کھٹنے سے تمہاری کیا مراد ہے۔“ ثمر جو کئی ”کیا زعیم بھائی نے ایسا نہیں کہا ہوا گا۔ یا پھر آپلی کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔“

”کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو زعیم سے بات کرنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔“ وہ کہہ کر بچن سے نکل گئی۔

”یہ تمہیں کیا ہوا؟“ اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر ثمر نے سوال انداز میں اربا کو اچکا۔



”باز کٹ رہی تھی۔“ اس نے دیر کے کہہ کر نگاہیں چرائیں۔  
 ”مگر تم تو نماز کٹ رہی تھیں۔“ شمر کی نظر کٹے ہوئے ٹٹوں پر پڑ چکی تھی۔  
 ”مگر کیوں میرا دل چاہئے مگر ہو۔ چلی کیوں نہیں جائیں۔“ اس کا لہجہ تلخ ہوا تھا۔ وہ چند لمحے تو حیرت سے اسے دیکھتی رہی پھر کسی قدر حقل سے باہر نکل گئی۔ اسے یگانگت ہی بے تحاشا شرمندگی محسوس ہوئی۔

”کیا کر رہی ہوں میں۔۔۔ یا گل ہو گئی ہوں اس بیوفا شخص کے لیے۔“ سر قہام کر گری پر بیٹھتے ہوئے اس نے بے بسی سے سوچا تھا۔ آنکھیں پھر سے ڈبڈبائے لگی تھیں اس نے میز پر دھرے اپنے بازوؤں پر سر رکھ دیا۔

”تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا زعیم میں نے تمہارا کیا گناہ تھا اس پوری دنیا میں تمہیں میں ہی نظر آئی تھی وہ توقف بنانے کے لیے ایک طرف مجھے یا گل بناتے رہے اور“ اور دوسری طرف میری بہن کے ساتھ زندگی گزارنے کی پلانز۔ میں کیسے بتاؤں گی اسے تمہارے اس دھوکے کے بارے میں۔ تم نے تو کبھی مجھے اپنی زبان سے کوئی امید کوئی یقین دلایا ہی نہیں اور میں یا گل آخر تک یہی اس تھا رہی کہ تم اب مجھ سے کچھ کہو گے اب کہو گے اور تمہارے لیے تو یہ سب صرف ایک کھیل تھا محض وقت گزارنے کا ایک بہانہ میرے جذبات کا مذاق اڑا رہے تھے تم؟“  
 روتے روتے اس کے سر بھاری ہوئے لگا تھا مگر اندر نہ جانے کون سا دریا چڑھا تھا کہ آنسو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

”تم نے مجھے کیسے کا نہیں چھوڑا زعیم خدا کرے تمہیں۔“ وہ اسے بد دعا دیتے دیتے رک گئی دل کا ناپ سا گیا تھا۔ وہ اس کی دھڑکنوں میں بستا تھا۔ کیا وہ اسے بد دعا دے سکتی تھی۔  
 ”خدا کرے تم بھروسہ فراق جیسے لفظوں سے ہمیشہ نا آشتی رہو تڑپ اور بے قراری کبھی تمہارے دل پر

دستک نہ دے جسے چاہو وہ اپنی محبتوں اور چاہتوں سے تمہاری زندگی میں خوشیوں کے سارے رنگ بھر دے۔ بد دعا تو نہیں لیکن دعا کی گمراہیوں سے نکلی تھی کہتے ہی آنسو نیل کی چکنی سطح پر پھیلنے لگے تھے اسے احساس ہی نہیں تھا۔



ارفع نے آہی سے زعیم کا نمبر لے لیا مگر اب اسے جھک سی ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ زعیم سے کیا بات کرے گی اور کیسے بات کرے گی۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ ہاں میں ہی ہاں کے سامنے تمہارا نام لیا تھا مجھے تم میں ہی اپنا آئیڈل نظر آیا ہے تب اس کے پاس کیا کچھ کا کہنے کے لیے پھر اس نے ایک دم ہی تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنی انڈی بے خونی کے ساتھ گل ملائی۔ اگر اس طرح بچھکی پل رہتی تو پھر اسے جملہ عروسی میں ہی اس سوال کا جواب ملتا۔ زعیم نے دوسری ہی نیل پر کل ریسو کر لی تھی۔  
 ”ہیلو السلام علیکم۔“ اس کی بھاری۔ آواز سننے ہی ارفع نے سلام کیا۔  
 ”وعلیکم السلام۔۔۔ آپ!“ وہ چند لمحے رکا شاید الجھن میں پڑ گیا تھا۔  
 ”میں ارفع بات کر رہی ہوں کراچی سے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔  
 ”ارفع جی۔“ یہ سنتے ہی اس کی آواز سے بشارت چھلکی تھی۔

”کیسی ہیں آپ۔۔۔ دیے آپ نے بھی باتیں تو بھی میں پہچان گیا تھا آپ کو۔“  
 ”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ وہ بے یقینی سے بولی۔  
 ”بالکل نہیں۔۔۔ آپ کی آواز میں سے کچھ ایسا خاص کہ میں نے پہچاننے کی کوشش کی تھی نہیں سکتا تھا اور پھر ہماری کافی لمبی کنویریشن بھی ہوتی رہی ہے۔“  
 ”جی! وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پھر بھی میں حیران ضرور ہوں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا تھا۔  
 ”چلے اب حیران ہونا چھوڑ دیجیے اور یہ بتائیے۔“

”ارفع الفاظ سوچنے لگی اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے۔  
 ”ہاں تو سیکھے میں سن رہا ہوں۔“  
 ”مجھے اس رشتے کے بارے میں آپ سے بات کرنی ہے جس کے لیے کچھ دنوں میں آپ کی اہل کراچی آنے والی ہیں۔“ یہ کہہ کر ارفع نے دانتوں تلے ہونٹ دبائے۔

”اس بارے میں۔“ زعیم نے حیرت سے دہرایا۔  
 ”آپ کھل کر کہیں۔ کیا کتنا چاہ رہی ہیں۔“ اس کا دل عجیب سے اندیشوں سے لرز گیا اربا کے اکٹھے اکٹھے تیر تو وہ ہمیں دیکھ چکا تھا اور اب ارفع کی یہ فون کال۔ اضطراب نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا۔  
 ”مجھے آپ سے یہ جاننا ہے کہ آپ نے اپنی اہل کے سامنے میرا نام کیوں لیا۔ ہمارے درمیان تو کبھی ایسی کسی بات کا تذکرہ تک نہیں آیا اور پھر آپ کو پہلے مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔“ وہ حقل سے کہہ رہی تھی۔ لیکن زعیم کی سمجھ میں اس کی ایک بھی بات نہیں سامی۔

”بجدا مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ بے بسی سے کہتے ہوئے اس کے لہجے سے شدید الجھن جھٹک رہی تھی۔  
 ”افوہ! ارفع کچھ جھلائی۔  
 ”اجھا میں آپ کو شروع سے بتاتی ہوں۔“ ایک گمراہ ساس لیتے ہوئے وہ اسے پوری تفصیل بتانے لگی اور ادھر زعیم کا دل غمبک سے اڑ گیا اس کے اعکاش پر۔

”اوہ میرے خدا میں نے تو اہل کے سامنے اربا کا نام لیا تھا۔“ وہ جھکا کر رہ گیا تھا۔  
 ”کیا؟“ ارفع اتنے زور سے چیخی کہ زعیم نے بے اختیار موبائل کان سے دور نکال دیا۔  
 ”آپ نے اربا کا نام لیا تھا کیوں؟“  
 ”کیوں! کیونکہ۔“ زعیم کو سمجھ میں نہیں آیا وہ کیسے اسے یہ بات بتا دے جو وہ ابھی تک اربا سے نہیں کہہ پایا تھا۔

آج ہماری یاد کیسے آگئی آپ کو آپ تو خیر نہ بھولنے کا دعوہ کر کے ہی تھیں۔ مگر اتنی جلدی مجھے قطعی امید نہیں تھی۔ نہ بہت خوشدلی سے بات کر رہا تھا۔ ارفع کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔  
 ”اگر آپ کی مراد اس فون کال سے ہے تو یوں یاد کرنے کی زحمت تو آپ نے بھی نہیں کی۔“ وہ ہنس پڑا۔

”نکونہ کریں ارفع جی۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ پھر پنا رات اور دن کی تفریق کے آپ کے کھر کا فون مستقل بجنا ہی رہے گا اور زیادہ نہیں تو عارضہ سماعت میں جٹلا ہو کر تو آپ مجھے کوئے پر مجبور ہو ہی جائیں گی۔“ وہ کافی ہلکے ہلکے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مگر ارفع اس بات کی متنی تیزی محسوس کر کے عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی۔  
 ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“  
 ”کیسے ہیں آپ؟“ اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل اچھا نہیں ہوں۔۔۔ آپ نے اپنی بہن کی خیریت نہیں بتائی۔“ وہ ایزی ہو کر بیٹھ گیا تھا شاید۔  
 ”اربا۔۔۔ آپ اربا کی بات کر رہے ہیں۔“ اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ اربا نہیں جان زعیم کیسے آج کل میری جان عجیب سی بے چینی کے حصار میں ہے اس لیے مجھے یقین ہے وہ بھی ٹھیک نہیں ہوگی۔ زعیم نے بدقت خود کو یہ کہنے سے روکا تھا۔ آج اس لمحے ارفع کی آواز سن کر اس کا دل کتنی شدت سے چل اٹھا تھا اس دشمن جان کی آواز سننے کے لیے اس کی ہر دھڑکن اس کا نام چنے لگی تھی۔ اس نے بمشکل دل کو سنبھالا۔  
 ”جی۔ اچھی ہے وہ بھی۔“ ارفع نے کہا تھا اور اس کا دل بے اختیار چلا اٹھا۔

”بالکل اچھی نہیں ہے وہ۔۔۔ میری نیندیں حرام کر گئی ہے مجھے آگ میں جلتا چھوڑ گئی ہے اور اب پلٹ کر خبر بھی نہیں لے رہی وہ کوئل نزل لوکی اندر سے لکڑی بکھڑ ہوگی۔ کاش مجھے پہلے بتا ہوتا۔“  
 ”اصل میں۔۔۔ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہ رہی



”کیونکہ کیا؟“ اس بار اس کی آواز میں غصہ شامل تھا۔

”کیونکہ... وہ یہاں سے جاتے جاتے میرا دل بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ میرا قرار میرا چین بھی۔“ زین کے دھیمے پر جدت لہجے میں گئی کی اس بات نے ارفع کی سماعتوں پر پکلی سی گرا دی تھی۔ وہ چپ سی رہ گئی۔ یہ بات ایسی تھی کہ اس کے ذہن سے الفاظ ہی غائب ہو گئے تھے کچھ کہنے کے لیے حتیٰ کہ وہ حیرت کا اظہار بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

”آپ کی بہن نے بہت برا کیا ہے میرے ساتھ۔“ وہ جیسے شکوہ کر رہا تھا۔

”یہاں سے جاتے ہوئے اس کا موڈ جتنا خراب تھا اس نے تو پہلے ہی میری نیندیں اڑا دی تھیں اور اب یہ نئی مصیبت پہنچیں۔ وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ اگر مجھے پتا ہو گا کہ اتنی بڑی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے گی تو میں بھابھی سے بات کر لیتا بلکہ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا آپ دونوں کے نام ملتے جلتے ہیں شاید اس وجہ سے اہل کو مغالطہ ہو گیا ہو گا میں نے بھی دوبارہ ان سے بات نہیں کی یہ میری دوسری غلطی تھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ نے بروقت مجھے بتا دیا ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔“ اس نے سوچا بھی تو غمراہ تھا۔

”مجھے... مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اتنی بے وقوف احقر پاگل بھی ہو سکتی ہوں۔“ ارفع کے لہجے میں دنیا جہاں کی بے یقینی تھی۔

”میری نظروں کے سامنے اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے پتا بھی نہیں چل سکا۔ وہ میرے خدا کتنے گھنے ہیں آپ دونوں۔“ اس نے اپنا سر تمام لیا تھا۔

”اور یہ اربا... اس نے بھی مجھ سے یہ بات چھپائی۔ میں تو سمجھ رہی تھی آپ دونوں کے بیچ تو کبھی رسمی سلام دعا بھی نہیں ہوتی مجھے کیا پتا تھا میں تو پیر راجنھکا کی داستان دہرائی جا رہی ہے۔“ اس کی بے یقینی اب بتدریج غصے میں بدلتی جا رہی تھی۔

”خدا نہ کرے ارفع ان کی محبت کا انجام تو جدائی تھا۔“ زعیم کو کچھ ہوا تھا اس کی بات پر۔

”ہوں تو یہ بات ہے۔“ ارفع نے ایک گہری سانس لی۔

”جی ایسی ہی بات ہے آپ بتائیے۔ اربا کا رے ایکشن کیسا ہے۔ مجھے تو پورے کہ کہیں اس ناکرہ جرم کی پاداش میں اس نے مجھے اپنے دل سے بدوخل ہی نہ کر دیا ہو۔ میں تو ابھی تک اس کی بلاوجہ کی ناراضی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب کسے دلاؤں گا اسے اپنے بے گناہی کا یقین۔“ اس کے لہجے میں از حد پریشانی تھی۔

”یہ تو آپ کو ہی سوچنا ہے؟“ ارفع نے نیازی سے بولی۔

”اگر آپ مجھے اپنی ہونے والی سالی سمجھ کر یہ راز مجھ سے شیئر کر لیتے تو اتنا فیور تو میں آپ کو دے ہی دیتی۔ مگر اب ایسا کوئی چانس نہیں ہے اور جہاں تک بات ہے اربا کے رے ایکشن کی تو پہلے تو میرے ذہن میں دوردور تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا مگر سب یاد کر رہی ہوں تو اس کی چیز ٹاٹھ اس کے اترے ہوئے چہرے اور سرخ آنکھوں کا سبب سمجھ میں آ رہا ہے۔“ وہ! اس کے دل میں چیخیں سی ہونے لگی۔

”آپ ایک بار میری اس سے بات کروا سکتی ہیں پلیز۔“

”دل تو نہیں چاہ رہا۔ مگر کیا کروں۔ رعایت تو دینی ہی پڑے گی۔ بہنوں جو بننے جا رہے ہیں۔“ ارفع کا انداز ایسا تھا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”تھینک یو سوچ۔“

”اور ہاں ایک بات اوس۔“ ارفع کو اچانک ہی کچھ یاد آیا تو بول اٹھی۔

”آپ کو تو میں نے ہلکے میں چھوڑ دیا۔ مگر آپ کی اربا اب میرے ہاتھوں سے بچنے والی نہیں ہے۔ دیکھیے گا میں کیا حال کرتی ہوں اس کا۔“ اس نے ممکن حد تک لہجے میں سنگینی سمیٹی۔ وہ ہنس بڑی۔

”جو بھی کریں۔ بس اتنا دھن رکھیں کہ مجھے وہ بالکل صحیح سالم چاہیے۔ جیسی وہ یہاں سے گئی تھی

بالکل ایسی۔“ کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ آپ رکھیے میں دیکھتی ہوں وہ کہاں ہے پھر آپ سے بات کروا دیتی ہوں۔“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ تھوڑے پہلے یہ کل ملاتے ہوئے اس کا وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ معاملہ یہ رخ بھی اختیار کر سکتا ہے اور اب... سوچ سوچ کر اسے نئے سرے سے غصہ آنے لگا وہ اربا کو ڈھونڈتے ہوئے کمرے میں آئی تو وہ وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکل رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس آئی اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔

”اب جاسا جلیہ بے ترتیب سے بال جو دونوں پہلے کی گئی چوٹی سے نکل کر چہرے کے اطراف میں بکھرے تھے۔ ماند بڑی رنگت، ستا ہوا چہرہ آنکھوں میں تیرتی گہری اداسیاں وہ سر تپا اداسی کا مجسمہ بنی محسوس رہی تھی۔

”اس طرح گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ سرر سینگ نکل آئے ہیں یا چہرے پر مونچھیں۔“ اسے مسلسل اپنی جانب گھورتا ہوا کہہ رہی تھی۔

”اگر یہ دونوں باتیں واقع ہو جائیں تب بھی مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنا کہ۔۔۔“ وہ کتے کتے چپ ہوئی۔

”یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا؟“ اس کی آواز کی بھراہٹ محسوس کر کے ارفع نے ہچکا۔

”گلا بیٹھ گیا ہے شاید۔“ وہ کپڑے استری اسٹینڈ پر پھینک کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کس روڈ پر تو نہیں بٹھایا زبردستی۔“ اس نے طنز لہجے میں ہچکا تو وہ گڑبڑائی۔

”کیا مطلب ہے۔۔۔ میں کیوں روؤں گی۔“

”چلو دفع کرو۔“ ارفع نے بے زاری سے بات بدل۔

”تمہارے لیے کل ہے۔“ زعیم کا نمبر ملاتے ہوئے ارفع نے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔

”کس کا فون ہے؟“ اس نے موبائل تھانے کی کوشش نہیں کی۔

”بات کر لو۔ خودی پتا چل جائے گا۔“ ارفع نے سیل اسے پکڑاتے ہوئے تند لہجے میں کہا تو اس نے مزید کچھ کہنے کے بجائے تمام لیا۔

”ہلو! سیل کلن سے لگاتے ہوئے اس نے کچھ بے دلی سے کہا تھا۔

”اربا!۔۔۔ زعیم کی بے تاب سی آواز سنتے ہی وہ ساکت ہوئی تھی اور دل یوں خاموش ہو گیا جیسے اب کبھی دھڑکے گا ہی نہیں۔ مگر یہ صرف چند لمحوں کی بات تھی۔

اپنے آپ میں آتے ہی اس نے کل ڈسکنکٹ کر کے سیل فون مٹھی میں دبایا۔ دل میں جوار بھٹا سا اٹھنے لگا تھا اور سانسیں ناہموار ہو گئی تھیں۔

”کیا ہوا اربا۔۔۔ فون کیوں کٹ دیا؟“ ارفع جو پاس ہی کھڑی تھی حیرت سے دریافت کرنے لگی۔

”رانگ کل تھی۔“ اس نے موبائل اسے تھما کر کمرے سے نکلے کا قصد کیا تھا کہ ارفع نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

”ذلیل لڑکی رائٹ کل کو رانگ کل کہہ رہی ہو۔ مسئلہ کیا ہے تمہارا زعیم سے بات کیوں نہیں کی۔“ اسی اثنا میں موبائل بجنے لگا تھا۔ ارفع نے نمبر دیکھ کر کل ریسپونڈ کی۔

”ٹو بات کرو۔“

”مجھے نہیں کرنی ہے کسی سے بات میرا پیچھا چھوڑو۔“ زبردستی ارفع سے اپنا بازو چھڑائی اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ دوسری طرف ریسپونڈ کلن سے لگائے بے قرار و مضطرب زعیم کی سماعتوں تک سب آسانی پہنچ گئی۔

”کرنی پڑے گی۔ اپنا یہ ڈرامہ بند کرو اربا۔۔۔ نہیں تو میں تمہاری جان لے لوں گی پہلے ہی مجھے تم پر شدید غصہ آ رہا ہے۔“ خوشخوار لہجے میں کہتے ہوئے ارفع نے اسے بٹھایا اور خودی سیل اس کے کلن سے لگا لیا۔

”حلق میں پھندا سا لگ گیا تھا وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنے آنسوؤں پر بند بانہ ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔



”اربا۔۔۔ بہت ناراض ہو مجھ سے؟“ اس کی سانسوں کا طوفان محسوس کر کے زعیم کا لہجہ بکھرا تھا انتہائی ملول مگر محبت اور امانیت بھرے اس کے انداز پر اربا کے آنسو بے قابو ہو کر بہ نکلے تھے۔

”کچھ تو کو اربا۔۔۔ مجھے اپنی آواز سنا۔۔۔ تمہاری یہ ناراضی بھری خاموشی میری اذیت سوا کر رہی ہے۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

”اور جو تمہاری خاموشی نے مجھے دایر لٹکانے رکھا اس کا کیا؟“ یہ شکوہ اس کی زبان پر آتے آتے رکا تھا۔ ایک ہاتھ سے آنسو صاف کرتے اس نے دوسرے ہاتھ سے سیل پر گرفت جمائی۔ تو ارفع اس کے سامنے آ بیٹھی اور بغور اسے دیکھنے لگی۔

زعیم کو اس کی خاموشی پر بے چینی ہو رہی تھی مگر اربا نے کچھ نہ کہنے کی قسم کھا رکھی تھی شاید۔

”تم۔۔۔ تم جانتی ہو اربا۔۔۔ تمہیں پتا ہے میرے دل کا حال۔“ اس کا لہجہ لڑکھا رہا تھا۔

”نہیں میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ مجھے غیب کا علم نہیں آتا۔۔۔ میں تمہارے دل میں نہیں جھانک سکتی۔“ دل تو کب کا سب کچھ بھولے اس شکر کے سامنے جھک گیا تھا۔ مگر دل غائبی تک مزاحمت پر کمر بستہ تھا۔

”میں لمحہ لمحہ سلگا ہوں اربا۔۔۔ اور اب تم اس طرح بغیر کسی غلط شکوے کے بنا میری کوئی صفائی نہ مجھے سزا دو گی تو میں۔۔۔ میری جان پر یں آئی ہے اربا، پلیز مت کہو میرے ساتھ ایسا۔“ بے ربط سے جملے کہتے نہ جانے کتنی کیفیتوں تلے دب کر اس کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی اربا کو اپنا وجود پھٹتا محسوس ہوا۔

”میں آپ سے کس بات کی صفائی مانگوں اور کیوں۔“ بالا خرہ وہ بول پڑی تھی۔ بڑی دقتوں سے اس نے لہجہ نادل رکھنے کی کوشش کی تھی پھر بھی وہ چمک ہی گیا۔

ادھر اس کی آواز نے زعیم کے چنچٹے بکھرتے اعصاب کو کسی نرم مہلن ہاتھ کی طرح چھوا تھا سارا تھا۔

اضطراب بل میں اڑ چھو ہو گیا۔ سکون کی ایک میٹھی لہ اے اندر تک شانت کر گئی تھی۔

”آپ نے مجھے ایسا کون سا یقین دلایا۔ جس کے بل بوتے پر میں آپ سے کچھ پوچھ سکوں۔“ توقف لگتی ہوں آپ کو یا ناگل آپ اپنی انا قائم رکھنے کے لیے اقرار کے دو لفظ نہیں کہہ سکتے اور میں اپنی عزت نفس روند کر آپ سے اس پار کی ہیک مانگوں جو شاید کبھی ہمارے درمیان تھا ہی نہیں۔“ وہ یا تو بول ہی نہیں رہی تھی اور اب بولنے پر آئی تو دل میں بھر اسارا غبار نکالتی چلی گئی۔ اس کا پس چلتا تو زعیم کا گریبان ہلکا کر ان گزرے دنوں کی اذیتوں اور تکلیفوں کا حساب مانگتی۔ جب وہ انجانے خدشوں اور اندیشوں میں کھل کھل کر آدھی رہ گئی تھی۔ محض زعیم کی زبان بندی کے سبب۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔“ زعیم کے اعصاب جھنجھو اٹھے تھے۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔۔۔ مجھے لگتا ہے آپ کو صرف یہ دیکھنے کی چاہ تھی کہ آپ کس حد تک کسی کو اپنا اسیر بنا سکتے ہیں۔ تو بس دیکھ لیا آپ نے پتا چل گیا آپ کو۔۔۔ اب آپ ساری زندگی اپنی انا کو اس بات سے تسکین دیتے رہیں کہ ایک لڑکی کس طرح آپ کے عشق میں دیوانی ہو گئی تھی۔“ اس کا غصہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ ارفع بے حد چربی کے عالم میں اس کا بھیجا ہوا سرخ چہرہ تک رہی تھی۔ اس نے کب سوچا تھا ان کی اتنی کمری وابستگی کا۔

”اربا! ربا خدا کے لیے ایک بار میری بات سن لو۔“ زعیم ناگل سا ہو گیا تھا اس کی اس قدر بدگمانیوں پر وہ تو اس سے اتنی دور بیٹھی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اپنی دیوانگی دکھا بھی نہیں سکتا تھا۔

”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔۔۔ کاش تم میرے پاس ہو تیں تو۔“ وہ بے بسی سے کہتے کہتے رکا تھا۔

”جب پاس تھی تب کہاں تھے؟“ اس کا لہجہ تلخ ہوا تھا۔

”تب۔۔۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”تب میں سوچتا تھا جب تم۔۔۔ پوری طرح سے میری دسترس میں ہو گی۔ جب جب ہمارے بچ کو کوئی دوری نہیں رہے گی تب میں تمہیں میرا ہر عمل نہیں بتانے گا کہ تم میرے لیے کیا ہو۔۔۔ میں بہت جذباتی بندہ ہوں اربا اور تم سے ملنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تو پاگل بھی ہوں۔“ اس کے لہجے سے چمکلتی وارفتگی اس کے ہر احساس سے لپٹ رہی تھی۔ اس کی ساری مزاحمت دم توڑنے لگی۔

”کیوں آزیما انتا پہلے کیوں نہیں کہا یہ سب۔“ آنسو پھر سے اس کے رخسار تر کرنے لگے۔

”اپنے آنسو صاف کر لو اربا۔۔۔ مجھ تکلیف ہو رہی ہے۔“ وہ بے حد نرم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”آپ کو کیسے پتا۔“ اس کے ہاتھ بے اختیار اپنے گیلے رخساروں پر گئے۔

”میرا دل تو تجھے تمہاری ہر ہوجمل سانس کی خبر دے دیتا ہے پھر تمہارے آنسوؤں کی نمی محسوس کیسے نہ کرتا۔“ زعیم نے دھیرے سے جس محبت بھرے انداز میں کہا۔ اس کے آنسوؤں میں دیوانی آئی۔

”میں جانتا ہوں تم بہت ہرٹ ہوئی ہو۔ مگر یہ ساری گریز اس غلط فہمی کی وجہ سے ہوئی یا پھر شاید میری جلد بازی کی وجہ سے لیکن میں کیا کرتا میرے دل کی بس ایک ہی خدشہ تھی کہ اس بار جب تم میرے سامنے آؤ تو بیشک ہمیشہ کے لیے میری بن کر آؤ۔“ مجھ سے نہیں رہا جا رہا ہے تمہارے بنا تم یہاں نہیں تو دل کو ایک تسلی تو تھی کہ میں جب چاہوں تمہیں دیکھ سکتا ہوں مگر جب تم چلی گئیں تو ہرل۔۔۔ جیسے میرے لیے ایک آزا نش بن گیا اور میں پھر بھی انتظار کر لیتا اگر تم جاتے ہوئے میری جان نہ نکال جائیں۔“ اس کے پجاری لہجے میں بے تحاشا شکوے تھے اربا کا من جل چھل ہونے لگا۔ کتنی بدگمان ہو گئی تھی وہ ان چند دنوں میں وہ تو پاگل ویسا ہی تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بے تاب اور بے قرار۔

”تم تو اتنی ظالم ہو ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہیں

کہ تمہارے اس بے جا کجی بھرے رویے نے کیسے میرے دل کو طوفانوں کے حوالے کر دیا ہے۔“ مجھے محسوس ہوا کہ اب اگر میں نے دیر کی تو کہیں میں تمہیں ہمیشہ کے لیے نہ کھو دوں۔ اپنے تئیں میں اہل کے سامنے تمہارا نام لے کر مطمئن ہو گیا تھا مجھے کیا پتا تھا۔ وہ اتنی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو جا میں گی۔ وہ تو ارفع نے مجھے فون کر کے بتا دیا تھا نہیں تو۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”آم سو ری اربا۔۔۔ آم سو سو ری۔“ وہ قدرے توقف سے بولا۔

”جب غلطی آپ کی ہے ہی نہیں تو سو ری کیوں بول رہے ہیں۔“ وہ اب خود کو سنبھال چکی تھی۔

”کیسے نہ کروں۔“ پچھلے پندرہ منٹ میں تمہاری اس خفگی نے میرا آدھا خون تو خشک کر ہی دیا ہے ذرا دیر اور ناراض رہیں تو کہیں جان سے ہی نہ گزر جاؤں۔“ وہ ہنس کر بولا تھا۔

”زعیم۔“ اس کی آواز کانپ گئی تھی اور زعیم کا دل چاہا وہ بل میں یہ سارے فاصلے سمیٹ لے اس سے مل کر اپنی زندگی بنالے۔

”میں نے آپ کو بہت سنا دیا نا۔“ وہ نادم سی کہہ رہی تھی۔

”بہت اچھا کیا غصے میں ہی سہی تم نے یہ اقرار تو کیا کہ تم بھی میرے عشق میں دیوانی ہو گئی ہو۔“ اس کے شونخ لہجے پر اربا کا رنگ گلابی پڑا تھا۔

سامنے بیٹھی ارفع جو کافی دیر سے اس کے تاثرات اور ایک آدھ جملے سے منہموم اخذ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اب باتوں کا رخ بدلتا محسوس کر لیا تھا۔ اندر آتی تمر کو اشارہ کر کے وہ اسے دھکیلے ہوئے باہر لے آئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

”یوں سمجھ لو۔۔۔ یہاں ڈونٹ ڈسٹرب کا بورڈ لگا ہوا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شہر اب بھی۔



# رکشا لالہ



”ارباں! بہت کر رہی ہے؟“  
 ”زعیم سے۔“ اربا نے اربا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”زعیم بھائی سے؟“ شمر کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور اربا نے اسے پوری بات بتادی۔  
 ”وہ بھائی گاؤ۔“ شمر نے سر ہٹا کر لیا۔  
 ”اربا نے تم تو خود کو فیس ریڈنگ ایکسپٹ کرتی ہو نا پھر بھی تمہیں اتنا پتا نہیں چلا کہ۔“ وہ اب بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
 ”بس کہ۔“ میں پہلے ہی خود کو کافی شرمندہ کر چکی ہوں۔“ اربا نے جھینپ لئی۔  
 ”پتا نہیں میں اتنی بدحواس کب سے ہو گئی۔ جانتی ہو شمر میں وہاں زیدہ کے لیے لائن کلیئر کرنے کی کوششوں میں تھی۔ تنہیک گاؤ مجھ سے کوئی بڑی حماقت نہیں ہوئی۔“ وہ جھجھکی لے کر رہ گئی۔  
 ”چلو اپنی اس غفلت کا ازالہ تو تم نے آج زعیم بھائی کو فون کر کے کر دیا۔ دیے میں شروع سے ہی تمہارے اور زعیم بھائی کے رشتے کے حق میں نہیں تھی۔“ شمر نے جس طرح اچانک سے پیتر ابد لا اربا ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔  
 ”کہاں تم جیسی شعلہ مزاج لڑکی اور کہاں زعیم بھائی جیسے نرم اور ٹھنڈے مزاج کے انسان ان کے لیے تو اربا جیسی لڑکی ہی ہونی چاہیے۔ سو فٹ سویٹ اینڈ سہیل۔ کیوں؟“ آنکھوں میں شرارت لیے مسکراہٹ چھپائے وہ کہہ رہی تھی۔ اربا اس کی شرارت سمجھ گئی پھر بھی کمر ہاتھ رکھے وہ چند لمحے تو اسے گھورتی رہی پھر کایک ہی ہنس پڑی تھی۔  
 ”واقعی۔ یہ دونوں صرف ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔“ سینے پر ہاتھ باندھے وہ دروازے سے سر نکا کر محبت سے اربا کو دیکھنے لگی۔  
 ”میں بہت خوش ہوں شمر مجھے بس ایک ہی افسوس ہے۔“  
 ”وہ کیا؟“ شمر جو تھی۔  
 ”اربا بہت دور چلی جائے گی آپنی کی طرح اور پھر

میں بڑی بدھی کبھی ملاقات ہوگی۔“ اربا نے کچھ لمحے میں اواسی تھی۔ اربا صرف اس کی ہنس ہی نہیں اس کی بہترین دوست بھی تھی۔  
 ”سو تو ہے۔“ شمر نے سر ہلایا۔ پھر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔  
 ”لیکن تم فکر مت کرو۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ جہاں تمہاری شادی ہوگی وہاں میرے لیے بھی ایک ڈھونڈ لیتا تھیک ہے۔“ اس کے شرارت بھرے لہجے پر اربا نے اسے ایک دھپ لگائی تھی اور پھر دونوں ہی ہنس پڑیں۔  
 ”اور زعیم اربا سے کہہ رہا تھا۔“  
 ”یہاں میرے علاوہ کوئی اور بھی ہے جسے شدت سے تمہارا انتظار ہے۔“  
 ”کون؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔  
 ”ہے تمہارا ایک دوست۔“ اس کی آنکھ پر رونے

مجھ سے یہی سوال پوچھتی ہے۔ اربا بک آنے کی اور میں کہتا ہوں اس بار وہ صرف میرے لیے آ رہی ہے تمہیں تو میں اس کے آس پاس بھی نہیں بھٹکنے دوں گا۔ بہت جلد لایا میرا لڑکی۔“  
 ”اوہ! اس کے آخری جملے پر اربا جھل ہوئی تھی۔  
 ”میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ لڑکی میری زندگی بن گئی ہے۔ میری سانسوں میں شامل ہے۔ میرے وجود کا حصہ ہے۔ وہ بے خود ہوتے لہجے میں کہہ رہا تھا یا تو چپ کا قتل ہونٹوں پر ڈال رکھا تھا اور اب جب اس چپ کا جادو ٹوٹا تو ایسا ادا امانہ اظہار کہ اربا کے دل میں ہزاروں چراغ ایک ساتھ جل اٹھے تھے۔ روشنی ہی روشنی پھیل گئی تھی اندر بھی اور باہر بھی وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے چہرے پر دھنک رنگ پھیلنے جا رہے تھے۔

دلوں میں سیندر موجزن تھے اور انتظار کی مختصری مدت ابھی باقی تھی۔ مگر انتظار کی یہ تڑپ اس روح پرورد احساس سے زیادہ نہیں تھی کہ یہ دوری بس چند روزہ ہے۔ مگر رت کے آنے میں اب زیادہ دیر نہیں۔“



اٹھیں گے گولی مارے لڑکی کھل رہے۔  
ہائے اٹھیں گے گولی۔  
گناہین موقع کی مناسبت اور اس کے جذبات کی  
بھرپور عکاسی کرتا ہوا تھا۔ مگر منہ میں پان ہونے کے  
باعث وہ ٹھیک سے گانیں پار تھا۔  
سرور سے آنکھیں سکیڑے، منہ میں دبے پان کو  
دائیں سے بائیں جانب منتقل کر کے بڑی بے نیازی  
سے منہ سے ایک گل رنگ پچکاری مار کے ٹوٹی پھوٹی  
شکستہ حال سڑک کو سجانے میں گویا اپنا حصہ ڈالا اور  
پچکاری بھی نہایت خوش اسلوبی و کامیابی سے دور تک  
پھیل بولے بناتی گئی۔ اس نے فاتحانہ سامنے اور برکی  
جانب لگے چھوٹے سے شیشے میں اپنی سرمہ لگی  
آنکھوں میں دیکھا۔ گویا کارہائے نمایاں انجام دینے پر  
خود کو سراہ رہا ہو، پھر ٹھکڑے پالے پال ایک اواسے اٹھا کر  
ماٹھے پر پھیلائے پرانے زمانے کے ہیرو کی طرح اکڑ  
کے پیٹھ کے پھر گنگنا شروع کر دیا۔  
”وئے لڑکی کھل رہے بھی۔ آنکھوں سے گولی  
مارے۔ ڈشکل۔ ڈشکل۔“

گالے میں اپنی مرضی اور پسند کے الفاظ کا اضافہ وہ  
بیش بہت آسانی سے کر لیا کرتا تھا اور مندرجہ بالا گالے  
میں تو اس کا پورا اندر ”لڑکی“ اور اس کی آنکھوں سے  
”گولی“ پر تھا۔ باقی گالے کے لفاظی و قافیہ بندی جیسی  
مرضی ہو جاتی اسے چنداں فرق نہ پڑتا۔  
سیدھی دودھ سڑک سے دائیں جانب بلی سڑک  
پر گڈی نکال کر وہ گلیوں کو چوں سے کھوتا کھاتا محلہ  
فاروق آباد کے اس جلی دار نیلے چوبارے کے تنگ  
سے اڑتے رنگ والے دروازے کے سامنے آ رہا جو  
گزشتہ چند روز سے اس کی امید و توجہ کا مرکز بنا ہوا  
تھا۔ ہوش و حواس کی چلتی پھرتی دنیا میں تو وہ سرور کی  
لہروں میں بہتا ہی رہتا۔ مگر اب تو خواب میں بھی اسے  
اکثر یہ نیلے چوبارے کی دائروں والی جالیاں دکھائی دینے  
لگی تھیں۔

رنگ اڑے دروازے کے اوہ کھلے کواڑے  
بکھرے بالوں والی ایک چھوٹی لڑکی نے یوں منہ نکال کر

جھانکنا جیسے چوڑا انڈے سے نکل کر حیرت سے دنیا  
ٹھنکا ہے۔ اسے دیکھ کے وہ واپس مڑی شاید اس کی  
”گڈی“ کی کھٹ کھٹ سن کر تصدیق کرنے ہی آئی  
تھی اور اب خبر بنی اندر اطلاع دینے بیٹھ بھاگی۔  
کچھ ساعتوں بعد نیم تاریک کھلے کواڑے پر وہی قاتل  
حسینہ نمودار ہوئی۔ سیاہ چادر میں ملفوف وجود اگر پچھلی  
نشست پر بیٹھ گیا۔ جس کی گڈی کو گڈی کننا یقیناً  
زیادتی تھی۔ اب وہ لڑکی کے ایک بیچ سے کچھ ہی  
فرق رکھتی ہوگی۔ کبھی اس پر فوج نہیں تھا۔ مگر اب اس  
نے اپنی طرح اس گڈی کا ڈھیان رکھنا بھی چھوڑ دیا  
تھا۔ مگر اتنی شاہانہ سواری کے بعد بے ساختہ وہ اپنے  
آؤر کشا کو چکا چلتا کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی  
لش ہٹس کرنے کا سوچ رہا تھا۔  
لڑکی نے آتے ہی معمول کی طرح نگاہ سامنے شیشے  
میں ڈالی۔ وہ جب جب نگاہ اٹھا کے شیشے میں دیکھتی تو  
اسے لگتا کہ شاہ کر کے گولی اس کے دل میں پیوست  
ہو جاتی۔ اسی لیے وہ آج کل مشہور فلمی گانا ہر دت  
گنگنا رہتا۔ مگر اب اس کے لبوں پر قفل لگ گئے  
تھے۔

لڑکی اپنی بڑی بڑی قاتل آنکھوں میں بھر بھر کے  
کاہل لگائی گویا اس کے جذبات کو وہ کالی۔ وہ باقاعدہ  
نقاب نہیں کرتی تھی۔ مگر سیاہ چادر سے آدھا چہرہ  
چھپائے رکھتی۔ گود میں دھرے ہاتھ دیکھ کے اسے  
لگن ہوتا جیسے کبوتر کے بچے نے نئے نئے سفید  
کول سے پر نکالے ہوں۔ اس کا جی چاہتا کہ اس کا  
آدھا چہرہ بھی کھل جائے نقاب سرک جائے اور وہ سیر  
ہو کر نظارہ کر لے۔ ڈھکی چھپی چیزیں جذبات میں  
ویسے بھی خوار بھانسا اٹھاتی ہیں۔

حسینہ بیٹھ کی طرح نزاکت سے سیکڑا دائیں  
طرف بیٹھ گئی تھی۔ یہ اس کی شرافت تو تھی ہی مگر  
دوسری سواری کے جنم اور پھیلاؤ کے باعث یہ فعل  
مجبوری بن کر رہ جاتا تھا۔ کیونکہ ڈیل ڈیل میں وہ لاہور  
کے کسی بھی پہلوان کو مات کرتی ہوئی تھی۔ اس نے  
بیک مرر میں گہری نگاہ ڈال کر چابی کھائی اور رکشا

اشارت کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ گلی  
کشا تو تھی۔ مگر کچھ روز قبل ہونے والی کھدائی کے  
بعد دوبارہ برابر کرنے پر بھی برابر نہ ہوئی تھی۔  
وہ اونچی پٹی گلی میں ست روئی سے رکشا چلا رہا تھا،  
کیونکہ وہ گلی پار اس وسیع الوجود سواری کو لینا نہیں  
چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی اس کی مجبوری ہی تھی۔ ان دونوں  
نے یہ رکشا اکٹھے لگوا لیا تھا۔ انہیں محلہ فاروق آباد سے  
لے کر سرائی اسکول تک لے جانا اور واپس لانا اس کی  
ذمہ داری تھی۔ اب رکشا ایک اور دروازے کے  
سامنے تھا۔ اس کے گھنٹی بجاتے ہی کوئی دھم سے آکر  
پچھلی نشست پر لدا تھا۔ کم از کم اسے تو وہ بیٹھنا نہ لگتا۔  
کیونکہ اب تک اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے اس نے  
جتنے بھی وسیع الوجود بشر دیکھے تھے یہ ان سب کو مات  
کرتا ہوا تھا اور وہ تو اسے انسان بنانے کو بھی تیار نہ تھا۔  
محض سوئذ کی کمی کے سبب کوئی بھی انسان کھلوا سکتا  
ہے بھلا؟

”آئے ہائے نی! آج تو بہت جلدی آگئی، میرا  
ناشتا کرنا بھی محال کر چھوڑا ہے، اوہراک نوالہ تو تو  
اور یہ رکشے کی پھٹ پھٹ کان چھانڑنے لگتی ہے۔“ وہ  
معمول کی طرح بے تکلفی سے اپنا بھاری بھر کم ہاتھ  
سیل کے نازک ہاتھ پر رکھ کر وہ کھٹکھٹ پھولنے کا آغاز  
کر چکی تھی۔ ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ میں دبے آلو  
کے پراٹھے کو رول کیے لٹے بھی لیتی جاتی اور بولتی  
جاتی۔ یہ اس کی پختہ عادتوں میں سے تھی۔ یوں لگتا  
پورا دن بیٹھ کر وہ ایک ایک بات اپنی چڑے کی بوتلی  
میں باندھ دیتی ہو اور رکشے میں سوار ہوتے ہی نکل  
نکل کے اپنی زبان کے جوہر دکھاتا۔ شروع کر دیتی  
ہو۔

اسے رہ رہ کے غصہ آتا۔ موٹی کی صورت اسرافیل  
جیسی آواز کے سامنے اس نازک اندام و دھینڈھ کے  
دھبے سر تو بالکل ہی دب کر رہ جاتے۔ لی الوقت تو  
شوکت عرف شوزا کو اس کے منافقانہ بیان اور اس کے  
رکشے پر لگائے گئے الزام یعنی پھٹ پھٹ پر بری طرح  
تو آیا تھا۔ اس نے غصے سے بے احتیاطی سے سامنے

آیا کھڈا پار کیا تو موٹی رید کے گیند کی طرح اچھلی۔  
”وئے پانی (بھائی) آرام نال چلا رکشا۔“ شوکی کو  
اس بدلے پر برا لطف آیا۔  
یہ درست تھا کہ رکشے کی حالت بہت ابتر تھی۔  
باڈی کا رنگ و روغن یوں اڑ چکا تھا جیسے کسی نے  
تیزاب کے تالاب میں ڈبو ڈبو کر اسے گنا گناشن دے  
دیا ہو، جس کے نتیجے میں وہ انتہائی رنگ ہو چکا تھا کہ اس  
کے صحیح رنگ کے اندازے لگانا ہر فرد تمام رنگوں کو  
باری باری سوچ کے تھک ہار کے مستزکر رہتا تھا۔

سالموں بے احتیاطی سے استعمال اور عدم نوچہ کی  
بدولت رکشے کی سیٹ کی گڈی یوں ہو چکی تھی جیسے  
دھولے کے ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر کسی صحت مند  
انسان کی کھال اوڑھ دی گئی ہو اور وہ ہڈیوں کا انجریٹ  
بننا اپنی معیاد پوری کر رہا ہو۔ مگر ان تمام خامیوں کے  
باوجود وہ فخر سے سینہ پھلائے پھرتا کیونکہ اس کا رکشا  
”سی این جی“ تھا۔ اس لیے نا صرف اسے وہ بے حد  
اہم لگتا، بلکہ جانے والے دیگر رکشوں والوں کے  
سامنے وہ اس کا برملا اظہار بھی دھڑلے سے کرتا تھا۔  
شوکی یعنی شوکت علی سات بچوں میں چھٹے نمبر پر  
تھا۔ اس کے باپ نے اپنی پوری زندگی ایک ریڑھی پر  
مختلف سامان لگا کر گلی کو چوں میں پھر پھر کے اور چوک  
میں کھڑے ہو کر فروخت کرتے ہوئے بسر کی یہ سامان  
موسم کی نوعیت کے ساتھ بدلتا رہتا۔ گرمیوں میں  
ریڑھی پر ”ٹھنڈے ٹھار گولے“ کے لفٹوں سے سج  
بینر کے ساتھ برف اور مٹھاس سے بھرے مختلف  
رنگ سج جاتے سردیوں میں وہ لنڈے سے —  
پانچ پانچ روپے میں لٹنے والی جریاں سوسٹر اور  
مقفلے آنا اور اسے تین گنا میں بھی فروخت کرتا تو

مقفلہ رقم نہایت تھا۔  
اس سے بڑے دھنڈائی تھے چوباب کے نقش قدم پر  
چل کر ان ہی چھوٹے موٹے کاموں میں بڑ کر زندگی کی  
گاڑی کھینچ رہے تھے۔ پھر تین بہنیں تھیں جنہیں بیاہ  
کر لینے پر دھری سلب سرکائی جا چکی تھیں۔ ان کے  
بعد شوکی اور چھوٹے لڑکے کا نمبر آتا تھا۔ تمام بن



بھائیوں کی طرح شوکی نے پرائمری کے بعد ہی تعلیم کو خیرباد نہ کہا بلکہ جیسے تیسے ریاضت اور کھیت کھیت کر ایف اے تک پہنچ ہی گیا۔ مگر براہون سینما کی رنگین دنیا کا کھنک کے بے باک دوستوں کے ساتھ وہ اس لت میں ایسا برا بھسا کہ باقی بھر ہرشے سے دلچسپی اٹھ گئی۔ دوستوں کا ٹولہ کلاس چھوڑے فرانے بھرتی موسٹرائیڈوں پر شہر کی سڑکیں تاپتا پھرتا اور پھر شونام ہونے پر سیدھا سینما کا رخ کرتا۔

اس نے دیری مگر جیٹی پنجاب دی، پنڈا باؤ، وحشی جٹ، جیسی فلمیں دیکھ دیکھ کر اپنا حلیہ بھی کم و بیش ایسا ہی کر لیا تھا۔ قمیص کا گریبان کھلا رہنے لگا۔ نئی نئی چڑھتی جوانی کے باعث اس کا خون جوش مارا اور وہ زرانے کی طرح گردن اونچی کیے کبوتر کی طرح سینہ پھلائے ہر ایک سے پنگا لیتا پھرتا۔

پان کھانے کی لت بھی اسے وہیں سے لگی تھی۔ ٹھنڈے پانی کے پتل میں تر کر کے تھپتھپا کر پھیلائے رکھنے کا اندیشہ بھی انہی فلموں سے لیا گیا تھا۔ ”نہ جتنا“ تیل اس کے پورے چہرے پر چمکتا ہوا نظر آتا اور رنگت مزید سنولائی ہوئی محسوس ہوتی۔ یہ بد معاشی دور یوں ہی چلتا رہتا اگر ایک روز اس کا ہاسینما کے سامنے اپنی ریزمی لگائے نہ بیٹھا ہوتا اور پڑھائی کے اوقات کار میں سینما سے نکلے اپنے سپوت کو خوش بخوابی گانا گنگنا تے ہوئے منہ میں تیلی دباے عجیب و غریب چلے میں برآمد ہوتا نہ دیکھ لیتا۔

اس صورت حال نے باپ کی غیرت کو بری طرح لٹکا رہا تھا۔ شوکی پر جھڑپ اور گردن سے پکڑے یوں گھر لایا جیسے گھر سے بھاگ جانے والی لڑکی کو کھیت کے لایا جاتا ہے۔ اپنے اس لڑکے سے اسے بڑی امیدیں تھیں جو کچھ کھانچ کر کالج جا پھنچا تھا۔ پھر بے شک وہ گیارہویں میں ہی ٹپل کیوں نہ ہو گیا ہو۔ مگر خاندان بھر میں کوئی اتنا قاتل نہ ہوا تھا کہ کالج کا گیت بھی پار کر سکتا۔

وہ تو اپنے لڑکے کی افسری کے خواب بھی دیکھنے لگا تھا۔ مگر حالات تو کچھ اور ہی تھے۔ پھر اس دن ماجے کے

ہاتھ میں جو چیز آئی اس نے اسی سے شوکی کو یوں دھنک کر رکھ دیا جیسے انڈے کو پھینچنا جاتا ہے۔ پھر شوکی کی زندگی میں اس تشوئے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ پورا مہینہ زخم سینکے کے بعد جب وہ جھلکا سی چارپائی سے اٹھا تو باپ کے بتائے ہوئے رستے پر چلنے کے لیے مکمل طور پر ناکاہ تھا کہ اب اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہ تھا۔ وہ اس کے دیے علم بجالانے کے لیے ذہنی و جسمانی طور پر تیار تھا جو کہ یقیناً ”کول گے“، ”املی“، ”اکو بخارے“ کے شہرت مند ریزموں یا پھر اصل سی ہولوں سروائی جیسی کسی ریزمی کے متعلق ہوتا۔

مگر مکمل یہ ہوا کہ ماجے نے اسے ریزمی دوانے کی بجائے اپنی میٹھی کے پیوں سے رکشالے دیا۔ شوکی مسرت و انبساط سے پھول کر چھت کو جالگا۔ یہ نسبتاً عزت والا کام تھا۔ ناکور سی این جی رکشا اور اس پر جم چم کرتی رنگین باڈی اسے اپنی لکڑی ہونے کے احساس سے سرشار کرنے لگی۔

اس دن اس نے کڑکڑ کرتے لٹھ کے سفید شلوار سوٹ پر جما جاکے استری کی اور پین کے رکشے میں آ بیٹھا اور چلانے سے قبل وہ تمام دعائیں پڑھ کر خود پر اور رکشے پر پھونک ماری جو بچپن میں مولوی صاحب نے اپنی بید کی چھڑی اس پر دالمانہ برسا کر اڑ کر کوئی تھیں۔ چالی گھنٹہ رکشا آہستہ سے آگے بڑھایا تو یوں لگا جیسے وہ ممکن پر تیر رہا ہو۔ اپنی چیز کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔

چھوٹی صاف سڑکوں سے ہوتا ہوا جب وہ ٹریفک کے سیل رواں میں اپنی ناڈے کر داخل ہوا تو ہر طرف سے بچ بچانے آگے بڑھتے ہوئے اسے چونہ ملتی روشن ہونے کا حقیقی مفہوم سمجھ آیا تھا۔

ہم لائے ہیں طوفان سے کتنی نکل کے کے مصداق اسے قوی یقین ہو چلا تھا کہ مندرجہ بالا شعر میں عظیم شاعر نے جنیں بچو کہہ کر مخاطب کیا تھا ان کا سربراہ سپہ سالار وہی ہے اور جان ہتیلی پر رکھ کر اس پر ہجوم سڑکوں کو روندتے رنگیدے ذرائع آمد رفت میں سے اپنی چھوٹی سی لکڑی کو نکالنا بلاشبہ جوئے

شیر لانے کے مترادف ہی تھا۔ یوں گلن ہونا کہ تیز رفتار گاڑیاں سڑک اور لڑائیاں اس کے اوپر چڑھ دوڑیں گے، پھر یہ خوف بھی رفتہ رفتہ زائل ہو گیا اور وہ ایک مشتاق تیراک کی طرح سبک انداز میں رکشا چلانے میں ماہر ہو گیا۔

ایک اور انوکھا تجربہ اسے پہلی بار ہوا، آنے والی منت نی اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والی سوار یوں کے مشاعرے اور ان کی ذہنی و خفیہ نوعیت کی گفت و شنید پر کلن لگا کر رکھا ایک بے حد دلچسپ عمل تھا۔ کمانے کے ساتھ ساتھ بیٹھے بیٹھے تعزیر کی ایک سبیل بن گئی تھی۔ لوگ پر سکون ہو کے بے پروائی سے یوں باتوں میں مشغول ہوتے گویا رکشا والے کے کلن یا تو پیدا نشی طور پر ناکاہ ہوں یا پھر رکشا خریدنے کے بعد ان پر لینڈیشن کروائی گئی اور اب وہ حس سماعت سے قطعی نااہل ہو چکے ہوں۔ مگر دوسری جانب حالات قطعی مختلف تھے۔ شوکی کو یوں لگنے لگا تھا جیسے اس کے کلن کسی اٹھیل جس کے دوارے کے وہ حساس آلات ہوں جن میں لے سنسر معمولی سی آواز کی بول بھٹہ پر بھی الرٹ ہو جاتے ہوں۔ اسے کچھ مستقل سوار یوں کی زندگیوں کے اندر چڑھاؤ، موجود واقعات کے علاوہ متوقع صورت حال کے متعلق تمام تر معلومات پر بھی مکمل قدرت حاصل تھی۔ کسی کی سانس کھلے سے تعویذ گنڈے کرواتی ہے، ہونے کھر میں کون سے ٹانگ رچا رکھے ہیں۔ فلاں کی بنی فلاں کے ساتھ فرار فلاں بد نصیب کا شوہر کامروالی کے عشق میں گرفتار۔

تمباکو والا باپان گل میں دباے آنکھیں سیکڑے وہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے ساتھ ساتھ ان کے پوشیدہ راز اپنی پونٹلی میں جمع کرنا جاتا۔ ایک طرح سے اسے ”مکمل بی بی نیوز“ کا منہ خاص ملتا تھا۔

جب تک اس کا باپ زندہ رہا وہ اسی خاموش تماشا کی کی طرح رکشا نکالتا اور سڑک پر ڈال کر ناک کی سیدھ میں چلانا شروع کر دیتا۔ مگر اس کی وفات کے بعد بھی پھر

شوکی میں خود کے لیے جتنی کی امنگ نہ جاگ سکی جو برسوں پہلے ماجے کی مار کے باعث سوچتی تھی۔ مگر جذبات اور امنگوں کے اس سوئے ہوئے گل میں اس حسینہ نے زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ جس کی کاجل زندہ بڑی بڑی آنکھیں میٹھی کے سمت بار بار اٹھیں اور لگا کر جھک جاتیں۔ شوکی نے اس تین پیوں کے چرنے میں ہر طرح کی عورت دیکھی تھی۔ وہ ہر طرح کی نظر سمجھتا تھا۔

لڑکی کی نظروں کی تکرار اور شرمانے لجانے میں نیم رضامندی کا بورڈ پڑھنا بہت آسان تھا۔ شوکی پھول کر چھت سے جالگا۔ اتنی حسین لڑکی اسے لفت کردار ہی تھی وہ کیسے نہ اترتا۔ اس کا جی چاہتا وہ آدھی رات کو اٹھ کر آجائے اور اس رنگ اڑے کو انڈوں والی چوکھٹ کے آگے بنی اوٹھڑی ہوئی سینٹ کی ٹوٹی پھوٹی میڑھی پر بیٹھا رات بٹا دے اور صبح دم جب وہ دروازے سے برآمد ہو تو وہ اس کے قدموں کے نیچے اپنی ہتھیلیاں بچھاتا جائے یا نیلی جالیوں والے اس چوبارے سے سرنگا کے زندگی گزار دے۔

اسے تو اس لڑکی کا نام تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اس کی ہتھنی نما سبیلی اسے ہمیشہ ”نی“ یا ”اے“ کہہ کر پکارتی۔ اس قدر بد تمیزانہ انداز پر اس کا جی چاہتا مڑے ایک زوردار پھپھرے اس کا منہ سینک دے اور کہے کہ ”تنی نازک اور پیاری لڑکی کو ایسے بلاتے ہیں کیا۔“ لیکن جو سوچا جائے اس پر عمل کرنا ہر آدمی تو ممکن نہیں ہوتا۔

روز بروز اس کا نام جاننے کی حسرت بڑھتی ہی جا رہی تھی، روز انہیں لانے لے جانے کے دوران اس کے کلن حساس آلات کی طرح الرٹ رہتے۔ مگر اجنبی حسینہ کا نام جاننا ناممکن نظر آتا۔ براہ راست تو وہ بھی نہ پوچھ سکتا تھا، کیونکہ آنکھوں کی یہ پراسراری زبان اسے بڑی لطیف لگتی۔ اس کی عمر بیس کے قریب قریب ہو چکی تھی۔ اب وہ اکثر حیران ہوتا کہ اس نے زندگی کا ایک بڑا حصہ یوں ہی ایسے کیسے گزار دیا۔ بنا کسی لطافت و بھگری کی رنگینی کے۔



انگوٹوں نے سر اٹھا رہا تو وہ بھی باقاعدہ تیار ہو کر آنے لگا۔ بال تو اس کے سیاہ ہی تھے۔ مگر اب اس نے وافر مقدار میں تیل لگانا چھوڑ دیا تو رنگت قدرے صاف لگنے لگی تھی۔ پان منہ میں بھرے رکھنے سے باجھوں سے گویا خون رہتا ہوا لگتا۔ چنانچہ اس نے یہ لت مکمل طور پر تو نہ چھوڑی۔ مگر ان مخصوص اوقات میں خود پر پابندی ضرور لگا دی، جب وہ امور خاص کی انجام دہی میں مصروف ہوتا۔

تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے شوکی کی صبح و شام کے موسم بدل چکے تھے اور اس کے خود کے رنگ و ڈھنگ بھی۔

اس کے گھر کے پچھلے کمرے میں وہ چھوٹی مقفل صندوقچی بھی کھل گئی تھی۔ جس میں وہ اپنی آمدنی لاہروائی سے ڈال دیا کرتا تھا۔ پیسے نکال کر سب سے پہلے رکشے کی مرمت کروا کر اس عظیم ہستی کے بیٹھنے کے لائق جگہ بناتی، پھر اپنے زیب تن کیے جانے والے ملبوسات بردھیان دیتے لگا۔ سلائی اسکول کے چوکیدار سے اس کی گاڑی چھنتی تھی، اسی کے ذریعے یہ بھی پتا چلا تھا کہ سلائی کو کڑھائی کا یہ کورس کم سے کم پانچ یا چھ ماہ کا ہوتا ہے۔ چنانچہ شوکی اطمینان سے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اپنے دل کا حال تو اس تک پہنچانا تھا۔ مگر اس انداز میں کہ وہ برا مانے بغیر اقرار کرے۔ چنانچہ اسے متاثر کرنے کے لیے یہی سب تیاری کی گئی تھی۔

سر ملیں آنکھوں کی تلواریں اسے بری طرح گھاس کر چلی تھیں۔ غالباً محترمہ خود بھی اپنے اس ہتھیار سے بخوبی واقف تھی۔ بھی سامنے والے پر بے دریغ اس کے وار کیے جاتی۔ حتیٰ کہ وہ چاروں شانے چت ہو جاتا۔

آج شوکی کی آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی تھی۔ وہ ہڑبوا کر جاگا۔ منہ پر چھپکے مار کے بھاگم بھاگ در عشق پر حاضری دینے پہنچا۔

”آج آپ نے بہت دیر کر دی آنے میں۔“ رکشے میں بیٹھے ہی مہ جیس کی سر ملی آواز میں آسا سوال اسے

شرمندگی کی اٹھ گہرائی میں ڈبوئے لگا۔

”وہی میری آنکھ نہیں کھلی وقت پر۔“ شرمسار مہ کہہ کے اس نے ————— رکشا اشارت کر دیا۔

”کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ مگر آپ وقت پر سویا کریں نا۔“ اتنے پار اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہنے پر شوکی پھول کر غبار بنے لگا۔ اس کی نگاہیں بے ساختہ بیک مرر پر اٹھ گئیں۔ نظروں سے نظریں ملیں اور غما کر کے ایک گولی اس کے دل میں کھب گئی۔ مگر وہ دیکھنے بجائے ایک لذت و سرور سے بھرا سیال اس کے اندر دوڑنے لگا۔ لڑکی کی فطرتی آنکھوں کے سیاہ حاشیے جیسے اس کے گرد بکھج گئے ہوں۔ اس کا دل چاہا اسی بے خودی میں لگتا تھا۔

کجوارے، کجوارے، تیرے کارے کارے نہیں تیرے نہیں تیرے نہیں تیرے نہیں تیرے نہیں جڑواں نہیں اس سرور کا تانا ایک جھٹکے سے ٹوٹا۔ دھمکی آواز کے ساتھ وہ دوسری سواری سیٹ پر بیٹھ چکی تھی اور چھوٹے ہی اپنی پاٹ دار آواز میں بولنا شروع ہو گئی۔

”وے پائی (او بھائی) یہ کوئی ویلا ہے تیرے آئے کا؟“ اس کی آواز غبارے میں سوئی کی طرح جا گئی۔

”پورا آوا کھنڈنہ دیر سے آیا ہے تو نہ نیچے یہ بتاؤ اتنے پیسے کس چیز کے لیتا ہے اگر اپنی ذمہ داری کا احساس ہی نہیں سمجھے“ شوکی کا دل پٹا پٹا رکشا روک کے پچھلا دروازہ کھولے اور ٹھیکٹے کے موٹی کو سرک پر پھینک کے رکشا چلا دے۔ مگر ضبط کر گیا۔

وہ محبوبہ کے کچھ دیر پہلے کے فکر انگیز جملے کے نشے سے باہر آنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ بے حد ضبط سے دیر سے آنے پر معذرت کر کے آئندہ ایسا نہ ہونے کا حلف بھی اٹھایا۔ آخر محبوبہ کی سیلی کی اتنی سی بات تو وہ سہر ہی سکتا تھا اور یہ تو ویسے بھی قدم قدم پر قربانیاں مانگتا ہے۔ مضبوط کھاتا ہے۔

سلائی اسکول کے دروازے پر چھوڑ کر وہیں کھڑا رہا۔ لڑکی جاتے جاتے پٹی اور مڑکے اس کی جانب دیکھ کے ہنس کے غراب سے گیت بار کر گئی۔ شوکی کو تو گویا ہفت اقلیم کا خزانہ مل گیا۔ وہ ربڑی گیند کی طرح اچھلتے

لگا۔ وہ دن شوکت علی کے لیے یقیناً ”بہت کامیاب اور خوش قسمت ثابت ہوا تھا۔ سیاہ چادر کی اوٹ میں سے نظر آتے آوے چہرے کا وہ دھندلا ہوا جیسا گورا رنگ اور کشادہ آنکھیں، بلی بلی۔ ہنسی جیسے اسے ماہی بے آب کی طرح تیرانے لگی۔

اس کا اس جیل پر بھی پختہ ایمان تھا کہ لڑکی ہنسی تو سمجھ چھٹی، دوسری جانب سے واضح انداز میں کرین سکھل چکا تھا۔

اب اسے باقاعدہ راہ رسم کا آغاز کرنا تھا۔ شوکی کو اس بات پر بھی بڑا یقین تھا کہ وہ اس چم چم کرتے کی اس جی رکشے کی بالکن بننے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرے گی اور اس پیش کش کو اپنے لیے اعزاز ہی سمجھے گی۔

واپسی پر اس نے رکشا کا بوجھ ہلکا کرنا ضروری سمجھا اور جلدی سے موٹی کو گیت پر اتار کر رکشا آگے بڑھانے لگا تو وہ اپنی گردن واپس اندر ٹھیکر کر چلا کے بولی۔

”نی رخشی! اب رات کو منہما (بلاوا) بھیج دینا“ ورنہ میں نہ آؤں گی تو کھو گی یہ۔“

”رخشی۔“ خود کی طرح اس کا نام بھی کتنا سوتا تھا۔ نام میں ساری توجہ پھنس گئی۔ چنانچہ بالی بات نظر انداز ہو چکی تھی۔

اس نے دو گلیاں دھیرے دھیرے طے کیں۔ اترتے وقت جب وہ جانے لگی تو یکدم پٹی۔

”جی وے“ ایک ساتھ بول پڑے پر وہ ہنس پڑی جبکہ شوکی شرملا جوان بننے کے نظر چھا گیا۔

دیدار کی طلب ہے تو نظرس جمائے رکھ پر وہ جیسا بھی ہو سرکنا ضرور ہے۔ ہنسنے سے آوے چہرے کی چادر بھی سرک گئی۔ پورا چاند بالوں سے نکل آیا تھا۔ شوکی کا دل بے ساختہ سبحان اللہ کہہ دینے کو چاہا۔ مگر جب بولا تو وہ کچھ اور تھا۔

”جی بولی بولی کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ ”پہلے آپ۔“ اک اوائے دلربائی سے وہ گویا

ہوئی۔ ”نہیں نا، لیڈیز فرسٹ۔“ جگہ جگہ سے گئے انگریزی کے اس لفظ کا بر محل استعمال کر کے وہ خود ہی مغرور سا ہوا۔

”ہاں میری بات تو زیادہ ضروری ہے۔“ اگلی بات کہنے سے پہلے وہ چادر کا کونا منہ میں دبا کے چھوٹی موٹی کی طرح لہرائی۔

”اصل میں رکشے والے بھائی اہل سے آپ مجھے لینے نہ آئے گا۔ میری شادی کے دن رکشے گئے ہیں۔“ لگاتار قائل لگتا ہوں کا وار کرتے ہوئے اس نے چادر کا کنارہ تھوڑا اور منہ میں ٹھونسا اور شرم سے دہری ہوئی ہوئی بدرنگے کاؤڈ حلیل کے اندر چلی گئی۔ شادی کی خوشی میں وہ شوکی کی بات سنتا بھی بھول گئی تھی۔ اب بات کرنے کو بچا ہی کیا تھا۔

ہنڈل پر ہاتھ رکھے وہ صدمے کی حالت میں اس کے جیلے کی بازوٹ ستارہا۔

”رکشے والے بھائی۔“ اس کا سر جھکا گیا۔ شادی تو ہو رہی تھی وہ قبول کر رہی لیتا۔ مگر اتنا عالی شان لقب رکشے والے کو ہی کیوں؟ کیا کبھی کسی نے سائیکل والے بھائی، گاڑی والے بھائی، بس یا ٹرائی والے بھائی کہتے سنا ہے؟

”دھت تیرے کی۔“ اس کا جی چاہا اس کھلے تضاد پر رکشے کو آگ لگا دے غصے سے پھٹکتے ہوئے اس نے رخشی کے سندور نام کو دھت کر کے کہہ کر سامنے رکھے پان کا کاغذ کھول کے منہ میں رکھا اور زور زور سے چبانے لگا اور جھٹکے سے رکشا آگے بڑھایا، عرصے بعد اس کا رخ اپنے من پسند سنیما کی طرف تھا۔ جہاں وہ حال ہی میں لگنے والی فلم ”وحشی حنینہ“ دیکھنے چل دیا کہ دل میں جلنے آگ کے بھانجور کی طور تو بچھانے تھے۔

☆ ☆

☆ ☆



# دکلیسی ضد

”ہینوں پٹا ایسے مت کو۔ اولاد کی آزمائش تو ماں باپ کو توڑ دالتی ہے، کس کا بھی نہیں چھوڑتی مہراں بھائی نے جو بھی کیا مجبور ہو کر کیا تھا اور مجھے بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہی تھیں ان کی تو بہت خواہش تھی کہ تم ان کی ہو سون لیکن۔“ وہ ان کی پوری بات سننے بغیر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

نہ جانے اس نے امی کو کون کون سی من گھڑت کہانیاں سنائی تھیں کہ وہ بالکل ہی پھل کر رہ گئی تھیں۔ اس کو یوں جانتے دیکھ کر بے ساختہ بچوں پر ہنس۔

”ماہین ایک بات تو سننی جاؤ۔“ فاطمہ بچو کے ہیکار نے بروہ دروازے سے ہی پلٹ کر سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔

”تمہارے لیے عدیدہ کاروبار پوزل آیا ہے۔ ماہوں جان اور مانی جی بھی جلد ہی پاکستان آرہے ہیں ابھی انہوں نے فون پر تمہارا ہاتھ مانگا ہے باقی کارمیں وہ ہمیں آکر کریں گے۔“

فاطمہ بچو کے چہرے سے چھلکتی حد درجہ خوشی کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے کچھ بھی نہ بول پائی نہ جانے کتنے عرصہ بعد وہ فاطمہ بچو کے اس حد تک چھلکتے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ان کے چہرے کو بھٹاتا ہوا دیکھتا نہیں چاہتی تھی سو خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔



شدید طیش کے عالم میں وہ ادھر سے ادھر پکر لگاتے ہوئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اضطراب ہی اضطراب وجود میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے گویا تمام حواس خنق ہو چکے تھے۔

جب سے اس نے ماما پاپا کو تسہینہ چھپو کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ دونوں ہی بے حد خوش اور مطمئن تھے گویا ایک بہت بھاری بوجھ تھا جو ان کے سینوں پر سے سرک گیا تھا۔ وہ جلد سے جلد ان سے ملنے پاکستان آنے والے تھے تاکہ اپنی کی گئی غلطیوں کی معافی مانگ سکیں۔ سب کچھ ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا لیکن ماہین کے انکار نے اس کے پورے وجود میں جیسے اک بھردی تھی۔

رات جب فاطمہ بچو نے اسے اس کے انکار کے بارے میں بتایا تھا اس کے اعصاب بری طرح تن گئے تھے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے جائے اور اس کے ہوش ٹھکانے لگا دے۔ لیکن رات کے نو بجے ایسا کرنا ہرگز ممکن نہ تھا سو صبح آٹھ بجتے ہی اس نے اسے اپنے آفس میں طلب کر لیا۔ جس وقت وہ روم میں داخل ہوئی وہ متشکر سا نکل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔

”تم آخر چاہتی کیا ہو؟“ اسے دیکھتے ہی وہ شروع ہو گیا تھا۔

”کیا کیا ہے میں نے؟“ اس کے انداز میں بلا کا اطمینان تھا۔ وہ تپ کر رہ گیا۔

”کیا نہیں کیا تم نے؟“ وہ دھاڑا۔

”جہ ماہ ہو گئے ہیں تمہارے پیچھے پیچھے پھرے ہوئے تمہیں مناتے ہوئے اور تم اپنی ضد سے ایک اچھے پیچھے نہیں بہت رہیں پھر پوچھتی ہو کیا کیا ہے تم نے وہ پہلی بار اسے اتنے غصے میں دیکھ رہی تھی۔ سوڑ ہی گئی اور پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اس وقت اتنے غصے میں تھا کہ وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبرا

رہی تھی اس کے پیچھے سے پہلے اس نے آگے بڑھ کر ڈور لاگ کیا اور اس کے مقابل آگے اہوا۔

”آج بات کلیر ہو کر رہے کی تب تک میں تمہیں اس کمرے سے باہر جانے نہیں دوں گا اور کہنا۔“

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ دھیسے مگر سخت لہجے میں بولا۔ تب ہی ٹیبل پر رکے فون کی کھنٹی بج اٹھی تو وہ اس طرف متوجہ ہو گیا۔

اس کی توجہ فون کی جانب مرکوز دیکھ کر وہ دروازے کی طرف لپکی ٹھہرے سوڑ۔

”ڈور آؤ میک لاکڈ ہے نہیں کھلے گا۔“ وہ ریسپور کلن سے لگاتے ہوئے تیز لہجے میں بولا تو وہ بے بسی سے بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔

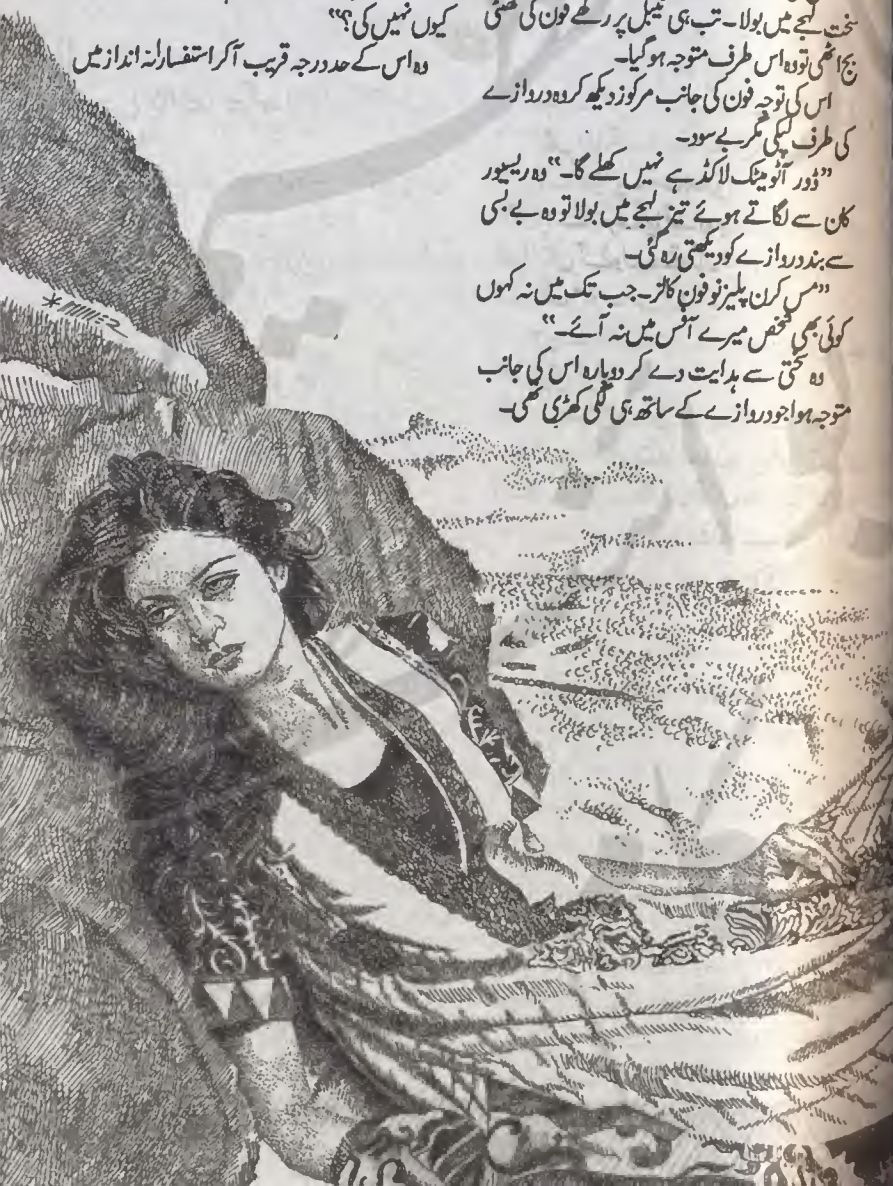
”مس کرن پلیر فون کالز۔ جب تک میں نہ کہوں کوئی بھی شخص میرے آفس میں نہ آئے۔“

وہ سختی سے ہدایت دے کر دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوا جو دروازے کے ساتھ ہی ٹکی کھڑی تھی۔

## فلم فلیٹ

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“

وہ اس کے حد درجہ قریب آکر استفارلہ انداز میں





بولاجیکہ لہجہ پہلے کی نسبت کچھ نرم تھا۔ اس کے سوال پر ایک لہجہ کے لیے اس کے دل کو کچھ ہوا ضرور تھا مگر وہ خاموش ہی رہی۔

”ہاں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دے دو ورنہ۔“  
”سیر میرا ذاتی مسئلہ ہے۔“ وہ اس کے اتنا قریب آنے پر کچھ گھبرا سی گئی تھی تب ہی اس کی بات پوری نے بغیر وہ جلدی سے بول پڑی۔  
”تمہارا ذاتی مسئلہ میں اپنا مسئلہ سمجھتا ہوں اور تم ہو کہ۔۔۔“

”پلیز عید میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔“ وہ جی۔  
اور وہ کتنی ہی دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا جس کے ہونٹوں پر نہ جانے کتنے عرصے بعد اس کا نام جگمگا رہا۔

”لیکن میں تم سے بات کر کے رہوں گا، تم یہاں سے باہر تو جاسکتی اس لیے بہتر ہے کہ خاموش رہنے کے بجائے مجھ سے وہ باتیں کر لو جو تمہیں بے چین کیے رکھتی ہیں۔“ اس کا انداز صاف نہ تھا۔  
”شادی کرو گی مجھ سے؟“ تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان مسلسل خاموشی چھائی رہی پھر اس نے پروپوز کرنے والے انداز میں اس سے پوچھا تو وہ اس کی اس قدر ڈھٹائی پر دل موس کر رہ گئی۔ اس کے اتنے سخت رویے کے باوجود وہ جوں کا توں اس کا خواستگار تھا۔

”جواب دو۔“ اس کی خاموشی کو دیکھ کر اس نے دوبارہ پوچھا۔  
”سوری۔“ اس کے جواب پر اس کا بے اختیار اپنا سر جھٹکے کو دل چاہا جو اسے مسلسل روکیے جا رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس کا دل صاف کرے۔

”کیوں شادی کرنا نہیں چاہتیں تم مجھ سے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے لہجے کی سختی کو بشکل کنٹرول کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولا۔  
”کیوں کروں گی میں تم سے شادی؟“ بولایا اس

نے سوال کیا۔

”کیا مطلب تمہارا؟“ اس کی بات پر وہ حیرت بولا۔  
”ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور۔۔۔“  
”اپنی غلط فہمی دور کر لو میں تمہیں پسند کرتی تھی اب نہیں۔“ وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر دے سے بولی۔

”کیوں اب کیا ہوا ہے اب کیا کیا ہے میں نے؟“ اس نے درشتی سے پوچھا۔  
”تم نے کیا کیا ہے میں تمہیں بتاؤں؟ جب تمہیں خود احساس نہیں ہے اپنے کیے کا تو میرے بتانے کا کیا فائدہ؟“

اس نے آزدگی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کا دل پھر آیا تھا لیکن وہ اس پر ظاہر ہونے نہیں دیتا چاہتی تھی تاہم مضبوطی کھڑی رہی۔

”میں جانتا ہوں میں نے کیا کیا ہے اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میں نے جو کیا اس میں تمہارا اور میرا فائدہ تھا اس لیے مجھے کوئی ملال یا پچھتاوا نہیں ہے۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر مکمل اطمینان سے کہا۔

”کون سے فائدے کی بات کر رہے ہو تم؟ میں نے کب چاہا تھا کہ تم مجھے کچھ بھی بتائے بغیر مجھ سے کچھ بھی شیئر کیے بغیر گینڈا چلے جاؤ۔“ اس نے رکھائی سے اس کی طرف دیکھ کر مزید کہا۔

”تم نے جانے سے پہلے ایک بار بھی میرے بارے میں سوچا مجھ پر کیا گزرے گی؟ یہاں تک کہ تمہیں وہاں جا کر بھی میرا خیال نہیں آیا تھا اتنے ممکن ہو گئے تھے تم۔“

”میں تم سے ناراض تھا زریں سے شادی کرنے والی بات کو لے کر مجھے کانٹیں اکیلا ہو گیا ہوں تم سمیت سب نے مجھے تھکا کر دیا ہے اور مجھے وہ کرنے پر اکسا رہے ہیں جو میں کبھی مرکز بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔“ اس کے لہجے میں دھک پھٹا تھا وہ مزید گویا ہوا۔

”میں یہ سب کرنے پر مجبور تھا مایا تم جانتی تھیں شہینہ آپ کی سرپرستی جتنی زریں سے میری شادی کرنا چاہتے تھے اور اسی کے کہنے پر شام بھائی نے شہینہ آپ پر بے حد دباؤ ڈالا ہوا تھا کہ کسی بھی طرح سے مجھے زریں سے شادی کرنے پر تیار کریں اور جب میں نہیں مانتا تو مایا نے مجھے کس حد تک پریشان کرنا شروع کر دیا تھا شاید وہ بھی شہینہ آپ کا گھر ٹوٹنے نہیں دیکھ سکتے تھے جو ایک فطری عمل تھا اور جب میں ہرگز تیار نہیں ہوا تو وہ مجھ سے کہنے بدگمان ہو گئے تھے میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“ اس کے انداز میں بو جھل پن تھا۔

”کیا تمہیں اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں آیا کہ میں نے جو کیا اپنے اور تمہارے لیے کیا؟“ اس نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر کوئی جذبیہ نظر نہیں آ رہا تھا وہ بالکل ساٹ چہرہ لیے کھڑی تھی۔  
”نہیں۔“ اس کا لہجہ خشک تھا جذبات سے بالکل عاری۔

”کیوں؟“ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔  
”کیونکہ تم مجھے کبھی بھی چھوڑ کر جاسکتے ہو۔ بالکل اکیلا اور تھکا کر کے۔“ نہ جانے کیسا خوف تھا جو اس کے لبوں پر آ رہا تھا۔

”میں کیوں جاؤں گا تمہیں چھوڑ کر؟ میں تمہارا ہوں مایا صرف تمہارا پھر تم میرے بارے میں ایسا کیسے سوچ سکتی ہو؟“ ایک غصیلی سی تھی جو اس کے وجود سے چھلک پڑی تھی۔

”کس طرح؟ اس کے دل میں موجود اس ڈر کو نکال باہر کرے جو اسے اس سے متفرک دے رہا تھا۔  
”کیوں نہیں سوچ سکتی میں؟“ بولایا وہ خشک کر بولی۔

”تم اپنی اور میری خاطر لڑ رہے تھے تو یہیں رہ کر بھی لڑ سکتے تھے حالات کا مقابلہ سب کے درمیان رہ کر بھی کر سکتے تھے لیکن تم باہر گئے کیونکہ تمہارے اندر حالات کو فیس کرنے کی پاور نہیں تھی اور ویسے

بھی تم تو شروع سے ملک سے باہر جا کر خوب سارا پیسہ کمانے کے خواہش مند تھے سو تم نے موقع غنیمت جانا اور سب کچھ چھوڑ چھڈ کر اپنی خواہشوں کو پورا کرنے چل پڑے۔ تم بہت کمزور انسان ہو عید جو۔“

”چل۔“ وہ جو خود پر ضبط کیے خاموشی سے اس کی باتیں برداشت کر رہا تھا اس کی آخری بات پر اس کے منہ پر پھوڑے مارا تھا۔ کتنا غلط سمجھتی تھی وہ اس کو؟ اس کا دل غم گھوم گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے؟

”میں پیسہ کمانے کی خاطر باہر گیا تھا میں؟“ وہ دھواڑ کر اس سے مخاطب ہوا۔ وہ جو اس کے اس اچانک حملے سے سنبھلی نہیں تھی اس کے بگڑتے تہوں سے گھبرا سی گئی۔ وہ اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑے اس سے مخاطب تھا اور آنکھوں سے سرخیاں جھلکنے لگی تھیں۔  
”مایا نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے زریں سے شادی نہ کی تو وہ مجھے گھراور بڑی سے بے دخل کر دیں گے۔ مجھے کسی چیز پر دانا نہیں تھی اور پھر میں نے تب ہی سوچ لیا کہ میں شادی تم سے کروں گا اور تمہیں اپنے بل بوتے پر دنیا کی ہر خوشیوں کا اور یہی بات میں نے مایا سے بھی کی تھی کہ مجھے ان کی جائیداد میں سے پھونکی کوڑی بھی نہیں چاہیے میں خود بھی وہ سب کچھ کما سکتا ہوں جس کو چھیننے کی وہ مجھے دھمکی دے رہے تھے۔ پھر میں نے باہر جانے کا پکا فیصلہ کر لیا کیونکہ جب تک میں یہاں رہتا مجھے اسی طرح پریشان کیا جاتا کہ میں زریں سے شادی کر لوں اور تم یہ سمجھتی ہو کہ میں نے اپنی خواہشیں پوری کرنے کے لیے یہ سب کیا ہے؟ میں نے کتنی مشکلیں اٹھائیں، کتنی مصیبتوں سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا ہوں تو وہ صرف تمہارے لیے اور تم ہی کہہ رہی ہو کہ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا، خواہش کا مارا سمجھتی ہو تم مجھے اگر میں نے ایسا کبھی چاہا بھی تھا تو وہ مجھ کی صرف تمہارے لیے کیونکہ میں تمہیں دنیا کی ہر آسائش دینا چاہتا تھا اور تم نے مجھے اتنا گرا ہوا سمجھ لیا کہ میں ان سب کی خاطر تمہیں چھوڑ کر جاسکتا ہوں۔“ اس کے



ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے دکھ 'افسوس اور غصہ چٹک رہا تھا۔ جسے قطعی نظر انداز کر گئی اور پھر کہہ دی۔  
 "اور تم بھی جانتے تھے کہ مجھے ان کی نہیں صرف تمہاری ضرورت تھی پھر بھی تم نے۔"  
 "کیا میری اپنی کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں تمہارے لیے کچھ کرتا، تمہیں آرام و سکون کی زندگی دیتا؟" وہ اس کی بات پوری سے بغیر دوسرے بولا۔  
 "ان سب کو پانے کے لیے میں نے بہت محنت کی ہے اور تمہیں میری اس محنت میں وہ محبت نظر نہیں آ رہی جو میں تم سے کرتا ہوں۔"  
 "ہاں نہیں آ رہی نظر۔" وہ اپنے گل پر جہاں اس نے چھڑ مارا تھا بدستور ہاتھ رکھے بے خونی اور بے دردی سے بولی تھی۔  
 "کیونکہ تمہارے اس طرح کرنے سے جو تکلیف اور اذیت میں نے اٹھائی تھی وہ ساری چیزیں مل کر بھی ختم نہیں کر سکتیں، میں ان آنکھوں کو نہیں بھول سکتی جیب میں فون پر محض تمہاری آواز سننے کو ترسا کرتی تھی لیکن تم ہم وہاں جا کر اس قدر مگن ہو گئے تھے کہ میرا ہی خیال نہیں آیا۔ اگر یہ تمہاری مجھ سے ناراضی تھی تو پھر میں کیسے مان لوں کہ تم نے یہ سب میری خاطر کیا ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے گالوں کو بھگور رہے تھے۔  
 وہ خاموشی سے کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر لیٹ کر ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔  
 "تو تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں نے یہ سب تمہاری خاطر کیا ہے نا؟" اس نے عجیب سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا پھر اگلے ہی لمحے شدید پیش کے عالم میں ٹیبل پر دھکی کر تمام چیزوں کو ہاتھ کی منڈ سے نیچے گرا دیا۔ اس کے اس طرح کرنے پر وہ گھبرا اسی گئی۔  
 "جب تمہیں ان سب کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے بھی نہیں ہے۔"  
 وہ سخت کچے میں آگے آگے بڑھا اور اپنی رپو الوٹک

چیز کو پاؤں سے زور سے ٹھوک مار کر پیچھے کی طرف دھکیل دیا جو لڑھکتی ہوئی گلاس وینڈو سے جا ٹکرائی۔  
 کمرے میں موجود دوسری چیزوں کو بھی زمین پر دس مارا۔ کئی گلاس شیشی اور مختلف ٹرائفزر زنن پر چمکتا چور ہو چکی تھیں۔  
 "میں نے یہ سب کچھ تمہارے لیے بنایا تھا جب تمہیں نہیں چاہیں تو یہ سب میرے کس کام کا۔" اس نے ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون اور انٹر کام دیوار پر دس مارے۔ اس دران وہ مسلسل بولتا جا رہا تھا۔  
 وہ پہلی بار اسے اتنے شدید غصے میں دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اسے روکے تب ہی وہ اپنے اندر ہمت پیدا کر کے اس کی جانب بڑھ گئی اس کا اپنا جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھی۔  
 "عدید پلیز رک جاؤ، ایسے مت کرو۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے بازو پر سے زور سے ہٹا کر ٹیبل پر رکھے لیٹ ٹاپ کی جانب بڑھا تو وہ بھی اس کے پیچھے بھاگی۔  
 "پاکل تھا میں جو اپنی زندگی کے پانچ سال یہ سب بنانے میں خوار کرتا رہا۔" اس نے لیٹ ٹاپ کو زور سے دیوار پر دس مار کر تقریباً "چیختے ہوئے کہا تو وہ مزید سسم گئی۔ لیٹ ٹاپ دیوار سے ٹکرا کر زمین پر بوس ہو چکا تھا۔ اس کے ٹوپیروں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔  
 وہ کس طرح اسے کنٹرول کرے وہ نہیں جانتی تھی۔ تب ہی وہ قریب رکھے فائل ریک کی جانب بڑھا جس میں تمام امور رشتہ خاں گزری تھیں۔  
 اگر ان فائلز کو کچھ ہوا تو بہت سے کانٹریکٹس ضائع ہو سکتے تھے۔  
 ایسی چیزیں میں اس کے حواس تو بالکل کام ہی نہیں کر رہے تھے۔ تب وہ تیزی سے اس سے پہلے اس ریک کے آگے آکھڑی ہوئی۔  
 "ہٹو یہاں سے۔" وہ ایک بار پھر حواڑا۔  
 "پلیز عدید مت کرو ایسا۔" وہ التجائی انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولی جبکہ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے جس کی پروا کیے بغیر اس نے ہاتھ

بڑھا کر اسے بازو سے پکڑ کر ایک سائیڈ پر دھکیلا اور پھر تمام فائلوں کے دودھ ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیے۔  
 اس کے اس طرح کرنے پر وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔  
 "میں کب سے تمہیں منانا تھا تم سے بات کرنے کے لیے ترس رہا تھا لیکن تمہاری غلط نہیں ہی دور نہیں ہو رہی تھیں۔" بولتے ہوئے اس کی طرف بڑھا جو دیوار کے ساتھ سسی کھڑی تھی۔ وہ یکبارگی اسے دیکھنے جاری تھی جو پورے کمرے کا نقشہ بل بھر میں بدل کر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔  
 "اب تو تمہیں یقین آ گیا کہ میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔" وہ اس کے بائیں طرف دیوار پر اپنا دایاں ہاتھ مضبوطی سے جمائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سوالیہ انداز میں قدرے نرمی سے بولا۔  
 وہ خاموش نظروں سے ڈری ڈری اسے دیکھ رہی تھی۔ جس کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔  
 "میں اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں اور کروں گا تم دیکھنا میں خود کو تمہارے سامنے کس طرح بریاد کرتا ہوں لیکن وعدہ کرو جب میں بالکل خالی ہو جاؤں گا تب تو تمہیں مجھ پر ہمیشہ کی محبت پر اعتبار آئے گا نا؟"  
 وہ جیسے عجیبے میں اس سے بول رہا تھا اور وہ لنگ بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر وہ جواب کی پروا کیے بغیر روانہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا تو وہ خالی خالی نظروں سے پورے کمرے کو دیکھنے لگی جہاں پہلے جیسا کچھ نہ تھا۔ ہر شے اپنے مقام سے دور ٹپٹی پھوٹی حالت میں پڑی تھی۔ کمرے کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ کارپٹ پر دور تک لکھڑی کانڈ بکھرے ہوئے تھے۔  
 وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کارپٹ پر غصوں کے گل بیٹھے گئی اور آواز دھمے بڑے لیٹ ٹاپ کو اٹھا کر چمک کرنے لگی جو بالکل بے جان ہو چکا تھا۔  
 پھر اس نے تمام کانڈات سمیٹ کر فائلوں میں

رکھے اور جتنا ہو سکتا تھا چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھا پھر کمرے کو باہر سے لاک کر کے اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ پتا نہیں کیوں اس کے دل پر کوئی بوجھ سا آگرا تھا یوں لگتا تھا جیسے اس سے کہیں کوئی بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے یا شاید وہ اسے سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ مزید کیا کرے گا؟ اسے شدید فکر لاحق ہو گئی تھی۔ وہ جو کہتا تھا کہ گزرتا تھا۔  
 وہ دکتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تمام کر بیٹھ گئی تھی۔  
 وہ سارا دن افس نہیں آیا تھا۔ تقریباً "چھ بجے وہ بھی افس سے نکل کر گھر آچکی تھی۔  
 افسردگی تھی جس نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ پشیمو قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔  
 "کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو، عدید سے کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"  
 عدید کے نام پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر فاطمہ بچو کو دیکھا جو اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ انہیں کیسے پتا؟  
 "میں سب جانتی ہوں کہ تم عدید کے ہی افس میں جا ب کر رہی ہو اور یہ بات ہمیں عدید نے ہی بتائی تھی۔ خیر یہ بتاؤ کہ عدید سے تمہاری کیا بات ہوئی کیونکہ وہ تمہارے انکار کو لے کر بہت پریشان تھا۔"  
 جب ساری بات انہیں پتا ہی تھی تو اس نے بھی کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور آج کی ساری روداد انہیں کہہ سنائی۔  
 انہوں نے غور کیا کہ باتیں کرتے وقت اس کی کتنی بار بار بھینکتی جا رہی تھیں اور آواز بھی رنڈھ گئی تھی۔ شاید اس کے اندر کی انا اب ٹوٹنے لگی تھی وہ قدرے نرم اور بدلی بدلی محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی فاطمہ بچو بول پڑیں۔  
 "ماہین ماہی جی اور اماں جان بالکل غلط نہیں تھے وہ اپنی اولاد کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے وہ فیصلے کر ڈالے جو ہمارے حق میں نہیں تھے اور



تمہیں بتا ہے یہ سب عدید کے گھر چھوڑ کر جانے کے بعد ہوا تھا پھر عدید تو ان سارے معاملات سے بے خبر تھا ایسے میں اس کو مجرم بنانا سراسر غلط ہے۔  
وہ آج خاموشی سے سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی ورنہ وہ تو ان کے ناموں سے ہی بھڑک اٹھتی تھی۔ انہوں نے موقع اچھا سمجھ کر لوٹنا شروع کیا جسے وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

”تم جانتی تو ہو نا کہ زبیر کی بیوی فریال کے مرنے کو۔ اس نے ساری زندگی ملک سے باہر گزاری تھی اسی لیے وہ کافی عرصے سے زبیر پر بھی زور ڈال رہی تھی کہ وہ یہ گھر بیچ کر اور برنس وائینڈ اپ کر کے جرمنی اس کے ساتھ چلے اور اس کے بھائی کے ساتھ برنس اشارٹ کرے لیکن جب زبیر نے انکار کیا تو اس نے کورٹ سے خلع لینے کی دھمکی دے ڈالی جس پر سب پریشان ہو کر رہ گئے اور پھر فریال جب ناراض ہو کر مچکے گئی تو اس نے اپنی بات منوانے کے لیے سلیپنگ پلو کھالی تھیں جس کی وجہ سے وہ کئی دن تک ہسپتال بھی ایڈمٹ رہی تھی۔ اس کی اس حرکت نے گویا ماموں جان اور مای جی کے پیروں تلے سے زمین ہی نکال دی تھی۔ پھر زبیر بھی فریال کا ساتھ دیتے ہوئے ماموں جان سے مطالبہ کرنے لگا لیکن ماموں جان نہیں مانے مگر جب زبیر نے ماموں جان کو مرنے کی دھمکیاں دیں تو وہ اہی اور ہم سب کی نظروں میں مجرم بننے کو تیار ہو گئے تھے۔

ماموں جان نے خاموشی سے گھر بیچ دیا اور برنس بھی وائینڈ اپ کر دیا۔ وہ عدید کو تو دیکھنے کو ترس گئے تھے اب زبیر کی دہری برداشت نہیں کر سکتے تھے یہ بھی شکر تھا کہ زبیر ماموں جان اور مای جی کو اپنے ساتھ ہی جرمنی لے جانے پر رضد تھا اس لیے فریال کی ایکس نہ چل سکی تھی لیکن وہاں جا کر فریال کے بھائی نے سارا روپیہ ہتھیالیا تو فریال کے بھی ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ تھوڑا بہت روپیہ تھا جو فریال نے زبردستی اپنے بھائی سے نکلوا لیا تھا اسی سے زبیر نے جرمنی میں چھوٹا موٹا سا برنس شروع کر ڈالا تھا اور یوں گزر رہے ہوئے تھے

تھی۔

جن دنوں جعفر کی ہفتہ ہوئی تھی ان دنوں جان اور مای جی اس تکلیف سے زبردستی تھے کہ ہمیں اس سب سے اس لیے بے خبر رکھا کہ پہلے ہی جعفر کے غم سے غافل تھیں وہ یہ سب بتا کر مزید ستم کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے جھوٹ بولا کہ برنس کو زبردستی قسم کا نقصان کے باعث سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور پھر حالات حد تک پہنچ چکے ہیں کہ گھر بیچ کر فرسے پورے کر کے علاوہ دو سرائو کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم سب یقین کر لیا تھا اور پھر ہم نے خوش خوشی ماموں جان مای جی کو زبیر کے ساتھ جرمنی بھی رخصت کر دیا تھا اچھا ہوا زبیر کو وہاں جا بھل گئی ورنہ وہ سب بھی اسی طرح کرانے کے ممکن میں پڑتے۔“

فاطمہ جو سانس لینے کو رکیں پھر دوبارہ گویا ہوئی ”ان کے جرمنی جاتے ہی ہمیں مختلف لوگوں سے پتا چل گیا تھا کہ ماموں جان اور مای جی نے ہم جھوٹ بولا تھا لیکن وہاں جا کر وہ ہمیں بھولے تھے۔ یکے بعد دیگرے کئی مکان بدلتے کے باعث سے رابطہ نہیں کر پا رہے تھے جبکہ مای جی نے اپنے رشتے داروں کو بھی کہا ہوا تھا کہ وہ ہمارے حلقہ معلوم کر کے انہیں بتائیں لیکن مکانوں کی تبدیلی ایسا نہ ہونے دیا۔ جب عدید نے کینڈا جانے کے بعد ہم سے رابطہ کرنا چاہا تب تک وہ گھر تک چکا تھا ساری باتیں جب عدید کو معلوم ہوئیں تو وہ اپنے گھر والوں سے بے حد غصا ہوا۔ اس نے احسن کو ہمارے بارے میں معلوم کرنے کو کہہ رکھا تھا پھر وہ جلد جلد وہاں سے آ کر پاکستان مہٹل ہو گیا اور پھر خلائ شروع کر دی۔ یہ بھی شکر تھا کہ قسمت نے اس سے ملادیا ورنہ کیسے اتنی غلط فیصلہ دہرے ہوتیں؟ یہ ساری باتیں مای جی نے قیون پر ہمیں بتائی تھیں بلکہ وہ بہت ملول اور پشیمان بھی تھیں اسی لیے اسی معافی بھی مانگ رہی تھیں لیکن اہی تو ماموں جان کا آواز سنتے ہی سب کچھ بھول بھال گئیں۔ اب تم

کچھ بھول جاؤ یا بہن یہ آزمائش تھی اللہ کی طرف سے اور کچھ نہیں تھا۔ اچھا میں تمہارے لیے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔ تم کچھ منہ دھو لو۔“  
وہ اپنی بات مکمل کر کے اسے سوچنا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل چکی تھیں اور وہ گہری سوچ میں مبتلا ہو کر رہ گئی تھی۔



وہ گزشتہ ایک ہفتے سے آفس نہیں آ رہا تھا۔ وہ کہاں تھا اور کس حال میں تھا کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کا فون بھی مسلسل آف جا رہا تھا جبکہ آفس کا نظام بھی دھرم بھرم ہو کر رہ گیا تھا کوئی کام بھی وقت نہیں ہو رہا تھا۔ تو قیر صاحب بھی ہر طرح اس سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کر چکے تھے مگر یہ پتا تھا اور نہ مگر کے فون انیڈ کر رہا تھا۔ وہ تو کئی بار گھر بھی جا چکے تھے تاکہ امپورٹنٹ فائلز سائن کر سکیں لیکن ہر بار ملازم اس کے گھر پر نہ ہونے کا عندیہ دیتا تو وہ ایسی سے لوٹ آتے۔

آفس میں موجود ہر فرد اس کو لے کر تشویش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ وہ اس قدر لا پرواہ اور غیر ذمہ دار بھی نہیں رہا تھا۔ سب کو اس کے بارے میں فکریں لاحق ہو چکی تھیں۔ تب تمام کوششوں کے بعد تو قیر صاحب نے احسن کو ساری صورت حال سے آگاہ کر ڈالا تھا۔ جو پہلی ہی فرصت میں اس کے پاس جا پہنچا تھا۔ ”تم کچھ بتاؤ گے یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ احسن اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آ کر بولا۔ ”کچھ نہیں ہو رہا یا ریس میرا دل نہیں کرتا۔“ اس نے بے فکری سے کہا۔

”عدید پلیز یا ریس سب کو اتنا لائٹ مت لو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو تمہارے اس طرح کرنے سے کتنا برا نقصان ہو سکتا ہے۔“ احسن اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”نقصان کی پروا کون کر رہا ہے یا ر۔“ اس کے ہر

انداز میں لا پرواہی تھی جس کو دیکھ کر احسن حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ اس کے اور باہن کے درمیان ہونے والی تمام باتوں سے واقف تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کو لے کر اس حد تک بھی جاسکتا ہے۔ احسن نرمی سے گویا ہوا۔

”تمہیں نقصان کی پروا کرنی چاہیے عدید تم جانتے ہو تم نے کتنی محنت اور تنگ و دو کے بعد یہ سب کچھ حاصل کیا تھا۔ یا ر تمہارے جیسے خوش قسمت لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو اتنے کم عرصے میں اتنی اچھی طرح برنس امپلیمنٹ کر لیتے ہیں کہ وہ انٹرنیشنل لیول پر بھی خود کو متعارف کرا سکیں اور تم ہو کہ اتنی آسانی سے یہ سب کچھ اپنے ہاتھوں سے گنوار ہے ہو۔ کتنی امپورٹنٹ ڈیلور ہیں جن کو تمہارے سائن کے بغیر ممکن نہیں ہیں آسٹریلیا کی ڈیلوری درمیان میں انکی ہوئی ہے تم سمجھ کیوں نہیں رہے کہ اس طرح سب کچھ ختم ہو جائے گا یا ر۔“

”تو ہو جائے ختم سب کچھ جب اسے احساس نہیں ہے کہ میں نے یہ سب اس کے لیے کیا تھا تو مجھے بھی نہیں ہے۔“ بالاخر اس کی برداشت جواب دے چکی تھی۔

”میں ایک ہفتہ سے آفس نہیں جا رہا، میرا سیل آف جا رہا ہے۔ ڈیلوریز رکی ہوئی ہیں۔ برنس ایک ہفتہ میں کتنا بچے اچکا ہے۔ کیا وہ بے خبر ہے اس سب سے نہیں۔ لیکن اس نے ایک بار بھی مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک بار بھی اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں اسے میری کوئی پرواہی نہیں ہے یا ر۔ کیا اس قابل ہوں میں کہ وہ میرے بارے میں اتنی لا پرواہ رہے مانا میں غلط تھا لیکن میں۔“ وہ بات کرتے کرتے رک گیا تھا پھر ایک گہرا سانس اپنے اندر اتار کر وہ دوبارہ احسن سے مخاطب ہوا مگر دھیسے لہجے میں۔

”مجھے حقیقتاً کوئی فکر نہیں ہے احسن برنس ختم



ہو آئے ہو جائے آئی ڈیم کیڑ اور تم بھی مجھ سے اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں کرو گے ورنہ میں تم سے بھی ناراض ہو جاؤں گا۔" احسن مزید کچھ بولنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسے اس کا مسئلہ سمجھ آ گیا تھا۔  
تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اسے بتائے بغیر سیدھا اس کے آفس میں باہر سے ملنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

اس وقت رات کو نو بج رہے تھے۔  
وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے سیدھا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔  
جس وقت وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا سامنے صوفے پر اسے بیٹھ کر ایک لمبے کے لیے ٹھنک کر اپنی جگہ پر رک گیا۔ ٹھنک کے لیے آواز پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو بلیک شلوار ٹیچس میں پوری مردانہ وجاہت سمیت کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر بند کیے دروازے کو اس نے ہاتھ بڑھا کر آٹھا کھول دیا اور ہاتھ میں موجود موبائل اور گاڑی کی چابیاں سائیڈ ٹیبل پر رکھیں پھر کف کے ٹین کھول کر باؤ کنبیوں تک چڑھائے صوفے پر جا بیٹھا اور ریوٹ سے سی وی آن کر کے نظریں سی وی اسکرین پر جمادیں۔

وہ خطرناک حد تک سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک نظر کے بعد اس نے دوسری نظر اس پر ڈالنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ کتنی ہی دیر تک کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کمرے میں دو نفوس موجود ہیں۔

اس نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا جو مکمل توجہ کے ساتھ نیوز دیکھنے میں مصروف تھا۔ بالا خرہ وہ اسی اور آگے بڑھ کر سی وی آف کر دیا تو اس نے محض ایک نظر اس پر ڈالی پھر ریوٹ صوفے پر اچھل کر خاموشی سے اٹھ کر ٹیبل پر آکر ٹپا ہوا۔

وہ بے حد خفا تھا سالک رہا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ٹیبل پر آکھڑی ہوئی۔

وہ دونوں ہاتھ رینگ پر مضبوطی سے جما رکھ رہا تھا۔  
"میں نے تم سے کچھ ضروری بات کرنی اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے ہو کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔  
"ہوں کرو۔"

"تم آفس کیوں نہیں آرہے؟" اس نے پوچھا۔  
"یہ بات میرے لیے ضروری نہیں ہے۔" میں جواب دیتا بھی ضروری نہیں سمجھتا۔  
"دو ٹوک انداز میں کہا۔

"لیکن میرے لیے یہی بات ضروری ہے۔" بات نے مجھے یہاں تک آنے پر مجبور کیا ہے۔  
"تم نے آرام سے کہا۔  
"میرے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ تم نے کیا بات اہمیت رکھتی ہے اور کیا نہیں؟" کا انداز ہی وہ سرا تھا۔ وہ ایک لمبے کے لیے چپ تھی پھر دوبارہ بول گیا۔  
"میں نے تم سے کچھ پیچھے زبانی کرانے اس نے مدعا لیا۔

"سوری۔" اس نے فوراً جواب دیا۔  
"عید پلینز تم جانتے ہو اب تک کتنا لوں ہو۔" کتنی ہی کمینز ہیں جو آؤر ڈوائس لینا چاہتی ہیں۔  
وقت پر ڈھلوری نہ ہونے کی وجہ سے۔  
بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے تم سب جاننے کیوں کر رہے ہو ایسا؟" اسے سمجھ ہی نہیں آتا۔  
کیسے اسے سمجھائے؟ جبکہ دوسری طرف وہ خاموش تھا۔

"عید میں تم سے بات کر رہی ہوں پلینز۔"  
"کس بات کا جواب دوں؟" وہ سامنے سے کراہتے ہوئے بولا۔

"میں اگر کچھ نہیں کر رہا یا مجھے پروا نہیں۔ تمہیں سمجھ جانا چاہیے تاکہ جو میرا دل چاہے وہی کروں گا۔"

"بغلط ہے عید۔"  
"کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ میں بھلا چکا ہوں۔" وہ مسخرانہ انداز میں مسکرایا پھر مزید بولنا ہوا۔  
"اور تمہیں بھی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم یہ سب میری وجہ سے کر رہے ہو نا۔" اس نے زہری سے پوچھا۔  
"نہیں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔  
"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے عید پلینز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اس کی بات پر وہ رینگ پر سے ہاتھ ہٹا کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور سینے پر ہاتھ باندھے رخ اس کی طرف موڑ دیا۔  
"دون سی غلطی کا احساس؟" اس نے سوال کیا۔  
"یہی کہ میں نے ماموں جان اور مامی جی کو بہت غلط سمجھا تھا اور یہ کہ۔"

"اسٹاپ اٹ مامی۔" وہ بول رہی تھی کہ اس نے یکدم ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔  
"تم نے انہیں غلط سمجھا تھا نا تو جاؤ جا کر انہی سے یہ ساری باتیں کرو۔"

اس کی آواز قدرے سخت تھی اس بار۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر بھی خنکی نمایاں تھی۔

اسے تو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے بتائے کہ وہ اس دن بہت سی باتیں غلط بول گئی تھیں۔ اسے بس اس سے شکایت تھی ناراضی تھی لیکن اس کی یہ شکایت اور یہ ناراضی اتنی شدت اختیار کر گئی تھی کہ وہ اسے ہی تکلیف پہنچا چکی تھی۔ وہ بہت شرمندہ اور ہشیمان سی تھی کہ جس نے اس کی خاطر اتنا سروائیو کیا اور اتنا کچھ سہوا اسے ہی سمجھ نہیں پائی۔

جس دن اس کے رونے نے اس کے اندر بہت کچھ جنم لیا تھا لیکن وہ خود اس کے سامنے جانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی تو ماموں جان اور مامی جی سے فغان پر بات کرتے ہوئے بھی اندر رہی اندر شرمندہ ہوئی

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال ہاتھ آتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں، بالور، بچوں کے لیے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیر آئل 12 سی سی بکس کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کی خرید جاسکتا ہے ایک بول کی قیمت صرف = 100 روپے ہے۔ دوسرے شہروں کے لیے آڈر بھی کر سکتے ہیں۔ پارسل سے عموماً اس پر رجسٹری سے منسلک ہونے والے نمبر آڈر اس حساب سے بجا کرتے ہیں۔

2 بکسوں کے لئے = 250 روپے  
3 بکسوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز، ب مارکیٹ، پکینڈ فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگز، ب مارکیٹ، پکینڈ فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

کتیہ عمران ڈاٹ نیٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021



جاری تھی جنہی کی اتنی برسوں کی محبت کے جواب میں ذرا سی آزمائش کرنے پر اس نے اپنے دل میں ان کے خلاف اتنے محاذبہ ڈالے تھے۔ لیکن ماموں جان اور مائی جی سے تو وہ بھی معذرت کر چکی تھی لیکن اس نے سامنے کھڑے اس شخص کو دیکھا جو اسے ہمیشہ سے ہی مٹا چلا آتا تھا لیکن آج وہ خود تھا ہوا تو اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے اور اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیسے بات کرے؟ کیسے منائے اسے ٹیڑس پر سوچتا چھوڑ کر وہ دوبارہ اندر جا کر صوفے پر براجمان ہو چکا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔

”پلیز عدید تم ہاں کیوں نہیں رہے؟“ اس نے آگے کر اسے دیکھا۔

”تمہیں لگتا ہے تم نے مجھے منایا ہے؟“ وہ اس کی کیفیت سے شاید حفا اٹھا رہا تھا۔ بھی سوالیہ انداز میں حیرت سے بولا۔

”تو اور کیا کر رہی ہوں میں اتنی دیر سے؟“ اس نے تجھے سے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تمہیں تو مٹانا ہی نہیں آتا۔“ وہ زیر لب بیڑایا جسے سن نہ سکی تھی۔

”ان پر سائن کرو پلیز۔“ سامنے ٹیبل پر رکھی فائلز کو کھول کر اس کے آگے پھیلا کر رکھتے ہوئے اس نے الجھتا انداز میں کہا۔

”کیوں؟“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ پلکیں جھکا گئی تھی۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ اس کی اس اچانک پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو اسے دیکھنے میں مصروف تھا۔ پہلے کی نسبت اس کا سر ہتر تھا۔

”میں تم سے آفس کی بات کر رہی ہوں عدید۔“ وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔

”اور میں صرف اپنے اور تمہارے متعلق بات رہا ہوں اور کرنا چاہ رہا ہوں۔ جب تک تم مجھے نہیں کہو گی میں آفس کے بارے میں بات نہیں کر گا۔“ اس نے قطعی انداز میں کہا۔

”عدید پلیز تمہارے سائن ان پیپر زیر دست ضرور ہیں اگر تمہیں کیے تو بہت سے پر اہم ہو سکتے ہیں۔“ اسے منانے والے انداز میں بولی جس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

”ان پیپر زیر سائن کرنے سے پہلے میں تمہارے ساتھ نکاح کے پیپر زیر سائن کروں گا اس کے بعد کی باری آئے گی اگر تم چاہتی کہ مزید کوئی لوس نہ یقیناً“ تم انکار نہیں کرو گی۔“

اس کی بات پر جہاں اس کا دل زور زور سے دھڑکا اٹھا اور چہرے پر رنگ بکھرے تھے وہیں اسے مدد طرح غصہ بھی آ گیا تھا۔

”تم مجھے ٹپ کر رہے ہو عدید۔“ اس نے اپنے لیے کی کھینچ کو تشویش کرتے ہوئے کہا جس کی ضد سے پہلے ہی برس میں بہت نقصان کڑا تھا تھا۔

”ٹپ تو بت کر تاجب تم مجھ سے محبت نہ کرو رہے ہو تم اور میں زبردستی تمہیں شادی کرنے پر مجبور نہیں کر رہا حال تم اگر چاہتی کہ مزید کچھ نہ ہو تو پہلے مجھے نکاح کرو اور تم سائن اچھی کرنا چاہتی ہو تو تمہیں بھی ابھی کرنا ہو گا۔“ وہ پختہ لیے میں بول رہا تھا۔

وہ اس کی اس عجیب سی منطق پر حیران ہوئے رہ سکی تھی۔

کسی طور پر اضی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”نہیں پہلے نکاح ہو گا پھر پیپر زیر سائن۔“ اسے ماننے پر وہ بھی قدرے نرمی سے بولا۔

”تم ہر بات اپنی منوائے ہو عدید۔“ اسے غصہ آ گیا تھا۔

”ہر بات کا تو پتا نہیں لیکن یہ بات ضرور منوا کر رہوں گا۔“ وہ پورے یقین کے ساتھ بولا تو وہ جڑبڑ ہو کر رہ گئی۔

وہ اس کی ضد کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی سو مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور تن فن کرتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”میں رات گیارہ بجے تک تمہارے جواب کا انتظار کروں گا ورنہ ہو سکتا ہے کہ گیارہ بجے کے بعد میرا یہ والا ارادہ بھی بدل جائے۔“ اسے اپنے پیچھے اس کی آواز سنائی دی پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی وہ بھروسہ پر قہر لگا کر سن پڑا۔ اور پھر رات پونے گیارہ بجے فاطمہ بچو کا فون آچکا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں کہ مایا نے ہاں کر دی ہے۔

وہ بالکل ہلکا ہلکا سا ہو گیا تھا۔ ایک دم تازہ اتنے دنوں کی ساری کلفت ایک لمحے میں دور ہو چکی تھی۔

الگے ہی دن صبح دس بجے ان کا نکاح قرار کیا گیا تھا۔ جس میں احسن سمیت تمام گھروالے شامل تھے۔ ملایا بھی بے حد خوش تھے انہوں نے موقع پر فون کر کے لاٹوں کو خوب ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا تھا۔ رخصتی ان کے پاکستان آنے تک ملتوی کر دی گئی تھی۔ ہر چہ وہ کھانا ہوا اور روشن تھا۔

نکاح کے بعد وہ احسن کے ساتھ خوش گہیوں میں مصروف تھا جب وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی تو وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا جو شکایتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

بہی نکل گئی اور وہ چپ چاپ تمام پیپر زیر سائن کرنے لگا۔

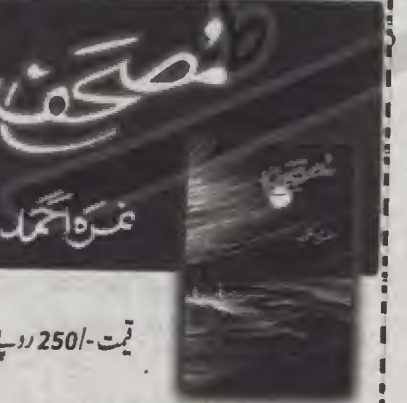
”یہ لیجئے جناب۔“ اس نے تمام پیپر ز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔

”اب تو آپ ہماری موت کے پروانے پر بھی سائن کرائیں گی تو بندہ جی جان سے حاضر ہے۔“ وہ سینے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا جھک کر بولا تو وہ اسے شکایتی نظروں سے گھورنے لگی پھر اس کی اس قدر محبت پر خود کو خوش قسمت تصور کرتی اور اللہ کا شکر ادا کرتی وہاں سے چلی آئی۔

”چل یار آج اپنا وعدہ پورا کر اور مجھے کسی اچھے سے ڈھابے سے کھانا کھلا۔“ احسن نے اس کا وعدہ یاد دلایا۔

”بندہ حاضر ہے میرے دوست۔“ وہ آج بے حد خوش اور مطمئن تھا۔ احسن دل ہی دل میں اس کی خوشیوں کے ہمیشہ رہنے کی دعائیں کرتا اس کے ساتھ سب کے درمیان جا بیٹھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



قیمت - 250/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی



## میرا تاج

میں جیسے ہی ڈاکٹر احسن تاج کے کلینک سے باہر نکلی اچانک ہی بالکل غیر متوقع طور پر اپنے سامنے ماہین کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ گزرے چھ برسوں نے اس کی شخصیت کو کافی تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ میں اپنی عزیز از جان دوست کو پہچان نہ پائی۔

”نشیمن“ ماہین کے سرسراتے لبوں سے میرے نام کی آوازی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ بھی مجھے پہچان چکی ہے۔ حالانکہ بقول عمو کے میرے جسم پر چڑھی چلی نے مجھ سے میرے اصل نقش و چہرہ لیے تھے۔ لیکن میں جانتی تھی کہ وہ ایسا عمو ”ذائقہ“ میں کہا کرتا تھا اور پھر پہچان کا مرحلہ طے کرتے ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ چکی تھیں اور پھر وہیں کھڑے کھڑے ایک دوسرے سے حل احوال دریافت کرتے، ہمیں کافی دیر ہو گئی۔ ہوش تو اس وقت آیا جب ماہین کی گود میں موجود اس کی معصوم بچی رونے لگی اور ایسے ہی مجھے بھی احساس ہوا کہ بچوں کا اسکول سے واپسی کا وقت ہو چکا ہے اور پھر دل نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس سے رخصت ہونا پڑا۔ لیکن جاتے جاتے بھی میں اسے اپنا فون نمبر اور ایڈریس دیتا نہ بھولی تھی۔

”یہ میرا ایڈریس اور فون نمبر ہے، اب رابطہ میں رہنا۔“

میں نے جلدی جلدی کانڈر چند سطرس کھینچ کر اس کے حوالے کیا جبکہ اس کا فون نمبر میں اپنے سیل فون پر فیکر چکی تھی اور اب جلد از جلد گھر جا کر عمو کو آج کی اپنی اس ملاقات کا احوال سن و عن بتانا چاہتی تھی اور



پھر گھر پہنچ کر میں نے اس دن عمو کا بڑی بے چینی انتظار کیا اور شام میں جب تک وہ گھر آیا میں گھر کا تمام کام سمیٹ چکی تھی معین اور معاذ اپنا ہوم ورک کر رہے تھے۔ جبکہ معین سو رہا تھا۔ کیونکہ پچھلے دن سے اسے بخار تھا اور اسی کو لے کر میں ڈاکٹر احسن کے کلینک گئی تھی جہاں اتفاق سے میری ملاقات ماہین سے ہو گئی۔ عمو کو پہلے تو میں نے معین کی طبیعت بتایا اور پھر فوراً ہی وہ خبر سنانی جسے سن کر مجھے یقین آیا کہ وہ بھی کچھ کم حیران نہ ہوگا۔

”تمہیں پتا ہے آج ڈاکٹر تاج کے کلینک پر میری ملاقات کس سے ہوئی؟“ مارے اشتیاق کے مجھ سے برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے جیسے ہی وہ فاسک ہو کر بیٹھا میں بے ساختہ بول اٹھی۔

”کس سے ہو گئی؟“ وہ اپنا لپ ٹاپ اٹھا چکا تھا۔ لیکن اسے آن کرنے سے قبل اس نے پلٹ کر میں

جانب دیکھا۔

”بوجھ تو جا میں۔“

”بوجھ تو نہیں سکتا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ملنے والی ہستی ضرور کوئی خاص الحاس ہی ہوگی، جب ہمارا رشتہ محترمہ اتنی خوش نظر آ رہی ہیں کہ چہرے پر سوائٹ کا بلب روشن ہو رہا ہے۔“ عمو نے بڑے پر سے مجھ پر ایک نظر ڈال کر جواب دیا۔

”خیر شخصیت تو یقیناً ایسی ہی تھی کہ سن کر تب بھی شک نہ رہ جائیں گے۔“ میں نے ذرا سادہ دماغ سے وے کر عمو کی جانب نظر ڈالی جو میری طرف ہی متوجہ تھا۔



شوہر کی اجازت کے ساری دھوپ میرے ساتھ گزار کر جاری تھی۔ جبکہ میں جب بھی کہیں جاتی رہی طور پر ہی سہی عدا سے بوجھتی ضرور میرے نزدیک ایکلی عورت کا اس طرح سترے ہمارے بالکل بھی درست نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جانا چاہتی تھی کہ وہ کون سے عوامل ہیں جن کے تحت ماہین جیسی ایک دولہ لڑکی اتنے دھڑلے سے بنا شوہر کی اجازت میرے گھر آئی۔

”بس یار کیا باتیں تمہیں تو پتا بھی نہ ہو گا ایک سرکاری ملازم کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں۔“ وہ میرے سے کہی۔

”م میں وہ دھوپ گیارہ بجے تک ایک سرکاری ادارے میں حاضری لگا کر نکل جاتا ہے اور پھر دوسری جگہ پر ایسٹ نوکری کرتا ہے۔ ورنہ اس کی ایک تنخواہ میں اس منگانی میں گزارہ کرنا کس قدر دشوار ہے تم اندازہ نہیں لگا سکتی۔“ وہ درست کہہ رہی تھی۔ لیکن پھر جس اس کا حلیہ دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

نخل حسی بیستی میں



فلاخو جیجی

قیمت - 400 روپے

منگلے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی  
فون نمبر:  
32735021

دہاں ہم سے ملے عدا آیا کرتا تھا اور ایسے میں اکثر و بیشتر اس کے ساتھ رحمان بھی ہوتا جو صرف ماہین کی ایک جگہ دیکھنے کے لیے آتا تھا۔ کیونکہ ایک دم ڈر پوک ماہین اسے اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا جاتی تھی اور اس کے منہ سے کوئی آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ اس وقت کو یاد کرتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آتی اور پھر اس دن ہم نے گزرے وقت کو یاد کر کے خوب انجوائے کیا میری اور عدا کی بے تابیاں یاد کر کے وہ خوب ہنسی اور پھر ہم سے ہوتے ہوئے بات رحمان کی بے فزائی تک جا پہنچی جسے یاد کر کے ہنسنے ہنسنے ماہین کی آنکھیں پانی سے لہلہاں بھر گئیں اور ایسے میں جب ہم دنا دنا فیملی کے خرابی باتوں میں کہہ رہے تھے اچانک ہی گھڑی نے چھ کا گھنٹہ بجایا جسے سنتے ہی وہ چونک اٹھی۔

”اے میرے خدا چھ بج گئے پتا ہی نہیں چلا۔“ وہ یکدم ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور میں چاہتے ہوئے بھی نہ کہہ سکی کہ رات کا کھانا کھا کر جاؤ، تمہیں عدا چھوڑ آئے گا۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ عدا تو ماہین کو اپنے گھر میں دیکھ کر ہی ناراض ہو گا۔ اس لیے میں بھی جانتی تھی کہ وہ اس کی گھر واپسی سے قبل ہی چلی جائے۔

”تمہاری بیٹیاں گھر میں کس کے پاس ہوتی ہیں؟“ چار گھنٹے کی طویل ملاقات میں مجھے پہلی بار اس کی بیٹیاں کا خیال آیا۔

”میری منہ کے پاس وہ طلاق کے بعد ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے۔“ ماہین کے جواب دیتے دیتے اپنا لپٹہ درست کیا اور ہنسنے لگا۔

”واپس بھی آگئی ہی جاؤ گی؟“

”ہاں ظاہر ہے اب خرم کو کیا پتا کہ میں تمہارے گھر ہوں۔ ویسے بھی اس کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہو گا کہ وہ ان بیٹیوں میں بڑے۔“

”کیوں نہ ایسا کہاں مصروف ہوتا ہے؟ اور تم نے اسے بتایا نہیں کہ تم میرے گھر آ رہی ہو؟“ میں نے اچھے سے سوال کیے، مجھے حیرت تھی کہ ماہین بنا اپنے

غالباً کوئی خاتون تھیں۔ اس وقت کسی کے آنے کر مجھے کوفت ضرور ہوئی۔ لیکن پھر بھی مہمان چاند کی رحمت ہوتے ہیں۔ بس یہی سوچ کر پاؤں سیلبر پین کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ جہاں صوفہ قریب ہی ماہین کھڑی تھی۔ بلیک اور ریڈ لان کے سر میں آج بھی اپنی انڈی خوب صورتی کے ساتھ۔

تک کہ اس دن کی ملاقات میں مجھے اس کے چہرے جو زور دی دکھائی دی تھی آج اس میں نمایاں کمی آ رہی تھی۔ جبکہ اس کا سٹائل اور متناسب جسم اب لگتا ہی نہ تھا کہ وہ تین عدد بیٹیوں کی ماں ہے۔ آج نہ سب سے تیار ماہین اس دن کے حلیہ سے قدر مختلف نظر آ رہی تھی۔

ماہین کو دیکھتے ہی مجھے پہلا خیال عدا کا آیا۔ لیکن اگلے ہی بل میں نے اسے جھٹک کر ماہین کو مٹا دیا اور پھر وہ ساری دھوپ رہتا کی اندیشے کے میں نے اسے ہنس بول کر ماہین کے ساتھ گزارا۔

ماہین سے ہونے والی گفتگو سے میں یہ اندازہ لگا میں کامیاب ہو گئی تھی کہ آج کی ماہین کل والی سے قدرے مختلف تھی۔ گزرتے وقت نے ماہین کی کافی تبدیل کر دیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ براعت مند تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈولر سہی ماہین جو اپنی ماں اور بڑی بھابی کی آواز سن کر کانپ جایا کرتی تھی آج اتنے اعتماد سے ایکلی ٹیکے سفر طے کر کے مجھ سے ملنے آئی تھی۔ مجھے وہ وقت آیا جب وہ ہر وقت اپنے چار عدد بھائیوں کے زیرِ عتاب رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے گھر کے گھٹے ہونے ماحول سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے گھر کے قریب ہی ایک ویکیٹل سینٹر جو اپنے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔

کیونکہ اسے کلچر بڑھنے کی اجازت نہ تھی اور اس ویکیٹل سینٹر میں اپنی دوست کی خاطر ایک گھنٹہ میں میں بھی جایا کرتی تھی۔ حالانکہ مجھے سلائی کڑھانے سے بالکل بھی شغف نہ تھا۔

ویکیٹل سینٹر آتے ہی کئی پرانی یادیں مجھے میرے ذہن میں اتر آئیں اور مجھے یاد آیا کہ کس

”مجھے آج ماہین ملی تھی۔“ اب مجھ سے مزید صبر نہ ہو سکا اور میں بول ہی پڑی اور میں توقع کر رہی تھی اس کے برعکس اس نے ایک ساٹھ نظر مجھ پر ڈالی اور پھر کسی بھی حیرت یا خوشی کے بجائے اس کے چہرے پر یکدم ہی گہری سنجیدگی سی چھائی۔

”آج کھانے میں کیا پکایا ہے؟“ اور میں جو عدا کے موڈ کو ایک ہی بل میں سمجھ جاتی تھی۔ فوراً سمجھ گئی کہ اسے میرا ماہین سے ملنا ناگوار گزارا ہے اور اس کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ وہ آج تک ماہین کی اس بے وفائی کو نہیں بھولا تھا جو اس نے رحمان کے ساتھ کی تھی جس کے نتیجے میں رحمان پچھلے چھ سالوں سے اسپین میں مقیم تھا اور اس نے ان گزرے چھ برسوں میں ہم سے کبھی کوئی رابطہ ہی نہ رکھا تھا۔ ہاں البتہ پھوپھو سے ہمیں اس کے بارے میں پتا ضرور چل جاتا تھا۔

عدا کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہی میں بھی خاموش ہو گئی اور دل ہی دل میں عدا کو لیا کہ اب مجھے ماہین سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا، کیونکہ شاید یہی میرے گھر کیلئے مفاد میں بہتر نہ تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے عدا پر سختی سے قائم رہتی میرے خیال کے بالکل برعکس اگلے ہی ہفتہ اچانک ہی وہ میرے گھر آئی اور میں جو یہ سمجھ رہی تھی کہ میرے رابطہ نہ کرنے سے یہ سلسلہ بحال ہی نہ ہو گا اب اس بات پر پچھتائی کہ کیوں اسے اپنا پتا اور فون نمبر دیا۔ لیکن بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اس کا سواگت دل کی گہرائیوں سے کرتی۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ شاید پیرا منگل کا دن تھا میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں قیلولہ کر رہی تھی۔ کیونکہ میری شروع سے عادت تھی کہ معین اور معاز کے اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھا کر انہیں بھی سلاوتی اور تقریباً دو گھنٹے خود بھی سوتی، تاکہ شام کو عدا کے گھر آنے سے قبل فریش ہو سکوں، ابھی بھی وہ دونوں اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ جبکہ معیت بھی سو چکا تھا اور قبل اس کے کہ میں بھی سو جاتی خلاف توقع آئندہ نے مجھے کسی غیر متوقع مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔ جو



مشکل سے گزارہ کرنے والی عورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بھائی اس کی مدد کرتے ہوں اور یقیناً ”ایسا ہی تھا۔“

زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے اور میں نے عماد پر ایک  
ڈالی جو گاڑی اشارت کر چکا تھا۔

ماہین آج صبح سے ہی میرے گھر تھی اور میں  
میں اس کی پسند کا کھانا تیار کروا رہی تھی۔ جبکہ وہ  
لان میں معزز کے ساتھ بیٹھیں باتیں کر رہی تھی۔  
اس کے ہمراہ اس کی پانچ سالہ بیٹی پریشہ بھی تھی۔  
وہ اکثر دو بیستر ہی میرے گھر آجایا کرتی تھی اور عمر  
واپسی میں اسے میں اور عماد ذراپ کو بیٹے تھے۔  
تک کہ ایک دو دفعہ باہر آنکب پر جاتے ہوئے  
نے اسے اپنے ہمراہ لے لیا تھا اور اس تمام عمر  
گھر کے باہر ہی میری ایک ملاقات اس کے شوہر  
سے بھی ہوئی تھی۔ جس کی دہلی دہلی سی شخصیت  
میرے سامنے ایک بار پھر پورے کوفرخ کے  
رحمان کو لا کر آیا اور پھر سوچ کر کہ جوڑے  
پر بیٹے ہیں میں نے خود کو تسلی دینے کی ایک

کوشش کی تھی۔ ورنہ کھل خرم اور کھل ایک شان دار شخصیت کا حامل رحمان احمد جو مابین پر اپنی جان تک بچھاؤ کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زائدہ آئی کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ مابین سے دستبردار ہونے کو رضامند نہ تھا۔

دنیا بھر میں منتخب معیاری ادب



جائیں اور اس وقت جب میں بچ تیار کر کے ٹیبل پر لگو رہی تھی۔ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے عمو بھی جلدی گھر آیا۔ حالانکہ عام طور پر وہ کبھی بھی بچ گھرنے کو نہ آتا تھا۔ کیونکہ یہ نام اس کی مصروفیت کا ہوا تھا۔ عمو کو گھر دیکھ کر میں حیران تو ضرور ہوئی، لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اچھا بھی لگا اور پھر ہم سب نے بچ ایک ساتھ کیا۔ بچ کے بعد عمو کو کسی کام سے باہر جانا تھا اور بالکل اس وقت جب وہ گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلا۔ یک دم ہی ماہین کو کوئی کام یاد آیا۔ جبکہ اس سے بیشتر اس کا ارادہ چائے پینے کا تھا۔

”پتو میں جاتا ہوا“ تمہیں ڈراپ کروں گا۔“ عمو نے اسے غلٹ میں کھڑا ہوتے دیکھ کر رک کر آخر کی اور پھر وہ عمو کے ساتھ ہی چلی گئی۔ ویسے تو وہ جب بھی آتی شام تک رکتی تھی۔ لیکن جانے کیوں آج بھری دوپہر میں ہی واپس چلی گئی۔ بہر حال سب کے گھر کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آج اس کو واقعی کوئی ایمر جنسی کام یاد آیا ہو۔ ویسے بھی۔۔۔ مجھے کیرید اور تجس جس کی زیادہ عادت نہ تھی۔ اس لیے میں جلد ہی مطمئن ہو گئی۔

جانے کیا بات تھی پچھلے کی دونوں سے ماہین میرے گھر نہ آئی تھی۔ اس کا سبب بھی بند جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ کسی پریشانی کا شکار نہ ہو۔ میں نے عمو سے کہا کہ وہ مجھے آگے جانا ہوا کچھ دیر کے لیے ماہین کے گھر چھوڑ دے اور پھر تھوڑے پس و پیش کے بعد وہ آتا ہو گیا اور اس کے مانتے ہی میں جلدی سے تیار ہو گئی۔ راستے میں ہم نے بیکری سے ڈھیر سارا سامان اس کی بچوں کے لیے خریدا اور جب اس دن پہلی بار میں ماہین کے گھر کے اندر داخل ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ باہر سے ہمساندہ نظر آنے والا یہ گھر اندر سے اس سے بھی زیادہ خستہ حال ہے اس گھر کی زبوں حالی نے میرے حساس دل کو ایک بار پھر دکھایا۔ ماہین کی تیند مجھے اندر کرے میں ہٹا کر جانے کھل غائب ہو گئی تھی اور پھر اگلے پندرہ منٹ تک میں اس کمرے کا جائزہ لے کر آتا چکی تھی اور ایسے میں جب میں اٹھنے کا ارادہ

کر رہی تھی تو یک دم ہی ماہین آئی۔ خرم کے سہارے چلتی ہوئی اس کی حالت دیکھتے ہی میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا تمہیں سب ٹھیک تو ہے۔“ میں نے آگے بڑھ کر اسے کہا۔

”کچھ نہیں، بس ذرا طبیعت ٹھیک نہیں ہے، فوراً پوائزن ہو گیا تھا۔“ اپنی حالت کا جواز دلاتے ہوئے وہ میرے سہارے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

”آپ آئی ہیں تو پلیراز سے سمجھائیں کچھ کھایا یا کرے، ایک تو بخار“ اس پر یہ کچھ کھائی بھی نہیں ہے۔“ خرم کے لہجہ میں ماہین کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ جبکہ ماہین کی بے زاری بنا کچھ کہے بھی مخصوص کی جاسکتی تھی۔

”پلیراز خرم ذرا جلدی سے کوئلہ ڈرنک لے آؤ اور یہ تم اتنا سب کچھ کیوں اٹھا لائی ہو۔“ خرم کو منظر سے ہٹاتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”اے پہلی دفعہ تمہارے گھر آئی ہو۔ آخر کچھ تو اپنی بھانجیوں کے لیے لے کر آئی ہو۔“ میں نے پھوٹی والی انوشے کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

”اور تمہاری طبیعت خراب تھی اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“ میں نے شکوہ کرتے ہوئے اس کی زرد زردی رنگت پر نگاہ ڈالی۔

”بس یار کیا تھوڑا سوچا تھا ٹھیک ہو جاؤں تو خود ہی تمہاری طرف چکر لگاؤں گی اور ویسے بھی بچ پوچھو تو مجھے امید نہ تھی کہ تم میرے گھر آ جاؤ گی۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بولی اور پھر تقریباً دو گھنٹہ تک کا وقت میں نے اس کے ساتھ گزارا اور اس دن پہلی بار مجھے ماہین کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی گھریلو زندگی سے خوش تو کیا مطمئن بھی نہیں ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آج بھی رحمان کی یاد ایک کسک بن کر اس کے دل میں موجود ہے اور جب یہ بات میں نے عمو سے کی تو اس نے بھی میرے اس خیال کی سوجھ بوجھ نہ کی۔



عمو میرے رشتہ کے پھوپھی زاد تھے جن کی

پوری فیملی دینی میں ہی رہائش پذیر تھی اور ان دنوں جب میں صرف سولہ سال کی تھی اور ابھی میٹرک میں زیر تعلیم تھی۔ عمو اپنی والدہ کے ساتھ ایک بار پاکستان آیا تو ہمارے گھر بھی آیا اور اس ایک ہی ملاقات میں وہ میری محبت میں اس طرح گرفتار ہوا کہ پھر پاکستان کا ہی ہو کر رہ گیا۔ پہلے تو وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے پاکستان آتے لگے۔ پھر اس نے اپنے گھروالوں کی مخالفت کے باوجود یہاں ہی IBA میں داخلہ لے لیا۔ جبکہ اس کے والد کی سپر اسٹورز کی ایک چین تھی اور ان کے خیال میں اپنا کاروبار سنبھالنے کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی عمو نے بی بی اے کیا اور اس دوران ایک زوردار معاشقہ کے بعد میری انور اس کی شادی بھی ہو گئی۔ حالانکہ اس شادی کی مخالفت میں اس کے گھروالوں کے علاوہ میری والدہ بھی شامل تھیں۔ کیونکہ انہیں عمو کی والدہ بالکل بھی پسند نہ تھیں۔ جبکہ ہمارے اسٹیشن میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا اور یہی چیز میری والدہ کو پریشان کر رہی تھی۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ نصیب کا لکھا ٹالا نہیں جاسکتا تو میرے نصیب میں بھی عمو لکھ دیا گیا تھا جو مجھے حاصل ہو گیا۔

جس پر میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ان دنوں جب بھی میں عمو سے ملی ہمیشہ ماہین میرے ہمراہ ہی ہوتی۔ ستارہ سی روشن آنکھوں والی سیدھی سا دی ماہین جس کی کھنک دار منہی ہم دونوں کو بہت اچھی لگتی۔ ہماری ملاقاتوں کی ہمیشہ ایمن رہی اور پھر میری منگنی کے موقع پر عمو کے کزن رحمان کو وہ اس قدر بھائی کہ مانو وہ اس کا شیدائی ہی ہو گیا اور پھر جب جب عمو ہمارے گھر آتا وہ بھی ہمیشہ ساتھ ہی ہوتا اور ایسے میں چائے کتنے پاز تیل کر میں ماہین کو اپنے گھر لے کر آیا کرتی تھی۔

شروع شروع میں تو ماہین رحمان کے نام سے ہی بدلتی تھی۔ جس کی وجہ یقیناً اس کے گھر کا قدمت پسند ماحول تھا۔ وہ چار بھائیوں سے چھوٹی تھی اور بھائی بھی نہ بھلا جو ذرا سی بات پر اس پر ہاتھ اٹھانے

سے بھی نہ دریغ کرتے تھے۔ ویسے بھی سننے میں آیا تھا کہ بچپن سے ہی اس کا رشتہ اپنے چچا کے گھر پر طے پا چکا تھا۔ لیکن اس بات کا ذکر کبھی بھی ماہین مجھ سے نہ کرتی تھی اور اس کی دل آزاری کے خیال سے بھی میں نے بھی نہ کیرید اٹھا۔ لیکن ان سب کے باوجود گزرتے وقت نے آہستہ آہستہ ماہین کے دل میں بھی رحمان کی محبت کو بھرا دیا اور اس کی اس دلی کیفیت کا سب سے پہلے مجھے ہی پتا چلا، کیونکہ جب بھی عمو اور رحمان ہمارے گھر آتے ماہین کی آنکھوں میں جنوں سے ٹپکنے لگتے۔ اب تو اگر رحمان میرے توسط سے اسے کوئی گفت دیتا تو وہ بھی خاموشی سے رکھ لیتی۔ یہاں تک کہ جب بھی ہم کبھی باہر گئے وہ بھی کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر ہمارے ساتھ ہی ہوتی۔

اس وقت جب رحمان کی ممّا زادہ آئی اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہی تھیں۔ رحمان نے نہایت اطمینان سے ماہین کا نام لے دیا۔ ہو سکتا ہے ایسا اس نے ماہین سے پوچھ کر ہی کیا ہو، لیکن پھر بھی جس دن زادہ آئی، ان کے ساتھ ماہین کے گھر گئیں مجھے لگ رہا تھا کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے اور وہ تمام وقت میں نے بدترین خدشات میں گھر گم گزارا اور پھر میرے خدشات درست ثابت ہوئے۔ رحمان کے رشتہ کا سن کر ماہین کے گھروالوں کا رد عمل اتنا شدید تھا کہ امی بھی حیران رہ گئیں۔ انہوں نے بنا کسی لحاظ و محوت کے امی کے ساتھ ساتھ زادہ آئی کی بھی جی بھر کے بے عزتی کی۔ اس کی والدہ نے اتنا اوڑا کیا کہ الامان ان کا کمانا تھا کہ ماہین کا خرم سے رشتہ اس کی رضامندی سے طے کیا گیا ہے اور میں ماہین کو درغلانی کی ذمہ دار ٹھہری۔ اس کی والدہ کا کمانا تھا کہ ان کی بیٹی تا صرف سیدھی سا دی، بلکہ نہایت ہی شریف النفس بھی ہے اور رحمان کو ان کے گھر بھیجنے میں میرا کردار سب سے اہم ٹھہرایا گیا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ماہین اس مسئلہ میں بالکل خاموش تماشائی بنی رہی۔ اس کا رد عمل بالکل ایسا تھا جیسے اسے رحمان کے متوقع رشتہ کے بارے میں بالکل بھی علم نہ تھا اور یہ سب



کچھ ایسی کی زبانی سن کر مجھے شدید ترین غصہ آیا۔ لیکن اپنے غصہ کا اظہار کرنے کا موقع مجھے یوں نہ ملا کہ اگلے پندرہ دن کے اندر مابین، خرم کے ہمراہ رخصت ہو گئی۔ اس کی شادی کی تقریب میں ہمارے گھر والوں کو مدعو بھی نہ کیا گیا اور پھر اس طرح جب میری شادی عمو سے ہوئی تو مابین کے گھر کے کسی فرد نے شرکت نہ کی۔ حالانکہ ہم نے محلہ داری کے ناتے کا رُز بھیجنا فرض سمجھا تھا اور پھر ہمارا ان سے رابطہ بالکل ختم ہو گیا اور آج بھی ایک ہی محلہ میں رہنے کے باوجود ہمارا اس گھرانے سے بالکل میل ملاپ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اور عمو نے مابین سے ہونے والی اپنی موجودہ ملاقاتوں کا ذکر گھر میں کسی سے نہ کیا۔ ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے پچھو پھو دہی سے آئی ہوئی تھیں۔ پہلے کی نسبت ان کا رویہ مجھ سے خاصا ہتر ہو چکا تھا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ میں نے ان کے اکلوتے بیٹے کو تین عدد وارث دیے تھے۔ اس لیے بھی شاید سسرال میں میری عزت پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

پچھو پھو کو رحمن والے قصہ کا نصف علم تھا بلکہ وہ مابین سے بھی واقف تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مابین کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ پچھو پھو کی موجودگی میں وہ گھر نہ آئے۔ مجھے علم تھا پچھو پھو اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔ البتہ فون پر اکثر ویسٹری میں بات کر کے اس کی خیریت دریافت کر لیا کرتی تھی۔ اس دن کے بعد میں اس کے گھر جانے کا حوصلہ بھی خود میں پیدا نہ کر سکی۔

\*\*\*

وہ ہی دن رات کا دورانیہ ہے وہ ہی کار جہاں ہے اور میں ہوں نہ جانے کون تھک جائے پہلے میری عمر رواں ہے اور میں ہوں وقت دے پاؤں بیٹا جا رہا تھا۔ اس دفعہ پچھو پھو تقریباً چھ ماہ کے لیے کراچی آئی تھیں۔ ان کو ہارٹ پرائیم تھا۔ جس کا علاج یہاں کے ایک بڑے اسپتال

میں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی اب پچھو پھو پہلے سے خاص تبدیل ہو چکی تھیں۔ ان کی طنز پر گفتگو نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اس لیے بھی مجھے ان کی اپنے گھر رہائش سے کوئی پرائیم نہ تھی۔ لیکن جب بھی میری مابین سے بات ہوتی وہ پچھو پھو کی موجودگی کا سن کر بڑا ناراض ہوتی۔

”کیا ہے یار یہ کب جائیں گی۔ پتا ہے کتنے دن ہو گئے تم سے ملے ہوئے۔“ اس کی بات کسی قدر درست بھی تھی۔ لیکن میں اسے اپنے گھر بلانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ اس کی بات سن کر ہنس دیتی اور اسے سمجھاتی۔

”پچھو پھو بیمار ہیں۔ ایسے میں اکلوتی ہو ہونے کے ناتے میں ان کی خدمت نہ کروں گی تو کون کرے گا۔“ ”بڑا جگر ہے یہی تمہارا مجھے اچھی طرح یاد ہے تمہاری ساسی تمہارے رشتے میں کتنی رخنہ اندازتی ڈالتی تھی۔“ وہ مجھے گزر اوقات یاد دلاتی جو مجھ سے زیادہ اسے یاد تھا۔

”چلو یار جانے دو سب کے اپنے اپنے اعمال ہیں۔ بہر حال اب وہ میرے ساتھ بہت اچھی ہیں۔ لہذا میرا بھی فرض بنتا ہے کہ میں بھی ان کی خوب خدمت کروں۔“ میں اسے مطمئن کر کے فون بند کر دیتی عمو پر آج کل وہ ہری زہد داری بڑھ گئی تھی۔ اپنا کاروبار گھر اور پھر پچھو پھو کے ساتھ اسپتال کے چکر لگاتی وجہ تھی کہ ہمارا باہر جانا بہت کم ہو رہا تھا۔ ورنہ میں کسی دوست سے ملنے کا بہانہ بنا کر ایک دو دفعہ تو مابین سے ضرور مل آتی۔ کام کی بے تحاشا مصروفیت کی بنا پر آج کل عمو بھی کچھ تھکا تھکا سا رہتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے چڑچڑاہی محسوس ہوتی۔ اسی لیے میں امی کی طرف بھی نہ جا پاری تھی۔ زندگی بہت ہی بے کس سی ہو گئی تھی۔ بالکل روکھی پھسکی، حالانکہ مجھے اس طرح کی زندگی بالکل بھی پسند نہ تھی۔ میں تو زندگی میں شور شرابا اور ہلا گلا کی قائل تھی۔ شاید یہی محسوس کرتے ہوئے بنا میرے کے عمو مجھے اور بچوں کو اس وقت لے کر روانے کے ایف سی لے گیا۔ جب ہم پچھو پھو کے چیک اپ کے

لے اسپتال آئے تھے اتنی مصروفیت میں بھی عمو نے جودت میرے اور بچوں کے لیے نکالا اس نے میری دلچسپی کو سرشار سا کر دیا۔

آج ہمیں پچھو پھو کے ساتھ باہر ڈنر پر جانا تھا۔ میں پچھو پھو اور بچے بالکل تیار ہو چکے تھے جبکہ عمو ابھی تک شوروم سے ہی نہ آئے تھے۔ حالانکہ عام طور پر وہ سات بجے تک گھر آجاتے تھے۔ جبکہ اب گھری نوکے ہندے پر تھی۔ دو دفعہ میں نے فون کیا۔ مجھے ریسیو کیے بغیر ہی ڈسکنکٹ کر دیا گیا۔ جس کی بنا پر میرا موڈ سخت آف ہو گیا اور جب دس بجے کے قریب وہ گھر آیا تو میرا موڈ وہی تھا جس پر بنا کوئی دھیان دینے عمو اپنے کام میں مشغول رہا۔

”میرے کپڑے نکال دو میں نما کر آتا ہوں پھر حلتے ہیں۔“ مجھے ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ اپنا موبائل چارنگ پر لگا کر وہ تیزی سے باختر روم میں گھس گیا۔ میں نے خاموشی سے اٹھ کر اس کے کپڑے نکالے اور بیگر سمیت ہی بیڈ پر رکھ دیے اور پھر میں ریک کی جانب بڑھی، پہل اس کے میچنگ جوتے موجود تھے۔ نقل اس کے کہ میں جوتے نکالتی اچانک ہی عمو کا موبائل بج اٹھا۔ جیسا کہ میں نے شاید آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ مجھے کبھی بھی زیادہ تجسس کی عادت نہ رہی تھی۔ اس لیے بنا موبائل پر دھیان دے خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ لیکن جانے دو سری طرف کون تھا یا شاید وہ سری جانب موجود شخصیت کو کوئی شدید قسم کی ایمر بھی تھی کہ فون بند ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ آخر کار نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے آگے بڑھ کر کال ریسیو کرنی پڑی۔ لیکن میری آواز سننے ہی فون بند ہو گیا۔ نمبر کوئی نیا ہی تھا۔ کیونکہ وہ عمو کے موبائل میں فیڈ نہ تھا۔ پھر بھی جانے کیوں وہ نمبر مجھے دکھا بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے آخر کے تین عدد کسی بھی ایسے نمبر کے تھے جو میرے پاس بھی موجود تھا۔

”کس کا فون ہے؟“ عمو باتھ روم سے باہر آچکا تھا اور اب تو لیے سے سر صاف کرتا ہوا میرے قریب آ کر بیٹھا۔

”پتا نہیں کوئی بولا نہیں۔“ آہستہ سے جواب دے کر میں آگے بڑھ گئی۔ لیکن میرے ذہن میں ایک عجیب سی خلیص سی پیدا ہو گئی۔ مجھے میں کوئی نام نہ دے رہی تھی۔ عمو نے آگے بڑھ کر فون کو چارجر سے علیحدہ کیا اور نمبر چیک کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس دوران بڑی تیزی سے اس نے کسی کو ایک پیغام بھی بھیجا جو غالباً ”فون کرنے والے کو ہی تھا۔ میں الجھ گئی تھی۔ میرے ذہن میں اس فون کے آخری تین ہندے اور سم کوڈ جیسے نقش ہو کر رہ گیا اور پھر وہ بے نام سی خلیص جلد ہی دور ہو گئی۔ ڈنر کے دوران میرے موبائل پر آنے والے مابین کا ایک فاورورڈ مہم سچ نے میرے ذہن کو صاف کر دیا۔ یقیناً ”عمو کے سیل پر آنے والی کال مابین کی تھی۔“

”رات کے اس وقت وہ عمو کو فون کیوں کر رہی تھی؟“ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا کوئی گھریلو مسئلہ ہو جس کے لیے عمو کی مدد درکار ہو یہ سوچ کر میں نے اپنے دل کو تسلی دینا چاہی۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں میرا دھیان بار بار بھٹک کر اسی فون کی جانب چلا جاتا تھا۔ حالانکہ میرے سامنے دکھائی دینے والا منظر بڑا خوش کن تھا۔ عمو حسب عادت میری بار بار تعریف کر رہا تھا۔ جبکہ آج تو پچھو پھو بھی مسکرا کر اس کی تائید کر رہی تھیں۔ اپنے دونوں جانب بیٹھے معین اور معاذ کو بڑی محبت سے کھانا کھلاتے ہوئے وہ نا صرف ایک شفیت بپ بلکہ جان نچھاور کرنے والا شوہر بھی نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں میں مطمئن نہ تھی۔ شاید میں ہی کچھ وہمی ہوئی جا رہی ہوں یہ سوچ کر میں نے دل ہی دل میں خود کو سرزنش کی اور پھر بظاہر مطمئن سی ہو گئی۔

\*\*\*

”کیا بات ہے آج کل آپ روزانہ کچھ لیٹ نہیں ہو جاتے۔“ عمو کھانا کھا کر لپ ٹاپ پر مصروف ہو چکا تھا۔ جبکہ میں قریب ہی بیٹھی ایک فیشن میگزین دیکھ



رہی تھی۔ ایسے میں برسبیل تذکرہ چھ بیٹھی۔  
 ”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں کیوں لیٹ ہو جاتا ہوں؟“ عمو نے ہمنویں اچکاتے ہوئے عجیب سی بے رخی کے ساتھ الٹا مجھ سے ہی سوال کر لیا۔ جبکہ میرا انداز تو قطعی سرسری تھا۔ اس سے مراد عمو پر کوئی شک کرنا نہ تھا۔ لیکن جانے کیا بات تھی مجھے محسوس ہوا کہ عمو سخت برا مان گیا ہے۔ میرے کوئی جواب دینے سے قبل ہی اس نے اپنا لپٹاپ بند کر کے زور سے بیڈ پر پھینک دیا۔ اس کے اس عمل نے تو مجھے ہکا بکاہی کر دیا۔

”ہاں بولو جواب دو“ تم کیا سمجھ رہی ہو؟ میں کہلا جاتا ہوں جو تمہارے دل میں ہے آج مجھے صاف صاف بتا دو۔“ اپنی سات سالہ انوائیڈ زندگی میں میں نے عمو کو اس طرح چلاتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ جیسا وہ اس وقت جی رہا تھا وہ تو بڑا ہی نرم خور اور صلہ جو انسان تھا۔ لیکن آج تو میرے سامنے ایک بالکل مختلف عمو کھڑا۔ ایک ایسے سوال کا جواب مانگ رہا تھا جو میرے پاس تھا ہی نہیں۔

”کول ڈاؤن عمو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کو میں نے کیا کہہ دیا۔“ میں روٹا لسی سی ہو گئی۔ جبکہ وہ بنا کوئی بات کے اپنا ہیٹل فون اٹھا کر کمرے سے باہر چلا گیا اور پھر وہ ساری رات میں نے کمرے میں اکیلے ہی گزاری۔ کیونکہ عمو اپنی اسٹڈی لاک کر کے وہاں ہی سو گیا تھا اور مجھے ساری رات یہی بے چینی ستاتی رہی کہ صبح پوچھو نے یہ سب دیکھا تو جانے کیا سوچیں اور پھر غالباً اپنی ماں کا ہی سوچ کر وہ جگر کی اذان کے ساتھ ہی کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کی سوٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی ساری رات سویا نہ تھا۔ لیکن اب میں اس سے کوئی بات کر کے پریشانی مولی نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے ہی کوٹ بدل کر سوئی بن گئی۔



اور پھر یہ عمو کا معمول بن گیا۔ وہ آدھی رات کے

وقت گھر واپس آتا اور جب آتا عجیب الجھا الجھا ہوتا۔ ایسے جیسے کوئی پریشانی اسے اندر ہی اندر کھا رہا ہو۔ لیکن اس پہلے دن کی لڑائی کے بعد میں نے وہاں اس سے کچھ پوچھنے کی جرات ہی نہ کی۔ میں پوچھ پوچھ موجودگی میں مزید کوئی ڈرامہ نہ چاہتی تھی۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کا رویہ مجھ سے خفا تبدیل ہو چکا تھا۔ اب وہ صرف ضرورت کے تحت ہی مجھے مخاطب کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ پہلے دن والی چپقلش کو بھولنا نہ تھا۔ ذرا سی بات پر بہانے جانے والے اس دن کے بنگلو نے مجھے بھی خاصا بد ظن کر دیا تھا۔ اس لیے میں بھی خاصا لیے دے انداز میں رہتی۔ لیکن پھر بھی میں لاشعوری طور پر تشکر تھی کہ کب عمو کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ مجھ سے اپنے اس دن کے رویہ کی معذرت طلب کرے۔ لیکن ہر گز رونا دن مجھے مایوسی سے دوچار کر رہا تھا۔

میں حیران تھی کہ عمو اتنا کٹھور کیسے ہو گیا؟ بس یہی وجہ تھی کہ اب میں اس کے معمولات میں کد دخل اندازی کرتی کہ کہیں پھر وہ کوئی ہنگامہ نہ کر دے۔ لیکن میری تمام تر احتیاط کے باوجود ہنگامہ پھر ہو گیا اور اس انجام اس قدر بھیانک لگتا کہ جسے سوچتے ہی آج بھی میری روح کانپ جاتی ہے۔ آج خلاف توقع سات بجے کے قریب عمو کا فون میرے سیل پر آیا۔ (جبکہ عمو اب وہ مجھے کم ہی فون کرتا تھا) اس کے کسی دوست کی بہن کی شادی تھی۔

”ان کی میلی انگلیڈ سے آئی ہے۔ صرف پاکستان شادی کے لیے۔ اس لیے مہمان خانے کم ہیں۔ اب فواد بار بار فون کر رہا ہے کہ ہمارا اس شادی میں شریک ہونا بہت ضروری ہے۔“ عمو نے تفصیلی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اب ایسا ہے کہ تم دس بجے تک تیار ہو جاؤ۔ ہم دونوں چلے جائیں گے۔“ اتنے دنوں میں ہونے والی شاید یہ پہلی جلی فونک گفتگو تھی جس کا دورانیہ دس منٹ کا ہو گا تھا۔ کافی دنوں بعد عمو کا نرم رویہ مجھے مطمئن کر گیا۔ آج ہے عورت کی زندگی بامراد کے بالکل الٹا

ہے جیسے بغیر بھول چوں کے خزاں کے موسم میں تن جھانک اور خشک۔  
 ”ٹھیک ہے میں تیار ہو جاؤں گی۔“ خدا حافظ کہنے سے پہلے میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے فون بند کر دیا اور پھر جلدی جلدی کھانا تیار کر کے پوچھ پوچھ بچوں کو دیا۔ بیٹھ کے لیے میں نے ایک تیرہ سالہ بچی رکھی ہوئی تھی جو آج — پوچھ پوچھ کے ساتھ ہی سو رہی تھی۔ تمام ضروری امور سرانجام دے کر میں پورے دس بجے تک تیار ہو چکی تھی۔

ریڈ اور بیج سوٹ میں خود کو آئینہ میں دیکھ کر میں خود ہی حیران تھی۔ کیونکہ آج شاید کئی دنوں بعد میں اتنے دل سے تیار ہوئی تھی۔ اور اب میں بڑی خوشی خوشی عمو کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں دس سے آگے بڑھ رہی تھیں میرا انتظار کوفت میں تبدیل ہونے لگا۔ اب گیارہ بج چکے تھے اور عمو کا کوئی آنا پانا نہ تھا۔ فون حسب روایت وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ پوچھ پوچھ اور بچے غالباً سو چکے تھے۔ جب باہر عمو کی گاڑی کے تیز ہارن کی آواز سنائی دی۔ اس وقت تک میں غصہ سے اپنی تمام چیزوں کی آمار چکی تھی۔ جب وہ اندر داخل ہوا عجیب تھا تھا تھا اور الجھا ہوا تھا۔ لیکن شاید میں نے اس دن غصہ کی شدت کے سبب اس کی حالت کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔

”آپ کے دس بج گئے؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اپنے لہجہ کی سختی پر قابو نہ پاسکی۔

”اگر نہیں جانتا تھا تو کیا ضرورت تھی اتنا ڈرامہ کرنے کی۔“ میں نے الماری سے اپنا سلینڈنگ سوٹ نکال کر ہاتھ رو م کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا ذرا سی بات پر ایٹھ کھڑے مت کیا کرو؟ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں جو الہ دین کے جن کی طرح تمہارے حکم پر حاضر ہو جاؤں۔“ بالکل خلاف توقع آج پھر وہ حلق کے بل چپٹاؤ میں اس کی غیر متوقع رعائزں کر اپنی جگہ سن ہوئی۔

”ہو گیا ہے آپ کو؟“ ذرا ذرا سی بات پر ایسے لڑائی کھٹ کرنے لگے ہیں۔ میں بھی اپنے غصہ پر قابو

نہ پاسکی۔  
 ”اس لیے کہ اب تمہیں برداشت کرنا مجھ سے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“ سنا تم نے؟ میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔“ الفاظ تھے یا کوئی پھلہا ہوا سیسہ جو کسی نے میرے کانوں میں اندیل دیا تھا۔ مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ الفاظ عمو کے منہ سے ادا ہوئے ہیں۔ عمو میرا عزیز ازاں شوہر جس کی مثل بورا خاندان دیا کرتا تھا۔ آج مجھ سے جس لہجہ میں گفتگو کر رہا تھا اس نے مجھے بت کی مانند اپنی جگہ پر ساکت کر دیا۔ اس کی تیز آواز سن کر پوچھ پوچھ بھی کمرے میں آچکی تھیں اور حیرت سے سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ کیوں ایسے جیج رہے ہو۔“ انہوں نے عمو کے قریب آکر اسے بازو سے تھاما۔  
 ”مئی جان آپ گواہ رہیے گا۔ میں آپ کی موجودگی میں منجمد کو طلاق دے رہا ہوں۔“ وہ شاید اپنے خواص کو چکا تھا۔

”ہوش میں آؤ عمو کیا کہہ رہے ہو۔“ پوچھ پوچھ کے جسم کی لرزش مجھے درد سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ جبکہ میری ٹانگوں نے تو میرا بوجھ ہی اٹھانے سے انکار کر دیا یا میرے خدا ہی میں کیا سن رہی ہوں؟ مجھے ایسا لگا جیسے قیامت آگئی ہو اور پھر میں اپنے ہوش و خواص کو بیٹھی اور پھر بھی کرتے کرتے میں نے عمو کی زبان سے اپنے لیے ادا ہونے والا طلاق کا لفظ کئی بار سنا۔ جو میرے دل غ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا اور پھر میں مکمل طور پر بے ہوش ہو گئی۔

میں کتنے دنوں بعد ہوش میں آئی۔ مجھے پتا نہ تھا۔ کیونکہ دنوں کا حساب کتب میں بھول چکی تھی۔ اگر مجھے یاد تھا تو صرف عمو کے وہ الفاظ جو آخری بار میرے کانوں نے سنے تھے۔ جنہوں نے مجھے ایک ہی بل میں عرش سے اٹھا کر فرش پر پھینک دیا تھا اور اب میں ایک زندہ لاش کی منہ بولتی نقیر تھی۔ میری طرف اٹھنے والی ہر آنکھ میں ایک ہی سوال تھا۔

”آخر تم نے انہیں کیا کیا تھا جو عمو نے تمہیں اتنی کڑی سزا سنائی۔“ اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں خود کو



مجموعہ محسوس کرنے لگی۔ اس سب کے باوجود میں نے اپنا گھر بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اپنی انا کو بلائے طلاق رکھ کر کئی بار عمو سے رابطہ کیا۔ اسے کسی عالم دین سے مشورہ لینے کا بھی کلمہ لیکن وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ یہاں تک کہ اتنے دنوں میں ایک بار بھی وہ اپنے بچوں سے بھی ملنے نہ آیا تھا۔ یقیناً ”یہ فیصلہ اس کے دل کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ جس پر اسے کسی بھی قسم کی کوئی شرمندگی نہ تھی اور میں حق دق تھی۔ کیا بچوں کا انجام اتنا بھیانک بھی ہو سکتا ہے؟ کیا کسی شخص کی محبت کی شدت ایک پل میں ختم ہو سکتی ہے اور حیران تو میں اس بات پر تھی کہ مجھے فیصلہ سنانے وقت یہ بھی نہ بتایا گیا تھا کہ میرا جرم کیا ہے؟ وہ عمو جو میرے بغیر ایک پل نہ گزارا تھا۔ اب جانے کتنے دن گزار چکا تھا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کی زندگی میں اب نشہ نام کی کسی چیز کی گنجائش موجود نہ تھی اور پھر گزرتے وقت نے میرے اندازے پر تصدیق کی مہربان کر دی اور اب وقت کے ساتھ مجھے بھی کوشش کرنا تھی کہ میں اسے بحال جاؤں جو کہ فی الحال میرے لیے مشکل تھا۔ ایسے میں ملنے والے طلاق کے کاغذات نے میری باقی امید بھی ختم کر دی۔

\*\*\*

مجھے یقین ہی نہ آیا کہ میرے سامنے ماہین موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں بے فراری سے اٹھ بیٹھی۔ خود پر گزری ہوئی قیامت کے دوران ایک بار بھی مجھے اس کا خیال نہ آیا تھا۔ اب جو اسے سامنے دیکھا تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”ماہین۔ ماہین۔“ فرط جذبات نے میری زبان سے الفاظ کی آوازیں کو ناممکن بنادیا اور میں سسکیں لے کر رونے لگی اور روتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی جو پیار سے میری کمر سلانے لگی۔

”تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا؟“ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر میں نے اس سے دریافت کیا۔ شاید

یہ خبر ماہین تک عمو نے پہنچائی ہو۔ یہ میرا ایک اندازہ تھا جو اگلے ہی پل غلط ثابت ہو گیا۔

”کل بھانجی آئی تھیں مجھ سے ملنے، بس انہوں نے ہی تمہارا ذکر کیا اور مجھے یہ سب کچھ بتایا۔ یقیناً میں تو سن کر حیران ہی رہ گئی۔ مگر پل تو مجھے یقین ہی نہ آیا۔ بھلا تمہاری اور عمو کی زندگی میں کس بات کی کوئی تھی جو اس نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا اس نے؟ اپنی اولاد کو بھی گھر سے نکل دیا۔ سچ ہے مرد کا کوئی بھروسہ نہیں، کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

تسک بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

”لیکن نشہ مجھے ایک شکایت تم سے بھی ہے۔ تم نے مجھے خود سے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا۔ یقیناً ماہین نے کئی فون تمہارے پل پر کیے جو مزید اذیتاں عمو کا نمبر تو میرے پاس تھا ہی نہیں ورنہ میں اس سے دریافت کر لیتی اور تمہارے گھر تمہاری خزانہ سانس کی موجودگی میں میرا جانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔“ وہ بولتی جا رہی تھی اور اس وقت میں بھول گئی کہ اگر اس کے پاس عمو کا نمبر نہیں تھا تو پھر کیسے وہ اس رات عمو کو فون کر رہی تھی۔

”مجھے بتاؤ نشہ ایسا کیا ہوا تھا تم دونوں کے درمیان جو عمو نے اتنا بدنام کر اٹھایا۔“ مگر بار بار چھایا سوال ایک بار پھر میرے سامنے دہرایا گیا۔ جبکہ سچ تو یہ تھا کہ اس سوال کا جواب نہ میرے پاس تھا اور نہ ہے میں تو آج تک خود ہی سوچ رہی تھی کہ عمو نے ایسا کیوں کیا؟ اور جب خود ہی نہ پائی تو ماہین کو کیا جواب دیتی۔ اس لیے خاموش ہی رہی۔ کیونکہ میرے نزدیک اس کی بات کا جواب خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

”مجھے حیرت تو اس بات پر ہے نشہ تمہارے سرسرا میں سے بھی کسی فرد نے تمہاری خیر نہ فرمائی۔ آخر تم ان کی ہوا اور تین عدد پوتوں کی ماں تھیں۔“ اس پہلو پر تو میں نے بھی سوچا ہی نہ تھا۔ اب جو ماہین نے توجہ دلائی تو میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ سچ تھا کہ میرے ہوش میں آنے سے لے کر اب تک میں نے رعبہ پھو پھوان کے شہر یا دونوں بیٹیوں میں سے

کسی کو بھی اپنے گھر نہ دیکھا تھا۔ اگر وہ میری حالت فراموش میں آئی ہوں تو میں بے خبر تھی اور اتنا حوصلہ خود میں نہ پائی تھی کہ امی سے اس سلسلے میں کچھ دریافت کروں۔ اپنے سرسرا والوں کی بے حسی نے مجھے ایک بار پھر لرزایا۔ ماہین نے میرے قریب ہو کر میرا سراپے کندھوں سے لگایا اور جب میرا دل ہلکا ہو گیا تو میں خود بخود خاموش ہو گئی۔ اس تمام عرصہ میں ماہین خاموش رہی غالباً وہ الفاظ جمع کر رہی تھی جن سے مجھے تسک ملے سکے۔

”دیکھو نشہ ہمیں ہمیشہ وہ ہی ملتا ہے جو ہمارا نصیب ہوتا ہے۔ نہ ایک چیز نصیب ہے کم اور نہ ہی زیادہ۔“ وہ سرسرا سے مجھے سمجھا رہی تھی۔

”اور اگر کچھ مل کر کھو جائے تو اس پر صبر کرنا بھی مومن کی پہچان ہے اور ہمیشہ یاد رکھو اللہ جب بھی اپنے بندوں سے کچھ لیتا ہے تو اس کا نعم البدل ضرور عطا کرتا ہے، جو پہلے کے مقابلے میں ضرور بہتر بن جاتا ہے۔“

آہستہ آہستہ پیار سے مجھے سمجھانے والی ماہین پہلو والی ماہین سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی اور اس کی باتیں میری روح کے اندر اتر رہی تھیں۔ وہ یقیناً ”سچ“ کہہ رہی تھی۔ اللہ اپنے بندوں پر ان کی ہمت سے زیادہ

بوجھ نہیں ڈالتا۔ میں بھی شاید اپنی مصیبت میں اپنے رب کو بھول گئی تھی۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ امید ہمیشہ اپنے رب سے لگانی چاہیے۔ اس کے بندوں سے نہیں اور جیسے جیسے میں یہ سب سوچتی گئی میرے دل کو ایک نئی توانائی حاصل ہوئی تھی اور پھر ماہین کے جانے کے بعد میرے نوٹے دل کو کافی ڈھارس حاصل ہو چکی تھی۔ میں اپنے اندر جینے کا ایک نیا حوصلہ پارسی تھی جو یقیناً ”ماہین“ ہی کی بدولت تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ

لب میں تن تما بھی دنیا سے مقابلہ کر سکتی ہوں۔ لیکن میری یہ ہمت و توانائی آنے والے اگلے چند دنوں میں بالکل ہی ختم ہو گئی اور اسے ختم کرنے والی بھی وہ ماہین ہی تھی جس کی کئی گئی باتوں کی بدولت میں نے اپنے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کیا تھا۔ اسی ماہین نے حوصلہ کے ساتھ ساتھ مجھ سے میرا سب کچھ چھین

لیا۔ میرے اعتماد اور بھروسہ کو کچی کی مانند بکیر کر رکھا دیا۔

\*\*\*

”عمو آیا ہے۔“ تیند میں سوتے جاگتے سے میرے کانوں میں امی کی آواز غلرائی اور میں ہڑبکا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر بتا کسی سے کوئی سوال کیے پاؤں میں سیلپر ڈال کر دھپہ سے بے نیاز ڈرائنگ روم کی جانب دوڑتے ہوئے میں ایک پل میں ہی سب کچھ فراموش کر بیٹھی بھول گئی کہ میرے اور عمو کے درمیان اب کوئی رشتہ موجود نہیں ہے مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اب وہ میرے لیے ایک عام مرد ہے یا صرف یہ بلکہ نا محرم بھی ہے اور دوران عدت میرا کسی بھی نا محرم کے سامنے جانا شرعی گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کے قبل کہ میں ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچتی جانے کہاں سے نکل کر ایک دم ہی امی میرے سامنے آ گئیں۔

”کیا ہوا تمہیں، کیوں اتنی بدحواس بھاگی آ رہی ہو۔“

”میں وہ۔۔۔ عمو۔“ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میرے زبان سے ادا ہوئے اور میری ماں میرے کسے گئے ان ادھورے لفظوں سے ہی میرے دل کا حال جان گئیں اور پھر میرے قریب آ کر مجھے بازو سے تھام لیا۔

”بیٹا وہ اندر نہیں آیا۔ بلکہ باہر گاڑی میں ہی بیٹھا ہے۔“ میری سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کر لی۔

”اور وہ تم سے نہیں اپنے بچوں سے ملنے آیا ہے۔ غالباً وہ معین کو کچھ دیر کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا چاہتا ہے۔“

”کہاں۔“ میں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں، بہر حال رو حیل باہر ہی ہے اور وہ ہی عمو سے بات کر رہا ہے۔“ امی نے میرے چھوٹے بھائی کا نام لیتے ہوئے کہا۔ جبکہ میں خالی خالی نظروں سے ان



کی جانب کیے گئی۔

”تم یہاں آؤ اندر چلو میرے ساتھ۔“ اور میں خاموشی سے اسی کے ساتھ اندر آئی اور پھر ہاتھ سے ملے میرا حال دریافت کیے وہ معین کو اپنے ساتھ لے گیا۔ آخر کو وہ میرے بچوں کا باپ تھا اور شاید مجھ سے زیادہ ان پر حق رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی بھی اسکول کی فیس اور اپنے دیگر اخراجات کے لیے اپنے باپ کے محتاج تھے اور اس سب کے لیے وہ مجھے ہر ماہ ایک معقول رقم دیتا تھا۔ پھر میں کس حساب سے اسے منع کرتی کہ وہ اپنے بچوں سے نہ ملے اور ویسے بھی میں باپ کے ہوتے ہوئے اپنے بچوں میں احساس کمتری پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی اور شاید یہی میری زندگی کی دوسری بڑی غلطی تھی جس کا خمیازہ مجھے کچھ ہی عرصہ بعد بھگتنا پڑا اور پہلی بڑی غلطی کیا تھی وہ تو میں نے آپ کو بتائی ہی نہیں جس جہاں میری پہلی بڑی غلطی ہی شاید باہن کو عداوت ملانا تھا اب جلد ہی آپ کو ہاتھ چل جائے گا کہ میں نے اپنی زندگی میں کتنی بڑی غلطیاں کیں جن کی سزا مجھے ایک عذاب کی صورت میں ملی۔ دونوں عداوت کے ساتھ گزار کر جب معین گھر آیا تو بے حد خوش تھا وہ اپنے ساتھ ڈھیروں ڈھیر مٹکوں اور کپڑوں کے علاوہ کے ایف سی کی ڈیل بھی لایا تھا جو معاذ کے لیے تھی اس بیل میرے چھ سالہ بیٹے کے چرے پر وہ خوشی اور رونق تھی جو شاید پچھلے تین ماہ میں اسے نہ دے سکی تھی۔

”آپ کو ہوتا ہے ماما بابا نے مجھے بہت گھمایا وہ مجھے میرے فیورٹ بیلے لینڈ بھی لے کر گئے پھر ہم نے خوب خوب جھوٹے جھوٹے۔“

وہ خوشی خوشی بتا رہا تھا اور میں نہایت خاموشی سے سنتے ہوئے اس کے سرخ چہرے پر نظر ڈال رہی تھی میرے لگژری طرز زندگی کے عادی بچے پچھلے تین ماہ سے کسی زندگی گزار رہے تھے مجھے معین نے ایک بیل میں ہی سمجھا دیا اس دور میں آسائش کی کس قدر اہمیت ہے اسے بتانے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہے یہ تو ہم سب ہی سمجھتے ہیں۔

”گور تمنا آپ کو ہوتا ہے ہمارے ساتھ ہماری چھوٹی بہن بھی تھی بالکل گریبا جیسی۔“ وہ روانی میں بولتا تھا جبکہ میں جو خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی ایک دم ہی چونک اٹھی۔

”چھوٹی بہن یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھلا تمہاری چھوٹی بہن کہاں سے آئی۔“ میں نے ایک دم ہی اسے ٹوک دیا اتنی دیر میں ابھی میرے قریب آچکی تھیں میں نے ان پر ایک نظر ڈالی وہ بھی معین ہی کی جانب متوجہ تھیں اور قبل اس کے کہ میں اسے خاموش کرواؤں انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کر دیا۔

”کیا نام ہے تمہاری گریبا سی بہن کا۔“ امی نے بڑے پیار سے معین کو مخاطب کیا۔

”نام۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں لیکن باہن اتنی اچانکی کہہ کر مل رہی تھیں۔“ وہ غالباً باہن کی بیٹی انوشے کی بات کر رہا تھا۔

”باہن آئی وہ تمہیں کہاں ملیں۔“ میں سمجھ گئی کہ وہ باہن کی بیٹی کی بات کر رہا ہے۔

”وہ ماما آپ بات کو سمجھتی نہیں ہیں۔“ وہ جھجکا اٹھا۔

”باہن آئی ہمیں ملی نہیں تھیں بلکہ میرے اور بابا کے ساتھ گئی تھیں ساتھ چکی بھی تھی۔“

”لیکن وہ تمہارے ساتھ کیوں گئی تھیں۔“ اب میں چڑی گئی۔

”میں نے یہ کہہ دیا کہ وہ میری نئی ماما ہیں۔“ طہینن نے جواب دے کر اس نے چپس کا پیکٹ کھول لیا۔

میں نے ایک دم کرنٹ کھا کر امی کی جانب دیکھا جن کا منہ معین کی بات سن کر کھلا کا کھلا رہ گیا تھا جب کہ میں مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے کند چھری سے میری شہ رگ کو بھی کاٹ دیا ہو۔

”تمہیں کس نے کہا کہ باہن تمہاری نئی ماما ہیں۔“ میں نے کھلونوں سے کھیلتے معین کو منہ پھیر کر دیکھا۔

”میں نے کھلونوں سے کھیلتے معین کو منہ پھیر کر دیکھا۔“

”بابا نے اور کل انہوں نے اپنے فرزند کو ہوٹل میں پائی بھی دی تھی اسی لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔“

چھ سالہ معین میری حالت دیکھ کر گھبرا اٹھا اور جلدی جلدی تفصیل بتانے لگا جبکہ میں دونوں ہاتھوں میں منہ چسپا کر رو پڑی ماہین کے آخری ملاقات میں کے گئے الفاظ کا منہموم آج صبح معینوں میں میری سمجھ میں آیا تھا وہ یقیناً ”اپنے دل کی ترجمانی کر رہی تھی اسے شاید خرم کا ظہم البدل عداوت کی صورت میں مل گیا تھا جو پہلے سے بہتر سن تھا جبکہ میں تو تھی دامن کھڑی تھی اور ابھی بھی جانے کون کون سے خسارے میرا مقدر بننے والے تھے۔ اب عداوت ہر شے معین کو لے جاتا اور پھر جو باجی دن معین میرے ساتھ گزارا اس میں بھی عداوتی کا ذکر ہوتا اور رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میرا ساتھ میرے بیٹے کو بھی پسند نہ تھا وہ بھی اپنے باپ کی طرح ظاہری چمک دمک پر جان دینے والوں میں سے تھا اور پھر میں نے خود میں جو صلہ پیدا کرتے ہوئے عداوت کے بعد معین کو کھونے کی ہمت بھی کر لی اور میرے بدترین اندیشوں کے عین مطابق اسلگے آٹھ ماہ میں ہی معین عداوت کے ساتھ چلا گیا کیونکہ باہن کو اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر بیٹی سے نوازا تھا جبکہ چھوٹی انوشے پہلے ہی اس کے ساتھ تھی یہی وجہ تھی کہ وہ بھی معین کو بے حد پیار کرتی اور اب تو چوٹھی بیٹی کو جنم دینے کے بعد اس کی معین میں دو چوٹی مزید بڑھ گئی تھی۔

میں نے بھی یہی سوچ کر صبر کر لیا کہ معین جس طرز زندگی کا عادی ہے وہ اسے شاید میں کبھی نہ دے سکوں گی جبکہ معاذ اور معین میرے ماحول میں رہ چکے ہیں گئے تھے اور پھر اس آخری مرتبہ عداوت نے میرے ساتھ ایک مہربانی یہ ضرور کی کہ اس نے یہ دونوں بیٹے مجھے کوٹ کے ذریعے لکھ کر دے دیے جس کے مطابق اب عداوت کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور پھر اس نے رفتہ رفتہ ان دونوں بچوں کا خرچہ پہلے سے کافی کم کر دیا میں نے ایک مقامی اسکول میں ملازمت کر لی جہاں معاذ کو بھی داخل کروا دیا اب باہن بڑی ڈھٹائی

سے کھلے عام اپنے گھر آیا کرتی اس کی بیٹی سی گاڑی اور ٹھاٹس بیٹ نے اس کی ماں اور بھائیوں کی زبان بھی بند کر دی تھی ایسے میں ایک دو دفعہ اسکول سے آتے ہوئے میری ماہین سے ملے بیٹھ ضرور ہوتی لیکن ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے پاس سے ایسے گزرے جیسے دو بالکل اجنبان اجنبی اور یہی ہمارے لیے بہتر تھا کہ ہم ایک دوسرے کو پہچانیں ہی نہ۔

\*\*\*

رمضان کا ماہ مقدس شروع ہو چکا تھا ایسا لگتا تھا کہ اپنی چوبیس سالہ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے رمضان کا مقدس مہینہ نصیب ہوا ہو میں نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار اتنے اہتمام سے رمضان کے روزے رکھے تھے ساتھ ہی ساتھ میں نے اپنے اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی بڑے دل سے کی اس سے قبل تو صرف دنیاوی عبادت کرتی تھی جلدی جلدی نمازی اور نیکی اور سارا دھیان صرف سحری اور افطاری کی تیاری پر ہوتا جو اللہ کے بندے کو خوش رکھنے کے لیے کی جانی لیکن اب میری خشوع و خضوع سے کی جانے والی عبادت صرف اور صرف میرے اللہ کی رضا کے لیے تھی ابھی سحری اور افطاری کا اہتمام کرتیں مجھے تو جہل جاتا صبر و شکر کے ساتھ کھائیں اور کوشش کرتی کہ جو بھی فاسد وقت ملے اس میں زیادہ سے زیادہ عبادت کر لی جائے اس دن غالباً ”ایک سو اسی روزہ قضا میں نے رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی اور اب ظہر کی نماز بڑھ کر کچھ ہی دیر قبل سوئی تھی جب ابی نے مجھے جگا کر کچھ کما پہلے تو مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ امی کیا کہہ رہی ہیں لیکن جب سمجھ میں آیا تو میں ایک دم ہی اٹھ بیٹھی جلدی سی دوپاسر پر اوڑھا اور پاؤں میں سلیر ڈالے۔“

”ڈرا سنگ روم میں بیٹھا ہے تم چلو میں کچھ افطاری کا خاص اہتمام کر لوں۔“ امی مجھے کہہ کر خود کچن کی جانب بڑھ گئیں جبکہ میں خود کو سنبھالتی ڈرا سنگ روم میں داخل ہو گئی جہاں سامنے ہی رکھے



صوفہ پر سفید شلوار قمیص میں ملبوس رحمان بیٹھا تھا وہ آج بھی ویسا ہی تھا اگر اس میں کچھ اضافہ ہوا تھا تو وہ صرف ہلکی ہلکی داڑھی اور سفید نظر کے چشمہ کا جس میں وہ پہلے سے بھی بھلا معلوم ہو رہا تھا صحبت کو اس کی گود میں دیکھ کر میرا دل بھر آیا باپ کی محبت کو ترسے میرے بچے رحمان روحیل سے کچھ بات کر رہا تھا اور معین بھی اس کے قریب ہی صوفہ پر موجود تھا اور نہایت ہی انہماک سے دونوں کی باتیں سنتے ہوئے رحمان ہی کے چہرے کی جانب نگے جا رہا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”سلام علیکم کسی ہونشیمہ“ پہلے ہی جیسا بڑی شفقت لہجہ وہ مجھے ہمیشہ اسی طرح پکارا تھا لیکن آج اس کے سلام کے جواب میں ہی میں روڑی اور آنسو میری آنکھوں سے بھل بھل بہنے لگے آواز میرے گلے میں پھنس گئی۔

”نشیمہ رو کیوں رہی ہو؟“ وہ حیران ہوا۔  
”تم کوئی دنیا کی پہلی اور آخری عورت نہیں ہو جس کے ساتھ ایسی زیادتی ہوئی ہے دنیا میں تو یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔“ شاید رحمان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا وہ مجھے کس طرح تسلی دے اتنی دیر میں روحیل اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ذرا نماز پڑھ کر آتا ہوں۔“ جاتے جاتے وہ معاذ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا جبکہ معین ابھی بھی رحمان ہی کی گود میں تھا رحمان کے ہمدردانہ رویہ نے دو دھاری تلوار کا کام کیا اور مجھے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اس دوران وہ میرے قریب کھڑا خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

”دیکھو نشیمہ تمہارے ساتھ دو معصوم بچے بھی ہیں ایسے ہی روتی روتی تو کیسے زندگی گزار دو گی۔“ اس نے تانف سے کہا۔

”لیکن رحمان تم تو جانتے ہو نا کہ میں اور عمو ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے تم تو ہماری ملاقاتوں کے امین رہے ہو نا بلور رحمان تم تو سب کچھ جانتے ہو نا۔“ میں اس سے بے بسی کی انتہا پر بھی جو میرے

لہجہ سے بھی چھلک رہی تھی۔  
”ہاں نشیمہ میں سب کچھ جانتا ہوں وہ بھی جوڑ نہیں جانتیں اور اگر جان جاؤ گی تو میرے طرح خود بھی حیران رہ جاؤ گی میں تو ہمیشہ یہ ہی سوچتا تھا کہ عمو تمہارے ساتھ زندگی کس طرح گزار رہا ہے مجھے کچھ نہیں آتا نشیمہ کہ عمو نے یہ سات سال تمہارے ساتھ کس طرح گزارے۔“ رحمان بولے جا رہا تھا اور میں حیرت سے منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی جو میری توقع کے بالکل خلاف تھیں وہ کیا کہہ رہا تھا میں سمجھ ہی نہ پا رہی تھی اسی لیے فکر کرنا اس کی جانب نگے جا رہی تھی۔

”اتنی حیرت سے مجھے مت دیکھو میں بے حد شرمندگی محسوس کر رہا ہوں نہیں یہ سب کچھ بتاتے ہوئے لیکن جو کچھ بھی میں کہہ رہا ہوں وہ بے شک سچ سہی لیکن ہے ایک حقیقت اسے غور سے سنو نشیمہ عمو تمہیں پورے سات سال سے دھوکہ دیتا رہا ہے جانتی ہو وہ اور ماہین تو تمہاری شادی سے قبل ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے بے حد اور بے تحاشا محبت غالباً ان دونوں کی محبت کی شدت تم سے کہیں زیادہ تھی صرف عمو کی محبت ہی تھی جو ماہین اپنے گھر کے دو قیاسی ماحول سے بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال کر ہر جگہ تمہارے ساتھ جایا کرتی اگر وہ کہیں بھی تمہارے ساتھ جاتی تو وجہ میں نہیں عمو ہوتا تھا جانے تمہاری منگنی والے دن اسے ماہین میں ایسا کسا نظر آیا کہ وہ اپنی سدھ بدھ ہی کو بیٹھا تھا اس بات کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں نے ماہین کے گھر اپنا رشتہ بھیجا حالانکہ شک تو مجھے شروع سے ہی تھا۔“

وہ بات کرتے کرتے رکا جب کہ میں نے صوفہ کی بیک کو مضبوطی سے تھام لیا ورنہ شاید میں گر جاتی میرا ہانہ غور و سربست کی دیوار ثابت ہوئے۔

”جیسا کرو تم پہلے بیٹھ جاؤ پھر میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔“ میری حالت نے رحمان کو بہت کچھ سمجھا دیا اسی لیے وہ مجھے بیٹھنے کا مشورہ دے رہا تھا میں اس کی ہدایات پر عمل کرتی ہوئی خاموشی سے بیٹھ گئی جب کہ

میری باتیں کانپ رہی تھیں۔  
”تمہیں بتا رہے رشتہ بھینچے سے قبل ہی مجھے اندازہ تھا کہ ماہین یہ رشتہ بھی بھی قبول نہیں کرے گی میں تو صرف اپنے اندازے کی تصدیق چاہتا تھا۔ لیکن مجھے حیرت اس وقت ہوئی جب عمو میرے پاس پھوٹ پھوٹ کر دیا اس نے کہا کہ وہ ماہین کو میرا ہوتا نہیں دیکھ سکتا اس لیے بہتر یہ ہے کہ میں اس کی زندگی سے کہیں دور چلا جاؤں ہاں نشیمہ صبح تو یہ ہے کہ ماہین نے مجھے اور عمو نے تمہیں دل کھول کر دھوکہ دیا تم تو اس دھوکہ کو آج تک نہ سمجھ سکیں لیکن میں اس وقت ہی سمجھ گیا تھا تم جانتی ہو ماہین کو میرا نام لے کر گفت عمو ہی دیا کرتا تھا وہ جب بھی تمہارے لیے کچھ لیتا بیشہ ماہین کے لیے بھی خریدتا اور میں سمجھتا کہ ایسا وہ تمہاری محبت میں کرتا ہے جو تمہیں ماہین سے بھی کتنا عرصہ تو میں یہ ہی سمجھ کر بیٹھا رہا کہ ماہین میری محبت میں گرفتار ہو چکی ہے لیکن نہیں نشیمہ وہ صرف تمہیں دکھانے کے لیے میرا دم بھرنی تھی ہاں لوہوتے ہیں کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں آتے ہیں کے سانب۔“ رحمان کے انکشافات نے مجھے اندر تک ہلا دیا اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے نے مجھے اودھ موا کر دیا مجھے ایسا لگا شاید دنیا میں کچھ نہیں ہے سوائے مکر و فریب کے میرا دل ایک دم ہی اس دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔

”تمہیں تو شاید یہ بھی نہیں پتا کہ تمہاری تاریخ فکس ہونے سے قبل ریجہ پھوپھو سب سے چھپ کر عمو کا رشتہ بھی ماہین کے گھر لے کر گئی تھیں اگر اس وقت اس کے گھر والے لیان جاتے تو تم سات سال بھی عمو کے ساتھ نہ گزار سکتیں۔“  
”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری سات سالہ ازدواجی زندگی بھی ماہین ہی کا تحفہ تھی ورنہ میں تو عمو کے قابل سات برس قبل نہ رہی تھی۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں رحمان سے سوال کیا۔  
”ہاں نشیمہ یہ ہی وجہ تھی کہ اس کے گھر والوں نے چندہ دن کے اندر ماہین کی شادی کر دی اس طرح وہ یہ سمجھے کہ انہوں نے ماہین کو تمہاری زندگی سے نکال دیا ہے لیکن ایسا نہ ہوا وہ شادی کے بعد بھی مسلسل عمو کے رابطہ میں رہی تاکہ کسی مناسب موقع پر تمہیں بے دروہان کر سکے۔“  
”بھوٹ بالکل بھوٹ۔“ جانے مجھے کیا ہوا ایک دم ہی چلا کر بولی۔

”اب رحمان اتنا بھوٹ تو نہ بولو کہ میں اپنی ہی نظروں سے گر جاؤں۔“ مجھے پہلی بار گھر میں کیے جانے والے ماہین کے ذکر پر عمو کا رد عمل یاد آیا اور میں ہلک ہلک کر رو پڑی وہ دھیرے دھیرے چلتا میرے قریب آیا اور صوفہ پر میرے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔  
”ہاں نشیمہ صبح ہے کہ تم سے شادی کے بعد بھی عمو مسلسل ماہین سے ملتا تھا اور یہ سب کچھ اس نے خود مجھے بتایا ہے اور تم جانتی ہو یہ سب بتاتے ہوئے وہ ذرا سامنے شرم سار نہ تھا تمہیں تو شاید یہ بھی نہیں پتا کہ جس دن تم ماہین سے ملنے پہلی بار اس کے گھر گئی تھیں اسے کیا بیماری تھی کمال ہے نشیمہ تم ایک عورت ہو کر نہ جان سکیں کہ ماہین ان دنوں کون سے مراحل طے کر رہی تھی یا تو تم بہت سیدھی اور معصوم ہو یا شاید تمہیں اپنے میاں اور اپنی لاسٹ پر بہت اعتماد تھا۔“

”نہیں شاید مجھے تجسّس اور کید کی عادت ہی نہ تھی میں نے کبھی کچھ جاننے کی کوشش ہی نہ کی میں نے تو کبھی عمو یا ماہین سے اس فون کل کا ذکر بھی نہ کیا جو اس ڈنروالی رات عمو کے سیل پر آرہی تھی۔“ یہ سب میں نے سوچا ضرور لیکن رحمان سے کہا نہیں کیا فائدہ مزید اپنی بے توقیری کا جو پہلے ہی بہت زیادہ ہو چکی تھی ایک صدمہ کے ساتھ سات سالہ ازدواجی زندگی پوچھو کہ کی مانند گزارنا اس سے زیادہ اور کربا ہے عزتی تھی جو میری ہو سکتی تھی کاش مجھے یہ سب کچھ رحمان شادی سے پہلے بتا دیتا تو میں اتنی بے عزتی کی زندگی گزار کر نہ آتی۔ یہ سب سوچتے ہی میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔  
”کیوں روتی ہو نشیمہ ان لوگوں کے لیے جو کبھی تمہارے قاتل ہی نہ تھے ان بے وفا اور بے حس لوگوں



بیوٹی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO



﴿ اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم ﴾

﴿ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے ﴾

﴿ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے ﴾

قیمت - 75/- روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور کسی آرڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں - 225/- روپے

تین بوتلیں - 300/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

بیوٹی بکس 53 اور گزیٹ مارکیٹ ماہم اے جناح روڈ کراچی۔

دستی خریدنے کے لیے:

کتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 3221636

ملی اللہ علیہ وسلم سے عقد ثانی نہ کیا تھا بولونشیمہ  
جواب دو۔ ”اور یقیناً“ میرے پاس اس کی باتوں کا کوئی  
جواب نہ تھا میں اس کی دی ہوئی دلیلوں کے سامنے  
لاجواب ہو گئی اور اسی پل کمرے کا پردہ ہٹا کر امی بھی  
اندرا داخل ہو گئیں میں نے ایک نظر ان کی جانب ڈالی  
مجھے اندازہ ہوا رحمان مجھ سے پہلے اپنا دعائیہ عمل  
کے سامنے پیش کر چکا ہے۔

”میرے بچے کیا کہیں گے کہ ہماری ماں۔“ میں  
نے ایک نظرائی کے چہرے پر ڈال کر ایک اور کمزور سا  
جواز پیش کرنا چاہا لیکن میری بات کو رحمان نے درمیان  
سے ہی کاٹ دیا۔

”کیا معجزہ تمہارا بیٹا نہ تھا؟“ اس نے مجھ سے  
سوال کیا۔

”یقیناً تھا پھر وہ تمہیں چھوڑ کر عمو اور ماہین کے  
پاس کیوں چلا گیا؟“ پہلے سوال کے جواب کے بعد اس  
نے خود ہی دو سراسوال بھی کر دیا اور میں جانتی تھی کہ  
اسے میرے جواب کی ضرورت نہیں ہے وہ تو صرف  
مجھے سمجھانے کے لیے دلیل استعمال کر رہا ہے۔

”صرف اس لیے کہ تم اسے وہ آسانکات نہیں  
دے سکتیں جو عمو دے رہا ہے اور ایسا کرتے ہوئے  
اسے یہ احساس کیوں نہ ہوا کہ اس کے بغیر اس کی ماں  
مر جائے گی کیا اس نے تمہارا ذرا سا بھی احساس کیا۔“  
وہ آج سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا جو میں نے خود سے بھی  
آج تک چھپایا ہوا تھا۔

”اگر تم مجھ پر اعتبار کرو تو یقین مانو میں معاذ اور  
معیت کو اپنی اولاد جیسا ہی پیار کروں گا میں اگلے چند  
دن تک پاکستان میں ہوں اور فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں  
ہاں یا نا تم کو مکمل اختیار ہے جو چاہو کرو لیکن اتنا یاد  
رکھنا تمہاری ایک ماں تمہیں زندگی کی وہ تمام خوشیاں  
دے سکتی ہے جو تمہارا مقدر ہونا چاہیے کیونکہ اپنی  
زندگی جینے کا تمہیں بھی اتنا ہی حق ہے جتنا عمو کو۔“  
مجھ سے بات کرنا وہ امی کے قریب چلا گیا۔

”انٹی آپ کے کہنے کے مطابق میں نے خود

اس سے کہیں زیادہ عطا کرتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ  
ہم اس کی رضا میں راضی ہوں وہ کبھی اپنے پیاروں کو  
تجارت نہیں چھوڑتا اور کسی بھی انسان کو اس کی ہمت سے  
زیادہ نہیں آزاتا۔“ بالکل ماہین والا انداز گفتگو میں  
آج بھی دم بخود اس کی باتیں سن رہی تھی اس دن کی  
طرح جب آخری بار ایسی ہی گفتگو مجھ سے ماہین نے کی  
تھی۔ میری روح کی کڑائیوں میں اتر جانے والی۔  
”اور مجھے بھی پورا یقین ہے کہ وہ تمہیں عمو سے  
بہتر نعم البدل عطا کرے گا کیونکہ وہ اپنے ہندوں کو  
بے یار و مددگار کبھی نہیں چھوڑتا اور اگر تم چاہو تو یہ نعم  
البدل تمہیں آج بھی مل سکتا ہے۔“ میں جو برس  
دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی ایک دم چونک  
اٹھی۔

”کیسے؟“ نا سمجھی کے عالم میں میرے منہ سے نکلا۔  
”میری صورت میں اگر تم پسند کرو تو یقین جانو میں  
تمہیں عمو سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کروں گا اور  
تمہارے بچوں کو بھی یہ احساس بھی نہ ہونے دوں گا  
کہ وہ میری اولاد نہیں ہیں۔“ وہ میرے سامنے کھڑا  
بڑے پراعتماد انداز میں بولتے ہوئے مجھے یقین دلانا تھا  
اور میں ہکا بکا صرف اس کی شکل دیکھنے جا رہی تھی۔

”ہاں نشیمہ، جن لوگوں نے مل کر ہماری محبت کا  
مذاق اڑایا ہمیں دھوکہ دیا کیا ان لوگوں کو ویسا ہی جواب  
دینا ہم پر فرض نہیں ہے۔“ وہ پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا میں  
سمجھ نہ پائی۔

”لیکن رحمان تم خود سوچو لوگ کیا کہیں گے۔“  
میں نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”اور مجھ کو تمہیں اور ماہین میں کیا فرق رہ جائے گا۔“  
”نہ رے فرق تم نے فرق رکھ کر کرنا بھی کیا ہے؟  
نکاح ثانی بالکل اسی طرح تمہارا حق ہے جس طرح عمو  
اور ماہین کا اور ہمارے مذہب میں بھی اس کی اجازت  
ہے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ کنواری لڑکی سے قبل طلاق  
یافتہ یا بیوہ کا نکاح کیا جائے مجھے قرآن سے حوالہ دے کر  
بتاؤ یہ کہاں لکھا ہے کہ مطلقہ کی شادی جائز نہیں ہے کیا  
حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہمارے پیارے نبی کریم

کے لیے اپنے اتنے قیمتی آنسو ضائع نہ کرو عمو کبھی بھی  
اس قاتل نہ تھا کہ تمہارا مقدر بنادیا جاتا۔“ میں نے  
بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا رحمان کے ان لفظوں  
نے مجھے زمین سے اٹھا کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔  
”میں سچ کہہ رہا ہوں نشیمہ تم جیسی معصوم لڑکی  
اس قاتل نہ تھی کہ عمو جیسے دھوکہ باز مرد کا مقدر  
ٹھہرتی یہ تو جانے کیسا نصیب کا ہیبر پھیر تھا کہ تم اس کے  
نصیب میں لکھ دی گئیں۔“ وہ کچھ پل کو ٹھہرا۔  
میرے آنسو ٹھہم چکے تھے لیکن جانے کیوں مجھے  
ابھی بھی اپنا آپست حقیر دکھ رہا تھا مجھے حیرت ہو رہی  
تھی یہ سوچ سوچ کر کہ دنیا میں ماہین اور عمو جیسے لوگ  
بھی ہوتے ہیں جو اپنی منزل پانے کے لیے دوسرے کو  
پیڑھی بناتے ہیں یقیناً“ میری مثال ایک سیڑھی ہی کی  
تھی ورنہ میں عمو کی منزل تو مر کر نہ تھی اس کی منزل تو  
ماہین ہی تھی جسے جانے لگتے جنٹوں کے بعد وہ حاصل  
کر چکا تھا اس نے تو شاید یہ بھی نہ سوچا ہو گا کہ اس کی  
اصلیت جاننے کے بعد میں زندہ بھی رہ پاؤں گی یا نہیں  
کیونکہ اسے اس سے کوئی سروکار نہ تھا اس سے محبت  
کی گناہ گار تو میں ٹھہری تھی اس لیے سزا بھی میرا ہی  
مقدر ہونا چاہیے تھی۔

”نشیمہ“ رحمان کی آواز سننے ہی میں اپنے  
خیالوں کی دنیا سے حقیقت میں واپس آ گئی۔  
”رحمان تمہیں مجھے یہ سب کچھ پہلے بتا دینا چاہیے  
تھا۔“ رحمان کے خلاف دل میں دیا شکوہ لبوں پر آ گیا۔  
”ضرور بتا دیتا لیکن اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کیا  
اس وقت تم اس پوزیشن میں تھیں کہ میری بات پر  
یقین کرتیں تمہیں بھلانے کو عمو کے پاس ایک سو  
ایک بہانے نہ تھے۔ جواب دو نشیمہ۔“ وہ سچ ہی کہہ  
رہا تھا میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے  
اندازے کی تائید کی سچ تو یہ ہے کہ آج اگر میرے ساتھ  
یہ سب نہ ہوتا تو میں کبھی بھی رحمان کی باتوں پر یقین نہ  
کرتی کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر سے بولا۔  
”ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور یہ یقین جانو جب  
ہمارا پروردگار ہم سے کچھ لیتا ہے تو اس کے بدلہ میں



# عزیز سنگھ



آج میری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں معاذ اور معیث کے علاوہ ہماری ایک بیٹی مریم بھی ہے جس سے وہ دونوں بے حد پیار کرتے ہیں اس عرصہ میں میں چار بار پاکستان گئی اور ہر دفعہ معیث سے ضرور ملی۔ مابین دو بیٹیوں کی مل بن چکی تھی جبکہ خرم بھی دو سری شادی کرتے ہی پریٹے اور فرشتے کو ماہین کے حوالے کر گیا تھا اس طرح معیث چار بہنوں کے اٹھتے بھائی کی حیثیت سے بڑے ٹھاٹ بھٹ کی زندگی گزار رہا تھا۔ میں جب بھی پاکستان گئی کبھی بھی عمو اور مابین سے نہ ملی مابین نے ایک دو دفعہ معیث کے ذریعے مجھ سے ملنے کی کوشش کی لیکن میرے سخت رویہ کے سبب وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ میں پیچھے دیکھنے کی قائل نہ تھی اور ویسے بھی سوائے معیث کے میرا ان دونوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

معاذ اور معیث کو کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ رحمان ان کا باپ نہیں ہے اور آج اگر رحمان کی اس بیٹی کو باپ رکھتے ہوئے میں اپنے پروردگار کا جتنا شکر ادا کروں تو کم نہ ہو گا میرا اللہ ہی تھا جس نے دس سال پہلے رحمان کو میرے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا ورنہ اس سے قبل کی زندگی میں تو رحمان کا مجھ سے کوئی تعلق بھی نہ تھا تو پھر یہ طے ہے کہ آج میں رحمان کا مجھ کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں وہ میرے پروردگار عالم کی دی ہوئی ایک عنایت ہے جس پر میں اس کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے یقیناً رحمان ہی میرا نصیب تھا اور عمو ماہین کا جو ہمیں ہمارے وقت پر عطا کر دیا کیونکہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور اس سے پہلے یا بعد ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ہم کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں۔



نشمہ سے بات کر لی ہے آپ اس پر کوئی زبردستی نہ کیجیے گا اگر یہ راضی ہو تو مجھے فون کر دیجیے گا میں باقاعدہ امی کو آپ کے پاس بھیجوں گا اور اب اجازت دیں۔ اس نے امی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اے بیٹا اے کیسے اب تو افطار ہی ہونے والی ہے روزہ افطار کر کے جانا۔“

”نہیں آنٹی! امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”اللہ حافظ۔“ امی سے بات کرتے کرتے اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور لمبے لمبے دگ بھرتا ہر کی جانب چلا گیا وہ جاتے جاتے مجھے ایک پل صراٹ پر کھڑا کر گیا جس کے ایک طرف دنیا تھی اور دوسری طرف میری اپنی زندگی کی خوشیاں مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کس کا انتخاب کروں اور پھر فوراً ہی میرے پروردگار نے مشکل آسان کر دی۔

”پاپا۔ پاپا۔“ کارپٹ پر بیٹھا میرا ڈیڑھ سالہ بیٹا رحمان کے باہر نکلتے ہی بلکتے لگا، میں نے اور امی نے چونک کر ایک ساتھ اس پر نظر ڈالی میں تیزی سے آگے بڑھی اور اس گود میں لے لیا جبکہ وہ روتے ہوئے مسلسل پاپا کی گردان کر رہا تھا اتنی ضد تو اس نے کبھی کی ہی نہ تھی جتنی آج رحمان کے جانے کے بعد کر رہا تھا اور پھر اسے سنبھالتے میں ہلکان ہو گئی امی خاموشی سے باہر نکل گئیں بنا مجھے کچھ کے اور پھر اس رات معیث کی حالت نے مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی کر دی صبح میرا فیصلہ سنتے ہی گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔





چکن کا پھلادلا دینے سے پہلے اسے رات کے بارہ بج گئے تھے، کام تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کمر تختہ ہو رہی تھی، آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ بار بار کمرے میں لیے حمزہ کا خیال آتا وہ یوں تو نیند کا بہت کچا تھا لیکن آج کل بخاری کی وجہ سے کچھ چیز اسے ہار رہا تھا۔ شاید بڑھنے کی عمر بھی قند نکل رہا تھا اس لیے بھی وہ اسے کمزور کمزور دکھائی دیتا تھا۔

”عالیٰ ذرا ایک کپ چائے بنا دو یا ر، سر میں بہت درد ہے۔“

سونیا بھابی نے اپنے کمرے سے نکل کر بیوی آن کرتے ہوئے کلمہ رحمان بھائی ان دنوں کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھے اور جب وہ گھر نہیں ہوتے تھے تو سونیا بھابی یوں ہی بولائی سی پھرتی تھیں ابھی تک ان کی گود بھی خالی تھی شاید اسی لیے وہ رحمان بھائی کی کمی کو زیادہ محسوس کرتی تھیں۔

”جی بھابی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کلمہ انکار کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ اس کی حیثیت اس گھر میں ایسی ہی تھی وہ اپنے باپ کے من کو نہیں بھائی تھی پھر کوئی اور اس کی عزت کیسے کر تا عانیہ سہیل اپنے میاں سہیل ہمدانی کو بالکل پسند نہیں تھی۔ وہ اس کے معیار پر پوری نہیں اتری تھی محض چند دنوں کی قرمت جو آدم اور حوا کی اولاد میں خدا نے نسل انسانی کی بقا کے لیے رکھی ہے اس کے لیے ایک سہارا دینا میں لے آئی، حمزہ سہیل اس کا بیٹا جو انبیاء کی زندگی کا محور بن گیا حمزہ کی پیدائش کا سن کر بھی سہیل پر کوئی فرق نہیں پڑا، انٹرنیٹ پر اس کی تصاویر دیکھ کر ہی شاید اس نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا بھابی کھار اس کے لیے کوئی کھلونا، کپڑے یا چاکلیٹ بھیج دیتا تھا گھر میں سب کے لیے ہی کچھ نہ کچھ آتا تھا۔ اگر خالی ہاتھ رہتی تو عانیہ سہیل شاید وہ اس سے اتنی نفرت کرتا تھا کہ اس کا خیال بھی سہیل حیدر کو نہیں آتا تھا۔

”لیس بھابی چائے۔“ اس نے چائے کا کپ انہیں تھمایا اور کچھ کے بنا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”حمزہ میری جان کیا ہوا؟“ وہ کمرے میں داخل ہوا تو حمزہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔

”اما۔۔ پیٹ میں بہت درد ہے۔“

”میرا پچھ۔ تم نے مجھے بلایا کیوں نہیں بیٹا، میں چکن میں تھی نا۔“ وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”آپ کو پیلے ہی اتنا کام ہوتا ہے اما۔“ وہ دوسری شدت سے دہرا رہا اور ہاتھ۔

”وہ کتنا حساس ہو چکا تھا۔“

”مجھے سب بتا ہے اما، یا سب کو چیزیں بھیجتے ہیں لیکن آپ کے لیے کچھ بھی نہیں، اما اب اگر انہوں نے مجھے کچھ بھیجا تو میں لینے سے انکار کر دوں گا۔“ وہ شاید فیصلہ کر چکا تھا۔ اس وقت اس سے بحث فصول تھی۔ عانیہ نے خاموشی میں ہی بہتری سمجھی۔ حمزہ دودھ پانی کر اس کی گود میں سر رکھے سو گیا۔ عانیہ کی آنکھوں سے آنسو جھکتے رہے، رات گہری ہوتی چلی گئی۔

گھر میں ہمہ وقت محفل جی رہتی۔ اماں جان بڑے جتنے عدیل بھائی، ان کی بیوی سعدیہ بھابی بیٹا ارسل، بیٹی حنیسی، اماں جان کی آنکھ کے تارے تھے۔ سعدیہ بھابی بھی گھر کی بڑی بہو ہونے کا خوب فائدہ اٹھاتی تھیں۔ ان کے مزاج شامانہ تھے۔ گوری رنگت پر دید تراش خراش کے پلو سات پنے، ہر وقت صاف ستھری جی سنوری رہتی تھیں، انہیں اپنی صحت اور خوراک کا خیال بھی بہت تھا، کچھ یہ ہی حال ان کے بچوں کا بھی تھا۔ عدیل بھائی اپنی تیس ہزار کی سیلری میں سے فقط سات ہزار ماں کو دے کر ہر فرض سے بری ہو جاتے تھے۔ بقیہ رقم ان کے بیوی بچوں پر ہی خرچ ہوتی تھی۔ کچھ یہ ہی حال سونیا بھابی کا بھی تھا۔ رسکمان بھائی کا برس اچھا خاصا تھا وہ ہر وقت بڑی کواعلا لباس میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ سونیا بھابی کے پاس تو زیورات بھی بہت تھے وہ ہفتہ میں ایک بار بیوی بار بار منور جاتی تھیں۔ ان کی گوری چمکتی رنگت اکثر ہی

سعدیہ بھابی کو جن میں جملہ لڑکی تھیں۔ وہ ددولوں ایک دو سرے کی خدمت میں بناؤ سنگھار کرتی تھیں۔ اس کے سر مرحوم اپنی وفات سے ایک سال قبل اسے سہیل کے ساتھ بیاہ کر لائے تھے۔ گھر میں سب ہی اس شادی کے خلاف تھے۔ اپنی خوبصورت بھابیہوں کی موجودگی میں سہیل بھی ان کی ٹکر کی بیوی چاہتا تھا لیکن باپ کی جذباتی بلک میلنگ کے ہاتھوں مجبوراً اسے عانیہ اور یس سے شادی کرنی پڑی تھی وہ اس کے چچا کی بیٹی تھی اور عانیہ کی زندگی بسر کر رہی تھی شادی کے دو مہینے بعد عانیہ کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا اور اس طرح اس کا میکا بالکل ختم ہو گیا سہیل کی ناپسندیدگی پہلے دن سے ظاہر تھی۔ دہلی تپتی سیدھی ساوی عانیہ اپنے باپ کے من کو بھائی ہی نہیں۔ وہ چند مہینے اس کے ساتھ گزار کر وہاں سے چلا گیا پھر شوہر کی بے زاری، خوراک کی کمی اور کام کے بوجھ نے اسے مزید کمزور اور پھیکا کر دیا۔ وہ مجبور اور بے بس تھی میکا ختم ہو چکا تھا اور جائے پناہ نہ تھی۔

رمضان المبارک کی آمد تھی۔ سہیل نے ایک بڑی رقم ماں کے نام بھیجی تھی جس میں گھر کے رنگ و روغن سے لے کر راشن تک کے اخراجات شامل تھے۔ عید کی تیاری کے لیے رقم الگ سے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ جب بھی گھر فون کرتا تھا حمزہ سے بات کر کے فون بند کر دیتا تھا۔ عانیہ کے بارے میں اس نے کبھی حمزہ سے بھی نہیں پوچھا تھا۔ سونیا بھابی نے انٹرنیٹ پر سب کی تصاویر سہیل کو بھیجی تھیں۔ یہ تصاویر شب برات پر لی گئی تھیں۔ سہیل نے فون پر ان تصاویر پر کھل کر تبصرہ کیا تھا فون کا اسپیکر ان تھا وہ کچھ فاصلے پر بیٹھی سب کے کپڑے استری کر رہی تھی اپنے نام پر چونک گئی۔

”عانیہ کیسی لگ رہی تھی سہیل؟“ سونیا بھابی نے شاید جان بوجھ کر اس کا ذکر کیا تھا۔

”عانیہ۔ اچھا وہ عانیہ تھی۔ میں سمجھا شاید بیگم پر







کروں گی۔ اتنی لمبی زندگی ہے، کب تک یوں گزارا ہوگا؟ حنزو بیٹا ہے اس سے رشتہ ختم نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب بیوی سے دل ہی نہ راضی ہو تو کیسے نباہ ہوگا؟ ایک یہ ہے اسے بھی شوہر کی خوشی اور پسند سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ۴۳ سال جان نے جیسے فیصلہ سنایا تھا۔ رمضان المبارک کا مہینہ اپنی برکتیں بچھا کر رہا تھا۔ ہر رات اللہ کے حضور گزرتی تھی۔

”یا اللہ میرا گھر آباد رکھنا۔ میرے شوہر کے دل میں میرے لیے محبت پیدا کرنا۔ اپنے بچے کا احساس جگانا۔ یا اللہ تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ میں اپنا گھر آباد رکھنے کے لیے ان سب کی خدمت کرتی ہوں۔ خود پر وہیمان دینے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں کہاں سے لے کر آؤں۔ اس گھر میں، میں اور میرا بیٹا دو وقت کی روٹی کو بھی محتاج ہیں بھھوئی اور باسی روٹی کھا کر ہم دونوں اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ یا اللہ اس بات کا احساس میرے شوہر کو ہو جائے۔“ وہ مجھ سے کی حالت میں گزرتی رہی۔ روٹی رہی۔ نہ جانے کیوں دل کو یقین تھا کہ سہیل ایک دن اس کی طرف ضرور لوٹے گا۔

\*\*\*

رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک دن اچانک ہی علی بھائی اور شازنہ بھابی آگئے۔ ”عانیہ یہ تم ہو؟“ وہ کتنی ہی دیر اسے حیرت سے دیکھتی رہیں۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں عانیہ؟ تم ایسی تو نہیں تھیں، میں نے مانا کہ تم صحت مند نہیں تھیں۔ لیکن اتنی کمزور اور بے حال بھی میں تھیں اور یہ صرف یہ تو تم سے بھی زیادہ کمزور دکھائی دے رہا ہے۔“ شازنہ کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔

”پلیہ بھابی خاموش رہیے۔“ وہ اپنے آنسو پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔

”آئی جی میں آپ سب کو افطار کی دعوت دینے آئی تھی۔ کل آپ سب نے افطاری ہمارے ہاں کرنی

ہے۔ عانیہ تم ضرور آنا۔ حنزو کو بھی ضرور لے کر آنا۔ وہ جاتے جاتے بولی۔

اگلے روز وہ ان سب کے ساتھ نہیں جاسکی تھی۔ اہل جان کا خیال تھا کہ اس طرح اگلی سحری کا انتظام نہیں ہو سکے گا۔ شازنہ نے پوچھا تو انہوں نے ہمارا بتادیا۔

”بس حنزو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ اسے بھی کچھ نہ کچھ ہوا رہتا ہے۔ کبھی پیٹ میں درد، کبھی کلن میں درد۔“ وہ چڑ کر بولیں۔ شازنہ نے ان سے چھپ کر عانیہ کو فون ملا دیا۔

”عانیہ میں جانتی ہوں یہ سب جھوٹ ہے، تمہیں نہ لے کر آنے کا بہانہ پہلے میں نے تمہارا دل دکھا تو دل چاہا تمہیں فوراً لے جاؤں۔ یا رنہ تمہاری صحت ہے نہ کچھ بے جوئی مناسب ہیں۔ اوپر سے حنزو نہیں عانیہ تم اپنے ساتھ ساتھ اپنے بچے کے ساتھ بھی ظلم کر رہی ہو۔“

”میں کیا کروں بھابی۔ بہت مجبور اور بے بس ہوں۔ جب میرا شوہر ہی مجھے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تو میں کسی اور کو کیا کروں؟“ وہ رو دی۔ ضبط جواب دے گیا۔

”اسے کیا اعتراض ہے؟“ شازنہ کو کچھ اندازہ تو تھا۔

”میری شکل و صورت، میری خراب صحت، میرا لباس، غرض یہ شازنہ بھابی کہ میں پوری کی پوری سہیل کو ناپسند ہوں۔“ اس نے صاف صاف بتا دیا۔ ”یعنی وہ ابھی تک تمہیں اپنی بیوی تسلیم نہیں کر سکا۔ عانیہ یہ زیادتی ہے۔“ شازنہ کا جی چاہا کہ وہ سہیل کا گلہ دیا دے۔

”آپ فون رکھیے بھابی۔ اہل جان کو شک ہو جائے گا۔“ وہ ان سے کتنی ڈری ہوئی تھی۔ شازنہ کو بخوبی اندازہ ہو گیا۔

”ٹھیک ہے رکھتی ہوں۔“ وہ بہت کچھ سوچ کر بولی۔

\*\*\*

اہل جان کو شازنہ کا آنا حنا قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ عانیہ کی بہت حمایت کرتی تھی۔ چاند رات کو جب شازنہ اور علی بھائی افطار کے لیے آئے تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ عانیہ اور حنزو اس گھر میں کس حیثیت سے رہ رہے ہیں۔

”یہ سراسر زیادتی ہے شانو، ہمیں انسانیت کے رشتے سے ہی عانیہ اور حنزو کو یہاں سے لے جانا چاہیے۔“ جو بات شازنہ کے دل میں تھی وہی بات علی نے خود کر دی۔

”اس بے چاری کے میکے میں بھی کوئی نہیں ہے۔“ شازنہ نے باورچی خانے میں برتنوں کا ڈھیر دھوئی عانیہ کو ترس بھری نگاہوں سے دیکھا۔

”اور حنزو کو دیکھو، بچے اس عمر میں ہنسنے سکرانے اور صحت مند ہوتے ہیں۔ سہیل کو سیدھے طریقے سے بات سمجھ نہیں آئی، دوسرا طریقہ اپنانا ہی پڑے گا۔ یہی سہیل ایڑیاں رگڑتا ہوا آئے گا اپنی بیوی کے پاس۔“ علی نے فیصلہ کر لیا۔ اس وقت وہ دونوں میاں بیوی بھی کچھ بھی کے بغیر خاموشی سے چلے گئے۔

عید کا دن بھی آپہنچا۔ سہیل نے سب کے لیے عیدی بھیجی تھی۔ حنزو نے لیے بھی عیدی کا ایک ہزار روپیہ تھا جو اہل جان نے اپنی منجھی میں دبایا۔

”حنزو نے کیا کرنا ہے ان پیسوں کو۔ ارسل کا نیا سوٹ عید پر پہن لے گا۔ دونوں ماں بیٹا کھاتے پیتے میاشی میں ہیں۔ میرا احسان ہے جو رکھا ہوا ہے۔ سہیل تو کس سے اشاروں میں کہہ چکا ہے۔“ اہل جان کوئی موقع نہیں چھوڑتی تھیں دل جلانے کا۔

عید کا سارا دن وہ کام میں مصروف رہی۔ سوایا، چنا، چائے، فروٹ چائے مختلف طرح کے حلوے، چکن کی اینٹرنے، کام کرتے کرتے کمزور ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ چکر اکر گرنے لگی کہ کسی نے اسے سنبھال لیا۔ داغ ڈاؤں ہو رہا تھا۔ بھتی آنکھوں نے سہیل کا ہیولا سادہ دیکھا اور پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک آرام دہ بستر پر تھی۔ چاروں طرف

نگاہ دوڑائی یہ اس کا کمرہ نہیں تھا۔ ”کیسی ہو عانیہ؟“ شازنہ بھابی سامنے ہی جوس لے کر کھڑی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں۔ حنزو کہاں ہے؟“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”تم فکر مت کرو، حنزو دوسرے کمرے میں سو رہا ہے۔ رات کو اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ آؤں کریم کھائی، علی کے ساتھ ویڈیو گیم کھیلی اور اب لمبی تن کے سو رہا ہے۔“ شازنہ نے اس کی تسلی کے لیے ساری تفصیل بتائی۔

”لیکن ہم یہاں کیسے؟“ وہ اٹھ بیٹھی۔

”نی اٹھال تم یہ جوس پیو، پھر سب کچھ بتاؤں گی۔“ شازنہ نے اس کی طرف جوس کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم شدید نقاہت اور کمزوری کا شکار ہو۔

”بیٹائیے بھابی؟“ وہ تجسس تھی۔

”تم جانتی ہو نا کہ سہیل چاند رات کو گھر آچکا ہے۔“ شازنہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

”نہیں، میں اس بارے میں بالکل نہیں جانتی تھی۔ بس جب ہوش جا رہے تھے تو سہیل کو اپنے قریب محسوس کیا تھا۔ نہ جانے وہ کوئی وہم تھا یا حقیقت۔“

”یہ سچ ہے، وہ چاند رات کو گھر آچکا تھا۔ عید کے روز جب تم بے ہوش ہو کر گر رہی تھیں تو اس نے تمہیں گرنے سے سنبھالا۔ سچ تو یہ ہے کہ عانیہ سہیل تم سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اس کے نزدیک تمہاری کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ لیکن جب اس نے تمہیں اتنی بری حالت میں دیکھا تو وہ خود کو شمارا مجرم سمجھنے لگا اور سب سے بڑھ کر جب حنزو نے بھی اسے مورد الزام ٹھہرایا۔ میں اور علی تم سب سے عید ملنے آرہے تھے۔ جب سہیل کو تمہیں اپنی گاڑی میں ڈالتے ہوئے دیکھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ عانیہ اور میں تمہیں اور حنزو کو اپنے ساتھ لے آئی۔ میں نے سہیل کو بے نقط سانئیں۔ وہ سر جھکائے منتظر رہا۔



تمہارا از رو مرجحاً چہ مجھے اور بھڑکا رہا تھا۔ سہیل نے اپنی بیوی کا حق غصب کیا تھا اور میں ایسے شخص کو کبھی معاف نہیں کرتی جو اپنی بیوی سے زیادہ دوسروں کو اہمیت دے۔“ شازینہ نے اسے ساری تفصیل بتادی۔

”لیکن اماں جان کی بات تو اور ہے نا۔“ وہ منمنائی۔  
 ”پلیز عافیہ۔ یہ ہی تو ہمارے مردوں کی برائی ہے کہ ان کے ماں باپ کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ انسان نہیں فرشتے ہیں اور اگر خدا ناخواستہ ان میں سے کوئی ایک بھی دنیا سے چلا جائے تو اس کے لگائے گئے زخم بھی بھول جاتے ہیں۔ ارے اگر موت گناہوں اور غلطیوں کو محدودیتی تو اللہ تعالیٰ حساب کتاب کا دن ہی کیوں رکھتے مانتا کہ ہم انسانوں کو یہ حق نہیں، ہمیں تو جانے والے کی مغفرت کی دعا کرنی چاہیے۔ لیکن مردہ انسانوں کے لیے زندہ لوگوں کا حق مارنا کہاں کا انصاف ہے۔ اب یہ ہی دیکھو اگر اماں جان کو کچھ ہو جاتا تو سہیل کی تڑپ کچھ اور ہوتی، کیونکہ وہ اس کی ماں ہے، لیکن تم۔ تم بھی تو کسی کی ماں ہو، تمہاری زندگی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اس کی ماں روز تمہیں طعنے دے دے کر بارتی ہے۔ وہ دکھائی نہیں دیتا اسے۔“ عافیہ کا غصہ ختم ہو رہا تھا۔ لیکن شازینہ بھابی کو سہیل پر بے حد غصہ تھا۔ یہ سچ تھا کہ والد کی وفات کے بعد سہیل اپنی ماں کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔

”میں اب تم دونوں کو کیس جانے نہیں دوں گی اور سچ پوچھو نا عافیہ تو تم بھی قصور وار ہو، تم نے پہلے دن سے خود کو اتنا کر لیا تھا کہ اس کے نزدیک تمہارا کوئی مقام رہا ہی نہیں، اس نے تمہیں حق دیا نہیں اور تم نے چھین کر لیا میں، تم نے خود کو بہتر بنانے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ شازینہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”کیسے کرتی بھابی، میرے پاس تو اپنے بچے کو ٹائی دلانے کے لیے ایک روپیہ نہیں ہوتا تھا بغیر پیسے کے میں کیا کرتی۔ نہ تعلیم حاصل کر سکتی تھی نہ کوئی ہنر سیکھ سکتی تھی اور نہ صحت اور لباس پر دھیان دے سکتی

تھی۔ آپ ہی بتائیے بغیر دولت کیا ہو سکتا ہے۔“ بے بسی سے بولی۔

”ہاں سچ کہتی ہو، خیر اب تم اپنی صحت بھی بھوک آرام بھی کرو گی اور اپنے حلیے پر بھی توجہ دو گی، دیکھو دنیا کی واحد خاتون ہو گی جن کے پاس سب سے سنورے، سالن تو دور کی بات، کوئی ڈھنگ کا کپڑا بھی نہیں۔“ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”سہیل کی اماں جان نے کوئی لڑکی دیکھی ہے اور اسی سلسلے میں سہیل کو یہاں بلایا ہے، اتفاق سے وہ لڑکی میری سیکنڈ کزن ہے میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے وہ ہمارے ساتھ ہے ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ لوگ پاکستان آرہے ہیں بہت مزا آئے گا جب ہم بھی لڑکی والوں کی طرف موجود ہوں گے۔“ شازینہ نے الماری کھول کر کپڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے بہت عام سے لہجے میں کہا۔

”ہرگز نہیں بھابی، میں سہیل کی بے عزتی کسی صورت نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ ایک دم گھڑی ہو گئی۔  
 ”ارے ایسا کچھ نہیں ہوگا، تم جلدی سے فریض ہو جاؤ اور یہ سوٹ پہن لو، میں نے تمہارے لیے منگوایا تھا کل لے کر بھی گئی تھی لیکن وہاں صورتحال ہی اور تھی خیر اب لے لو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ، پھر حمزہ اٹھے گا تو ہم لوگ گھومنے چلیں گے، عید منائیں گے۔“ وہ بہت عام سے لہجے میں بات کر رہی تھی ایک خوبصورت سا سوٹ اس کی طرف اچھال کر وہ باہر نکل گئی۔ عافیہ ہاتھوں میں وہ کپڑے اٹھائے سوچتی رہی کہ کیا ہو رہا ہے؟

وہ سب عافیہ کے لیے فکر مند تھے، شازینہ کی کزن حنا کے گھر لڑکے والوں کا انتظار ہو رہا تھا، عافیہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں کچھ ہی دیر میں سہیل کو دیکھنے والی تھی حنا نے اسے بہت لسی ہوئی تھی کہ کچھ بھی غلط نہیں ہو گا۔ لیکن یہ انتظار، انتظار رہا۔ لڑکے والوں نے بے حد انتظار کے بعد فون پر معذرت کر لی۔

”اصل میں ہمارے لڑکے کا بہت برا الیکسیڈنٹ



ہو گیا ہے۔ ”خنا کا خیال تھا کہ وہ سری طرف سے کوئی ایسا جملہ سننے کو ملے گا لیکن ایسا کچھ نہیں کہنا گیا۔  
 ”کوئی بوجہ؟“ خنا کی والدہ نے استفسار کیا۔  
 ”وہ اصل سہیل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے ہم لوگ پھر کبھی آجائیں گے۔“



پورا ایک سال بیت گیا تھا، خواب بننے، راہ دیکھتے، انتظار کی شمعیں جلائے وہ ابھی تک شازینہ بھابی اور علی بھائی کے گھر رہ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس نے اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دی تھی ایک بونٹیک کے لیے لپڑوں کی کٹائی سلائی کا کام گھر پہ ہی شروع کر دیا تھا۔ دلی تپتی گرمیوں کی عانیہ اب صحت مند اور تازہ دم دکھائی دیتی تھی۔ صاف ستھری جلد، چمکتا چہرہ متناسب سر لیا اسے بہت خوب صورت بنا چکا تھا۔ شازینہ بھابی کے گھر لٹو ٹھکوں نے رنگت بھی بے حد نکھار دی تھی۔ جدید انداز کے لمبوسات تو اب وہ خود ہی بنا لیا کرتی تھی۔ سہیل کی محبت اور اپنے گھر کو بچانے کی چاہ اب بھی اس کے دل میں موجود تھی۔ رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ اللہ کے حضور سجدے میں گر کر رودہ کو دعائیں مانگتی۔  
 ”یا اللہ میرے شوہر کا دل میری طرف موڑ دے پروردگار، آپ کر سکتے ہیں میرے مالک، میرے گھر کو اجڑنے سے بچائیں، مجھے میرے شوہر کی نظر میں محبوب کر دیں آپ کے اختیار میں یہ ہے یا مالک۔“  
 نہ جانے کب اس کی دعائیں قبولیت پائی تھیں اس کے رب نے آزمائش کے دن ختم کر دیے شازینہ بھابی چاند رات کو علی بھائی کے ساتھ مندی لگوانے گئی تھیں۔ وہ میز پر بیٹھی بادلوں کے پیچھے چھپے چاند کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حزن کب کا سوچ کا تھا دروازے پر تیل ہوئی تو وہ چونکی۔

”یہ بھابی اتنی جلدی کیسے آگئیں؟“ وہ میز پر اتر کر نیچے آئی بھابی کہیں دور پناخہ چھوڑ گیا شاید چاند دکھائی دے گیا تھا اس نے دروازہ کھول دیا وہ بلاشبہ

سہیل ہی تھا۔ عانیہ کی آنکھوں کے آگے اندر چھلنے لگا اور سہیل اس کے حسن کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا وہ عانیہ جیسی خوبصورت بیوی کی ناقدی کر رہا تھا کہ جو اس کی کمائی پر سب سے زیادہ حق رکھتی تھی۔  
 ”عانیہ۔“ سہیل نے فوراً اسے گرنے سے روکا تھا وہ اس کی بازوؤں میں جھول گئی۔

”عانیہ عانیہ۔“ وہ اس کی ہند آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گیا لبے سیاہ بال، چمکتی جلد صحت مند سر لیا اس کی تھی عانیہ میں وہ خود کو ملامت کرنے لگا اس کی ناقدی کرنے کا جرم کیا تھا سہیل نے اسے فائے دیے تھے تو ہیں کی تھی اس کی اب ازالہ کرنا تھا وہ اسے اندر سے آیا صوفے پر لٹا کر پانی کے چھیننے اس کے چہرے پر چمڑے کو وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

”سہیل آپ یہاں؟“ وہ حیران تھی اور خوش تھی سہیل نے دیکھا اگرچہ وہ بے حد خوب صورت ہو چکی تھی، لیکن اس کی آنکھیں ویران تھیں۔ سہیل کو ان آنکھوں میں اپنا ہی عکس دکھائی دیا۔

”مجھے شازینہ بھابی نے تمہاری اور حمزہ کی تصویریں بھیجی تھیں۔ میں ان تصویروں کا موازنہ ان تصویروں سے کرتا رہا جو بھابی نے مجھے انٹرنیٹ پر بھیجی تھیں۔ میں سوچ میں ڈوب گیا۔ اس پر شازینہ بھابی نے مجھے خوب سنائیں۔ یہ سچ ہے کہ تم میری پسند نہیں تھیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ نکاح کے بندھن میں بندہ جانے کے باوجود میں تمہاری قدر نہیں کرتی تمہارا حق نہیں نہیں دیا میں نے حمزہ کو اور تمہیں اپنی کمائی سے دور رکھا۔ حالانکہ تم دونوں کا حق سب سے زیادہ تھا۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں عانیہ، مجھے معاف کرو، انہوں میں مگدھا ہوں، جو اتنی خوب صورت بیوی کو چھوڑ کر اور ڈھونڈ رہا تھا۔“ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔

”اور وہ جو اپنی بھابیوں کے ساتھ میرا مذاق اڑاتے تھے وہ۔“ وہ رودی دل اسے اتنی آسانی سے معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔

”کہا نا کہ بہت غلط کرتا تھا۔ اب کوئی تمہارے بارے میں بات کر کے دیکھے زبان کھینچ دوں گا قسم۔“ اس نے کان پکڑ لیے۔  
 ”میں مت کریں سہیل۔“ عانیہ نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”اب سے خوب صورت ہو اب تو مجلس کی سب سے بہتر ان کا مذاق اڑانا۔“ اس نے عانیہ کے چہرے پر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ عانیہ کے چہرے پر شرمیں مسکراہٹ آٹھری۔  
 ”آج سے سہیل وعدہ کرتا ہے، میری بیوی اور بیٹے کا حق سب سے زیادہ ہے۔ اب میں پیسے تمہارے نام میں کراؤں گا۔ عید کی چھٹیوں کے بعد تمہارا اکاؤنٹ کھلا دیا ہوں اور ہاں اب تمہاری اور حمزہ کی صحت کا خیال بھی رکھوں گا۔ پلیز عانی ایک بار مجھے معاف کر دو۔“ وہ اس کے قدموں میں جا بیٹھا۔ وہ تڑپ کر

”سہیل مجھے گناہ گار مت کریں۔ غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں اور اب تو آپ اپنے کے بر شر مندہ ہیں۔ ہم نئے عہد کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں۔ اللہ نے عورت کو کمائی کے لیے پیدا نہیں کیا۔ مرنے کا حق داری ہے کہ وہ عورت کے لباس اس کی خوراک کا خیال رکھے، اس کی ضروریات کا خیال رکھے اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو جو حال میرا ہے وہ اللہ کی کاہنہ کرے۔“ وہ سسک پڑی۔

”روٹی کے ایک ایک ٹوالے کو ترسے ہیں ہم ماں، جانا اپنے کھانے تنک کا حساب دیا ہے ہم نے۔“ وہ سسکیوں کے درمیان کہتی رہی۔  
 ”اب معاف بھی کرو عانیہ۔“

”میں نے آپ کو معاف کیا عانیہ نے آپ کو معاف کیا“ وہ ایک سہیل، حمزہ کی ماں نے آپ کو معاف کیا، لیکن آپ بھی ایک وعدہ کریں کہ کبھی اپنے گھر والوں کے سامنے میری تذلیل نہیں کریں گے، کسی کو موقع نہیں دیں گے کہ کوئی میری ذات کو مذاق کا نشانہ بنائے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں عانیہ! تمہارا شوہر اگر تمہاری طرف لوٹ کر آیا ہے تو پورے خلوص کے ساتھ آیا ہے، تمہارا مقام اس دل میں سب سے بلند ہے بہت اونچا، میں اپنی بیوی کی عزت کروں گا اور دوسروں سے عزت کروں گا۔ اب کوئی تمہارے بارے میں غلط بات نہیں کرے گا۔ تم صرف میری بیوی ہی نہیں بلکہ میرے بیٹے کی ماں بھی ہو اور کوئی بچہ یہ نہیں چاہتا کہ سب کے سامنے اس کی ماں کی تذلیل کی جائے۔“ وہ سچے دل سے وعدہ کر رہا تھا۔

”تو پھر مجھے اس بات پر اپنے رب کا شکر ادا کرنے دیں، سہیل کہ یہ عید میں آپ کے ساتھ کروں گی، آپ کا پیار بیکر۔“ وہ سب سے پہلے شکر ادا کرنا چاہتی تھی اس رب کا جس نے اس کی دعاؤں کو قبولیت بخشی تھی اور اس کا گھر ٹونے سے بچا لیا تھا۔

”تم شکرانے کے نوافل ادا کر لو، میں حمزہ کے پاس جا رہا ہوں شازینہ بھابی اور علی بھائی آجائیں تو پھر ہم چلیں گے مندی لگوانے اور چڑیاں سنسنے۔“ وہ اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اور میں منگنا سو جاؤ بھی خریدوں گی۔“ اس نے اپنا حق جتایا۔ سہیل نے جبکہ کر اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

”صرف ایک نہیں، آج میں بہت کچھ لے کر دوں گا بہت سے شکوے دور کرنے ہیں وقت تو لگے گا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”اور پیسہ بھی لگے گا۔“ وہ ہنسنے ہوئے اندر بھاگ گئی گیٹ سے اندر داخل ہوتے شازینہ اور علی نے اس منظر کو حیرت اور خوشی سے دیکھا تھا۔ سہیل نے انہیں دیکھ کر ایک بار پھر کان پکڑ لیے۔

”صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“ شازینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سہیل کہتے ہیں۔“ علی نے آنکھ ماری تو سب ہی مسکرا دیے۔ بادلوں کی اوٹ سے جھانکنا لال عید سجدے میں مگر عانیہ کے لیے ڈھیروں دعائیں کرتا مسکراتا رہا۔





# محبت کی کھڑکی

بس اک لمحہ لگا تھا۔ محبت بین کرتی وصول ائے۔  
رستہ کی مسافریں بیٹھی تھی۔ وہ خالی ذہن و دل محبت کو  
اپنے وجود کی دیواروں سے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔  
بھلا کوئی یوں بھی کرتا ہے جیسا اس نے کیا تھا۔  
اس نے محبت کو ناراض کر دیا تھا۔ اس نے اپنے دل کو  
ویران کر دیا تھا۔ وہ ظالم نہیں تھا۔ وہ اپنے دل کو ویران  
بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس  
کی زبان یہ کیسے فطرتاً پڑے ہیں۔  
وہ ریٹنگ کے ساتھ کمر نکائے کھڑا رہا۔ اس کے  
نزدیک دنیا کا مشکل ترین کام کسی کو مٹانا اور آسان  
ترین کام کسی کا دل توڑنا تھا اور اس نے ”کسی کا نہیں“  
بلکہ اپنی روح میں رچی بسی مائی کا دل توڑا تھا۔

\*\*\*

مائی بہت چھوٹی سی عمر میں نفیسہ خاتون کی گود میں  
آئی تھی۔ جب مائی کی والدہ بیمار پڑیں تو امتیاز علی  
پر دس میں بیوی کو سنبھالنے یا نوزائیدہ مائی کو بالآخر  
گالی سوچ بچار کے بعد نفیسہ خاتون نے یہ حل پیش کیا  
کہ مائی کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ امتیاز علی کو بھی  
وقت کی ضرورت کے تحت یہ فیصلہ دانش مندانہ لگا اور  
یوں ڈیڑھ ماہ کی ماہِ سرخ کو لیے وہ پاکستان اپنے بہن  
بہنو کی گھر لے آئے۔ نفیسہ خاتون نے جیسا کہا  
تھا ویسے ہی اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا۔

ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ منیب علی وہاب ان کے شوہر  
علی وہاب کا چند برس پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ جب منیب  
میرٹھک میں تھا۔ نفیسہ خاتون بڑی حوصلہ مند خاتون

تھیں۔ حالات کا جواں مروی سے مقابلہ کیا۔  
شریک زندگی کا دکھ دل کے نہیں خانوں میں چھپا  
منیب علی وہاب اور مائی کی پرورش میں کوئی کسر نہ  
رہی اور بچہ تو یہ تھا کہ مائی کی بھی اپنی پھیپھوں میں  
تھی۔ حالانکہ اس کی ممالی صحت پائی کے بعد اتنا  
نے بارہائی کو واپس لے جانا چاہا۔ مگر وہ نہیں گئی۔  
”تمہاری اسی میل اتنی ہیں مائی۔ جا کے چکے  
کر لینا؟“ وہ پھیپھوں کے ساتھ رات کے کھانے  
تیار کر دیتی تھی۔ جب منیب وہاب پر آیا تھا۔  
نے تھکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کہتے  
وقت یہ آیا تھا۔

”نہیں جاؤں پھیپھو؟“ مائی انتہائی فرماں برداری  
سے بوجھ رہی تھی۔ مقصد صرف اور صرف ہاتھ  
روٹی پختے سے جان چھڑانا تھا۔

”نہیں؟“ پھیپھو کا لہجہ ساری صورت حال سمجھنے  
کے بعد حتیٰ اور قطعی تھا۔

”کوئی ضروری میل آئی ہوگی پھیپھو۔ مجھے چکے  
کرنا چاہیے نا؟“ نفیسہ خاتون چکن وھو کر اس پر  
لگاری تھیں۔ انداز یوں تھا گویا سنا ہی نہیں۔

”مائی ذرا وہ باؤل تو اٹھانا؟“ انہوں نے پلاسٹک  
باؤل کی جانب اشارہ کیا۔ مائی بے دلی سے اٹھا کر قریب  
آئی اور کاؤنٹر پر دھر دیا۔

”کو پکھو۔ اب لسن اور ک کا پیٹ چکن پکھو۔  
اس باؤل میں رکھتی جاؤ۔ پھر اس میں۔ تم سن رہی  
نا۔“ مائی کی بے توجہی کو محسوس کرتے نفیسہ خاتون  
نے سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔





”جی پھپھو۔“ فیب جو اس ہی ڈانگ چیز پر بیٹھا سیب کھا رہا تھا۔ مای کی مری مری آواز پر بے اختیار ہنس دیا۔ پھپھو بھی پچھلے کچھ دنوں سے بڑی سنجیدگی سے مای کو امور خانہ داری میں طاق کرنے کی کوشش میں اس کے پیچھے لگی تھیں۔ مگر مای کی پانی نہ پینے والی مای کو یہ سب کسی قیامت سے کم ہرگز نہیں لگتا تھا۔

”مما! پھوڑیں نا خود بخود ایسے مای کے ہاتھ کا کھلا کر مجھے کیوں بے موت مارنا چاہتی ہیں؟“ وہ ہر مشکل وقت میں مای کے لیے کسی فرشتے کی مانند اس کی مدد کو آن پہنچتا تھا۔ کوئی اور وقت ہو تا مای ایسا کہنے پہ اس کی جان نکالنے کے در پے ہوتی۔ مگر اس وقت وہ خود یہ مزید بے چارگی و معصومیت طاری کیے خود کو مظلوم ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

”اس کی اتنی سائڈ مت لیا کہ۔۔۔ میں سال کی ہو چکی ہے۔ اس کے والدین اس کی شادی کے چکر میں ہیں۔ وہاں سسرال میں جا کے یہ سب کام کیسے کرے گی۔۔۔ وہاں تو یہ سب کام کرنے پڑتے ہیں؟“ نفیسہ خاتون نے مستقبل کے اندیشے فیب کے سامنے رکھتے ہوئے اسے مای کی بلا جو از حمایت سے روکا۔

”تو پھپھو میری شادی آپ کسی امیر گھر میں کیجیے گا نا، جہاں کھانا کا مای نہ بڑے بلکہ شیف ہوں۔ اور اگر بالفرض کوئی ایسا رشتہ نہ بھی ملے تو خیر ہے۔ مجھے اپنے گھر میں ہی رکھ لیجیے گا نا۔۔۔ فیب کی دلہن بنا کر۔۔۔ دیکھیں نا میں بھی آپ کی نظروں کے سامنے رہوں گی اور فیب کو کیسی دلہن ملے گی یہ پریشانی بھی نہیں ہوگی آپ کو۔۔۔ کیوں فیب۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ وہ شرارت سے اپنا چلا ہونٹ دائیں تلے دباتی فیب کو آنکھ مارتے ہوئے بولی تھی۔

”کیا تم واقعی میں ایسا چاہتی ہو مای؟“ نفیسہ خاتون کا انداز پر سوچ تھا۔ فیب ہنس دیا۔

”آہ۔۔۔ آہ۔۔۔ پھپھو میرا کیا ہے، میں تو مشرقی لڑکی ہوں۔ جس کھونٹے سے باندھ دیں گی ہند جاؤں گی۔ مگر اصل مسئلہ تو فیب کا ہے نا، یہ مجھ سے شادی ہی نہیں

کرنا چاہتا ہوگا۔ ہے نا فیب؟“ وہ ایک کام سے بچتا کتنے ہمارے بتا رہی تھی۔ کیسی کیسی کہانیاں گزرتی تھی۔ فیب علی وہاب ہنس دیا۔

وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ نفیسہ خاتون فیب علی وہاب کی کتنی پروا کرتی ہیں اور وہ اس اعتبار سے فیب کی جان ہے۔ تب ہی تو بات سے بات نکال کر اپنی اور اس کی شادی کا تذکرہ چھیڑ بیٹھتی تھی یہ سوچے بغیر کہ ایسا اگر ہو جائے تو نفیسہ خاتون کو تو ہفت اقصیٰ کی دولت مل جائے گی۔

\*\*\*

”رامش آ رہا ہے؟“ بنری کی نوکری اس کے نزدیک رکھتے انہوں نے مای کو بتایا تھا۔ مای کا دل ایک لمحے کو دھڑکنے لگا۔ تاہم لہجہ دانداز سرسری بنایا۔

”تو اس میں نئی بات کون سی ہے پھپھو؟ وہ تو ہر سال آتا ہے زبردستی کا مہمان بن کے۔ وہ بھی پورے ایک مہینے کے لیے؟“ اپنی بات کے اختتام پہ وہ خود ہی قہقہہ لگائے ہنس رہی تھی۔

”کل فون آیا تھا شام میں۔ کہہ رہا تھا شادی کر رہا ہوں؟ اپنی پسند ہے۔“ نفیسہ خاتون نے عام سے لہجے میں کہا۔ مای جو بیٹھی مزے سے دھوپ میں کیونے مزے لے رہی تھی۔ کیونکہ پھانک انگلی میں دبائے حیرت زدہ رہ گئی۔

”رامش بھائی شادی کر رہے ہیں؟“ انداز اس قدر بے یقین تھا کہ لمحے بھر کو تو نفیسہ خاتون بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

”یقین نہیں آ رہا پھپھو۔۔۔ شکیلہ آئی ناں کیسے گئیں۔۔۔ وہ تو اپنی لندن پلٹ بھانجی کے لیے بند تھیں؟ مگر رامش بھائی نہیں مانتے تھے۔ انہیں کیا اور لڑکی پسند ہے، جس سے وہ شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“ اب وہ کیونے کیج مین سے نکال کر بیٹھتے ہوئے پرسوج انداز میں کہہ رہی تھی۔

”مہیں کیسے بتا یہ ساری باتیں؟“ پھپھو کا انداز

نیشی تھا۔

”رامش بھائی نے ہی بتایا تھا پھپھو۔ کتنی خوش فیب ہے نا، لڑکی۔ جس سے رامش بھائی ہار کر تے۔۔۔ اتنے سال اس لڑکی کے لیے اپنے گھر والوں سے کتنی رعب۔ کتنی محبت ہوگی نا انہیں اس لڑکی سے؟“ رامش بھائی ہیں بھی تو کتنے ہنڈم اور پڑھے لکھے، ایک ایک انداز سے شاہانہ پن جھلکاتے ان کے۔۔۔ مای کی کسی یونانی دیوتا کے جیسا۔۔۔ لوگوں کی زندگیوں میں بھی کیسے کیسے حسین موڑ آتے ہیں۔ پھپھو اور ایک ہم ہیں۔ ایسا کوئی رنگ دور دور تک کیسے نظری نہیں آتا؟“ مای کے لہجے میں باسیت تھی۔ پھپھو چونک کر اس لیے نہیں کہ یہ اس کی بڑی پرانی عادت تھی۔ کسی بھی صورت حال میں کسی کے بھی مسئلے پہ رکھی، دلوں ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگیوں سے متاثر ہو جاتا۔

”تمہیں اس لڑکی کے بارے میں رامش نے بتایا نہیں؟“ پھپھو کو بھی کٹ چلی تھیں۔ اب آکو چھیل رہی تھیں۔

”نہیں۔۔۔ اس نے منہ نہ لگایا۔“

”کتنی مرتبہ پوچھا، مگر انہوں نے بتایا ہی نہیں، کتنے ہیں سربراہ۔ جب گھر والے مان جائیں گے تب بتاؤں گا۔ پھر میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا کہ کہیں فرما دیا امیر زادہ ناراض نہ ہو جائے؟ کیا وہ لڑکی بہت خوب صورت ہوگی پھپھو۔“ مای کی سوئی ابھی تک اس لڑکی میں لگی تھی۔

”ہاں۔۔۔ ہو سکتا ہے۔“ پھپھو کی بنری بن چکی تھی۔ اب پھیلا واسیٹ رہی تھیں۔

”میں کیسی لڑکی ہوں پھپھو؟“ مای کا سوال اس قدر ہلکا تھا کہ نفیسہ خاتون ٹھنک سی گئیں۔

”تم بہت معصوم اور پیاری ہو مای۔ اتنی اچھی کہ مای کی لڑکی تمہارے محبت بھرے دل کا مقابلہ نہیں کر سکتی؟“ نفیسہ خاتون نے آگے بڑھ کر اس کا

”تو کیا مجھے بھی رامش بھائی کے جیسا اچھا محبت کرنے والا لڑکا ملے گا؟“ بے یقینی سے نفیسہ خاتون کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”اس سے بھی زیادہ اچھا۔ اور اتنی محبت کرنے والا کہ تم خود پہ رشک کرنے لگو گی۔“ پھپھو اس کی جذباتی فطرت سے آگاہ تھیں۔ اس لیے تسلی آمیز لہجے میں اسے یقین دلا رہی تھیں۔ مگر مای مطمئن نہیں ہو سکی تھی۔ اسے اس لڑکی کو بنا دیکھے، بنا جانے اس پر رشک آیا تھا۔ وہ رامش احمد جیسے ناقابلِ تخیر ہندے کی پسند تھی، محبت تھی، جس کی خاطر وہ پچھلے چار برس سے اپنی سگی ماں سے لڑ رہا تھا۔

\*\*\*

دوسرے ہی دن وہ صبح صبح اس کے سامنے تھا۔ وہ ابھی سو کر اٹھی ہی تھی بچن سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ عمو! پھپھو صبح کا وقت بچن میں خاموشی سے کام کرتے گزار تیں صرف فیب اور وہی تھے جو ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ناشتا کرتے اس کے بعد فیب تو یونیورسٹی چلا جاتا۔ پیچھے وہ اور پھپھو رہ جاتیں۔ گھر کی صفائی، تھرائی کے لیے مای آتی تھی۔ پھپھو اپنی نگرانی میں صفائی کروانے لگتیں۔ مای بی اے کے امتحان دے کے آج کل فارغ تھی۔

”السلام علیکم رامش بھائی۔ کب آئے۔“ وہ اپنی مندی مندی پکلیوں کو بمشکل کھولتی چہرے پہ آتی تھے بے ترتیب لٹوں کو کانوں کے پیچھے اسٹی رامش احمد کو کوئی اور ہی مای لگی۔ اس مای سے بالکل مختلف، جسے وہ پچھلے سال شوڈر کٹ بالوں میں ڈھکی ڈھالی جینز شرٹ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ انہیں وہ بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔

”یا وحشت! پھپھو آپ کے شر کے لوگ کتنے کونفشن ہو گئے ہیں۔ اس ایک سال میں؟“ وہ کرنے کے سے انداز میں گری پر بیٹھا۔

”اور سگھر بھی؟“ فیب نے گلزا لگایا۔



”غیریت تو ہے کیا یہاں سورج مغرب سے طلوع ہونے لگا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پہلے خبر کرتے تا بندہ کوئی اپنا بندوبست ہی کر کے آتا ہے ان حیرت کے جھکوں سے بچنے کے لیے؟“ رامش اسے تیار ہاتھ دل ہی دل میں اس کی خوب صورتی کا اعتراف کرتے وہ اسے نظروں کے رستے دل میں اندر ہاتھ اس قدر احتیاط سے کہ جیسے یہ کوئی کالج کی گڑیا ہو جسے اگر ذرا برہمی سے بھی دیکھا تو وہ ٹوٹ کر بھر جائے گی۔

”پھپھو۔۔۔ اگر ان دونوں نے مزید ایک بھی لفظ میرے بارے میں کہا تو میں یہاں سے ابھی چلی جاؤں گی اور ناشتا بھی نہیں کروں گی؟“ حسب توقع ماہی اپنے جلال میں واپس آچکی تھی اور اب انگلی اٹھائے وارننگ دیتے ہوئے وہ ان دونوں کو اپنی شخصیت پر تبادلہ خیال کرنے سے بھی منع کر رہی تھی۔

”اچھا بھئی بس۔ بس اب اور نہ سناؤ میری بچی کو۔ تم سب ناشتا کرو، ماہی بیٹا۔ جیم کے چار اٹھالادو رامش کو بھوک لگی ہوگی۔ رات بھر سفر کرتا رہا ہے؟“ وہ متا جیسے بھرپور برشت لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”توجہ جاز میں آیا ہے پیدل تو نہیں نا۔ پھپھو۔۔۔ آپ بھی نا؟“ ماہی نے اپنے تئیں بدلہ چکانے کی کوشش کی۔ لاہور اور فیصل آباد کا سفر ہی کتنا ہے؟

”محترمہ آپ کے بس میں ہو تو پیدل آنے والے کو بھی پانی کا گلاس تک نہ پوچھیں یہ تو پھپھو ہی کی بدولت اس گھر میں مہمان نوازی کی روایت بنی ہے اور میں سیدھا دہی سے آرہا ہوں۔ لاہور سے نہیں اور کل دوپہر کا کھانا ہوا ہے اور میں کتنا بھوک کا کچا ہوں پھپھو بخوبی جانتی ہیں۔“ رامش نے بھی اس کے انداز میں جواب دیا تھا۔

”ماہی۔۔۔ کہاں کوئی ہو۔ ناشتا کرو نا؟“ فییب نے اسے کھویا کھویا دیکھا تو شوکارا۔ وہ جیسے کسی خواب سے جاگی سوچوں کا رنگ بھرنا تو اندازہ ہوا کہ وہ رامش احمد کے خوب صورت و صبح چہرے پہ نگاہیں جمائے بیٹھی ہے۔

”کسک۔۔۔ کر تو رہی ہوں؟“ اف لہو اپنی بے اختیاری پر کس قدر شرمندہ تھی۔

”لگتا ہے محترمہ ابھی غندے نہیں جا سکتی۔ کاشوہر بے چارہ تو بھوکا مرے گا۔ بغیر ناشتے کے؟“ جب اسے آس جانا پڑے گا نا؟؟ ان کی توخیر نیند ہی نہیں پوری ہوتی؟“ رامش احمد مستحق کسی خوش خیال تصور کو سوچتے ہوئے مسکرایا۔

”اپنی ماہی نے اس کا دل دھونڈ لیا ہے رامش۔ شادی ہی کسی ایسے بندے سے کرے گی جو خانہ سالانہ انورڈ کر سکتا ہو۔ نہیں تو یہ شادی ہی نہیں کرے گی۔ ہے نا ماہی؟“ فییب نے غصے سے چہرہ پھلائے بیٹھی تھی کہ وہ کد کد کر راس کو بتایا۔

”میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں شادی نہیں کروں گی۔“ فییب اور رامش دونوں ہنس دیے۔

”بلکہ یہ کہا تھا کہ میں شادی فییب سے کروں گی۔ تاکہ پھپھو کھانا بنائیں تب تک جب تک فییب خانہ سالانہ انورڈ نہیں کر سکتا؟“ اب کھانے کی باری فییب کی تھی۔ ماہی بڑے آرام سے توس پر جیم لگا رہی تھی۔ بڑے ہی مکن انداز میں۔ جبکہ رامش احمد مسکرا بھی نہیں سکا۔

”تو یہ کرو لڑکی۔ کیوں ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔ تمہیں ہر مسئلے کا حل مجھ سے شادی ہی میں نظر آتا ہے۔ بخش دو مجھے۔“ فییب کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ رامش احمد ہنس دیا، مگر دل میں اک جھاس ایسی بھی چبھ رہی تھی تو کیا ماہی فییب میں انٹرنل سٹریس ہے؟ وہ خوف ناک سوال قاجس کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی اور نہ ہی وہ براہ راست پوچھ سکتا تھا۔

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے، بس مجبوری میں مجھے ایسا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی پیسے والا شوہر ملے تو؟“ وہ اپنا جیم لگا تو س ختم کر چکی تھی۔ اب ابلا ہوا ہاتھ چھیل رہی تھی۔ آج کل وہ اپنی ڈائریہ خصوصی فونڈ وے رہی تھی۔ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ پھپھو کے سے۔ مئی ڈیڑی اگلے مہینہ پاکستان واپس آ رہے تھے اور پھپھو بے حد سختی سے اس کے انداز و اطوار

نست و برخاست بہ نظر کر رہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ وہ ماہی کو ایک ریٹیکٹ مشنی لڑکی کے روپ میں سامنے لانا چاہتی تھیں۔ جس کی تربیت وہ ناز کر سکیں۔

”ماہی! بس بھی کرو، کچھ جسمی اول فوٹ بولتی رہتی ہو؟“ پھپھو نے رامش کے چہرے پر تحریر پائندیدگی پڑھتے ہوئے اسے بے اختیار ٹوک دیا تھا۔

”تو کیا کروں پھپھو! میری زندگی کا سوال ہے اب میں اسے یوں شرم و حیا میں جلاہو بریاد تو نہیں کر سکتی نا۔ آج میرے پاس وقت ہے اگر میں آج اپنے حق کے لیے نہ بولی تو ساری عمر پچھتاؤں گی۔ اور میں پچھتانا نہیں چاہتی، پلیز۔“ وہ ہاتھ اٹھائے دو ٹوک انداز میں اپنی جذباتی تقریر کے اختتام میں درخواست کر رہی تھی پھپھو نے اپنا سر پیٹ لیا جبکہ رامش اور فییب ہنس دیے۔

”بہت بڑی ڈرامہ کوئین ہو؟“ رامش احمد زیر لب مسکرایا۔ ماہی نے کندھے اچکائے ناشتے کے بعد فییب تو نیوورسٹی چلا گیا، پھپھو جگن سمیٹنے اور وہ دونوں اپنی اپنی جائے ٹاگ لیے لاؤنج میں آ بیٹھے۔

”آہم۔ کیا اسٹوری چل رہی ہے رامش بھائی۔“ شائے شکیلہ آئی ماں کس۔۔۔ ”وہ رازدارانہ انداز میں اس کے کان کے قریب جھکی کہہ رہی تھی۔

”کوئی دھمکی دی ہے؟“

”دھمکی تو کوئی نہیں دی۔ بس جذبہ سچا تھا۔ اسی لیے توجیت کیا؟“ وہ چائے کا کھونٹ بھرتے ہوئے اس کی شرارت سے بھری آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولا۔

”آہ۔ بہت بہت مبارک ہو رامش بھائی؟“ ماہی نے رامش احمد کے چہرے پر قوس و قزح جیسے رنگوں سے نظریں چرا لے کر۔

”چار سال۔ ماہی پورے چار سال میں نے دن رات ماما کو منانے میں گزار دیے۔ اک لمبا عرصہ۔ تب جا کے میری زندگی میں خوشی کی کوئی کرن چمکی ہے۔ میں۔۔۔ میں نہیں بتا نہیں سکتا۔ مجھے اس دن کا کتنا انتظار ہے، جس دن میں اسے اپنا نام ملے گا۔ بیشک کے لیے اسے اپنا ہوں گا؟“

”کیا وہ بھی آپ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے رامش بھائی؟“ ماہی کے لہجے میں رشک تھا۔

”نہیں کرتی تو اتنا کرنے لگے گی ماہی۔ وہ ہے ہی اتنی پیاری اور معصوم۔“

”کیا وہ بہت خوب صورت بھی ہے؟“ ماہی کے لہجے میں حیرت اور درد سجھا ہونے لگے۔ نامعلوم کیوں اسے اس لڑکی کا ذکر کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

”ہاں بہت۔۔۔؟“ اس کے ذکر پر رامش احمد کا چہرہ محبت کی حدت سے تھمتانے لگا تھا ماہی کو کسی وضاحت کی طلب ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”مجھے کب ملوائیں گے؟“ اک نئی فرمائش کی۔

”چند روز میں جب مشق کرنے جائیں گی تب تم ساتھ ہی چلنا۔ ان فیکٹ تمہارا وہاں ہونا بہت ضروری ہوگا۔ تم تو میری سب سے اسٹیشن گیٹ ہو گی وہاں؟“

”پھر بھی رامش بھائی۔ کچھ تو بتائیں اس کے بارے میں وہ کیسی دھمکتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ اب تو سیکرٹ کلوز کروں؟“ ماہی آج ہر صورت رامش احمد سے اس لڑکی کے متعلق جاننا چاہ رہی تھی۔ رامش احمد اس کی بے چینی جانچتے ہنس دیا۔

”تمہارے جیسی دھمکتی ہے؟“ رامش احمد بچ کر کہہ رہا تھا۔ گھر ماہی کو یقین نہیں آیا۔ اسے لگا رامش احمد اسے بتا رہا ہے۔

”بتائیں تو مت؟“ وہ نڈھٹے پن سے بولی۔

”بتا کر رہا ہوں یا۔۔۔ بچ کر رہا ہوں؟ وہ بالکل تمہاری جیسی دھمکتی ہے، تمہاری ہی طرح معصوم اور بے ریا۔ پاکیزہ اور دل پھولی۔“

”تو پھر شکیلہ آئی اسے پسند کیوں نہیں کرتی تھیں؟“ ماہی کے ذہن میں ایک نیا سوال ابھرا۔



”کرنے لگیں گی مانی۔ وہ اسے جانچی ہی کتنا ہیں؟“ رامش احمد کا لیٹن و اعتبار کامل تھا۔  
 ”ایک بات بتاؤ۔ ماما اور پاپا میری بھی شادی کرنا چاہ رہے ہیں؟“ مانی نے برے برے منہ بناتے ہوئے بتایا۔

”چھ۔ کب۔ کس سے؟“ رامش احمد نے حیران ہونے کی شان دار اینٹنگ کی۔  
 ”جلد ہی۔ پتا نہیں کس سے؟ مجھے پھپھو بالکل بھی کچھ نہیں بتائیں، ہر بات مجھ سے چھپا کر رکھتی ہیں۔“

”سچ کہہ رہی ہوں رامش بھائی! مجھے کچھ وقت تو دیں کم از کم۔ مجھے پتا تو چلے کہ جس بندے کے ساتھ مجھے اپنی پوری زندگی گزارنی ہے وہ ہے کیا؟ میری اس سے بے لگ بھی بائیں؟“

”یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے تمہاری مانی۔ کم از کم تمہیں پتا تو ہونا چاہیے تاکہ جس بندے کی تمہارے ساتھ قسمت پھوٹ رہی ہے اس میں کتنا صبر کا مادہ ہے؟“ مانی نے خوشخوار نظروں سے رامش احمد کی طرف دیکھا۔

”آپ بھی مل گئے ان کے ساتھ۔ مجھے آپ سے یہ امید ہرگز نہیں تھی؟“

رامش احمد اپنی ہونے والی دلہن کے لیے دینی سے کی جانے والی قیمتی شاپنگ پھپھو کو دکھا رہا تھا۔ مانی پاس ہی لیٹی بے دلی سے میگزین کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ جب ایک دم رامش احمد نے اس کے ہاتھ سے میگزین چھینا۔

”بس۔۔۔ اتنا سارا خرچہ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ تم اپنی قیمتی رائے بچا گئے رکھو۔ انھو یہ بعد میں بھی بڑھا جاسکتا ہے۔ پہلے یہ ساری چیزیں دیکھو؟“

”آپ پہلے پھپھو کو تو دکھالیں۔ میں بعد میں دیکھ لوں گی؟“ مانی نے ہنسنے لگا جبکہ حقیقت میں اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا ان چیزوں کو دیکھنے کو۔

”تمہاری رائے تو مجھ سے بھی زیادہ اہم ہے رامش کے لیے مانی اور تم ہی بہانے بنا رہی ہو۔“ نفیسہ

خاتون نے ہاتھ میں پکڑاؤ اٹھنا کالغیس برسلٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”ڈاؤن۔ زبردست۔ کتنا بار بار ہے رامش بھائی۔ بہت قیمتی بھی ہوگا؟“ جگر جگر کرتے ڈانٹنے کے برسلٹ پہ مانی کی نظریں گویا جم گئی تھیں۔

”ہے تو۔۔۔ مگر اس سے زیادہ تو نہیں۔ جب وہ اسے ہنسنے لگی تب اس کی قیمت بڑھے گی مانی؟“ رامش احمد کے لہجے میں جذبول کی شدت تھی۔

”اللہ تمہاری خوشیاں سلامت رکھے، رامش! بیشہ خوش رہو؟“ نفیسہ خاتون کو رامش کی بات اتنی پسند آئی تھی کہ بے اختیار دعا دے بیٹھیں۔

”تھینک یو پھپھو! بس میرے لیے ہر وقت دعا کیا کریں۔ مجھے اپنی خوشیاں مکمل چاہیں۔ اوسووی چیزوں سے مجھے نفرت ہے؟“ وہ ان کے ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔

”بس۔۔۔ بس۔۔۔ بس۔۔۔ اب یہ جذباتی ڈرامہ نہ شروع کیجئے۔ مجھے وہ میک اپ باکس دکھائیں۔ دور سے ہی اتنا زبردست نظر آ رہا ہے۔ یقیناً“ اندر بھی خاص الخاص پروڈکٹس ہوں گی۔“ آخر رامش بھائی اپنی محبت کے لیے کوئی عام سی چیز خرید سکتے ہیں بھلا؟“ مانی نے رامش احمد کی تمام شاپنگ دل لگا کر دیکھی اور خوب دل لگا کر تعریف بھی کی۔ جس کے بعد رامش احمد اسے کہہ رہا تھا۔

”مجھے ابھی اس کے لیے متنہی کے دن پہننے والا ڈریس بھی سلیکٹ کرنا ہے اور اس میں تمہیں میری مدد کرنا ہوگی؟“ رامش احمد اس پہ ایک بھاری ذمہ داری ڈال رہا تھا۔

”بس۔۔۔ میں کیوں کروں مدد۔ جس نے پہننا ہے آپ اسی کو لے جائیں نا ساتھ؟“ مانی ہٹلائی۔

”اے کیسے لے جاؤں۔۔۔ وہ تو شرمیلی ہی بہت ہے تمہاری اور اس کی پسند ایک جیسی ہے۔ حتیٰ اسے بھی کچھ نہیں پتا شاپنگ کے متعلق سو پسند تو میں ہی کروں گا۔ تم بس ساتھ چلی چلنا۔ اتنا تو کرسی کتی ہو میرے لیے۔“

”ادکے۔“ مانی کو مانتے ہی بنی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔  
 ”ایسے کام تو ساس کرتی ہیں۔ آپ کیوں کر رہے ہیں رامش بھائی۔ یہ کام تو شکیلہ آئی کیو کرنے چاہئیں نا؟“

”پانی تیار تو ہماری کریں گی۔ مگر یہ میری ضد تھی کہ دکھانا تو اسے میں نے ہی ہے تو اپنی پسند کے روپ میں دیکھوں؟“

”لوں۔ ایک زمانے نے دکھنا ہوتا ہے۔ اس دن تو لڑکی کہہ اور آپ کو تو وہ ویسے بھی اچھی ہی لگے گی نا۔ ہر روپ میں گردنیا والے دو دو آنکھیں رکھتے ہیں اور ان آنکھوں پر آپ کی طرح محبت کی کالی پٹی نہیں بندھی۔ جس سے وہ کچھ دیکھ ہی نہ پائیں؟“ رامش اور پھپھو مانی کی جلی کٹی سن کر ہنس پڑے تھے۔

”مینی ہاؤس۔ میں تیار ہو کے آتی ہوں، پھر چلتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر اپنی چھیل درست کر کے پاؤں میں اڑنے لگی ساتھ ہی ساتھ بڑا بلاٹ عروج پر تھی۔

”عجیب بندہ ہے، دنیا دہی سے جا کے شاپنگ کرتی ہے، یہ برائڈل ڈریس فیصل آباد سے خریدنے کے لیے آیا ہے۔ تو بے، اچھی بھلی گزر رہی تھی اس بندے کی کس لڑکی نے تو بے چارے کو بالکل کرنا ہے۔“ وہ جب آگے گئے بعد تیار ہو کے آئی تو بہت تڑا زہ لگ رہی تھی۔

”چلیں!“ وہ رامش احمد کے اس قدر محو ہو کے دیکھنے پر ٹوٹے بنا رہ نہیں پائی۔ اسے یقین تھا کہ ابھی رامش اس کی کئی گنی تیاری میں سے نقص نکالے گا۔ اسی لیے وہ اس کی خود پر سے توجہ ہٹانا چاہ رہی تھی۔

”پھپھو کو بتاؤ۔ وہ اس وقت کچن میں ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ کھانا نہ بنائیں۔ ہم لے آئیں گے۔“ دو بجت میں کتا والٹ میں اسے ای ایم کارڈ اور کیش چیک کر رہا تھا۔

”مگر جائیں گے کیسے گاڑی تو نیب کے پاس ہے اور ابھی تک آیا نہیں ہے؟“ مانی کو ایک نئی پریشانی سے گھیرا۔

”کوئی بات نہیں، یہاں سے فٹ پاتھ تک پیدل، پھر وہاں سے کوئی ٹیکسی لے لیں گے۔ تم چلو تو سہی۔“ رامش احمد کے پاس ہر بات کا مسئلہ کا حل تھا۔ مانی نے بے دلی سے اپنے سفید پیروں میں پٹنی بلک اسٹریپس والی جی ٹیل کو دیکھا۔ وہ ان کو پہننے کم از کم فٹ پاتھ تک پیدل تو نہیں چل سکتی تھی۔

”میں ڈرامینٹل پیسج کر آؤں؟“ اب کی بار رامش احمد کی نظراس کی کبوتر کے مانند سفید پیروں پہ پڑی اور مسکرا دیا۔

”رہنے دو۔ مذاق کر رہا تھا۔ میرا ارادہ تمہیں اتنی دور تک پیدل لے جانے کا ہرگز نہیں ہے۔ چلو دیر ہو رہی ہے، نیب بس آتا ہی ہوگا، میں نے اسے کال کر دی تھی؟“ اور مانی اس کی ذمہ دارانہ عاوت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ اس کا کتنا خیال رکھ رہا تھا۔ مگر وہ کسی اور کا مقدر تھا اور رامش احمد کی بات سو فیصد سچ تھی۔ وہ دونوں پھپھو کو بتا کے گیٹ سے باہر نکلے ہی تھے تو نیب گاڑی سے دن بھر کا تھکا ہوا اتر رہا تھا۔

”بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو، ورنہ تم بھی ہمیں جوائن کرتے؟“

”نہیں، بھی میں سارا دن خوار ہوتا آیا ہوں، اب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں، تم لوگ جاؤ؟“ رامش کی آفر کے جواب میں نیب نے مجھے تھکے سے لہجے میں بتایا۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے دنیا جہاں کی باتیں کرتے جب اٹار کھلی پیچھے تو شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ انہوں نے مارکیٹ کی ایک ایک دکان جہاں ماری تھی۔ مگر رامش احمد کو کچھ پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ بالا خراک بوتھیک میں رامش احمد کو اپنی پسند کا جوتا بالآخر نظر آئی گیا۔ گہرے پیچ کمر پہ سفید گورے کا کام تھا۔ لانگ شرٹ، ساتھ میوون پاجامہ تھا۔ دوپٹہ دو کمر میں تھا۔ مگر بے حد خوب صورت۔

”بس۔۔۔ مجھے ہی چاہیے تھا۔ کیوں مانی یہ اچھا ہے نا؟“ وہ بچوں جیسے اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔  
 ”بہت پیارا ہے رامش بھائی! مگر آپ اس سے



پوچھ لیں شاید وہ کچھ اور خریدنا چاہتی ہو؟ لنگیا شیارہ وغیرہ؟

”اے نہیں شاید وہ بڑی ہو، تم تھوڑی لڑکیاں ملتی کا ڈریس کیسا پسند کرتی ہیں؟“

”عموماً تو لپکا چلکا ہی پہنتی ہیں، جو بعد میں بھی پہنا جاسکے۔ مگر کچھ لڑکیاں۔۔۔؟“ (یعنی وہ بات مکمل کر رہی تھی کہ رامش احمد نے نوک دیا۔)

”تمہاری لڑکیوں کو چھوٹے۔ اگر تمہاری ملتی ہوتی تو تم کیسا ڈریس خریدتیں یہ یاد۔۔۔“ رامش احمد نے اپنے پسند کیے ہوئے اور ایک لنگا چولی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رائے طلب کی۔

”میں تو پھر یہی خریدتی آپ کا پسند کیا ہوا۔۔۔ یہ ہر طرح سے خوب صورت بھی ہے اور اسٹائلش بھی؟“ مایہ نے کھلے دل سے رائے دی۔

”وٹن۔“ رامش احمد نے کوٹری کا نشان بنایا۔ رامش نے سیلزمین کو ڈریس پیک کرنے کا آرڈر دیا اور خود سینٹرل اور جیولری بیچ کرنے کو آگے بڑھ گیا مایہ نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ آج کل اسٹونز کی جیولری کا ہست فیش ہے اسی لیے رامش احمد نے ایک پرل سیٹ اور ایک امیرلڈ کا ٹینکس سیٹ سلکٹ کیا اس کی پسند کی ہوئی ہر چیز اتنی پرفیکٹ تھی کہ مایہ دل ہی دل میں متاثر ہوئے بغیر رہی نہیں پاتی تھی۔

”سینٹرل تم دیکھ لے۔ مجھے لڑکیوں کی سینڈلز خریدنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ان فیکٹ کھانے کا بھی۔۔۔؟“ وہ اپنی بات کا خود ہی مزالیے ہوئے ہنسا تھا۔

مایہ نے سوٹ کی میچنگ سینڈلز بھی اپنی ہی پسند اور ٹاپ کے خریدے تھے تمام شاپنگ مکمل کرنے کے بعد ان کا رخ ”سیرینہ“ کی جانب تھا یہ مایہ اور رامش کا پسندیدہ ہوٹل تھا انہیں یہاں کا کھانا اور سروس بے حد پسند تھی۔ ان دونوں نے۔۔۔ ایک کونے والی ٹیبل سلکٹ کی تھی۔ ان کی ٹیبل کھڑکی کے پاس تھی جس کا ویو سن سیٹ (Sunset) کا منظر دکھاتا تھا۔ مایہ نے کھڑکی کے شیشے پر گہری ہوتی شام کو دکھا آسمان کے سینے پر بے ترتیب بکھرے ہوئے بے حد

دلکش تھے۔ رامش کھانا آرڈر نوٹ کروانے لگا۔

”فائنلی! آپ کی شاپنگ تو مکمل ہوئی۔ ہر چیز آپ کی پسند کی ہے اب تو مطمئن ہو گئے ہوں گے؟“ مایہ نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے استفسار کیا۔

”صرف میری پسند نہیں اس میں تمہاری بھی پسند شامل ہے یعنی ففٹی ففٹی۔۔۔؟“ رامش احمد نے مسکرا کے خوشدلی سے جواب دیا مایہ مسکرا دی۔

”ہاں یہ تو ہے۔ اسے ہماری شاپنگ پسند تو آجائے گی نا؟“ مایہ کو اک نئی فکر نے آن گھیرا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو وہ بہت اچھی لڑکی ہے لوگوں کی محبت اور خلوص کو سمجھتی ہے اور پھر ہماری پسند ہے ہی اتنی اعلا کہ وہ پسند کیے بغیر وہ ہی نہیں پائے گی۔“ رامش احمد نے فرضی کالر جھڑکتے ہوئے قدرے شوخی سے جواب دیا۔

”میںی دے۔ انکل اور آنٹی کب تک واپس آ رہے ہیں؟“

”اسی بیٹے کے آخر میں یا پھر اگلے ہفتے ابھی کچھ صحیح معلوم نہیں مجھے۔ پلاس سر انڈویس کے چکر میں ہمیشہ غلط ڈٹ بتا دیتے ہیں؟“ وہ بڑے لڑکھانا سرو کرنا شروع کیا تو ان دونوں کے درمیان کچھ دیر کے لیے خاموشی در آئی۔

”اور تمہارے رشتے کے لیے کچھ لوگ آنا چاہ رہے تھے ان کا کیا ہوا۔ اتنی مین رشتہ تو شاید تمہارا لے ہو گیا ہے تمہارا ان ف بارنٹر کے متعلق کوئی تو آئیڈل ہوگا۔“ رامش احمد نے چاول اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے سر سری بجا دیا۔

”ہے تو۔ مگر یہ کچھ پتہ نہیں بھی تو۔ ویسے بندہ ہونا اسمارٹ چلا ہے، ذہین، خوش گفتار اور اچھی ہانٹ والا جو میرے ساتھ کھڑا ہو اور میں اسے سر اٹھا کے دیکھوں۔“ پانی پیتے رامش احمد کو اچھو لگ گیا۔ اس کی آخری عجیب و غریب خواہش سن کے۔

”تمہاری آخری والی خواہش کچھ عجیب سی نہیں ہے۔ آئی مین اگر۔۔۔ ہانٹ والا لڑکا نہ ملا تو۔۔۔“ رامش احمد نے رویاں سے منہ صاف کرتے ہوئے

پوچھا۔

”تو میں کسی چھوٹے قد والے سے بھی شادی نہیں کروں گی۔“ اس نے قطعیت سے کہا۔

”اوکے اوکے کیا معلوم وہ لڑکا لمبا ہی ہو تم کھانا کھاؤ ہمیں دیر ہو رہی ہے پچھو اور منیب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

وہ دونوں لمبے پھندے جب گھر میں داخل ہوئے تو دس بجے رہے تھے۔ پچھو اور منیب بی بی وی لاؤنج میں بیٹھے کوئی ٹاک ٹو دیکھ رہے تھے۔ مایہ نے سلام کہا اور چکن میں کھانا نکال کر ان دونوں کے لیے لانے لگی مٹی وہ بڑے لگا کر جب لاؤنج میں داخل ہوئی تو رامش انہیں اپنی شاپنگ دکھا رہا تھا۔ پچھو بہت آہستہ آہستہ آواز میں اس سے کچھ کہہ رہی تھیں اسے دیکھتے ہی فوراً چپ ہو گئیں۔

”پچھو! دیکھیں کتنا پیارا سوٹ ہے۔ نا۔ میں بھی اپنی ملتی پر ایسا ہی خریدوں گی۔“ ٹیبل پر کھانے کی برے رکھ گدہ فوراً پچھو کے پاس آئی تھی۔

”رہنے دو۔ تمہارا ہونے والا منگیترا اتنا پیسے والا نہیں ہے کہ اتنا خرچہ افورڈ کر سکے؟“ اس سے پہلے کہ پچھو کچھ بولتیں منیب نے اسے نوک دیا۔

”کیا! مایہ کے تو سر پہ لگی ٹکڑیاں۔۔۔؟“

”تو کیا پچھو آپ نے میرا رشتہ منیب سے طے کر دیا ہے؟“ وہ روپائی ہو کے پچھو سے لپٹی۔

”میں تمہیں پیسے والا نظر نہیں آتا کیا؟“ اس سے پہلے کہ نفسہ خاتون کچھ بولتیں منیب چلا اٹھا۔

”ہو گے تو نظر آو گے نامولی!“ مایہ نے جیسے بدلہ چکایا۔

”دفع دور! ایک دن تم دیکھنا آسمان کی وسعتوں کو چھوؤں گا۔ اپنی بیوی کو پوری دنیا کی سیر کرواؤں گا سوئے کی جوتی پہناؤں گا؟“

”اے! دیوانے کا خواب؟“ مایہ نے اسے جڑایا۔

”نہیں! بس لو۔ ایک دن تم ہی رشک کر دو گی۔“

منیب نے سالن اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پیش کوئی کہ مایہ نے کندھے اچکائے جبکہ رامش اور نفسہ

خاتون دونوں ہی ایک ساتھ ہنس دیے۔



وہ اک نزل سی صبح تھی جب مسز شکیلہ احمد ان کے گھر آئیں۔ یہ بہت حیران کن بات تھی۔ دروازہ مایہ نے ہی کھولا تھا اور اس دن ایک اور حیرت انگیز بات بھی ہوئی، ہمیشہ مایہ کے سلام کا جواب بے رخی سے دینے والی مسز شکیلہ احمد نے مایہ کے سر پر ہنس دیا تھا۔ بھلے ہونٹ محض چھو کے ہٹا لے گئے تھے مگر مایہ کے لیے تو یہ حیران کن بات تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا لاؤنج میں بظاہر بی بی کے سامنے براہین رامش احمد کے لیے کیا گیا ہے مگر وہ اس کی ماں تھیں اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ رامش احمد کی ساری توجہ اس وقت بی بی کی جانب نہیں بلکہ دروازہ کھولتی مایہ اور سامنے موجود شخصیت کی جانب ہے۔ مایہ بہت عزت و احترام کے ساتھ انہیں لاؤنج میں لاتی تھی رامش احمد فوری طور پر اٹھ کے ان کے کھلے مل رہا تھا وہ اسے اتنے دن گھر سے غائب رہنے پر شکوہ کر رہی تھیں۔

مایہ کو ان ماں بیٹا کا پیار جانے کیوں کچھ مصنوعی سا لگا یوں جیسے وہ دونوں ڈانٹا ہلاک یاد کیے کسی ایجنٹ کے ایکٹر ہوں جو ایکٹ بھلے بہت خوب کرتے ہوں مگر ان میں جذبول کی حدت شامل کرنے میں قاصر رہ گئے ہوں۔

”ایک ماہ سے تم گھر سے غائب ہو رامش! ایک دفعہ بھی ماں کی یاد نہیں آئی تمہیں؟“ وہ اب صوفے پر بیٹھ چکی تھیں اور بڑی نزاکت سے ہاتھ میں پکڑے نشو سے آنکھوں میں در آنے والی نمی کو پونچھ رہی تھیں مایہ نے گہری لمبی سانس فضا میں خارج کی اور پچھو کو بلانے چل دی تھی۔

”سوری ماما! کچھ کچل لاہور کی کوئی فلائٹ مل نہیں سکی اور فیصل آباد مجھے ضروری کام بھی تھا سو چاروں سے کیا فرق پڑتا ہے پھر چلا جاؤں گا لونٹا تو گھر ہی تھا؟“ رامش احمد کالجہ کسی بھی قسم کی شرمندگی سے عاری تھا صاف لگ رہا تھا وہ صرف ان کا دل رکھنے کو



ایسا کہہ رہا تھا۔

”آپ ایمرپور سے سیدھی آئی ہیں کیا؟“

”نہیں۔ آئی تو رات کو تھی زبیدہ بھابی کی طرف رات ٹھہر گئی تمہارا موبائل ٹرائی کیا تو وہ آف جا رہا تھا اسی لیے ابھی غنغفر چھوڑ کے گیا ہے۔“ اسی اثنا میں پھپھو آگئیں شکیلہ آئی اٹھ کے گلے ملیں۔ مای پلاس بڑے صوفے پر رامش احمد کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”ناشتا بناؤں یا چائے لاؤں؟“ مای آداب میزبانی نبھانے کی غرض سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں کچھ نہیں فی الحال۔ میں ناشتا کر کے سیدھی آ رہی ہوں۔“ انہوں نے انکار کیا تو پھپھو کمرے بغیر رہ نہیں سکیں۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے شکیلہ! اتنے عرصے بعد تو تم آئی ہو۔ کچھ تو کھانا پینا پڑے گا بلکہ وہ سیر کا کھانا کھائے بغیر میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ مای جاؤ بیٹا تم چائے پیالو ساتھ کباب بھی مل لیتا۔“ مای ”جی“ اچھا“ کہتے اٹھ گئی۔

”اور سناؤ! کیسا چل رہا ہے سب؟“ نفیسہ خاتون نے خوشدلی سے پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے تم بتاؤ! ایسی گزر بسر ہو رہی ہے۔ اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں خیر مای کا باپ بھی تو بھیجتا ہو گا نا؟“ شکیلہ احمد نے بظاہر ہمدردی سے پوچھا تھا۔ مگر نفیسہ خاتون جانتی تھیں وہ ہمدردی کے پیچھے زبان پہ بھالار کے طنز کے تیر چلا رہی تھیں مگر وہ خندہ پیشانی سے برداشت کر گئیں۔

”روزی دینے والا تو اوپر کی ذات ہے بس وہ عزت کی روزی دے رہا ہے۔ زیادہ کی چاہ نہیں آپ بتائیں نہرو کا کہیں رشتہ وشتہ طے کیا یا نہیں؟“ ”فی الحال تو نہیں۔ ابھی تو رامش کی کریں گے اس کے بعد ہی سوچیں گے۔“ انہوں نے مختصر جواب دیا تھا تبھی مای چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے اندر داخل ہوئی۔

”تمیاز بھائی کب تک آجائیں گے؟“ مای کے ہاتھ سے کباب کی پلیٹ تھامتے ہوئے انہوں نے

پوچھا۔

”بس چند دنوں تک۔“ وہ بغور مای کو دیکھ کے بولیں

”آپ نے ان سے بات کی؟“ شکیلہ احمد کا لہجہ جانچتا ہوا سوالیہ تھا۔

”جی کی تھی۔ مگر آپ خود بھی کر لیں تو اچھا تھا۔“ مای کے جانے کے بعد انہوں نے قدرے بدتم لہجے میں بتایا۔ مای کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا وہ چن چن میں جانے کے بجائے دروازے کی اوٹ میں چھپ گئی۔

”اچھپ چھپ کے کسی کی باتیں سننا کتنی غیر اخلاقی حرکت ہے کیا تمہیں پتا نہیں؟“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سن پائی رامش احمد اس کے سر پہ آکھڑا ہوا۔ ”سن کہاں رہی تھی۔ ابھی تو آکے کھڑی ہی ہوئی تھی کہ آپ ٹپک پڑے۔“ وہ بغیر شرمندہ ہوئے الٹا اس پر برس پڑی تھی۔

”تمیں جانتا تھا۔“ رامش احمد صورتحال کا مزہ لیتے ہوئے ہنسا وہ غصے سے وہاں سے واک اوٹ کرتی چن میں آگئی وہ پیچھے پیچھے چلا آیا۔

”آپ کی والدہ ماجدہ کی تشریف آوری کچھ ہضم نہیں ہوئی مجھ سے۔“ وہ چائے کے برتن سنک میں رکھتے ہوئے بولی انداز شرارتی ضرور تھا مگر ہلکے ہلکے طنز کی جو بھی شامل تھی۔

”کیوں؟ وہ یہاں آئیں سکتیں کیا؟“ رامش کا لہجہ حیران کن ہو گیا۔

”آج سے پہلے تو کبھی نہیں آئیں۔“ وہ بھی مای تھی۔

”اوہ؟ وہ مصروف اتنی ہوتی ہیں کہ ٹائم کہاں مل پاتا ہے انہیں کہیں بھی آنے جانے کا۔“

”کننے بھرم رکھنے لگے ہیں نا رامش بھائی!“ مای کے لہجے میں یکدم ڈھیر ساری شرارت بظاہر ہمدردی کے روپ میں ہی سمٹ آئی۔ وہ گھورے بنارہ نہیں پایا۔

”ویسے مجھے تو کوئی گڑبڑ لگتی ہے؟“ مای کا انداز اب سوالیہ لے ہوئے تھا۔



”تمہیں ایسا کیوں لگا ہے؟“ رامش احمد کا انداز سوالیہ ہو گیا۔  
 ”ہاں۔“ مائی نے کندھے اچکا کر کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔  
 ”وہ مجھے لینے کے لیے آئی ہیں۔“ رامش نے بلی تھیلے میں سے نکل ہی دی۔  
 ”میں نے تو آپ سے کوئی وضاحت نہیں مانگی۔“  
 رامش بھائی؟“ مائی کالب و لوجہ اور بھی شرارتی ہو گیا  
 رامش احمد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جان بوجھ کے اسے تنگ کر رہی ہے۔  
 ”رفع ہو؟“ وہ اسے کوستا کچن سے ہی نکل گیا۔



پھپھو کو بازار جانا تھا سو وہ منیب کو لے کر صبح دس بجے ہی چلی گئی تھیں رامش احمد کل ہی اپنی ماں کے ساتھ شام کی فلائٹ سے لاہور روانہ ہو گیا تھا۔ اس دفعہ اس کا دورہ خاصی کم مدت کا تھا سو اس نے بہت جلد دوبارہ واپس آنے کے وعدے کے ساتھ رخصت طلب کی تھی۔  
 ”تا مزا آ رہا تھا رامش بھائی! اور آپ اتنی جلدی جارہے ہیں۔“ مائی شکوہ کر رہی تھی سپاس ٹھہری شکلیہ احمد خاں خود پہلو پہ پہلو بدل رہی تھیں۔  
 ”میں چند دنوں میں دوبارہ چکر لگاؤں گا مائی۔“  
 رامش احمد نے اس کے چہرے پر پھیل مایوسی دیکھ کے کہا۔ نفیسہ خاتون نے رامش احمد کی والدہ اور اپنی چچا زاد بہن کی تخی ہوئی گردن پر بچے مغرور چہرے کی طرف دیکھا تو نخوت و ناگواری کی واضح لکیریں نظر آئیں اسی لیے مائی کو فوراً ”ٹوک دیا۔“  
 ”خند مت کرو مائی! وہ ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہا ہے جلد ہی دوبارہ لوٹ آئے گا۔ انہیں جانے دو۔“  
 مائی نے نفیسہ خاتون کے لمحے میں چھپی تنبیہ و ناگواری محسوس کرتے ہی خاموشی اختیار کر لی۔ مسز شکلیہ احمد اس جذباتی سین میں زیادہ دیر ٹھہری نہیں رہ سکیں اسی لیے جلدی سے گاڑی میں جا بیٹھیں۔ انہیں

جانا دیکھ کر رامش کو بھی جا بوا۔ منیب انہیں ایئر پورٹ چھوڑنے جا رہا تھا۔ دل تو مائی کا بھی چاہ رہا تھا جانے کو مگر پھپھو نے منع کر دیا اتنی سختی سے کہ وہ خند کر ہی نہ سکی۔ وہ کل سے بے چین و مضطرب تھی۔  
 رامش احمد کی جدائی ایک لمحے کے لیے بھی اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ وہ کل اسے بہت جلد دوبارہ واپس آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا تھا مگر وقت تھا کہ جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔  
 ”کیا ماہ رخ امتیاز علی ساری زندگی کی جدائی سہہ مانے گی؟“ بہت مشکل تھا یہ بات سوچنا بھی کہ وہ اس کے لیے نہیں تھا کسی اور کے بخت کا ستارہ تھا۔  
 جانے کتنا وقت بیت گیا اسے یونی لائن میں بیٹھے ہوئے سرمئی شام اپنے آپکل میں سیٹھی ہوئی ساری اداسیاں اس کی جھوٹی میں ڈال کے رخصت ہو رہی تھی پھپھو کو سارا دن گزر گیا تھا بازار گئے ہوئے مائی کو حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ وہ شاپنگ بے حد اطمینان اور سکون سے کرنے کی عادی تھیں۔ ایک چیز خریدنے کے لیے اگر انہیں آواحدن بھی صرف کرنا پڑا تو وہ بھد شوق کرتیں۔ مگر اپنی پسند و معیار کے معاملے میں سمجھوتہ ہرگز پسند نہیں کرتی تھیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی کا عنصر شامل ہو رہا تھا مائی اٹھ کے اندر آ گئی۔  
 اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ پہلے سوچا منیب کو فون کرے پھر اپنے خیال کی خوبی ترید کر کے فریج کی تلاشی لی مگر وہ خالی اس کا نہ چڑا رہا تھا۔ اب وہ کیا کپائے شام کے لیے اسے سوچ کے ہی الجھن ہونے لگی پھر اس نے منیب کو کل کی اور اسے بازار سے کھانا لینے آنا کا کہہ کے فون بند کر دیا۔ مائی یہ اس وقت شدید قنوطیت کا دورہ پڑا تھا۔ اس نے بے دلی سے چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگایا ابھی پہلا گھونٹ بھر ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے اٹھا کے نمبر دیکھا تو ساری کلفت لمحے بھریں ہو ہوئی۔  
 ”اسلام علیکم رامش بھائی۔“ فون آن کرتے ہی وہ بڑی بے تابی سے بولی۔  
 ”وعلیکم السلام کیسی ہو مائی؟“ جذبول کی حد

سے چکا لچکا مائی کو مسحور کر گیا۔  
 ”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ اس نے لہجے میں ہلاکت پیدا کرتے پوچھا۔  
 ”اچھا! مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے تم اداس ہو رہی ہو اس وقت۔ مگر تم تو بہت خوش لگ رہی ہو۔“ رامش نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کی مایوسی سموتے ہوئے اسے چھیڑا۔  
 ”آپ کے فون سے پہلے واقعی میں بہت بور ہو رہی تھی رامش بھائی! مگر آپ سے بات کرتے ہوئے بہت ہلاکت محسوس کر رہی ہوں خود کو۔“ مائی نے جلدی جلدی وضاحت کی مبادا کہیں رامش احمد فون بند ہی نہ کر دے۔  
 ”تو پھر مجھے کال کر لیتیں۔“  
 ”میں نے سوچا آپ بڑی ہوں گے اس لیے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“  
 ”ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھایا؟“ اپنا ”نہیں سمجھا؟“ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔  
 ”تو یہ ہے رامش بھائی! آج تو آپ بیویوں کی طرح سے مشکوک ہو کے شکوے کر رہے ہیں خیریت تو ہے۔“ دوسری جانب رامش احمد قہقہہ لگا کے ہنس پڑا تھا۔  
 ”تمہاری اچھی بات پتا ہے کیا ہے مائی۔ تم میرے پر انداز کو پہچانتی ہو۔“ رامش احمد اپنے قہقہہ کا گلا گھونٹتے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔  
 ”ایک دن میں ماما میرا رشتہ مانگنے جا رہی ہیں۔ شاید حقانی بھی کر آئیں۔“ اس نے بہت ہولے سے اس کے سر پر ہم پھوڑا۔ ابھی شاید وہ کچھ اور بھی بتاتا مگر اچانک کال ڈراپ ہو گئی مائی نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا اس کے موبائل کی بٹھوری آف تھی۔ پہلی مرتبہ اسے اپنے موبائل کی بٹھوری ختم ہونے پر یار آیا۔ اس نے بے دلی سے اٹھ کر موبائل فون چار چنگ پہ لگایا دفعتاً ہونے والی دُور تیل نے مائی کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔  
 ”ایسا تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا پھر وہ کیوں اندر

سے مجھ گئی تھی۔“ دروازہ کھولتے وقت لاؤنج سے مرکزی دروازے تک کا سفر چند قدموں کا تھا مگر اسے وہ چند قدم ایک لمبی مسافت پر محیط لگے اس کے قدم من من اور ٹانگیں گویا شل ہو گئیں۔ اس نے بے دلی سے دروازہ کھولا اور سامنے موجود ہستی کے گلے جا لگی شدت سے اس وقت کسی ایسے کندھے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی جس پر سر رکھ کر وہ اپنے سارے دکھ بھادے مگر کوئی اس سے وجہ نہ پوچھے امتیاز علی ہولے ہولے اس کا سر سہلا رہے تھے وہ اسے اچانک سر پر انز دینے کے چکر میں تھے مگر یہاں اگر انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بیٹی تو ان کے لیے بے حد اداس ہے تبھی تو اس قدر حساس ہو رہی تھی۔ مائی اتنی ہی تڑپ کے ساتھ اپنی ماں کے گلے لگی عاصمہ خان کی آنکھیں بھی تین سال بعد اپنی جوان و خوش صورت بیٹی کو دیکھ کے جل جھل ہو گئیں۔ کتنا اصرار کرتی تھیں اس سے کہ ان کے ساتھ آکر رہے مگر مائی نفیسہ خاتون کو اکیلا چھوڑنے پر کبھی راضی نہیں ہوئی تھی۔



”امتیاز! آپ نے دیکھا مائی کتنی بڑی ہو گئی ہے کتنا سلیقہ آگیا ہے اس میں؟“ عاصمہ خان نے خوشی سے معمور لہجے میں امتیاز علی کو مخاطب کیا جو بڑی گرجوٹی سے ڈانٹنگ ٹیبل پہ سجائے گئے برتن اور لوازمات دیکھ رہے تھے۔  
 ”یہ سب نفیسہ کی بدولت ممکن ہوا ہے ورنہ آج اگر مائی لندن میں ہوئی تو شاید ہم اس کی اتنی اچھی پرورش نہ کر پاتے شاید اسے اپنی اقدار سے روشناس کرانا بھی ہمارے لیے مشکل امر ثابت ہوتا۔ بہت شکریہ نفیسہ ہم پر تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔“ وہ تشکر سے کہہ رہے تھے جبکہ نفیسہ خاتون جھینپ گئیں۔ انہیں ہمیشہ کی طرح آج بھی مائی کو نفیسہ خاتون کو سوینے کا فیصلہ غلط نہیں لگا تھا اور آج مائی بیٹس کی ہو چکی تھی اور وہ اس کی شادی کے سلسلے میں واپس آئے تھے انہیں نفیسہ خاتون نے بتایا تھا کہ مائی کے



لیے چند ایک بہت اچھے رشتے آئے ہیں جن میں سرفہرست رامش احمد کا پرنسپل تھا۔ کل سے ماہی کے والدین اور پیچھو کے درمیان کچھ میٹنگ ہو رہی تھیں۔ فیصلہ الگ تیاریوں میں اٹھا ہوا تھا ایک ماہی ہی بھی جو سب کچھ دیکھ رہی تھی اور بہت کچھ سمجھ کے بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ شام کو انہوں نے بتایا تھا کہ کل اسے دیکھنے کے لیے چند لوگ آ رہے ہیں۔ پیلا کے فیملی فرینڈ ہیں کافی سال ان کے ساتھ وہیں لندن میں بزنس بارنٹر رہے ہیں اور بس لڑکے کے بارے میں کچھ بتایا نہ ہی کوئی سرکاری آگاہ دیا۔

ماہی کو پیچھو نے صبح سے ہی کچن میں اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا دوسرے کے قریب وہ لوگ آئے تھے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ممانے کچن میں جھانک کے اسے تیار ہونے کا کہا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں فریش ہونے چلی گئی۔ نہانے کے بعد اس نے ڈرائیو سے اپنے بال خشک کیے چند ایک لٹیں چہرے کے اطراف میں ڈالیں اور میک اپ سے میرا چہرہ لے۔ اپنے ملاوے کا انتظار کرنے لگی جب پیچھو اور فیصلہ ممانے کے ہمراہ اچانک کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”مبارک ہو ماہی۔ تمہارا رشتہ بخیر وعافیت رامش احمد کے ساتھ طے پا گیا ہے؟“ فیصلہ نے گلاب جاسن کھاتے ہوئے ماہی کے سر پہ گولہ باری کی اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

”کیسا لگا ہمارا سر اترے؟“ ممانے آگے بڑھ کے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”میں نے تم سے کہا تھا ماہی، کہ تم اپنے فیصلہ پہ رشک کرو گی۔ وہ خوش فیصلہ لڑکی تم ہی تھیں ماہی۔ رامش احمد کا خواب؟“ پیچھو اس کی کی باتیں اسے یاد دلا رہی تھیں مگر ماہی حیرت زدہ تھی۔ ممانے سے ڈرائنگ روم میں لے گئیں جہاں رامش احمد اپنے والدین دو چھوٹے بسن بھائی کے ہمراہ قح کے احساس سے دو چار بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مسکرایا۔ ماہی کے چہرے پہ پچھلے حیرانی کے تاثرات وہ بخوبی پڑھ سکتا تھا۔

ہی نہیں بلکہ ماہی کے دل میں ہونے والی پچھل سے بھی بخوبی واقف تھا۔

ماہی اگر سب سے ملی مگردانستہ رامش احمد کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ مسز شکیلہ احمد نے اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور ڈائمنڈ کی خوبصورت رنگ بنیادی۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا اور ایک دوسرے کو مٹھائی کھلائی گئی۔

”ہم لوگ چاہ رہے تھے کہ اپنے چند ایک قریبی دوست احباب اور عزیز واقارب کو بلا کے ایک چھوٹی سی رسم کر لیتے۔ ہمارے گھر کی بھی پہلی خوشی ہے اور آپ کے گھر کی بھی۔ کیوں امتیاز بھائی آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟“ احمد فاروق نے بڑے سجاوے کہا تھا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ اگر شادی کرنا چاہیں ہمیں تو تب بھی کوئی اعتراض نہیں۔“ سدا کے جلد باز امتیاز علی نے جوابا کہا۔

”ارے واہ بھی یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ ان کے تودل کی جیسے مراو برائی تھی۔ ایک وہ ہی تو تھے رامش احمد کے بڑے سپورٹر ورنہ تو شاید شکیلہ احمد کبھی نہ مانتیں۔

”لیکن بھائی صاحب! آخر ہمیں بٹی بیاہنی ہے اور پھر اتنی ڈھیر ساری تیاریاں بھلا کیسے کر پائیں گے، ہم لوگ۔“ نفیسہ خاتون نال کا شکار تھیں اور گھبراہٹ کا بھی۔

”ارے چھوڑیے بھائی! تیاری کیسی ”پنے“ ہی گھر تو جاری ہے ماہی۔ اور اللہ کا شکر ہے ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہوگی اسے وہاں کیوں شکیلہ بیگم!“ انہوں نے دانت بہ دانت جمائے اپنی ناپسندیدگی کو بمشکل چھپائے بیٹھی اپنی نصف بہتر کو دیکھ کر کہا تھا۔

”جی بالکل۔“ وہ فقط اتنا ہی کہہ پائیں۔ شکیلہ پروین امتیاز علی اور نفیسہ خاتون کی سکی پچازاد تھیں اور کسی زمانے میں امتیاز علی کی منگیتر مگر پھر امتیاز علی لندن چلے گئے اور وہیں گرین کارڈ حاصل کرنے کے لیے ایک پاکستانی برٹش فیملی میں شادی کر لی۔ عاصمہ خان پاکستانی

نہلا تھیں۔ اسی لیے امتیاز علی بہترین مستقبل کے لیے ہمیشہ کے لیے وہیں شفٹ ہو گئے۔ وہ شروع ہی سے شکیلہ پروین جو مزاج کی ترش اور سخت تھیں کو کچھ خاص پسند نہیں کرتے تھے امتیاز علی نے ادھر لندن میں بیاہ کر چایا ادھر غصے میں آکے شکیلہ پروین نے اپنے سے آدھی عمر بڑے احمد فاروق جن کے آس میں وہ کام کرتی تھیں ان سے شادی کر لی۔ رامش احمد ان کی پہلی بیوی کا بیٹا تھا۔ نہرو اور اشعر شکیلہ پروین کے بیٹے تھے مگر انہوں نے رامش احمد کو کبھی بھی اپنے سگے بیٹے سے کم ہرگز نہیں سمجھا تھا۔ وہ دس سال کا تھا جب شکیلہ پروین بیاہ کر احمد فاروق کے محل جیسے گھر میں آئیں گزرے وقت نے ان کے دل سے امتیاز علی کی محبت تو دھندلا دی مگر وہ اپنی اہانت اور بے عزتی کا وہ احساس نہیں مٹا سکیں۔ وہ کبھی بکھار جب کبھی فیصل آباد اپنے میکے کا چکر لگاتیں تو رامش احمد کو بھی ساتھ لائیں کبھی کبھی نفیسہ خاتون کے بھی گھر چلی جاتیں وہیں رامش احمد کی اپنے ہم عمر فیصلہ علی وہاب سے دوستی ہوئی کہ ان کے گھر رامش احمد کا آنا جانا شروع ہو گیا جسے شکیلہ پروین باوجود کوشش کے بھی ختم نہیں کروا سکیں۔ کچھ نفیسہ خاتون تھیں بھی بہت لمبنا اور نرم مزاج کی کہ بندہ ان کی محبت میں خود ہی کھینچا چلا آتا۔ پھر جب ماہی کے لیے رامش احمد نے خواہش ظاہر کی تو انہیں لگا جسے کوئی بر چھپی لے کر ان کے دل کو زخمی کر رہا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ رامش احمد اس عورت کی بیٹی کا نام لے گا جنہوں نے اس کے دل کو دریائے کر کے ”پنا گھر“ آباد کیا تھا۔ چار سال انہوں نے بے حد نفرت و بے گانگی سے رامش احمد کی خواہش کو مسترد کرتے گزارے تھے مگر رامش احمد کی محبت و فرماں برداری دیکھ کے انہیں مانتے ہی نہ تھے اور آج وہ اپنے دل میں موجود نفرت و بے گانگی کو چھپائے شادی کے معاملے طے کر رہی تھیں اور سب کچھ رامش کے حسب فضا ہوا تھا۔ دمن بن کر ماہی پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ عین ناظم پر رامش احمد نے اپنے والد کے کان میں نکاح کی خواہش ظاہر کر دی۔ وہ اپنے

جیتنے کے لیے فوراً سب کو رضامند کرنے لگے۔ ماہی انہیں پریشان کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے ابھی تو وہ اس نے بندھن کو ہی نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ نکاح کے فوراً بعد رخصتی کا مطالبہ کر دیا۔ ماہی کو ڈھیروں ڈھرونا آیا اس نے تو اپنی شادی کے دن کے حوالے سے بے حد خواب دیکھ رکھے تھے اسے وہ کہہ کر رامش احمد پہ غصہ آ رہا تھا جس نے بیٹھے بیٹھے یہ شوشا چھوڑ دیا تھا۔ رخصتی کے وقت اسے بے حد رونا کیا۔

دھائی کھنے کی تھا کاہنے والی مسافت کے بعد جب اس نے بیڈ روم میں قدم رکھا تو اس کے قدم دبلیز رہی لڑکھڑائے گئے پورا کمرہ بالکل دلن کی طرح سجا ہوا تھا۔

ماہی اور رامش احمد کو ایک ساتھ بٹھا کر دودھ پلایا گیا ساتھ ہی ساتھ۔ آرسی کی رسم بھی کی گئی تھی دوپٹے کی اوٹ میں جب آئینے میں رامش احمد نے ماہی کا دلفریب روپ دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ماہی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تھا۔ رامش احمد کو پل بھر میں اندازہ ہو گیا تھا ماہی کے موڈ کا۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔ آہستہ آہستہ سب مہمان چلے گئے تو ماہی کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ نہرو اسے اس کے کمرے میں چھوڑ گئی تھی ساتھ ہی رات کو ہینے کا آرام وہ سوٹ دے گئی تھی۔ وہ ابھی چینیج کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ رامش احمد کمرے میں چلا آیا۔

”نہ۔ نہ۔ ابھی نہیں مجھے پتا تھا تم غصے میں چینیج کرو گی۔ اور میں نہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔“ وہ ہاتھ روم کا دروازہ کھولنے ہی والی تھی جب رامش احمد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کے بازو پہ لٹکے کپڑے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کھا جانے والے ارادے سے پلٹی تھی۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ رامش احمد اس کے قریب آتے ہوئے اس کے نازک سے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

”چھوڑیں میرا ہاتھ۔“ وہ بے حد درشتگی سے اس کا ہاتھ جھٹک رہی تھی اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے۔



”ناراض ہو؟“ وہ اب اس کے چہرے کے بے حد قریب اپنا چہرہ کیے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ گولڈ میڈل پہنانے کو دل چاہ رہا ہے آپ کو۔“ رامش احمد کی توبہں پوچھنے کی دیر بھی مانی تو پھٹ ہی پڑی۔ رامش احمد قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ رامش احمد نے بہت پیار سے اس کا رخ اپنی جانب موڑنا چاہا جو ناراضی سے وہ پھیرے ہوئے تھی۔

”رامش بھائی پلیز؟“ وہ ان کی طرف مڑتے ہوئے بے ساختہ بولی تھی۔ رامش احمد کا قہقہہ بے حد جاندار تھا۔

”نکاح کو مشکوک مت کرو یا ر۔ کچھ تو سوچ سمجھ کے بولو؟“ مانی بے ساختہ جھینپ گئی مگر اپنی خفت مٹانے کو پھر کہنے لگی۔

”آپ نے اچھا نہیں رامش۔ بھائی ی؟“ مگر اتنی برسوں پر اپنی عادت تھی۔ اتنی آسانی سے بھلا کہاں چھٹنے والی تھی مگر رامش نے محسوس نہیں ہونے دیا مبادا ناراض ہی نہ ہو جائے۔

”یہی ہوتی ہے شادی! نہ مندی لگی نہ دھولک رکھی گئی اور نہ ہی میں نے اپنی پسند کا برا بیڈل ڈریس پہنا؟“ مخصوصیت سے اپنی ناراضی شکاری تھی۔

”مندی تو ہاتھوں پہ لگی ہے تمہارے۔“ رامش احمد نے اس کے دو دھیما ہاتھوں پہ سجے مندی کے نیل بوٹے دیکھتے جیسے اس کی شکایتوں کے ایک پلندے میں سے ایک شکوہ کیا۔

”یہ تو باہر سے لگوائی تھی۔ مگر تھوڑی فنکشن ہوا تھا۔“ وہ جیسے رامش احمد کی بات کی گہرائی کو نہ سمجھنے پر جھنجھلائی۔

”لگی تو میرے نام کی ہے نامی۔ چاہے گھر میں نہ سہی پارلر میں سہی۔“ رامش احمد نے اس کے گرد بازوؤں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ وہ مکمل طور پر اس کی گرفت میں تھی۔ لمحے بھر میں مانی کو اس کی سانسوں کے زیرِ دم میں جیسے جذبات کی شوریدہ سری محسوس ہوئی تو کثرت کھا کے پیچھے ہٹی۔

رشتے کا اچانک احساس ہوا تو نگاہیں اٹھنے سے انکاری ہو گئیں۔ رامش احمد نے مدھنسی کے عالم میں اس کے آویزے کو چھیڑا۔ دوپٹے سر سے سر کا، رامش احمد نے اسے اتار کر صوفے پر ڈال دیا اب وہ بہت محبت سے اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو محسوس کر رہا تھا مانی کسمسلی مگر رامش احمد نے چھٹکارا پانے نہیں دیا اس کے گلے میں موجود نقیصہ ڈامنڈ لگانیکلیس کا ہک کھول دیا اور اس کی چوڑیوں سے کھیلنے لگا پھر اسے یونہی بازوؤں کے حلقے میں لیے بیڈ پر اگیا اور جیب سے وہی برسٹل نکال کر پسنایا جو وہ دہنی سے لایا تھا یہ اس کی منہ دکھائی تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“ مانی دم بخود تھی۔

”سب تمہارے لیے۔ میری محبت کے لیے؟“

اس رات رامش احمد نے مانی پہ اپنی محبت و چاہت کی بارش کچھ اس طرح سے کی کہ مانی جل تھل ہو کے سیراب ہو گئی تھی اسے یقین آگیا تھا کہ محبت مدھوشی کا دوسرا نام کیوں ہے؟

ولیمہ بے حد شاندار انداز میں کیا گیا تھا ولیمہ کے فوراً بعد وہ دونوں ایک ماہ کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک ماہ ان دونوں نے ایک دوسرے کی سنگت میں بے حد انجوائے کرتے گزارا تھا کبھی وہ ٹھٹھ جاتی تو رامش احمد کی جان پہ بن آتی۔ اسے رامش احمد کا منانا بے حد اچھا لگتا تھا۔ کبھی بکھار وہ جان بوجھ کے روٹھ جاتی۔ ہاں البتہ رامش احمد اس سے کبھی ناراض نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں جب ایک ماہ بعد گھر لوٹے تو سب لوگ ہی ان دونوں کے چہرے پر موجود سکون اور خوشی دیکھ کے حیران رہ گئے اس کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تیسرے مہینے بعد جا کے زندگی عام ڈگری آئی تھی۔

روٹین لائف شروع ہوئی تو مانی نے بھی خوب جی لگا کے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی صبح رامش اور بابا کا ناشتا خاناں ہونے کے باوجود وہ خود باقی تھی وہ بہت سحر خیز تھی۔ میکے میں بھی صبح کی نماز

ادا کرنے کے بعد پھپھو اور منیب کو بیڈنی وہی بنا کر دی تھی اور اب یہاں بھی عمرو تو ان کی شادی کے دوسرے مہینے ہی لندن چلی گئی تھی اپنی خالہ کے پاس وہ وہیں ان کے پاس زیر تعلیم تھی کم ہی پاکستان آئی جبکہ اشعر اوہری تھا وہ ذرا لٹ اٹھا تھا اور ماما بھی شادی کے بعد وہ بھی رامش احمد کی طرح شکیلہ احمد کو ماما کہہ کر پکارنے لگی تھی ان کا رویہ گو کہ مانی کے ساتھ بے حد سرد تھا مگر پھر بھی وہ ان کی بے حد عزت و احترام کرتی تھی۔ لیلیا البتہ اسے بے حد پیار کرتے تھے۔ اشعر لیے دیے رہنے والا تھا مگر پھر بھی مانی کی اس سے خوب گاڑھی چھتی اس کی دن رات کی خدمت نے شکیلہ بیگم کا دل بھی نرم کر دیا تھا وہ اپنا دل صاف کر کے مانی کو حقیقی بیڈوں کی طرح چاہنے لگی تھیں۔



موبا سئل کی نیل ہو رہی تھی اسکرین پر پھپھو کا نام دیکھ کر وہ خوش ہو گئی۔

”السلام علیکم پھپھو! بڑی لمبی عمر ہے آپ کی۔ ابھی آپ کو ہی یاد کر رہی تھی۔“ چھوٹنے ہی اس نے بے باکی سے کہا۔

”وعلیکم السلام! جیتی رہو۔ میں تو پھر بھی تمہیں یاد کرتی ہوں اور تم تو وہ بھی نہیں کرتی ہو۔ اتنی مصروف ہو اپنی زندگی میں۔“ وہ محبت سے شکوہ کر رہی تھیں۔

”سوری پھپھو! اس واقعی مصروفیت ہی بہت ہو گئی ہے مگر اس دیک اینڈ پر رامش نے پروگرام بنایا تو ہے آپ کے ہاں چکر لگنے لگا۔“

”میں تو ہر روز راہ نکلتی ہوں مانی۔ تمہارے بغیر تو میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں۔“

”موبا ہے تو آپ کے پاس پھپھو؟“ مانی نے ہنس کر کہا۔

”اس کی شادی کر دیں نا۔“ مانی نے اپنے تئیں انہیں بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔

”مشورہ تو تمہارا اچھا ہے مگر کوئی تمہارے جیسی طے بھی تو۔“ شاید منیب پھپھو کے پاس ہی بیٹھا تھا

دیک کر ماما سے موبائل لے کر نکلنے لگا مانی کھٹکھٹلا دی۔

”تمہیں تو کہا تھا موبا! کہ مجھے گھر میں ہی رکھ لو۔ مگر تم نے بھی تو اس وقت میری قدر نہیں کی تھی اب بھٹکتی۔“ وہ اس کا مذاق سمجھتے ہوئے جوابا ”اسے چھیڑ رہی تھی اسی لمحے رامش احمد کمرے میں داخل ہوا تھا خلاف معمول وہ اسے کچھ سنجیدہ نظر آیا مگر مانی نے توجہ نہیں دی۔

”غلطی ہو گئی مگر کوئی بات نہیں میں اپنی غلطی کا ازالہ تمہارے ہی جیسی بیوی دھوئو کے بہت جلد کروں گا۔“ دوسری طرف بھی منیب تھا بھلا آسانی سے جو کئے والا تھا۔

”اوں۔ ہوں۔ بھول ہے تمہاری میرے نام کا صرف ایک ماڈل اس دنیا میں بھیجا تھا اوپر والے نے جو تمہارے نہیں بلکہ رامش احمد کا نصیب تھا۔ اب تم صرف صبر کرو۔“ وہ رامش احمد کے ہاتھ سے کوٹ لے کر ہینک کرنے لگی۔ وہ آفس میں سارا دن سر کھاکر آیا تھا۔ مانی کو چاہیے تھا کہ فون بند کر کے اسے کپڑے چھینچ کر واتی جائے پانی کا بوتھ جی مگر وہ فون پر ہنسی مذاق کرنے میں مصروف تھی۔ رامش احمد کو بے حد برا لگا۔

”کہاں ہے وہ تمہارا مجازی خدا۔ آیا نہیں ابھی تک۔“ آخر منیب کو ہی اس کا خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔

”بھی آئے ہیں! واش روم میں ہیں ورنہ تمہاری بات کرو اتنی؟“

”اوکے۔ پھر میں رکھتا ہوں تم اسے ٹائم دو؟“ اتنا کہہ کر منیب نے فون بند کر دیا اور مانی بچن میں۔ رامش کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ وہ چائے لے کر آئی تو خلاف معمول رامش احمد کرنا شلوار میں ملبوس بیڈ پہ نیم دراز خاموش سا لگا۔ مانی نے آہستگی سے چائے اس کے قریب سائڈ ٹیبل پہ رکھ دی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ اتنے چپ جب سے کیوں ہیں؟“ وہ نرمی سے اپنا ہاتھ رامش احمد کے گلے پہ رکھتے ہوئے بولی تھی۔



”کچھ نہیں۔ بس ذرا سر میں درد تھا۔“ رامش احمد نے جیسے اسے تلا تھا۔  
 ”لاٹس آپ کا سر دبا دوں۔ چائے پی لیں پہلے پھر آرام کر لیں؟“ وہ فوراً فکر مند ہی سے کہہ کر اس کے اور قریب آگئی رامش احمد نے لب بھینچ لیے۔  
 ”ماہی۔“ وہ اس کا سر دبا رہی تھی جب رامش احمد نے اسے پکارا تھا۔ آج اس کا چہرہ ماہی کو کسی بھی قسم کی وارفتگی سے عاری ہے حد بخیدہ محسوس ہوا۔  
 ”تم اب شادی شدہ ہو۔ پہلے کی طرح فیب کے ساتھ فری مت ہوا کرو۔ ایک شادی شدہ عورت کو یہ سب ذنب نہیں دیتا اور پھر مجھے بھی یہ سب اچھا نہیں لگتا؟“ وہ بے حد سنجیدگی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ ماہی شک گذشتہ ہوئی۔

”آہ۔ آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں رامش؟“ وہ دکھ سے چوری ہوئی۔ ”نہیں۔ اس بات کو غلط رنگ مت دو ماہی۔ تم جانتی ہو میں تم پر کبھی شک نہیں کر سکتا؟“ مگر ماہی مطمئن نہیں ہو پائی تھی۔ اس کے لیے یہ بات بے حد تکلیف دہ تھی کہ رامش احمد اس پر فیب کے حوالے سے روک ٹوک کر رہا ہے جس کے ساتھ وہ دن رات ایک چھت تلے گزارتی رہی تھی۔ جس نے اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا تھا۔ جس نے ایک بڑے بھائی کی طرح سے اس کی حفاظت کی تھی اور رامش احمد یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا۔ پھر بھی وہ اسے فیب احمد سے فری انداز میں بات کرنے سے روک رہا تھا۔ یعنی کہ دوسرے لفظوں میں اس سے رابطہ کوئی تعلق نہ رکھنے کو کہہ رہا تھا۔  
 ”سیدھی طرح سے کیوں نہیں کہتے کہ آپ مجھے ان سے کوئی رابطہ نہ رکھنے کا حکم دے رہے ہیں؟“ وہ بے حد غصے کے عالم میں اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے پھینکاری تھی۔

”نکو اس بند کرو اپنی۔ خواہ وہ بات کو طول مت دو؟“ رامش احمد کو بھی غصہ آگیا۔ ماہی نے اب تک رامش احمد کی بے تحاشا محبت دیکھی تھی۔ ایسا روپ پہلی بار دیکھا تو سمجھ نہیں پائی۔ اور دوڑتے ہوئے

کمرے سے باہر چلی گئی رامش احمد سر پکڑ کر رہ گیا۔ مگر وہ کیا کرتا اپنی شدت پسندی کا جو وہ ماہی کے لیے رکھتا تھا۔ اسے بے حد برا لگتا جب ماہی اس کے علاوہ کسی اور سے فری ہو کے بات کرتی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اس کے علاوہ ماہی کو کوئی نظر بھرے دکھتا بھی تو۔ سچی بات تو یہ تھی کہ رامش کو ماہی کا فیب کے لیے التفات کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔  
 ماہی روتے ہوئے دوڑ کر باہر لان میں جانے کے لیے دروازہ کھول رہی تھی کہ سامنے ہی کسی کے بھاری وجود سے ٹکرائی۔ اس کے تو چاروں طبق روشن ہو گئے۔

”یا وحشت! محترمہ اندھے نکل کی طرح سے کہاں بھاگے جا رہی ہیں؟“ ماہی نے اس کے کچھ حواس بحال ہونے پر اپنے سامنے دکھا۔ ایک بے حد وجہ بہ شکل و صورت کا دراز ڈال کا اس کے سامنے کھڑا تھا۔  
 ”اندھی میں ہوں یا آپ؟“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔

”ویسے محترمہ! آپ ہیں کون اور یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ مڈر عباس نے بے حد جراتی سے یہاں اس کی موجودگی کے بابت سوال کیا۔ ماہی کے تو سر پر گہری اور ٹکڑوں پہ بھیجی اس کے گھر میں کھڑے ہو کر وہ شخص اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کون ہے۔

”یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے۔ کہ میرے گھر میں یوں اس قدر دھڑلے سے آپ کیوں کھڑے ہیں اور آپ کو اندر کس نے آنے دیا؟“ وہ اب مشکوک انداز میں کھڑی اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا رونا بھول کر۔

رامش احمد نے ٹھنڈی سانس بھری اور اس کے پیچھے آیا وہ جانتا تھا کہ ماہی اس سے بے حد خفا اور بدتمن ہو گئی ہے اور چین تو اسے بھی نہیں آ رہا تھا سو پندرہ منٹ بعد ہی پیچھے اس کی تلاش میں باہر لان میں نکل آیا۔ مگر گینچ میں اسے پھرشتے مسکراتے دیکھا تو پرسکون سا ہو گیا۔

”محترمہ یہ میرے چاچو کا گھر ہے؟“ وہ اس کے

سوال پر بھڑکا۔

”اور میرے یہ شوہر کا گھر ہے؟“ وہ بھی اسی کے انداز میں دو بدبو بولی تھی۔ مڈر عباس اس کے براعتوانداز کو دیکھ کر زور سے ہنس دیا تھا۔ اتنی دیر تک رامش بھی ان کے قریب چلا آیا۔  
 ”ہائے رامش۔“ وہ اس کے گلے لگا تھا۔  
 ”یار تو نے شادی کر لی اور مجھے بتایا تک نہیں؟“

مڈر عباس ماہی کو بے حد کمری نظروں سے دیکھتے رامش احمد سے شکوہ کر رہا تھا۔  
 ”تو رابطے میں رہے تو مجھے کچھ خبر بھی ہو۔ چار ماہ ہو گئے میری شادی کو اور تو سنا آج کل کس ملک کی خاک چھان رہا ہے؟“ وہ اسے لیے اندر بڑھ رہا تھا۔

ماہی کا دل چاہا وہیں سے واپس پلٹ جائے مگر وہ اس گھر کی بڑی ہو گئی اور ایک ہوئی حیثیت سے اسے اس گھر میں ہر آنے والے مہمان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوٹی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھرتی کچن میں آگئی خالنا ماں کھانا تیار کر رہا تھا۔ دو ایک ڈشٹر اضافہ کرنے کے بعد وہ کولڈ ڈرنک کے ساتھ کباب رول سے ٹرائی سجانے لگی۔ رامش کچن میں آیا تو ماہی کو چاچے کی ٹرائی لے جاتے دیکھ کر زیر لب مسکرا دیا۔ اسے اس کا سلیقہ ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی اقدار کو یاد رکھتی تھی۔ ٹرائی لے کر جب وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو وہیں پاپا جانی اور ماما جانی کے ساتھ ساتھ اشعر بھی مڈر عباس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھا تھا۔ ماہی نے آگے بڑھ کے سب کو سرود کرنا شروع کیا۔ مڈر عباس نے بہت غور سے ماہی کو دیکھا تھا۔

بہت معصوم سی کچھ کچھ جذباتی سی وہ اس وقت اسے روٹی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ فیس ریڈر تھا اور اپنے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ خصوصاً ”صنف نازک کے جذبات اور چروں کے ساتھ کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔  
 ”یار مجھے ایک پرائیلم پیش آرہی ہے؟“ ماہی نے جب اسے لوازمات سے بھری پلیٹ تھامی تو اس نے اچانک کہا۔ سب نے بخش سے اسے

دیکھا۔  
 ”رامش کی بیوی کو کیا کہوں۔ رشتے میں تو میری بھابھی لگتی ہے۔ مگر عمر میں مجھ سے کافی چھوٹی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بھابھی کہہ کر ہونق لگوں یا نام لے کر پکاروں؟“ وہ کباب کا ٹکڑا ہاتھ سے توڑ کر کھاتے ہوئے بے بسی سے بولا تھا۔ سب کے چروں پہ مسکراہٹ آگئی۔ ساوائے رامش احمد کے۔  
 ”تم اسے بھابھی ہی کہو۔ اپنے رشتے کو طوطا خاطر رکھتے ہوئے تم تو اس کے جیٹھ ہوئے یا؟“ ماما جانی نے اس کی مشکل حل کر دی تھی۔  
 ”بہت خوش نصیب ہو یا رامش! اچھی بیوی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔“ وہ بخور ماہی کا جائزہ لیتے ہوئے بظاہر حیرت زدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”تم کب خوش نصیب بن رہے ہو بر خور دار؟“ پاپا جانی نے ماہی کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہائے چاچو! اپنے ایسے نصیب کہاں کہاں لوگوں کے مقدر میں دو دو ہوتی ہیں کہاں غم غمیوں کو ایک بھی نہیں مل رہی۔“ وہ بڑی شائستگی سے احمد صاحب پہ چوٹ کر رہا تھا۔ مزہ شکیلہ احمد ہنس پڑیں۔ انہیں احمد صاحب کا یہ جھنجھٹا شروع ہی سے بہت اچھا لگتا تھا۔  
 بے حد ہنس کھ رہا ایک کے عم کو چنگی میں اڑا دینے والا۔ احمد صاحب جھینپ گئے تھے جبکہ رامش اور اشعر محفوظ ہو رہے تھے۔

دوسری صبح سات بجے اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ ”بھابھی! آذر ایک کپ چائے تو بنا دیں۔“ وہ کیلے بالوں کو تولیے سے مرگڑا تو اس کے پاس ڈائمنڈ نیپل پہ ہی بیٹھ گیا تھا ماہی نے ایک نظر دیکھا وہ بنیان اور شلوار میں ملبوس ہے پروا سا بیٹھا تھا۔ ماہی کو اس حلیے نے دیکھ کر حیا آئی مگر پھر بھی خاموش رہی۔

”آپ جانیے میں بھجوا دیتی ہوں۔“  
 ”ارے نہیں۔ کوئی تکلف نہیں میں گھر کا بندہ ہوں میں بیٹھ کے پی لوں گا۔“ ماہی نے اثبات میں سر ہلایا۔



”نچن کاسارا کلام آپ کرتی ہیں بھابی؟“  
 ”سارا تو نہیں البتہ پایا اور رامش کے لیے صبح کا  
 ناشتایا پھر رات کا کھانا وغیرہ بناتی ہوں۔“ مانی نے  
 سادگی سے وضاحت کی اور چائے کب میں ڈالنے لگی۔  
 چائے کا کپ پکڑ کر وہ مڑنے لگی تھی کہ وہ پھر بولا۔  
 ”اس طرح سے تو وہ آپ کے موی ہاتھ خراب  
 ہو جائیں گے بھابی! یہ ہاتھ کوئی کام کرنے کے لیے  
 تموڑی ہیں۔ یہ رامش بھی نا اپنی فطرت سے مجبور  
 ہے میل شاولٹ کیس کا؟“

”ارے رے ایسا نہیں ہے۔ رامش نے مجھے  
 کبھی مجبور نہیں کیا کام کرنے کے لیے میں تو بس خود  
 ہی شوقیہ۔“ مدثر عباس کے چہرے کے ناقابل فہم  
 تاثرات دیکھتے مانی انک سی گئی۔  
 ”تو کیا وہ منع کرتا ہے آپ کو؟“ مانی سوچ میں پڑ  
 گئی۔

”منع تو نہیں البتہ انہیں میرے ہاتھ کا کھانا  
 پسند ہے اس لیے۔“ وہ آٹا گوندھ چلی تھی اب آلیٹ  
 کی پیاز کاٹ رہی تھی۔ مدثر نے اسے سہارت سے کام  
 کرتے ہوئے دیکھا اور بڑی پراسراری مسکراہٹ  
 چہرے سجالی۔

”مجھے اپنے بارے میں بھی پتا نہیں نا بھابی!“ وہ  
 محبت سے بولا۔

”میرے بارے میں آپ کو کیا جانتا ہے؟“ وہ  
 آلیٹ بناتے ہوئے دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

”آپ کی ہائیز وغیرہ۔“ مانی ہنس دی۔  
 ”یہ سارے جو خیلے شادی سے پہلے کے ہوتے ہیں

شادی کے بعد عورت کی پہلی ترجیح اس کا شوہر گھر  
 والے اور اس کا گھر ہوتے ہیں؟“

”شادی کا مطلب یہ تموڑی ہے بھابی کہ عورت  
 خود کو بارے اندر سے۔“ وہ اسے آسرا ہاتھا۔

”کبھی مغرب کی عورت کو دیکھا ہے وہ  
 خود کی ذات کو کبھی فراموش نہیں کرتی خود سے کبھی

غفلت نہیں برتی جبکہ ہماری مشرقی عورتوں کا ایہ  
 ہی یہی ہے کہ وہ شادی کے بعد اپنی ضروریات‘

خواہشات اور ترجیحات کو سب سے پہلے ختم کرتی ہیں  
 اور جب مرد حوصلہ دیتا ہے تو نہ اوھر کر رہتی ہیں نہ اوجھ  
 کی؟ ہمارے مردوں کا بھی تصور اتنا ہی ہے اس میں وہ  
 چاہے جتنا بھی پردہ لکھ جائیں جتنی بھی ترقی کر لیں مگر  
 جہاں بات عورت کی آتی ہے وہیں ان کی حاکمیت  
 شروع ہو جاتی ہے وہ آج بھی عورت کو پیر کی جوتی سے  
 زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔“ وہ چائے کا پڑا سا کھونٹ  
 بھرتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔ مانی پہ سوچ کا ایک نیا  
 در کھلا۔

”ماں مگر ہمارے اسلام میں بھی تو عورت کو مرد  
 کے ماتحت بنایا گیا ہے۔ وہ گھر کی ملکہ کی حیثیت رکھتی  
 ہے جبکہ مرد کا گرا کی سی تہلیل پر رکھتا ہے۔“ مانی نے  
 ہلکا سا دفاع کیا۔

”بھابی! پھر بھی عورت مرد کی محتاج تو ہوئی نا۔ اگر  
 وہ خود کمائے مرد کے شانہ بشانہ کھڑی ہو تو مرد کو  
 اس کی قدر ہوگی۔ اسے پتا ہوگا کہ یہ میری محتاج نہیں  
 بلکہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہے اس کی بھی معاشرے میں  
 اتنی ہی عزت اور اہمیت ہے جتنی وہ خود کی سمجھتا ہے۔  
 آپ نے مغرب کی عورت کو دیکھا وہ کتنی مضبوط ہے  
 کتنی باور فل ہے ہر ہر شعبے میں مرد مقابل۔“

”نثر۔ ہمارے پاکستان کو ہی کیجئے ہماری عورت بھی  
 آج مردوں کے مقابل کھڑی ہے وہ کسی طور بھی مردوں  
 سے کم نہیں ہے۔“ وہ اب روٹی توے پر ڈال کر پلٹتے  
 ہوئے ساتھ ساتھ عورت کا دفاع بھی کر رہی تھی۔

”تم بھی نا بھابی! بہت بھولی ہو۔“ مدثر عباس ایک  
 دم بڑے زور سے ہنس۔ ”سوچو عورت پہ کتنی دہری

دستکاری عائد ہو جاتی ہے پھر مغرب میں مرد اور عورت  
 اپنا اپنا کام خود کرتے ہیں جبکہ یہاں عورت کو مرد کا بھی  
 سارا کام کرنا پڑتا ہے۔ رامش جب آفس سے تھکا آتا  
 ہے تو آپ اس کے آگے پیچھے پھرتی ہوں گی کہ وہ کام

میں مصروف تھک کر گھر آیا ہے جبکہ آپ سارا دن گھر  
 اور چکن میں لگی رہتی ہیں اور اس نے یقیناً آپ سے  
 کبھی نہیں کہا ہوگا کہ تھک گئی ہو تموڑا آرام کر لو یہ  
 فرق ہے بھابی مشرق اور مغرب کی عورت کا۔“ مدثر

کی بات مانی کے دل کو لگی تھی واقعی میں رامش نے  
 اس سے بھی پوچھا تک نہ تھا کہ وہ سارا سارا دن گھر  
 میں کرتی کیا ہے وہ اگر گھر کا کوئی معاملہ اس سے  
 کہیں کرنا بھی چاہتی تو وہ اسے فوراً ”ٹوک کر“ ۳۰ منی  
 رامش کی ”بات کرنے کو کہتا۔ اسے پسند نہیں تھا کہ  
 گھر کی پھولی سے چھوٹی بات بھی وہ ٹیکسل عورتوں کی  
 طرح اس سے شیر کرے۔ مانی نے تھک ہار کر کمری  
 ٹھنڈی سانس لی۔

”یہاں تو آپ کا آواہی بگڑا ہوا ہے مدثر بھائی!  
 اول سے یہی کہانی چل رہی ہے پھر انقلاب آئے تو  
 کیسے؟“

”مگر صرف یہ سوچا جائے کہ پہلا دن کون جلائے گا  
 پھر تو انقلاب آنے سے رہا بھابی! ہم اپنے اپنے حصے  
 کا یا تو جلائیں ہم تو پہل کریں پھر قافلہ بنتے دیر کہاں  
 جیتی ہے۔“ وہ بے حد گہری نظروں سے اس کا جائزہ  
 لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اپنے خیالات کا اظہار کر کے وہ  
 اور اپنے کمرے میں چینج کرنے چلا گیا۔

مانی اور رامش کی بول چال کل سے بند تھی رامش  
 نے وہ ایک مرتبہ اس سے بات کرنے کی کوشش بھی  
 کی مگر وہ جان بوجھ کے نظر انداز کر گئی اور جب اس نے  
 رات کو اسے اپنے پاس بلایا تو جان بوجھ کے سوئی بن  
 گئی۔ پھر رامش احمد نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا وہ  
 جانتا تھا جب مانی ضد میں آتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت  
 اس کی ضد نہیں توڑ سکتی۔ جب تک وہ  
 خورند چاہے اس روز صبح ناشتے کے دوران مانی نے  
 پہلی مرتبہ غور کیا تھا کیا رامش احمد اس کی محبت کو  
 سراپے گا؟ کیا رامش احمد کو اس کا احساس ہے؟ کیا  
 رامش احمد اس کی محنت کو جاچتا ہے؟ مانی کو از حد  
 باؤسی ہوئی

اسی غصے میں آکے مانی نے اسے ڈرائیوے تک  
 بلکے اللہ حافظ بھی نہیں کہا۔ رامش احمد کو حیرت  
 کس ہوئی مگر مانی کو بے حد ہوئی یہ جان کر کہ اگر وہ اس

سے بات نہیں کر رہی اسے اللہ حافظ نہیں کہے گئی تو  
 رامش احمد کو بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس کے  
 نزدیک بھی اس کی اہمیت نہیں تھی اس کا دل بے حد  
 دکھی ہوا کیا یہی تھی رامش احمد کی محبت اس کے لیے  
 بس چند ماہ تک وہ اس سے محبت کر گیا جس کے لیے  
 اس نے چار سال اپنی ماں کی منتیں کی تھیں؟

سارا دن وہ بلاوجہ کڑھتی رہی شام کو رامش احمد  
 آیا تو اس کے ہاتھ میں مانی کے لیے کچرے تھے۔  
 لے جا کر اس نے ڈرننگ ٹیبل پہ رکھ دیے مانی  
 جب شام کی چائے لے کر۔ کمرے میں آئی تو  
 کچرے دیکھ کر ایک بار پھر برامید ہو گئی گویا محبت ابھی  
 بھی باقی تھی۔ ورنہ اس نے تو سارا دن اپنی ٹم کشہ  
 محبت کا سوگ مناتے گزارا تھا۔

رامش احمد ڈرننگ روم سے نکلا اور بغیر کلام کیے  
 کچرے اٹھا کر مانی کے ہاتھ میں پہنانے لگا مانی نے  
 ایک دو مرتبہ ہاتھ چھڑائے مگر رامش احمد کی گرفت  
 مضبوط تھی۔ وہ اس کے کسمسلسلے اور ہاتھ چھڑانے  
 پہ بے اختیار ہنس دیا۔

”بہت خرابے کرتی ہو ہم سے؟“ اس کے ہاتھ  
 تھامے محبت سے بھرپور انداز سے دیکھتے ہوئے اسے  
 چھیڑا۔

”اور آپ دل بہت جلاتے ہیں؟“ مقابل بھی مانی  
 تھی بھلا اوہا رکھتی؟ ہرگز نہیں۔

”تو تم سینے کی عادت ڈالو نا۔“ وہ اور قریب آیا۔  
 ”آپ نے ڈال لی ہے نا۔“ رامش احمد نے اس کی

کلائی کو جھٹک دیا ایک سیکنڈ میں مانی اس کے سینے پہ  
 آگری۔

”آپ سی طاقت ہے تم میں۔ اور باتیں اتنی بڑی  
 بڑی کرتی ہو؟“

”آپ کو بھی دیکھ کے ایسا نہیں لگتا کہ یہ بندہ اتنا  
 سخت ہوگا؟“ وہ بھی نروٹھے پن سے آنکھوں میں آئی

نمی کو جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔



”غلط نہیں ڈانٹا تھا یا! تم سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ میں تم پہ شک نہیں کر سکتا۔ تمہیں دنیا کی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بہت معصوم ہو مای! تمہیں دنیا کے مکروہ چروں پہ چڑھے خوبصورت نقاب اتارنے کا ہنر نہیں آتا تمہاری باطن نگاہ بھی وہی دیکھتی ہے جیسی تم خود ہو خالص اور بے ریا۔ تمہارا ہر ایک کے ساتھ کھل مل جانا ان پر اعتبار کر لینا ایک دن تمہیں کسی بڑے نقصان سے دوچار نہ کر دے اس لیے تمہیں ان سب سے دور رکھنے کی کوشش کرنا ہوں۔“ وہ اسے نرمی سے سمجھاتا بہت محبت سے اس کے بال سلہا رہا تھا۔ مای کو اس کا اپنے بالوں کو یوں سلہانا بے حد اچھا لگتا تھا اسے بے اختیار نیند آنے لگتی تھی۔

”اے سونا نہیں۔“ اسے ہلکا سا جھکا دے کر جگا دیا۔

”رامش۔ ایک بات کہوں۔“ مای بغیر سر اٹھائے اسی انداز میں اس کے سینے پر سر رکھ بولی۔  
”میں نہیں جانتی محبت کیا ہے اور ان ساری باتوں کو کیسے بیان کرتے ہیں مگر میں اٹنا جانتی ہوں کہ میں آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی۔“ وہ بے حد معصومیت اور ناہنجی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اظہار کر رہی تھی۔ رامش احمد کا دم دم سرشار ہو گیا۔ مای کو اپنے سینے میں پیچھے ارد گرد سے بے گانہ محبت کی بارش میں بھیگ رہا تھا کیا اظہار میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ لمحے میں زمان و مکان ہوش و خرد سے بے گانہ کر دے۔

”پلےز مجھ سے کبھی بدگمان مت ہونا ورنہ۔ مای مرجائے گی۔“ وہ اس کے سینے میں سر چھپائے اظہار محبت کرتے ہوئے اپنے آنسوؤں سے محبت کو امر کر رہی تھی کچھ اس خوبصورتی سے کہ محبت بھی ”اپنے ہونے“ پہ فخر محسوس کر رہی تھی۔

”اگر میں کبھی تم پہ غصہ ہوں تو تم روٹھنا مت

مای۔ ورنہ مجھے بھی چین نہیں آئے گا۔“ رامش احمد بھی اسے متنبہ کر رہا تھا۔  
”غصہ ضرور کرتا ہے۔“ مای ایک جھکے سے سیدھی ہوئی تھی تیکھے جوتوں سے دیکھتے ہوئے کہا ہوئی۔

”کیا کروں۔ مجھے تمہارا ”اپنے علاوہ“ کسی اور کو توجہ دینا اچھا نہیں لگتا اس لیے۔“ وہ سادگی سے وضاحت کر رہا تھا۔

”مای! تمہیں پتا ہے میرا دل چاہتا ہے جب ہمارے بچے ہوں تو وہ نوٹرز ہوں۔“ وہ اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں چلاتے آج پہلی بار بچوں کا ذکر کر رہا تھا مای شرم سے سرخ ہو گئی۔ مگر رامش احمد نے غور نہیں کیا اپنی ہی بات میں گم رہا۔

”میں فیصلہ کر چکا ہوں اس کے بعد کا سارا وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزاروں گا ماکہ تم ریسٹ کر سکو۔ وہ سارا دن تمہیں بلکان رکھیں گے۔ تاہم تم آرام سے سو جایا کرنا کیونکہ رات بھر وہ تمہیں بے چین رکھیں گے تمہاری نیند پوری نہ ہوئی تو تم بیمار پڑ جاؤ گی اور مجھے اپنی مای ”بیمار“ بالکل بھی نہیں چاہیے۔“

رامش احمد نے مای کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا جواب آہستہ آہستہ نیند میں گم ہو رہی تھی رامش احمد کی نظریں آنے والے وقت کے خوشحال اور خوش کن خیالات پر جمی تھیں۔ مگر تقدیر مسکرا رہی تھی۔



آج سڑے تھا سو رامش احمد اور پیا جاتی گھر پہنچے۔

حسب معمول ناشتے پہ اچھا خاصا انتظام دیکھ کے مدثر عباس کے منہ میں پانی آگیا۔ مای کی کمر پہنچنے بل جنین نماز کے انداز میں لیٹے دوپٹے کی اوٹ میں سے بھی دیکھا جاسکتا تھا اس کے روپ میں اک عجیب سی روشنی اور نور سا محسوس ہوتا تھا۔ مدثر عباس نے زندگی میں بہت سی عورتوں کو دیکھا تھا مگر ایسی ملاحت

معصومیت ایسی شوقی دیا نہیں اس لیے دیکھنے میں نہیں ملتا تھا۔ اسے وہ مگر رامش احمد کی قسمت پہ رشک آتا۔ رامش احمد کے چہرے پہ چھائی آسودگی سے دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ظاہر کر رہی تھی۔

”مای بھابی! ذرا یہ حلوہ تو پاس کر دیجیے۔ ہم بھی بھر ہیں آپ کی توجہ کے مگر آپ کو تو اپنے میاں سے فرمت ہی نہیں۔ تو یہ تو یہ ایسی بے حیائی۔“ آخری الفاظ اس نے بے حد آہستہ آواز میں کہے تھے

جو صرف مای ہی سن سکی تھی مای سن ہی ہو گئی اس نے خاموشی سے ڈونگا مدثر کے سامنے کر دیا اور واپس مڑ گئی۔

”کمال جا رہی ہو مای! ناشتا تو کرلو۔“ رامش احمد نے اسے بلاتے دیکھا تو نوک دیا۔

”دل نہیں چاہ رہا ابھی آپ لوگ کر لیں میں بعد میں کر لوں گی۔“ اس نے بہانہ بنایا مگر رامش احمد مطمئن نہیں ہو سکا فوراً ”اٹھ کے اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

”کیا ہو مای تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ فکر مندی سے اس کے ماتھے کو چھو رہا تھا۔

”جی۔ آپ ناشتا کر سن ٹھنڈا ہو رہا ہے“ میں ٹھیک ہوں پلےز۔“ اس نے غیر محسوس انداز سے رامش احمد کے ہاتھ ہٹائے جانے کیوں اسے مدثر بھائی کو دیکھ کر حیا آ رہی تھی۔

”ایسے کیسے کر لوں مای۔ جب تک تم نہیں کوئی۔“

مای کو ناچار بیٹھنا پڑا۔ می اور اشعر خاموشی سے بیٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ پیا جاتی اخبار میں گم رہ گیا مدثر تو وہ بڑے غور سے بڑی پراسرار مسکراہٹ چہرے سے سجائے مای کو دیکھ رہا تھا مای اس کے ناقابل فہم تاثرات دیکھ کر سم سم سی گئی۔ ناشتا کیے ابھی ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ مدثر عباس پھر سے کچن میں موجود تھا۔

”وہو آج تو بڑی خاص تیاریاں ہو رہی ہیں۔“ وہ

کاؤنٹر پہ مای اسیاے خوردنوش کو دیکھتے ہوئے ہلکے پھلکے کچے میں کمر رہا تھا۔  
”جی۔ وہ دراصل رامش گھر پہ تھے تو میں نے سوچا ان کی پسند سے کچھ بنالو۔“ مای نے آہستگی سے دوپٹہ پھیلاتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

”جتنی کمر آپ رامش کی کرتی ہیں نا بھابی! اللہ کرے وہ آپ کی قدر بھی کرے۔“ مدثر عباس کا لہجہ لحظ بھر کو یاسیت میں ڈوب گیا مای کا دل عجیب سی لے پہ دھڑکا مدثر عباس یہ کیوں کہہ رہا تھا۔ اس نے آخر ایسا کیا محسوس کیا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں مدثر بھائی! رامش میری بہت قدر کرتے ہیں۔“ وہ چکن کو مسالا لگا کر رکھتے ہوئے بولی تھی وہ آج تندوری چکن بنا رہی تھی۔

”ایک گلاس ملک شیک بنا دیں گی۔“ اس نے فرمائش کی۔

وہ چاہتی تھی کہ دو بجے تک لانچ بالکل ریڈی ہو جائے ماکہ وہ رامش کے ساتھ شام کو لانگ ڈرائیو پہ جاسکے۔ اس نے فریج میں سے آم نکالا اور پھیلنے لگی مدثر عباس وہیں کرسی ٹھیک کے بیٹھ گیا تھا۔ ”آپ دودھ اور برف نکالیں میں یہ کر لیتا ہوں۔“ اچانک اس نے مای کے ہاتھ سے آم لے لیا تھا اس کے ماتھ کی انگلیاں مای کی انگلیوں سے لمحہ بھر کو مس کیا ہوئیں مای کو لگا اس کی انگلیوں نے کسی شعلے کی پیک کو چھو لیا ہو۔ وہ اٹھ کر دودھ اور برف نکال کر جو سر میں ڈالنے لگی جب مای کو احساس ہوا مدثر عباس اس کے بالکل پیچھے اور بے حد نزدیک کھڑا تھا۔

”تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں بھابی! بالکل ریشم جیسے چھوئے بغیر نگاہیں پھسل پھسل جاتی ہیں۔“ مای کو ایک دم ہنس اٹھی تعریف کے اچھی نہیں لگتی اور جو بھی تھا مدثر عباس باتوں کے ہنر سے واقف تھا اسے لوگوں کو خوش رکھنا آتا تھا۔

”کبھی کبھار سوچتا ہوں۔ میں نے بڑی دیر کر دی آپ سے ملنے میں اگر نیچے جا ہوتا تو میں بھی آپ کو رامش کی بیوی نہ بننے دیتا۔“ وہ اب حسرت زدہ لہجے



میں کہہ رہا تھا سہمی کی ہنسی نے شہر دی تھی۔  
 ”بیڈ لک! اب تو میری شادی ہو چکی۔ اب مہر  
 کیجئے؟“ مامی اس کا مذاق سمجھتے ہوئے ہنس کر کہہ رہی  
 تھی۔  
 ”وہی تو کر رہا ہوں۔ مگر وہ نہیں پارا، مجھ سے بار بار  
 اپنی غلطی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ تمہارے جیسی  
 معصوم، خوبصورت اور سمجھدار بیوی قسمت والے کو  
 ملتی ہے میری زندگی تو دنیا میں ہی ”جنت“ ہوتی۔“ وہ  
 اس کے ہاتھ سے ملک شہک کا گلاس لیتے ہوئے  
 آرزو کی کہ رہا تھا۔  
 ”اتنا تو مت بنا کس مدثر بھائی۔“ جو سر کا پلک  
 نکالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔  
 ”بنا کب رہا ہوں پارا! رامش سے پوچھ لو۔ کیا اس  
 نے کبھی نہیں بتایا آپ کو۔“  
 ”جب کبھی میں ان کو اچھی لگوں تعریف کر دیتے  
 ہیں مگر یوں آپ کی طرح تو نہیں۔“  
 ”سی لیے تو کہتا ہوں کہ قدر نہیں اسے آپ کی۔  
 اگر اسے آپ کی قدر ہوتی تو یوں جن میں دل نہ رہی  
 ہوتیں بلکہ وہ کسی نازک آئینے کی طرح سے سنہل  
 کے رکھتا آپ کو۔ مگر محبت کرنے اور اسے قائم رکھنے  
 میں بڑا فرق ہوتا ہے؟“  
 ”وہ اب گلاس ختم کیے منہ صاف کر رہا تھا مامی سے کوئی جواب نہ بن  
 پڑا جانے اس شخص کی آنکھوں میں ایسا کیا تھا وہ جب  
 رامش کے دفاع میں کچھ بولتی اس کی آنکھیں سنسخر  
 اڑاؤں محسوس ہوتیں وہ انک کر چاہنے کے باوجود  
 خاموش ہو جاتی۔  
 رات کو جب مامی اپنے بیڈ روم میں واپس آئی تو  
 رامش احمد عشاء کی نماز ادا کر رہا تھا مامی کو بڑی  
 حیرت ہوئی کم از کم اس نے تو ان چار پانچ مینٹوں میں  
 رامش احمد کو ایک مرتبہ بھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا  
 تھا۔ رامش احمد نے جانے نماز سیٹھی اور برش کرتی  
 مامی۔ پھونک سار دی۔  
 ”کیا ظلم ہے پڑھ کر پھونک رہے ہیں جناب؟“  
 ”جو تم نے جاو کیا تھا مجھ پہ اپنی کالی زلفوں کا۔ بس

اس کا تو ذکر رہا ہوں۔“ مامی کو بے اختیار ہنسی آئی  
 ”تمہارے بال بہت ریشمی ہیں مامی۔ ایسے پر  
 پھسلتی ہوئی آثار۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ بھر کر  
 ان کی ملاقات اور ریشمی احساس کو محسوس کر رہا تھا۔  
 مامی بے اختیار بول بیٹھی۔  
 ”مدثر بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ مامی تمہارے بال  
 بہت ریشمی ہیں انہیں پھسل جاتی ہیں ٹھنڈی ہی  
 نہیں؟“ رامش احمد کا ہاتھ جمل تھا وہ رہ گیا اس  
 مامی کو کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف سیدھا کیا۔  
 ”یہ سب تم سے مدثر کہتا ہے؟ اور تم سن لیتی ہو۔“  
 اس کے لہجے میں بے یقینی عیاں تھی۔  
 ”ہاں تو ایسی کیا بات ہوگی۔ تعریف ہی تو کرنے  
 ہیں؟“ مامی کا انداز سرسری تھا جیسے اس بات کی اس  
 کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی مامی کو سمجھ نہیں  
 آتی تھی۔  
 ”ایک غیر مرد تمہارے خدو خال کو“ شہس“ نظر  
 سے دیکھ کے قہیدہ گوئی کرتا ہے تو تمہارے نزدیک یہ  
 اتنی سی بات ہے مامی؟“ رامش احمد غصے سے چلا اٹھا۔  
 ”ایک شادی شدہ عورت کی تعریف کوئی غیر شادی  
 شدہ مرد جب کرتا ہے تو اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ کیا تم  
 نہیں جانتیں؟“ مامی قسم گئی وہ دم پیچھے ہٹ گئی۔  
 ”آپ خواہ مخواہ بات کو بدھا رہے ہیں رامش! آخر  
 ایسی کون سی قیامت آئی ہے؟“  
 ”قیامت آئی نہیں تو آجائے گی مامی۔ اگر یہی حال  
 تمہارا رہا تو؟“ رامش احمد نے غصے سے اپنی ٹھٹھیاں  
 پیچھے کر غصے کو کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔  
 ”سی لیے منع کرتا ہوں تمہیں کہ غیر محرم مردوں  
 کے اتنے قریب مت ہو جایا کرو کہ اپنا مقام بھولے  
 لگو۔“ وہ ترختے ہوئے بولا تھا مامی سلگ سی گئی۔  
 ”آپ تو دیے کئی میرے پرکٹ دینا چاہتے  
 ہیں رامش؟ صرف اپنا محتاج رکھنا چاہتے ہیں۔ میری  
 اپنی بھی کوئی پر ساتھی ہے کوئی ترجیحات ہیں یہ تو نہیں  
 کہ جیسا آپ چاہیں دیا کریں۔ آپ سب کچھ کریں  
 آپ کا وہ حق اور اگر کوئی میری تعریف کرے تو وہی چیز

لیے بری ثابت کیسے ہو جاتی ہے۔ یہ ہے آپ  
 کی بل ازم“ شیخ کہتے ہیں مدثر بھائی آپ ہیں ہی میل  
 ڈانٹ (مردانہ حاکمیت رکھنے والا) دہری شخصیت  
 کے ملک“ آپ کے نزدیک صرف اپنی ذات کی اہمیت  
 ہے مدثر سراجاں بھائی۔ آپ چاہتے ہی نہیں کہ  
 مجھے اپنی ذات سے ”آگاہی“ ملے؟“ وہ کبھی جواباً غصے  
 میں روتے ہوئے چلائی تھی۔  
 ”پھر جا کے بازار میں بیٹھ جاؤ!“ رامش احمد کو اول  
 دہشتہ آتا نہیں تھا اور اگر آتا تھا تو بے حد وحال آتا  
 تھا بغیر سوچے سمجھے وہ کچھ بھی بول جایا کرتا تھا جس کا  
 اسے احساس تک نہیں ہوتا تھا مگر جسے کہا جا رہا ہوتا  
 اسے تو بخوبی احساس ہوتا تھا۔  
 ”جاؤ جا کر بناؤ اپنی شناخت۔ سمیٹو حسن کی داد  
 تحسین۔ اور دھو دھو اپنی ذات سے آگاہی۔ مگر جس دن  
 ”عزت“ حاصل کر پاؤ اس دن میرے منہ پہ ایک  
 لہجہ ضرور آکے مارا؟ ہمیں نے تمہیں عزت دی تم  
 سے شادی کی کچھ دہائیوں میں نہیں الجھایا، تمہاری  
 آواز کو تار مار نہیں کیا۔ کیا میں نے برا کیا؟ میں یہی  
 کر سکتا تھا جو میں نے کیا اگر تمہیں یہ سب نہیں  
 چاہیے تو میرے گھر کے دروازے ابھی کھلے ہیں تم اپنی  
 شناخت بنانے جا سکتی ہو۔ مگر رامش احمد اتنا بے غیرت  
 پر کر نہیں کہ اپنی بیوی کو دوسروں کی نظروں کی حدت و  
 گرائش کے لیے سجائے سنوارے رکھے؟“ مامی کم  
 سم رامش احمد کا ایک ایک لفظ اپنے دل میں کسی خنجر کی  
 طرح سے اتار رہی تھی، کتنی معمولی سی بات کا اس نے  
 اتنا برا ”ایڈو“ بنا دیا تھا۔ وہ چپکے سے مڑی اور ڈرنگ  
 روم میں جا کر اپنی بکننگ کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد  
 وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ رامش احمد کھڑکی کی  
 طرف منہ کیے کھڑا رہا تھا۔ وہ چپکے سے لاؤنج میں آئی تو  
 لاؤنج میں بی بی وی دیکھتے سب لوگوں کی حالت غیر ہو گئی۔  
 ایسی لڑنے پڑنے انداز میں روتے ہوئے کھرچھوڑ کر جاری  
 کی سب سے پہلے ماما جانی کو ہوش آیا تھا۔  
 ”لگ لگ کیا بات ہے مامی!“ وہ لپک کر اس کے  
 قریب آئی تھیں۔

”کچھ نہیں ماما! رامش نے مجھے ”گھر“ سے نکال  
 دیا ہے۔“ وہ روتے ہوئے ان کے گلے لگی کھڑی تھی۔  
 ”گھر کون۔“ احمد آپ اس سے بات کریں آخر ایسا  
 کیا ہو گیا ان دونوں کے بیچ کہ فوت یہاں تک پہنچ  
 گئی۔“  
 ”مامی بیٹا تم یہاں بیٹھو تو۔ ایسے کیسے جانے دوں  
 میں تمہیں؟“ وہ اسے پیار سے چمکارتے ہوئے کہہ  
 رہی تھیں۔  
 ”نہیں ماما! میں اب اس گھر میں ایک بل کے لیے  
 بھی نہیں رہ سکتی۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔“ وہ اپنے آنسو  
 پونچھے ہوئے کہہ رہی تھی۔  
 ”یہ تمہارا گھر ہے مامی اور ”اپنا گھر“ کبھی نہیں  
 چھوڑتے بیٹا۔“ احمد صاحب نے اسے سمجھایا۔  
 ”گھر شہر ہے ہوتا ہے پاپا اور جب وہی نہ ”اپنا“  
 رہے تو پھر خالی مکان میں رہنے کا کیا فائدہ۔“ وہ اپنے  
 آنسو بے دردی سے پونچھ رہی تھی۔  
 ”نہیں جانے دیجئے چچا! اگر رامش کو اپنی  
 اطاعت گزار بیوی کا احساس ہی نہیں تو یہ یہاں کیوں  
 اپنی قدر کھوئیں۔ بہتر ہے کہ یہ یہاں سے چلی  
 جائیں۔“ مدثر عباس وی مسکرا ہٹ سجائے بظاہر کہہ  
 رہا تھا مگر در پردہ سوچ رہا تھا یہی تھا مامی کا یقین اور  
 محبت۔  
 ”اسے جانے دیجئے پاپا! بنالینے میں معاشرے میں  
 اپنی الگ سے پہچان؟“ رامش احمد جو اشعر کے بلانے  
 پہ کھڑا تھا وہیں کھڑا کہہ رہا تھا۔  
 ”مگر رامش۔“ آخر ہوا کیا ہے؟“  
 ”کچھ نہیں ہوا پاپا۔ بس اسے اب میں ”اچھا“  
 نہیں لگتا؟“ مامی اس ”الزام“ پر تڑپ سی گئی تھی۔ مگر  
 بولی کچھ نہیں فوراً ”اپنا سوٹ ٹیس اٹھا کر باہر نکل گئی  
 تھی ماما اور پاپا جانی نے فوراً اس کے پیچھے اشعر کو بھیجا  
 تھا کہ وہ بخیر وعافیت اسے فیصل آباد پہنچائے۔  
 ☆ ☆ ☆  
 پچھو اور غیب اسے رات کے ڈھائی بجے یوں



روٹی روٹی آنکھیں انہیں عجیب سی داستان ساری تھیں۔ مایا ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ نسیب، اشعر کو دانستہ کمرے میں آرام کرنے کو چھوڑ گیا تھا تاکہ وہ رات سکون سے بسر کر سکے اور صبح واپس جا سکے۔

”پچھو! رامش نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے؟ وہ مجھے بہ شک کرتے ہیں مجھے نسیب سے بات کرنے کو منع کرتے ہیں۔ اشعر اور مدثر بھائی کے پاس بیٹھنے پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔ پچھو! رامش ویسے نہیں ہیں جیسا میں نے انہیں سمجھا تھا؟“ وہ بے دردی سے روتے ہوئے — کہہ رہی تھی۔ پچھو عجیب مجھے کا شکار تھیں وہ بچپن سے رامش احمد کو جانتی تھیں۔ وہ تو ایسا تھا ہی نہیں اور پھر مایا کا بچپن اور جوانی اس کے سامنے تھی وہ مایا کو نہیں جانتا تھا یا اس کی فطرت سے باخبر تھا۔ پچھو نے اسے یار کر کے لسی دی تھی اور کمرے میں نیند کی گولی کھلا کر سلا دیا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ صبح رامش احمد سے بات ضرور کریں گی۔

مگر رامش احمد رات بھر سو نہیں سکا کبھی اسے اپنی باتیں یاد آتیں تو وہ نئے سرے سے خود پر غصہ ہونے لگتا۔ وہ جانتا تھا ساری فساد کی جڑ مدثر عباس تھا۔ اس کی فطرت تھی وہ کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتا تھا اور اچھی بھلی عورت کو ٹیک پر سے اتار کر مزے لینا اس کی بڑی پرانی عادت تھی۔ لندن میں ایک ساتھ رہتے رامش احمد نے بار بار دیکھا تھا۔ وہ اکثر اپنی اسٹریٹ کی لڑکیوں کی اپنے ہوائے فریٹنز اور شادی شدہ عورتوں کی اپنے شوہروں سے جھگڑے کروایا کرتا تھا۔ کبھی نوبت طلاق تک پہنچ جاتی تو کبھی وہ ایک دوسرے کو مرنے مارتے پہ مل جاتے اور مدثر عباس اپنی خیانت کو چھپاتے ہوئے بظاہر ان کے دکھ بانٹ رہا ہوتا۔ عورت اس کے لیے ایک ایسے کھلونے کی طرح سے تھی جس کے ساتھ کھینے اور اسے توڑنے میں اسے ہمیشہ مزا آتا تھا وہ اس کام سے کبھی بوری نہیں ہوا تھا اسے عورت کو

دانا، پچھو، اشعر، مایا اس کی دل پیادوں کو انما مایا کی کمرے کو اس کے یقین کو۔ اس کے اطمینان کو چاہے اس کے لیے اسے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرنی پڑے۔ رامش احمد کو لگتا تھا یہ اس کی جوانی کی شرارت محض تفریح لیے ہوئے ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کچھ شرارتیں فطرت — بن جایا کرتی ہیں اور عادت سے چھوڑی جاسکتی ہے مگر فطرت کو بدلا نہیں جاسکتا اور آج مدثر عباس کی اس شرارت نے اس کا گھر اجاڑ دیا تھا اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود وہ اسی لیے مایا کو توڑتا تھا وہ معصوم اور سیدھی سادی تھی نہیں جانتی تھی کہ مخالف کس قماش کا انسان ہے وہ جیسی خود بھی دوسروں کو بھی ویسا ہی سمجھ لیتی تھی مدثر عباس جیسا گھاک مڑو کر گھٹ کی طرح سے رنگ تبدیل کر سکتا ہے کو اپنے جال میں پھنسا تاکہ وہ اپنے وجود کی دیواروں سے ٹکریں مار مار کر بے حال ہو جائے مگر جال میں سے نکل نہ پائے۔ رامش احمد نے سوچا تک نہیں تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے یہ خیال چھو کے نہیں گزرا تھا کہ ”مدثر عباس“ اس کے ساتھ ایسا کرے گا اسے تو مایا یہ اعتبار تھا ہی محبت پہ یقین کامل تھا اسے اپنی غصے والی عادت پہ غصہ آیا وہ کیوں آئے سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ کیوں مایا پہ اپنی محبت پہ چلا رہا تھا وہ کیوں نہیں مایا کو نرمی سے سمجھا کا۔ وہ اسے اعتماد کو لاسکے بھی تو ساری صورت حال سمجھا سکتا تھا۔ ایسا بھی کیا کہہ دیا تھا مدثر عباس نے صرف تعریف ہی تو کی تھی اور یہ تو اس کی ابتدائی سیشن ہوتے تھے ابھی تو ابتدائی مرحلہ تھا وہ صورت حال کو پینڈل کر سکتا تھا مگر وہ اپنی غصے کی عادت اور قدامت پسندی کے آگے ہار گیا تھا۔

ڈاکٹر نے مایا کو سکون اور انجکشن دے کر نفیہ خاتون کو خوش خبری سنائی تھی۔ نفیہ خاتون وہیں لاؤنج میں ہی کم سی بیٹھی تھیں وہ ان کے قریب چلا آیا۔ ”کمال ہے ماما! خوشی کی اتنی بڑی خبر سن کر بھی آپ

خوش بیٹھی ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے تاہو بے ماری ہیں آپ۔“ مایا کے دکھی چہرے کو دیکھتے ہوئے رات سے بولا تھا۔

”نسیب میرا دل نہیں مانتا کہ اپنا رامش ایسا نکلے گا۔ میری ساری حالت کو دیکھتے ہوئے اس کی باتیں جھٹلانے کی ہیں۔ دل نہیں چاہ رہا۔“ نفیہ خاتون اس وقت مدثر عباس کی دیکھ رہی تھیں کہ مایا انہیں عزیز بھی تو ہے حد تک

”نسیب! فکر نہ کریں ماما! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ مایا ہی غصے کے تیز اور بے حد جذباتی ہیں۔ ایک دوسرے کو کہہ دیا ہو گا کچھ غلط سلط۔ مایا کو کھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا اس طرح بات کبھی آگے نہ جاتی۔

”نسیب! کوئی عورت اپنا گھر خود نہیں چھوڑتی جب تک اسے مجبور نہ کیا جائے۔ یقیناً“ مایا کو اس حد تک مجبور کیا گیا ہو گا کہ وہ گھر چھوڑنے کو بھی راضی ہو گئی۔ ”نفیہ خاتون مایا کا دفاع کرتے ہوئے بولی تھیں۔ جانتی تھیں مایا چاہے جتنی بھی کم عقل اور جھالی سہی مگر اپنے ہاتھوں اپنا گھر نہیں اجاڑ سکتی تھی۔“ مایا! میری بات رامش سے کروا دو پلیز۔“ وہ ایک دم بے چین سی ہوا تھیں۔

”مگر مایا کو نہ بتانا۔“ ”نسیب جی اچھا کہہ کے نبر دے لگا۔

ادھر ماما جانی اور مایا جانی رامش احمد سے سخت ناراض تھے ان کے نزدیک رامش احمد نے انہیں اپنا تسلیم نہ کرتے ہوئے دو کوڑی کا کر دیا تھا۔ پاپا جانی رامش احمد پہ خوب برے تھے

ماما تو بے حد دکھی تھیں کہ رامش احمد سے کلام ہی نہیں کر رہی تھیں انہیں بھی پاپا جانی کی طرح سے یہ ہی گلہ تھا کہ ان دونوں کی اگر جس میں لڑائی تھی بھی تو بجائے آپس میں جھگڑا کرنے کے ان دونوں کو انہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہی سہی کسر مدثر عباس پوری کر رہا تھا۔ آخر ایک دن رامش احمد

باتیں کی بیٹیل ہے اس نے اچھا دیا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے مدثر! کسی کو دیکھ کر خوش کیوں نہیں رہ سکتے۔ خود تو تیار و تیار دہو رہی تھیں وہ دوسروں سے کیوں انتقام لینے پہ مل جاتے ہو؟“ ماما اور پاپا جانی نے رامش احمد کو قور! نوکا تھا کہ مدثر عباس سے اس انداز اور لب و لہجے میں بالکل بھی بات نہ کرے مگر وہ تو پھرا ہوا شیر تھا۔

”مجھے کہہ لینے دیجیے ماما! اس کی وجہ سے صرف اور صرف اس کی گندی زبان اور فطرت نے میری مایا کو مجھ سے جدا کیا ہے۔“ اور پھر رامش احمد ساری بات بتاتا چلا گیا تھا۔

مدثر عباس کو کہ اپنی باتوں کی وضاحت کرنا چاہتا تھا مگر رامش احمد نے اسے کچھ بولنے نہیں دیا تھا۔ کچھ نفیہ خاتون کے فون نے اسے مایا کی طبیعت کے بارے میں بتا کر بے چین سا کر دیا تھا۔ مایا جانی اپنی کرسی سے اٹھ کر مدثر عباس کے عین سامنے آکھڑے ہوئے تھے ان کا انداز بے حد سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ مدثر عباس ان کے سامنے نگاہیں جھکائے کھڑا تھا۔ پاپا جانی نے بھرپور پھپھراس کے منہ پہ مارا تھا۔

”اگر یہ پھپھر آج سے پانچ سال پہلے“ تمہارا باب“ تمہارے منہ پہ مار دیتا تو آج تم یوں نگاہیں جھکائے شرمندہ نہ کھڑے ہوتے۔ اس پھپھر کو اپنی زندگی کا آخری پھپھر بنا دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی عادتوں کی وجہ سے اپنی عزت و توقیر گونا گونیو۔“ اور اس کے بعد مدثر عباس وہاں رکنا نہیں پھرے نہ جانے کس دیس کی خاک چھانے نکل پڑا تھا۔

\*\*\*

نفیہ خاتون کی گود میں مایا سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ آج چوتھا روز تھا اسے آئے ہوئے۔

”کیا ہوا تھا مایا؟“ اور مایا سسک سسک کر روتے ہوئے ساری باتیں بتا گئی۔ نفیہ خاتون نے مایا کی تمام باتیں غور سے سنی تھیں۔

”ایک بات کہوں مایا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں



# Art with you

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan

a Complete Set of

5 Painting Books

in English



Water Colour I & II

Oil Colour

Pastel Colour

Pencil Colour

آپ آرٹ کے طالب علم ہیں یا پروفیشنل آرٹسٹ  
برس کرنے سے مکمل پینٹنگ تک آپ بن سکتے  
ہیں ایک مکمل آرٹسٹ

آپ پینٹنگ سیکھا بہت آسان ایک ایسی کتاب  
جس میں پینٹنگ سے متعلق ساری معلومات

Art with you

شائع ہو گئی ہے

قیمت - 350/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمر ان ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

میں نے کیا ہے اس میں تمہاری غلطیاں تھیں  
ری ہوں۔ میں کچھ غلط نہیں سمجھ رہی۔“ اس نے  
ہاتھ اٹھا کے ہائی کو ٹوک دیا تھا۔  
”بڈا جیسا سانچا ہے وہ تو سرے سے عورت  
ذات کو کچھ سمجھتا ہی نہیں اس کے نزدیک عورت کو  
عقل ہے جو محبت اور یقین کا دعوا تو کرتی ہے مگر  
آزمائے جانے پہ ثابت قدم نہیں رہ پاتی اور تم نے  
مائی! اس کے اس خیال کی اپنے اس عمل سے  
”تصدیق“ کر دی۔ عورت ذات کے جذبات اور زندگی  
سے کھینکا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے مائی۔ وہ عورت  
ذات کے دفاع میں نہیں بولتا وہ اس کے حقوق کے  
لیے نہیں لڑتا بلکہ اسے اکساتا ہے ان کاموں پہ جو  
انہیں برائی کے گڑھے میں لے جا کر پھینکتے ہیں جو اس  
کے قدم زمین سے اکھاڑ کر ہوا میں معلق کر دیتے ہیں  
جو عورت کو چار دیواری اور گھر کے سکھ سے نکال کے  
سڑک پر بازوؤں کی زینت بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ تم  
ایسا بننا چاہتی ہو مائی۔ صرف دو یا تین ملاقاتوں میں تم  
نے اس شخص کی باتوں کا اتنا اثر لے لیا اور راضی احمد  
کی اتنے سال کی ”محبت“ کی تمہیں سمجھ ہی نہیں  
اسکی۔ تم نے اپنا گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا مائی۔“  
”میں نے گھر نہیں چھوڑا تھا پھپھو۔ بلکہ راضی  
نے مجھے گھر سے نکالا تھا۔“ مائی تڑپ کے سیدھی  
ہوئی تھی۔

”بھول ہو گئی ماما جانی! میں خود حیران اور شرمندہ  
ہوں آپ سب سے مائی سے مائی کے سامنے جانے  
کی تو بہت بھی نہیں میرے اندر۔“ راضی احمد سر  
جھکائے ماما جانی کے گھٹنوں کے پاس انسرہ سے بیٹھے  
کہہ رہے تھے۔  
”اے لے او راضی۔ وہ تمہارے بچے کی ماں  
بننے والی ہے گمراہ ڈر ہے کہ کہیں تم اس کے بچے پر  
بھی ٹھک نہ کرو؟“ بہت دھیسے سے ماما جانی نے راضی  
احمد کے سر پہ ہموڑا تھا۔  
”میرا بچہ آپ نے مجھے یہ سب پہلے کیوں نہیں  
تلا۔ تم میں باپ بننے والا ہوں۔“ وہ خوشی سے

راضی احمد کا دفاع کر رہی ہوں۔“ وہ اس کے بالوں  
میں انگلیاں چلا رہی تھیں۔  
”مگر شرعی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نے کچھ  
غلط نہیں کیا ایک شادی شدہ عورت کے لیے ایک غیر  
محرم سے فری ہونا، ہنسی مذاق کرنا بالکل بھی جائز نہیں  
قرار دیا گیا اس لیے کہ عورت بھٹک نہ جائے وہ  
لا شعوری طور پہ اپنے شوہر اور دوسرے مرد کا موازنہ  
کرنے لگتی ہے۔ ہم عورتوں کو لگتا ہے شادی کے بعد  
ہم اپنے ہر فعل میں آزاد ہو جاتی ہیں مگر اصل  
دستواری تو شروع ہی شادی کے بعد ہوتی ہے۔ بننا۔ والدین  
تو بچوں پہ آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے ہیں جبکہ ازدواجی  
زندگی میں اپنے ہر قول و فعل سے اپنے شوہر کو لکھ بہ  
لکھ یقین دہانی کروانی پڑتی ہے۔ جیسی مرد بھی عورت کی  
قدر کرتا ہے۔“ وہ اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے مائی  
کے آسرو پوچھ رہی تھیں۔  
”پھپھو! میں راضی سے بے حد محبت کرتی ہوں۔  
ان سے بے وفائی کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں  
سکتی۔ پھر بھی راضی نے مجھ پر شک کیا مجھے باتیں  
سنائیں الزامات لگائے اور تو اور مجھے گالی بھی دی۔“  
”وہ شوہر ہے تمہارا۔ اس شخص میں تم پہ ہاتھ بھی  
اٹھا تا تو حق بجانب ٹھہرتا۔“  
”مگر پھپھو! میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ روتے روتے  
چلائی تھی۔  
”غلطی تمہاری نہیں تھی مائی! قصور تو اس  
بد خصلت انسان کا ہے جو جگہ جگہ شرمپیلانے کو پہنچ  
جاتا ہے۔ تم خود سوچو جن باتوں کی طرف تمہارا دھیان  
نبی کبھی نہیں گیا تھا اس نے وہ سب تم سے راضی  
کے سامنے کھلایا۔ اس نے تمہیں اپنی ذات سے  
آگاہی شعور کی بے داری پہ لیکچر دیا۔ اپنی الگ  
شناخت اور پہچان بنانے کی ترغیب دی اور تم سچ میں  
اپنی جنت کو ٹھوکر مار کے آ گئیں۔“  
”پھپھو! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“ مائی نے اپنا  
دفاع کرنا چاہا۔  
”نہیں مائی! تمہاری باتوں سے جو تجربہ حالات کا

میں نے کیا کروں پھپھو! میں نے بہت بڑی غلطی  
کر دی۔ میں نے راضی کو ناراض کر دیا ہے۔“ وہ  
سکستے ہوئے نفیسہ خاتون کے ہاتھ تھامے کہہ رہی  
تھی۔  
”سب ٹھیک ہو جائے گا مائی۔ اللہ بہتر کرے گا۔“  
وہ اسے تسلی دے رہی تھیں جبکہ ان کی نگاہیں دور  
فضاؤں میں کچھ کھون رہی تھیں۔

\*\*\*

”میں نے جتنی نفرت اس کے وجود سے اے بن  
دیکھے اور جانے کی اب اتنی ہی محبت اسے دیکھنے جانے



# یہی ہے زندگی



چور لہجے میں بدلا۔  
 ”مائی نے منع کیا تھا مجھے وہ سخت ناراض ہے تم سے۔ اور بدگمان بھی۔ اسے ڈر ہے کہ تم اس کا بچہ۔“

”مما پلیر۔ ایسا تو مت کہیں۔ میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں۔ اپنے وجود کے جسے کو اسنے ہاتھوں کیسے کاٹ کے پھینک سکتا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے بھلا۔“ رامش احمد تڑپ اٹھا۔

”تو پھر اسے لے آؤ رامش! تمہارے بغیر مائی مر جائے گی۔“ وہ سسک اٹھی تھیں اور ٹھیک ساڑھے تین گھنٹے بعد رامش احمد مائی کے دروازے پر بیٹھا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے وہ لان میں شام کے انچل میں سیٹی ساری اداسیاں اپنی جھولی میں ڈالے بیٹھی تھیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی مگر وہ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری یک تنگ بس اپنی غلطیوں پہ شرمندہ روئے جاری تھیں۔ رامش احمد اس کے قریب چلا آیا۔ مائی اسے دیکھتے ہی رو پڑی تھیں۔ رامش احمد

آنسو تھے دونوں ہی رو رہے تھے اور دونوں ہی کی آنکھوں میں ندامت اور شرمندگی کے آنسو تھے دونوں ہی اپنی اپنی محبت سے شرمندہ تھے۔

”اسے اے مائی! تم مجھے چھوڑ کے کیوں چلی آئیں گی؟“

”آپ نے گھر سے نکال دیا تھا؟“ وہ بھی روتے روتے شکوہ کر رہی تھیں۔

”میں نے تو تم سے کہا تھا کہ اگر کبھی میں تم سے غصہ ہو جاؤں تو رو غصا مت۔“ وہ اسے اپنی پہلے کی کمی بات یاد دلانا تھا۔

”اور میں نے بھی تو کہا تھا کہ کبھی مجھے یہ شک نہ کرنا ورنہ مائی مرجائے گی۔ اور آپ نے مائی کو مار دیا ہے رامش۔“ وہ ہچک ہچک کے رو دی۔ رامش احمد نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے جو کہ بے حد ٹھنڈے اور بے جان لگ رہے تھے۔

”میں نے اپنی مائی پہ شک نہیں کیا تھا۔ بس غصے میں کچھ غلط کر گیا حالات کا تقاضا ہی یہی تھا کہ اس

وقت تمہارا وہاں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔“  
 ”تو یوں بے عزت کر کے نکالنا ٹھیک تھا؟“ اس کی وضاحت یہ خائف ہوئی۔  
 ”آپ نے مجھے ’’گورنر عورت‘‘ کہا؟“ مائی نے اسے خود کو دی جانے والی گلی یاد دلانی۔ سب سے زیادہ کو ہی اس بات کا تھا کہ رامش احمد نے اسے گلی دی تھی کہ ”میں اس بات کی تم سے صدق دل سے معافی مانگو ہوں مائی! میں نے اسلام کا اب بغور مطالعہ کیا ہے تو جانتا ہے کہ غصہ حرام کیوں قرار دیا ہے میرے سونے رب نے۔ اسی لیے کہ غصے میں انسان اپنی سادہ بدہ کھو رہتا ہے اور جانے کیا کیا بول جاتا ہے۔ تم تو بہت پاکیزہ ہو بہت معصوم ہو۔ ان چھوٹی ہو۔ اُلی ایم سوری؟“ وہ اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”غلطی تو میری بھی تھی نارامش! آپ سے محبت دعا اتنا کمزور نکلا کہ پہلے مرحلے پہ ہی بدگمان ہو گئی۔ میں تو اپنی محبت سے بھی شرمندہ ہوں۔ پھر آپ سے کیسے نظرس ملایاؤں گی؟“

”دونوں اس غلطی سے سیکھ جاتے ہیں مائی! اور آج کے بعد ایک دوسرے پہ اعتبار کریں گے۔ اپنی محبت کو سرخرو کریں گے تاکہ شرمندہ وہ نہیں؟ میں نے عمرے کی درخواست دی ہے ہم دونوں اللہ کے گھر جا کے اپنی اپنی غلطیوں کی معافی مانگیں گے اور دوبارہ سبھی بدگمان نہ ہونے کا وعدہ کریں گے اور دعا کریں گے کہ ہماری اولاد ہمارے لیے باعث رحمت اور خوشی ہو۔ آؤ گھر چلیں مائی۔ تمہارا گھر تمہارا رامش تمہارے بغیر ادھورا اور نامکمل ہے اور رامش احمد کو ادھورا رہنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔“ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

مائی نے ایک لمحے کو اس کی نظروں میں دیکھا جہاں محبت مسکرا رہی تھی۔ اس نے فوراً سے پشیمان ہو کر محبوب کے ہاتھ کو تھام لیا کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔ اسے اپنی محبت کو کامل اور سرخرو کرنا تھا تاکہ پھر کوئی ”مڈر عباس“ ان کی زندگی ان کی خوشیوں کو ”نقشب“ نہ لگا سکے۔



متوجہ ہوں!

مخیر حضرات سے اپیل ہے کہ میں ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی ہوں۔ گھر میں چھوٹے پانچ بہن بھائیوں اور بوڑھی ماں کے علاوہ نہ کوئی فرد ہے اور نہ ہی ذریعہ معاش۔ ان پر نہ ہونے کی وجہ سے روزگار کی امید بھی مشکل ہے۔ ایسے میں میرا تیسو سالہ بھائی بلڈ کینسر کا شکار ہو کر دن رات زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مخیر اور صاحب ثروت افراد سے دردمندانہ التجا ہے کہ اس کے علاج کے لیے ہماری مالی امداد کر کے اپنی آخرت سنواریے۔

اکاؤنٹ نمبر: فون نمبر۔

نوٹ: ڈاکٹر نے اپنی اپنی علاج کی شروعات کے لیے پانچ لاکھ روپوں کا فوری مطالبہ کیا ہے۔  
وسیم نے با آواز بلند اشتہار پڑھ کر سننے کے بعد اخبار پر بے پھینکا اور نادر کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگا۔ زید اور خاقان کے قہقہے بھی ان سے کچھ کم بلند نہ تھے۔

”واہ یا رتو نے بھی کیا پانڈا اشتہار دیا ہے، قسم سے میں تو جیسے پڑھ کر روئے ہی والا تھا۔“ وسیم نے گود میں رکھے تکیے کو دیوار کے ساتھ رکھ کر ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”اب تو دیکھیں جناب کیسی بارش ہوتی ہے اس اکاؤنٹ میں روپوں کی۔“ زید نے پتپی کا خالی ٹن مروڑ کر ڈسٹ بن کی طرف اچھالا۔

”دیکھ یار مزے کی بات تو یہ ہے کہ خاقان نے یہ اشتہار ایک لڑکی کی طرف سے دیا ہے تو کوئی پتا نہیں روپوں کے ساتھ ساتھ کچھ آفرز اور طرح کی بھی آنے لگیں۔“ زید نے دائیں آنکھ مارتے ہوئے کہا تو وہ سب اوروں سے کہتے ہوئے ایک بار پھر ہنسنے لگے۔

”ہائے اللہ! ایسے تو نہ کہو میں ایک تنہا بے سہارا لڑکی۔ اتنی ہمدردی کا مقابلہ کیسے کر پاؤں گی۔“ خاقان جو کہ نسوانی آواز بنانے میں مہارت رکھتا تھا۔ نیچلے ہونٹ و انتوں تلے دیبے میزے اتر کر کمرے کے عین وسط میں کھڑے ہوتے ہوئے بڑے اسٹائل میں

بولتا تو زید کو بھی شرارت سوچتی۔

”نہ پیسہ پیسہ کر کیا کر پاؤں نہ تو ذریا کر کی پروا ہے پیسے کی پیسے کی لگاؤں بڑھیری میں بارش کر دوں پیسے کی جو تو ہو جائے میری ایک بھر پور سٹی کے ساتھ زید نے موبائل میں لگا لگایا تو خاقان کسی ٹرک ڈرائیور کی طرح دائیں بائیں ڈولنے لگا۔ چہرے پر شرانے کے تاثرات ہونے کی آواز کے ساتھ یوں ابھرے کہ لگا ملکہ شرارت کی طرح بھی شرارتے ہوئے کسی شدید اذیت یا تکلیف کا شکار ہے۔ اس کی اپنی ”قابل آواؤں“ نے زید و وسیم اور نادر کو بھی اکساتے ہوئے کمرے کے عین وسط میں اس کے قریب ہی لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں ”اعضاء کی شاعری“ میں سب ہی اپنی اپنی ”آواز نظمیں“ پیش کرنے لگے۔ ”مردانہ بھرے“ کے اس ماحول میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے زید نوٹ بچھاؤ کرنے کا لایٹ کرنا ہرگز نہیں بھولا تھا۔

\*\*\*

بواز باہل ہمیشہ سے کہ ارض پر موجود وہ خطہ رہا ہے جہاں شاید کافرستان (چترال) کی طرح کوئی قانون لاکو نہیں ہوتا۔ یہاں بسنے والے ہمیشہ دل کے قاعدوں اور موڈ کے قانون کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں دن رات عیاشی کرنے کے لیے والدین اور ادارے کی اجازت سے داخل ہوا جاتا ہے اور پھر پھر نکلنے کا کسی کا دل نہیں چاہتا۔ بلاشبہ یہاں کے باسیوں کی غروب آفتاب اور رات طلوع آفتاب سے شروع ہوتی ہے۔ مختلف قسم کی الیکٹرونیز میں مصروف ہمارے مستقبل کے معمار بھی بکھار آؤنگ یا تفریح کی نیت سے یونیورسٹی اور کالج کالج بھی کرتے ہیں جہاں ہمیشہ ہی انہیں نیا طالب علم سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کے نئے طالب علموں میں زید، وسیم، خاقان اور نادر کا شمار بھی ہوتا تھا۔ جو مختلف جگہوں سے حصول علم کے لیے لاہور آئے تھے۔ چاروں ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور کاشت کاری اور

معت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے گزر اوقات بہتر انداز میں ہو رہی تھی فطرتاً چلیے اور شوخ ہونے کی وجہ سے ان چاروں کو ایک دوسرے کے قریب نہ میں بالکل بھی وقت نہیں لگا تھا۔ مزاج اور بیک گراؤنڈ کی اسی ہم آہنگی کے پیش نظر ہاشل میں بھی ہاشل ایک ہی کمرے میں ہوتی تو پورے ہاشل میں ان کا گروپ مشہور ہو گیا۔

چاروں کو ماہانہ اخراجات کی مدد میں والدین سے منی آرڈر وصول ہوتا جس سے وہ اپنی فیس اور دوسرے خرچے بھی نبھاتا کرتے ہاں یہ الگ بات تھی کہ اگر عیاشیوں کے لیے کبھی مزید رقم درکار ہوتی تو وہ بلا جھجک مخیر حضرات کا دروازہ کھٹکھٹا دیتے اخبارات میں دیے گئے اشتہار کا متن ہمیشہ الگ مگر مقصد ایک ہی ہوتا۔ اس دفعہ بھی والدین کی طرف سے اضافی رقم نہ بھیجنے کے اعلان کے بعد ایک بار پھر وہ اخبار کے دفتر بھاگے تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ مخیر حضرات کو یقیناً ”اور بھی کئی کام ہوتے ہیں اس لیے امداد کی ایمر جنسی اپیل کر کے کہ ان کے ہاتھ پاؤں نہیں پھلانا چاہتے تھے۔ جسی ابتدا میں صرف پانچ لاکھ روپوں کی امداد کی گئی تھی اور یہ اپیل اب وقتاً فوقتاً اخبار میں نظر آتی تھی۔

\*\*\*

”اوئے بل گیش! کسی وقت کسپیوٹر کی جان چھوڑ بھی دیا کر یار، مجھے تو لگتا ہے یہ کسپیوٹر نہیں تیری نئی ٹیبلٹ دیکھن ہے۔ جب دیکھو اسی کے پاس اسی کے ساتھ۔“

وسیم نے کھانے کی ٹرے دیوار کے ساتھ رکھے نیل پر رکھی تھی۔

”تو یار تو بھی تو مارشل لاک کی طرح اچانک ہی آجاتا ہے اب مجھے کیا پتا کہ تو میس کی لائن میں لگا ہوا تھا۔“ خاقان نے فٹ سے اسکرین پر minimizes کی

یا اور نیٹ سے کھانے کے سامنے آ پہنچا اس کی طرف سے وقوع پذیر ہونے والے اسی فائنٹ عمل نے گری کے باعث سینے سے شرابور وسیم کو جلا ڈالا

تھا۔ ”مجھے تو قسم سے سیاست دان ہونا چاہیے تھا جب کام کا وقت آتا ہے تو کٹری کی طرح کونے کھدروں میں جا گھستا ہے لیکن ہاں کچھ کھانا ہو تو ہاتھ رگڑتا سب سے پہلے کھاتا ہو گا۔“

”او جگر کیوں گرمی کھاتا ہے یار۔۔۔ یاد رکھا کر ہم پاکستان میں ہیں جہاں ایک کتا نا اور دس کھاتے ہیں۔ تو غیلوں ہاشل کے اس کابک نما کمرے کو یورپین قانون کے تحت چلا کر ہرنے سے کام کروانا چاہتا ہے۔“

خاقان نے ہنستے ہوئے ایئر کو لڑا کر کے اس کا رخ و سیم کی طرف کیا جو مکمل طور پر روکھی ہوئی محبوبہ کی نفیر بنا بیٹھا تھا۔

”چل نا بس اب ٹھنڈا ہو جا غصہ نہ کر۔۔۔ ویسے یہ نادر اور زید کہاں ہیں ابھی تک؟“

”ان دونوں کا دل گھبرا رہا تھا اس لیے ذرا سیر و تفریح کرنے کا رخ گئے ہیں، امید ہے راتین آنچلوں کی ہمار سے طبیعت میں خاصا افادہ ہو گا۔“

وسیم پر ایئر کو لڑی ٹھنڈی ہوانے خاصا مثبت ڈالا تھا ابھی خوشگوار موڈ میں جواب دے کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا یوں بھی یہ ایئر کو لڑی بھی خاقان کے اشتہاروں ہی کی بدولت خرید گیا تھا۔

”وسیم یار مجھے پتا ہے آج بوندا باندی ہو رہی تھی۔“

”ہائیں بوندا باندی؟ باہر چڑیا گھرے سب اپنے گھونسلوں میں منہ دیے بیٹھے ہیں اور تو کہہ رہا ہے آج بوندا باندی ہو رہی تھی۔“ خاقان کی بات پر اس کا حیران ہونا فطری تھا۔

”سچ کہہ رہا ہوں یار کہ آج کینٹین کی دیگوں میں بوندا باندی ہوئی تھی جسے اڑن طشتریوں کے ساتھ ہمارے حوالے کیا گیا ہے۔“

خاقان بھی اپنے نام کا ایک تھا چہرے پر ”خیراتی اواروں کے ایڈورٹائزمنٹ“ نما تاثرات بنائے یوں بات کی کہ وسیم نے پہلے تو پلیٹ میں موجود ماش کی وال اور عجب الحقت ساز کی روٹی کو دیکھا اور پھر بے اختیار



ہنس دیا۔

”ارے تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں تو خود دیکھ لے“ ان کنبھوں کو تو اللہ پوچھے گا ماش کی وال۔ اور اس کے بھی دانے لگتا ہے مردم شماری کے بعد ہر پلٹ میں ڈالے گئے ہیں۔“

منہ بسورتے ہوئے اس نے پلیٹ پر بے کھڑکادی تھی چہرے پر یکایک ”سارے چہ“ بجتے دکھائی دیئے تو وسیم نے اس کی بھوک مر جانے پر پر سرہ دینا ضروری سمجھا۔

”بس یار ہم تم کیا کر سکتے ہیں بے بس ہیں کہ میں انچارج کو یہی منظور تھا خود میں بھی تیرے غم میں برابر کا شریک ہوں۔“

”ایک لبا ہیں تو وہ لگی بندھی رقم کے علاوہ ایک روپیہ نہیں دیتے کہ کہیں ان کا لاڈلا بکڑ نہ جائے اور یہ میں والے۔“ بھوک یقیناً اس وقت زوروں پر تھی جبھی غصہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”میں انچارج کا بس چلے تو چال چل بھی شور بے والے پکا میں۔“

”تو کچھ تو سہی یار۔ نمک مرچ بہت کرار ہے۔“

وسیم سے اس کا خالی پیٹ رہتا ہوا دشت نہیں ہو رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ خاقان کوئی کرار اس کا جواب دیتا ناور اور زید کسی بات پر ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے لیکن خاقان کے بڑے ہوئے تاثرات دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”کیوں بھئی یہ تیرے منہ پر کیوں لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے؟“

زید کا مخاطب یقینی طور پر خاقان تھا جس کی پیشانی پر شکنوں کا ہاؤس فل جاری تھا۔

”میرے منہ کو چھوڑ تو یا ایک تو الجبرے“ جیسا تیرا منہ ہے اور ہے ”مریٹ“ بھی کھلے چھوڑتا ہے کتنی دفعہ سمجھایا ہے یا روکھنے والوں پر ہی ترس کھالیا کر۔“

خاقان جو کہ پہلے ہی چوٹ کھائے بیٹھا تھا زید اور ناور کا ہنسا سے مزید پتایا گیا۔

”ہااا۔ تو بھائی تو ہی اس ”بند جیو میڑی“ کا مسئلہ

فیضا غورث بتا دے۔“ اپنے چہرے کے مونے نقوش کی الجبرے سے مماثلت پر زید مل کھول کر ہنسا تھا۔

”کوئی نئی بات نہیں ہے یار۔ یہ بے چارہ تو ہمیں ”میں ستانی“ کا شکار ہے۔“ وسیم کے وجہ بتائے پر زید اور ناور نے ایک دوسرے کو معنی خیز ہوں کے ساتھ دیکھا تھا۔

”بائے وا دے تم دونوں کہاں سے آرہے ہو۔“ خاقان اب تک کھانے کا خیال دل سے نکل چکا تھا اور آرام سے ٹانگیں پیارے بیٹھا تھا۔

”ہم۔۔۔ تم تو آج چائیز کھا کے آرہے ہیں۔“ ناور نے ذرا اتر کر جواب دیا۔

”چائیز۔۔۔؟“ اوائے اللہ کے ہندو ایک تو پہلے ہی چائنا والے اپنی آبادی کم ہونے پر رو رہے ہیں اور تم مزید ”چائیز“ لکھا کے آگئے ہو؟“

”جناب اخروٹ، ہم چائیز فوڈ کھا کے آئے ہیں اور لگتا ہے یہی بات سن کر تیرا ذہن تو ازن۔۔۔“

”ہائیں چائیز فوڈ؟“ او کچھ ہوش کرو یا رو تمہیں نہیں پتا وہ بھی نہیں کھائی چاہیے۔ خصوصاً ہم پاکستانیوں کو۔“

خاقان نے اس کی بات درمیان سے ہی اچک کر جواب دے ڈالا تھا۔ جبکہ وسیم اور زید مسکراتے ہوئے دونوں کی جملہ بازی کا مزالے رہے تھے۔

”لیکن کیوں۔۔۔ چائیز فوڈ کیوں نہیں کھائی چاہیے؟“ وہ زچ ہوئے تو تھا۔

”کیونکہ چائیز فوڈ کھانے سے آنکھیں ”چھوٹی“ اور پتلی ہونے کا خت خطرہ ہوتا ہے اور اگر ہم پاکستانیوں کی آنکھیں ایسی ہو گئیں تو ہائے او رہا گھوڑیں گے کیسے؟“

خاقان کی بھرپور تاثرات سے کی گئی اس بات پر مشترکہ فلک شگاف قہقہہ کمرے میں گونجا تھا۔

”چل پھر وسیم یہ تو ہی سارا کھالے ورنہ ہم تو تم دونوں کے لیے پارسل کروالائے تھے۔“ ناور نے شام وسیم کی طرف بڑھایا جس کی طرف پہلے ان دونوں کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

”او میرے نوشہروں کو نوشیرواں اللہ تجھے بیشہ دے گا کھانا کھانے کی توفیق دے۔“

”لیکن یار اگر تیری آنکھیں چائیز فوڈ کھانے سے زید نے کچھ یاد دلانا چاہا۔“

”تو یہ فکر چھوڑ۔۔۔ پتل کیا، اگر آنکھوں کی جگہ کرے ڈیش بھی لگا دے گا تو اسی چائیز کی قسم کھاتے ہوئے سیاہی پھیل جائے گی۔“

اپنی بات پر سب کے ساتھ ہنستے ہوئے اب اس کی جان میں جان آگئی تھی۔ چند لمحوں پہلے چہرے پر بین کرنی بھوک کی جگہ لذت کی شہنائیوں نے سنبھالی تو وہ جس کو کہہ رہی بیٹھ گیا۔

ماش کی وال اس وقت یقینی طور پر چائیز فوڈ سے سوکھ کا سا جلایا محسوس کر رہی ہوگی جس کے آنے سے محی اور پائی الگ الگ ہو کر اس کے عیب مزید نمایاں کر رہے تھے۔

جب سے مختلف اخبارات میں خاقان کا دوا گیا اشتہار چھپا تھا وہ سب تقریباً ”روزانہ ہی کالج آرہے تھے جبکہ سے وہی اشتہار کاٹ کر نوٹس بورڈ پر بھی لگا دیا گیا تھا نا صرف یہ بلکہ وہ چاروں ہر ایک سے بات کرتے ہوئے مختلف انداز میں گھما پھرا کر موضوع کو اشتہار کی طرف موڑ دیتے اور پھر سب کے سامنے اس ٹوکی سے ہمدردی جاتے ہوئے مدد کرنے کے مختلف طریقوں پر غور کرتے نظر آتے۔

مزے کی بات تو یہ تھی کہ خاقان ایسے کتنے ہی کلاس فیلوز سے فون پر لڑکی بن کر بات کر چکا تھا اور اسی تجربے سے گزرتے ہوئے اسے بہت سوں کی ”ذہنیت“ اور ”اصلیت“ معلوم ہوئی تھی لیکن ان سب

شخصیوں میں وہ یقیناً ”یہ بھولے بیٹھا تھا کہ وہ تین جوان بہنوں کا اکلوتا بھائی اور بوڑھے والدین کی امیدوں کا واحد مرکز ہے۔ ایک سل ہوئے کو آیا تھا مگر اس نے بھی اپنے باپ سے معاشی امور پر سوائے اپنے اخراجات کے کوئی بات نہیں کی تھی۔ زمینیں کیا اگا

رہی ہیں؟ کیا کاشت کیا جا رہا ہے؟ بہنوں کی شادی کب اور کیسے ہوگی؟ اپنی لالہ بلی طبیعت کے باعث بہ سب باتیں کبھی بھی اس کی توجہ اپنی جانب نہیں کھینچ پائی تھیں۔

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے کس کی ماں نے کتنا زیور بیجا تھا

”ویسے یار خاقان تو بے بڑا تیز۔“ زید کمپیوٹر آن کیے بیٹھا تھا اور خاقان کے فون بند کرنے کے انتظار میں تھا جبھی اس کے فون بند کرتے ہی بغیر وقت ضائع کیے بول اٹھا۔

”تیز؟ کیوں تو نے مجھ سے سبزی کاٹی ہے؟“ اس کا مزاج دھنک رنگ سا تھا بہت کم بخنبدہ ہوتا۔

”نہیں میں نے تو نہیں البتہ یہ تری ”شازہ“ نے ضرور سبزی کاٹی ہے۔“ زید کے ”میری شازہ“ کہنے پر وہ ایک دم چونکا ضرور مگر پھر سنبھل گیا۔

”نا صرف سبزی بلکہ اس نے تو میرا خیال بے کتوں کے کان بھی کالے ہوں گے اور اب سو فیصد لوگوں کی جھپیں کالے گی۔“

زید بڑی دلچسپی سے کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے تبصرہ کر رہا تھا۔

”چل کان اور جیس تو ٹھیک ہیں، ناک تو نہیں کٹوائی نا۔“ فون کو چار جنگ پر لگا کر وہ بھی اب اس کے ساتھ ہی آ بیٹھا تھا جہاں زید اپنے فیس بک اکاؤنٹ میں شازہ کی وال پر موجود رش دیکھ رہا تھا۔

”ویسے ناک تو تو کٹوائے گا۔ اس کی بھی اور اس کے اماں بواؤں کی بھی، اگر اس کے کسی لگتے سکتے نہ دیکھ لی تو۔۔۔“

”ارے جب میرا کی تصویریں انٹرنیٹ پر دنیا بھر نے دیکھیں اور اس کی ناک نہیں لٹی تو پھر اس کی بھی خیر ہے۔“ شازہ کی طرف سے دیے گئے اپنے کمشنس کو وہ بڑے مزے سے پڑھ رہا تھا۔

ج اوج دی چھتاں اچیاں سن



کچ کھتا آون دا جوک دی سی  
کچ ہسائی دے بھائی دی ظالم سن  
کچ سائوں تائون دا شوق دی سی  
”یار اتنی اچھی شاعری کو تو لکھ بھر میں ایسے بدل  
ڈالتا ہے کہ سنجیدہ شاعری کرنے والا شاعر اپنی شاعری کا  
یہ حال دیکھ کر کہنے بہانہ رہ سکے۔“

”بس God Gifted ہے یار کبھی غور نہیں کیا  
اس ہنر پر۔“ خاقان نے اتراتے ہوئے کندھے سے  
فرضی گرو بھاڑی تھی۔

”ویسے یہ تصویر ہے بڑی پناخ، مگر اور پینٹل لگتی  
ہے۔ کہاں سے اڑائی؟“

”اپنے گاؤں کی بے دوست، پچھلی دفعہ گاؤں گیا تھا  
تب موبائل سے بنائی تھی یہ تو اپنے گھر میں سبزی کٹ  
رہی تھی اور اسے تو اب تک پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ  
میں نے اس کی تصویر کبھی بنائی بھی تھی۔“

خاقان نے پیڑھے پر بیٹھی شانہ کو ایک بار پھر دیکھا  
جو اپنے سامنے زمین پر سبزی کا ڈونگار گھے ہوئے تھی  
مگر کسی کے پکارنے پر چونک کر دیکھا اور بس وہ ایک  
لحہ اپنے گھر کی کھڑکی میں موجود خاقان کے موبائل میں  
قید ہو گیا۔

صبح سے گئی چٹیا میں سے شام کے وقت بال نکل  
کر صرائی دار گردن سے لٹنے پر اتر اٹھ کاٹھار تھے تو  
کاہل سیاہ آنکھوں کی چمکی زمین مس کرنے پر مغرور  
!۔۔۔۔۔

”تصویر تو چل تو نے بنائی مگر فیس بک پر یہ جعلی  
اکاؤنٹ بناتے ہوئے اسی کی تصویر لگا دی اور وہ بھی  
درست معلومات کے ساتھ، کچھ زیادتی نہیں ہے یہ۔“  
زید کو شانہ سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

”ارے چھوڑنا، تو یہ دیکھ کہ اشتہار میں دی گئی  
معلومات سے یہ تصویر کتنا بیچ کر رہی ہے اور دیکھنا  
اکاؤنٹ میں جتنے روپے آئیں گے نا سب میری  
ٹیلیفونک بات چیت اور اس تصویر کے سبب ہی آئیں  
گے۔“

”کھانا آگیا بھی آجاؤ اور دشمن کی فوج سمجھ کر اس

پر ٹوٹ پڑو۔“ وسیم اور تادر ٹرے اٹھائے اندر داخل  
ہوئے تو وہ دونوں حقیقتاً ”بلیک کتے ہوئے لکھ بھر میں  
مجاز پر آن موجود ہوئے۔“  
”یار تادر کھانا لائے ہو تو ساتھ ہی لائف جیکٹس  
بھی پکڑ لاتے۔“ کھانے پر نظر پڑتے ہی خاقان کے منہ  
سے نکلا۔

”آخر بوٹی ڈھونڈنے کے لیے شور بے میں ڈوب کر  
مرنا تھوڑی ہے۔“

”نہ یار نہ۔۔۔ ڈوبنے کی ضرورت نہیں ہے، دیکھ  
میں ہیلی کاپٹر سے پکڑ لایا ہوں تو یہ لے لے۔“ وسیم  
نے اسے اپنی پیٹ سے بوٹی نکال کر دی تھی۔

یوں بھی خاقان کی قسمت اچھی تھی کہ گھر بھر میں  
اس کے لاڈ اٹھائے جاتے اور یہاں وہ تینوں بھی اس کا  
بے حد خیال رکھتے کہ وہ تینوں ہی اس کے مقابل  
کہیں زیادہ ذمہ دار تھے۔



”اوئے ہیو، یہ کس کا تولیہ اٹھا لایا ہے؟“ خاقان  
نہانے کے بعد ابھی کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ زید  
کی پولیس چوکی پر کناڑا۔

”یار ایک تولیہ ہے، کوئی لڑکی تو نہیں اٹھا لایا جو تو یوں  
تفتیش کر رہا ہے۔“ بیڈ کی طرف اچھالے گئے کیلے  
تولیے کو زید نے کرسی کی پشت پر پھیلا دیا تھا۔

”تیجھ سے کیا بعد یار، لڑکی جھی اٹھا لائے۔ لیکن  
یہ تو بتا کہ کسی اور کا تولیہ کیوں لے آیا؟“

”اوئے بابو صاحب میرا کسی نے اڑا لیا اور میں نے  
کسی کا اٹھا لیا۔ بس! اور ویسے بھی ہاسٹل میں تو یہ چھوٹی  
مولی چوریاں جانتی ہوتی ہیں یار۔“

”جی نہیں تو اپنا نفی اپنے پاس رکھ، چوری چوری  
ہوتی ہے وہ چلے جھاڑو کا ایک تنکا ہی ہو۔“ زید کی  
بات درست تھی، کچھ ہی ڈٹ گیا۔

”او تو یہ فکر چھوڑ دے بھائی، اب تیرے دست کا  
اسٹینڈرڈ اتنا بھی گرا ہوا نہیں ہی کہ مندر لعل کے جھاڑ  
کے تنکے چراؤں، میں نے کوئی خلال تھوڑا ہی کرنا ہے



اس سے۔ اور ویسے بھی یہ شرارت ہے چوری نہیں  
”کم از کم ہاسٹل کے قانون کے مطابق۔“  
”ہاسٹل نہیں جنگل کا قانون کہو۔“

”ہاں یار ویسے یہ بوائے ہاسٹل بھی کسی جنگل سے کم  
نہیں ہے۔ رہنمائی تو کیا زندگی تک کا نام و نشان نظر  
نہیں آتا۔ دور دور تک جہاں دیکھو ”گنے کے کھیت“  
کھڑے بیٹھے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ نہ گندم  
کی پائیاں نہ بھولوں کی ڈالیاں، چڑیوں سی پچھاہٹ نہ  
ہو سی نہاٹ بلکہ جگ پوچھو تو یہ ”سب جیل“ ہے ہم  
سب کی جہاں ظالم و ذلیل جیسا وارڈن ہم جیسے  
مزارعے نما اسٹوڈنٹس کے بیچ و لٹن بنا گھومتا رہتا  
ہے۔“

زید اپنے کپڑے پر یس کرنے کے ساتھ ساتھ اس  
کی دکھ بھری داستان بھی سن رہا تھا۔  
”یقین کر ان ہی باتوں کی وجہ سے مجھے تو ”جوڑوں کا  
درد“ رہنے لگا ہے۔“ خاقان نے رفو م کے ان گنت  
اسپرے کرتے ہوئے کہا تو زید چونک گیا۔  
”ہائیں۔۔۔ جوڑوں کا درد۔۔۔؟ مگر کب سے۔۔۔“

”بس یار کیا باتوں جب بھی پیار محبت میں مگن ہوتے  
مسکراتے جوڑوں کو دیکھتا ہوں دل میں عجیب سا درد  
ہوتا ہے تو یہ ظاہر ہے ”جوڑوں کا درد“ ہی کہلائے گا  
کہ نہیں؟“

چہرے پر نیر سلطانہ سے اثرات سجائے بات کا آغاز  
کرنے والے خاقان نے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی  
دائیں آنکھ بند کی تھی اور اس کی شرارت پر زید نے  
پاس رکھے کاٹن کے سفید کرتے کا کولہ بناتے ہوئے  
اس پر ڈون حملہ کیا۔  
”تو کب بڑا ہو گیا اس۔“ زید نے مسکراتے ہوئے  
دریافت کیا۔

”جب تو ہاتھ میں لامٹی پکڑے جبک کر چلے گا  
تب۔۔۔“  
”مگر نہ کر وہاں تیک نوٹ نہیں آئے گی۔“ زید  
نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

”نکواس بند کر گیا الٹی سید مہا نکار تاتا ہے۔“  
ہر وقت مستی مذاق کرنے والا خاقان لمحہ بھر میں  
سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”تو اور کیا چھوٹے قد کا یہی تو فائدہ ہے کہ بڑھاپے  
میں بھی لامٹی کی ضرورت نہیں پڑتی۔“  
زید نے ہنستے ہوئے جوابی آنکھ ماری تھی اور اس  
سے پہلے کہ اس پر بھی ڈرون حملہ ہوتا خاقان کے  
شانزدہ والے موبائل پر تیل ہوئی اور وہ اسے گھورتا ہوا  
نسوانی آواز میں بیلو کہہ کر فون کی طرف متوجہ ہوا  
لیکن چند ہی سیکنڈ بعد جیسے خون خشک ہوتا محسوس  
ہوا۔ جیسے تیسے چند منہ بابت کرنے کے بعد اس نے  
فورا ”سانے“ رکھی۔ پانی کی بوتل کو منہ لگا لیا۔ چند  
گھونٹ پیے تو لگا جیسے وہ دوبارہ دنیا میں آ گیا ہو۔

”کیوں یار خیر تو ہے؟“ زید استری شدہ کپڑے  
الماری میں رکھ کر لوٹا تو اسے دیکھ کر حیران ہوا۔  
”جھے پتا ہے کس کا فون تھا؟“

”دک لیکس“ سمجھا ہے کیا۔؟ بھی تو بتائے گا  
نہیں تو پتا کیسے چلے گا؟“

”یار ابا فون تھا شانزدہ کے نمبر۔“ خاقان نے لفظ  
”ابا“ پر زور دیتے ہوئے کہا تو زید کو کرٹ سا جھم میں  
دوڑتا محسوس ہوا۔

”انکل کا؟ بار دیکھنے میں تو بڑے شریف النفس  
انسان لگتے ہیں لیکن اس عمر میں بھی اتنے رنگین  
۔۔۔“

”اوئے بھینس کی دم عقل کی بات کہ۔۔۔ تجھے پتا  
بھی ہے فون کیا کیوں تھا؟“

”لٹنے کا ٹائم مانگ رہے تھے؟“ چہرے پر شرارت  
حیرت کے لبادے میں موجود تھی۔

”نہیں تیرے مرنے کا ٹائم مانگ رہے تھے۔“ زید  
نے حقیقتاً اسے زچ کر چھوڑا تھا۔

”ہاں تو فیس ضرور۔۔۔ تارنا۔۔۔ دیے کیا آج کل  
انہوں نے بندے مارنے کی سپاری لینا شروع کی ہے۔“

”سپاری تو نہیں البتہ تیرے جیسوں کو مارنے کی

زمہ داری ضرور ہے رکھی ہے تاکہ دوسرے ”ڈینکھی“  
سے محفوظ رہیں ہونہ، ”خس کم جہاں پاک۔“  
”اچھا تو انکل حکمہ صحت میں بھری ہو گئے ہیں  
وہی ان کی دل بہ دن بہترین ہوتی صحت دیکھ کر تجھے  
پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔“

خاقان سمجھ گیا تھا کہ زید کی اہل اسے ستانے کے  
مہو میں ہے جمی آئینے کی طرف منہ کیے اب جیل  
سے بالوں کو سیٹ کرتے ہوئے اچھی ہوسوں کی طرح  
دوسروں کی سننے اور خود خاموش رہنے کی پالیسی اپنا چکا  
تھا۔ لیکن ظاہر ہے زید کے لیے یہ بات محض ہونے  
والی نہ تھی۔ جمی ہنستا ہوا شیشے کی طرف پشت کیے اس  
کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”اوئے کشمیری سب میں تو مذاق کر رہا تھا بتانا انکل  
نے اس نمبر پر فون کیوں کیا تھا؟“ خاقان نے پہلے تو  
اسے پولیس آفیسر زوالی نظروں سے جاچ کر اس کے  
سنجیدہ ہونے کی یقین دہانی کی پھر بولا۔

”یار ابا نے شانزدہ والے اکاؤنٹ میں چالیس ہزار  
روپے پڑا سفر کیے ہیں۔ کہہ رہے تھے میں خود بھی  
بٹیوں کا باپ ہوں اور تمہارے حالات پڑھ کر بہت  
رنجیدہ ہوں۔ روپوں کے ساتھ وہ کچھ کپڑے بھی لائے  
تھے جو وہ چاہتے تھے کہ اس کی والدہ کو دے آئیں تاکہ  
کچھ کام آسکیں۔“

”پھر؟“ زید منہ کھولے حیرت سے ساری بات سن  
رہا تھا۔

”پھر کیا میں نے کہہ دیا کہ ہم تو بھائی کو لے کر اسلام  
آباد آئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر کے پاس روپوں کی مرہانی  
البتہ کپڑے یا تو آپ واپس لے جائیں یا آئیڈمی سنٹر  
دے دیں تاکہ کسی اور کے کام آجائیں تو پتا ہے کہنے  
لگے کہ بی بی تم فکر نہ کرو مجھ سے جتنا ہوسکا ہر ماہ بینک  
کے ذریعے تمہاری انداد کو تار ہوں گا۔“

”اوہاں گاؤ کسی لیے تو دنیا کو گول کہا جاتا ہے۔“  
”بات تو ٹھیک ہے لیکن دیکھ اتنے روپے ابا نے  
آج تک مجھے نہیں دیے۔“

”ہاں تو یار یہ رقم بھی وہ شانزدہ کو کب دے رہے ہیں

اللہ تعالیٰ کو دے رہے ہیں قرضے کی مدد یا یوں سمجھ  
کہ انہوں نے sky bank میں اللہ تعالیٰ کے پاس  
غیر معینہ مدت کے لیے ڈپازٹ کروادی ہے جو بعد میں  
انہیں کئی گنا منافع کے ساتھ لوٹائی جائے گی۔“

”لیکن یہ سب تو تب ہو گا نا جب ان کی دی گئی رقم  
حقیقی معنوں میں کسی کے علاج یا یاد ادا میں خرچ ہو۔“  
زید کی بات نے خاقان کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔  
”انکل کی نیت تو سچی ہے اور انہوں نے رقم دے  
دی اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا ثواب تو اسی وقت سے  
ملے شہد ہے کہ نیک عمل کا ثواب نیت کرنے سے ہی  
ملنے لگتا ہے البتہ برے کام کا گناہ اس کے کرنے کے  
بعد سے شروع ہوتا ہے۔ تو بس اب یہ تو رقم وصول  
کرنے والوں کی گردن پر بوجھ ہے تاکہ وہ کس چیز کے  
حق دار ٹھہرتے ہیں۔“

بات کرتے ہوئے شاید زید کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ  
سوچنے والے ذہن کے لیے یہ کتنی گہری بات تھی۔  
البتہ جیسے ہی بات ختم ہوئی تو خاقان اور زید دونوں نے  
ہی اپنے اندر کچھ پچھل سی ہوتی محسوس کی۔

بعض اوقات ڈھونڈنے کے دوران سامنے رکھی چیز  
نظر نہیں آتی اسی طرح یہ باتیں بھی جانتے تو وہ بھی تھے  
لیکن دھیان کو گیان کی منزل نہیں مل پاتی تھی۔ زندگی  
کی افراقی ظاہری آسائشوں، وقتی تفریح اور رزق  
حاصل کرنے کی دھن میں وہ یقینی طور پر رازق کے  
بنائے گئے اصول و ضوابط کو نظر انداز کر بیٹھے تھے۔

خدا کو بھول گئے لوگ فکر روزی میں  
خیال رزق ہے رازق کا کچھ خیال نہیں  
دوسری ہی صبح ابا ان کے سامنے بیٹھے تھے۔  
مہمانوں کو چونکہ کمروں تک آنے کی اجازت نہیں دی  
گئی تھی۔ اسی لیے تمام لوگ کینٹین کے نزدیک ہی  
بنے دو بیٹرزوم میں بیٹھا کرتے جہاں آج زید و سیم اور  
ناور خاقان کے والد صاحب کے ہمراہ اس وقت ملکی  
صورت حال پر گفتگو کر رہے تھے۔ آنے سے قبل  
چونکہ وہ خاقان کو بتا چکے تھے کہ وہ اسے اپنے ساتھ  
لے جانا چاہتے ہیں تاکہ دو سال بعد ہونے والی بہن کی



شادی کے سلسلے میں ان کی مدد کر سکے۔ جیسی طے یہ پایا تھا کہ "شہزادی رزم" کو ٹھکانا لگانے کے بارے میں واپسی پر فیصلہ کیا جائے گا۔ لیا کی طرف سے بھی کو مدعو کر دیا گیا تھا البتہ تاریخ طے ہو جانے کے بعد دوبارہ فون کرنے کا کہہ کر خاقان نے بھی انہیں گھر آنے کی پر خلوص دعوت دی تھی۔



"نانفس۔ یہ تیری "لوکی" کو کیا ہوا ہے؟ جب سے آیا ہوں ایک بار بھی ہنسنے نہیں دیکھا۔ لہجہ بن کی طرح منہ بند کیے گھوم رہی ہے۔"

خاقان نے شیو کرنے کے بعد تو لے سے منہ صاف کرتے ہوئے چھوٹی بہن سے شانزہ کے بارے میں پوچھا تھا جس کے لیے قد کی وجہ سے وہ اکثر ہی اسے لوکی کہتا ہر وقت ہنستی مسکراتی شانزہ اس مرتبہ اسے بے حد ادا لگ رہی تھی اور یہی بات خاقان کو بے چین کیے دے رہی تھی۔ خلاف معمول اس دفعہ اسے شہر سے آنے کے بعد سے اب تک نہ تو وہ اسے ملنے آئی تھی اور نہ اس کے لیے کچھ بکا کر لائی۔

دونوں گھر ایک دوسرے کے بالکل آئے سانسے تھے مگر دل دونوں گھرانوں کے ایک ساتھ دھڑکا کرتے۔ گو کہ گاؤں کے ماحول میں یوں بھی اپنائیت ہوا کرتی ہے لیکن یہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے لیے جان تک بچاؤ کرنے والے لوگ تھے۔

"کچھ نہ پوچھ بھائی" اس کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ "نازو بھگت بھری کے بھائی لگا کر جانے کے بعد اب ڈسٹنگ کر رہی تھی۔

"کیوں" کیا برا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ اس کی تو شادی ہونے والی تھی نا۔ "خاقان اس کے ساتھ کچھ بھی برا ہونے کے خیال سے دل سا گیا تھا۔ لمحہ بھر میں لولہ لگا جیسے مینے بھر کی محنت کے بعد ہاتھ آنے والی آمدن کی جیب کترے کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ نظرس سبز اور سرخ شیشے کی ٹکڑیوں سے مزین روشندانوں سے ملحقہ کھڑکی سے ہوئی ہوئی شانزہ پر جی ہوئی

تھیں جو اتنی گرمی میں بھی محن کے پتوں بچ گئے ہیں کے پیر کے نیچے چارپائی بچھائے سفید چادر پر چار سوئی ٹانگا کاڑھ رہی تھی، لیکن خاقان کو لگا جیسے یہ چادر محض دوسروں کی نظروں سے بچنے اور خود کو مصروف دکھانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

اور اسی خیال کی تائید شانزہ کی انگلی میں جیسے والی سوئی نے بھولی کر دی جس کی آڑ میں اب وہ آنسوؤں کی صورت بہن کو اچھلتے خالالت کو بھانا چاہ رہی تھی۔

"بتا بھی نا۔ تیرا ریڈیو کیوں بند ہو گیا ہے؟ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟"

نازو اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی تھی اور دوبارہ اس کے استفسار پر چونک کر دیکھنے لگی کیونکہ گھر گاؤں یا رشتہ داروں کی اس قسم کی بات چیت سے وہ ہمیشہ جان چھڑاتا تھا اور آج وہ خود شانزہ کے بارے میں کرید رہا تھا۔ اسی بات نے نازو کو حیران کیا تھا۔

"بھائی یہ تو تمہیں پتا ہے نا کہ شانزہ کی اماں تو پہلے ہی اس رشتے کے حق میں نہیں تھیں وہ تو اس کی پھوپھی نے بس ضد میں آکر اس کے اماں کو بھی اپنی باتوں میں لگا کر اس رشتے کی ہاں کو لی تھی۔ نہتی تھی کہ آج سے چند سال پہلے اپنے آپ کو کیا سمجھ کر شانزہ کی اماں نے اس رشتے سے انکار کیا۔ میری بھی ضد ہے کہ شانزہ کو اپنی ہوس نہ بنایا تو ناہیدل دیتا۔"

"اوہ تو مجھے بس آخری حصہ پتا کہ مسئلہ کیا ہوا؟" من کی بے چینی خاقان کے اعصاب پر مکمل حاوی ہو چکی تھی۔

"مسئلہ یہ ہوا کہ مکمل بھائی نے اسے انٹرنیٹ پر دیکھ لیا تھا جہاں بقول ان کے شانزہ نے جانے کتنے ہی لڑکوں سے دوستیاں کر رکھی ہیں اور پناخوں پھلجڑیوں جیسی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی تصویر سے لے کر شہر تک کا نام وہاں درست ظاہر کر رکھا ہے نہیں ہے تو بس گاؤں کا نام۔ نا صرف یہ بلکہ اور بھی کئی طرح کے الزامات لگا کر انہوں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔"

"چھوڑ دیا۔ مطلب؟"

"مطلب کیا بھائی؟ سیدھی سی بات ہے کہ انہوں نے رشتہ توڑ دیا اور اس کی پھوپھی نے بھی اس بات کو بنیاد بنا کر ایسی باتیں گاؤں میں پھیلانی ہیں کہ میں تو وہ سب بتا بھی نہیں سکتی۔"

بات کرتے کرتے وہ بھی خاقان کے ساتھ کھڑکی سے ٹھوڑا ہٹ کر یوں کھڑی ہو گئی کہ وہ دونوں تو او جھل تھے مگر انہیں بخوبی نظر آ رہا تھا کہ شانزہ اب اس سفید چادر کو شہر میں ڈالنے کے بعد وہیں اپنے اوپر دوپٹا پھیلانے لپٹ چکی ہے۔

"کیا؟" خاقان نے صدمے کی شدت سے کہا تو ضرور مگر آواز جیسے کہیں کھو سی گئی تھی۔

"بھائی پورے گاؤں میں ان کی بہت رسوائی ہوئی ہے۔ ہر بندہ ان پر انگلی اٹھا رہا ہے شانزہ تو ایک طرف اس کے اماں اب بھی گھر میں بند ہو کر رہ گئے ہیں کیونکہ بت سے لوگوں کو تو مکمل نے کچھ ثبوت بھی دکھائے تھے۔"

"لہل۔ لیکن نازو ہمیشہ آنکھوں دیکھایا کانوں سنا سچ تو نہیں ہوتا نا۔" اس کی لالہابی فطرت کے ہاتھوں کیا گیا ایک چھوٹا سا عمل یوں کسی کی زندگی برباد کر دے گا یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

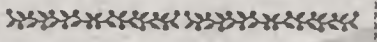
یوں بھی یہ تصویر اس نے پچھلی دفعہ آنے پر اسی جگہ کھڑے ہو کر بنائی تھی جب شانزہ کا رشتہ طے ہو جانے کا نر اس کا دل عجیب سی کیفیات میں گھرا ہوا تھا۔ وہ احساس کیا تھا کہ یوں تھا؟ یہ وہ سمجھ نہیں پایا تھا لیکن بس مکیا کی انداز میں ایک تصویر ضرور بنا لی تھی جو بعد میں کسی اور طرح کام آئی۔

"ہمیشہ نہیں مگر اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے نا بھائی دنیا اس کو بچ جاتی ہے جو سامنے ہو۔ آنکھ او جھل حقیقت کو براؤ او جھل بان کر لوگ پاؤں کی دوسری سمت جانے کی کبھی زحمت نہیں کرتے۔"

بات کرتے کرتے نازو تو اماں کے بلانے پر کمرے سے نکل گئی مگر اس کی باتوں سے جو چھانٹ خاقان کے چہرے تھی وہ نکلتی اب یقیناً ہر شکل تھی۔

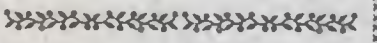
مشہور و مزاح نگار اور شاعر  
انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین  
آفٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش



## کتاب گاہ

450/-	سفر نامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفر نامہ	دنیا کول ہے
450/-	سفر نامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفر نامہ	چلنے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سفر نامہ	مکرمی مری پیرا مسافر
225/-	طرز و مزاج	خدا کدیم
225/-	طرز و مزاج	اُردو کی آکری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوپے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاندگر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈ گرائیں پو این انشاء	اعدا کا نواں
120/-	ادب مری این انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طرز و مزاج	باتیں انشاء جی کی
400/-	طرز و مزاج	آپ سے کیا پردہ



مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی



دل پر ایک بار گراں گویا یوں پڑا رہے بیٹھ چکا تھا۔  
چاہنے کے باوجود ایک گہرا سانس لے کر اندر جمع ہوتی  
مخزن کو چند لمحوں کے لیے ہی سہی وہ باہر نکل پھینٹنے  
میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ سانس لیتا تو محسوس ہوتا جیسے  
گلے کے اوپر ہی حصے سے ہی واپس لوٹا دی گئی ہو۔ اندر  
تک جانے کی اجازت شاید اسے اپنے ضمیر سے مل  
نہیں پا رہی تھی۔ اور یہی اسے محسوس ہوا کہ گہری  
سانس لیتا بھی اللہ کی کس قدر بڑی محبت ہے جو ہم بغیر  
کسی عذرت کے جس دقت چاہیں ہوا کو اندر بھیج  
کر حاصل کر لیتے ہیں اس بات کا احساس ہوتے بھی  
ذہن میں ایسا تلاوت کی آواز گونجی تھی۔  
”بے شک تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو  
بھٹلاؤ گے۔“

بچپن سے لے کر آج تک ان سب کی صبح ابائی  
تلاوت سے ہی ہوتی۔ جب آنکھ کھلتی تو وہ مخزن میں  
بجھائی چارپائی پر بڑی عقیدت اور انہماک سے تلاوت  
قرآن میں مصروف ہوتے۔ سورۃ رحمن اور چند  
دوسری سورتیں ان کے روزانہ کے ورد کا اہم حصہ  
تھیں مگر جیسے ہی وہ اس آیت پر پہنچتے سر جھکا کر کچھ دیر  
خاموش رہتے۔ چہرے کو بھگوتے بے آواز آنسوؤں کو  
بڑی تنظیم سے اپنی پیشانی اور چہرے پر ملتے اور اسی  
ہاتھ کو کرتے کے اندر ڈال کر اپنے سینے پر پھیرتے کہ  
ان کا یقین تھا کہ اللہ کے خوف اور اس کی محبت میں  
نکلنے والے یہ آنسو روز قیامت ان کا سینہ اور چہرہ اپنے  
نور سے روشن کر کے اللہ کے حضور ان کے گناہ  
بخشوانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

یہی سب سوچتے ہوئے جانے کیسے آج خاقان جیسے  
انسان کے چہرے پر بھی دو آنسو سرمئی آنکھوں کی  
سرحد پار کیے اب نیچے لڑھکنے کو تھے جنہیں لاشعوری  
طور پر ابائی تقلید میں اس نے بھی اپنے چہرے پیشانی  
اور سینے پر پھیر لیا۔ باوجود اس کے کہ وہ جانتا تھا کہ وہ  
آج تک جو کچھ کرتا آیا ہے ان کے لیے یہ آنسو بہت  
کم ہیں لیکن شانزہ کے ساتھ انجانے میں کی گئی اس  
زیادتی کے احساس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ نا

صرف شانزہ بلکہ اس کے اماں ابا کا بھی گناہ گار ہے یہ  
بات اس کے اعصاب کو بنا نعلن جھجھوڑے جاری  
تھی اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے دل میں موجود اس  
دبے کی لومزید تیز ہوئی جو ایک دن زید کی باتوں پر اس  
کے دل میں یکایک جلنے لگا تھا۔ جیسا اس نے ایک نظر  
آہستہ آہستہ تیز ہوئی وہ صوب اور جس سے بے نیاز بنیل  
کی چھاؤں میں لپٹی شانزہ کو دیکھا اور کچھ سوچ کر اماں کی  
طرف چل دیا جو کمری کے باعث گھر کے بجائے گاؤں  
میں موجود تنور سے روٹیاں لگوانے کا مشورہ دے رہی  
تھیں۔

”خاتو تیرا دل غ تو ٹھیک ہے ناجانتا بھی ہے کیا کہہ رہا  
ہے؟“

اس کی بات نے اماں سمیت سلطانہ کو بھی چونکا دیا  
تھا۔ اسی لیے وہ آنے کی رات بھاگ بھری کو کھٹاکر  
اماں کے کمرے میں ہی آنی جہاں ایڑ کو لڑکی ٹھنڈی  
ہوا کے سامنے خاقان اپنی ماں کا دماغ گرم کر چکا تھا۔  
اکھوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے بچپن سے بھی روایتی  
اکھوتے سپوتوں کی طرح اس کے ناز خروں کا اتحادی  
جماعتوں کی طرح خیال رکھا جاتا۔ گرمی اس کا بوڑ  
خراب کر دیتی تھی جیسا اسے آرام پہنچانے کی خاطر شر  
سے بولی ایس خرید آگیا۔ ہاتل سے جتنے دن چھٹی پر وہ  
گھر آ گاؤں کا سبزی فروش روزانہ شر سے اپنے  
سووے سلف کے ساتھ تازہ اخبار لا کر ان کے گھر  
پہنچانے کا بھی پابند ہوتا دو سروں کی پسند ناپسند  
مطلع نظر کھانے میں بھی اس کی پسند کو فوقیت دی  
جاتی۔ اپنی تمام رویوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے امید  
تھی کہ نتیجہ حسب توقع ہی ہوگا۔

”ہاں جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور یہ بھی کہ  
گاؤں والے اب اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے  
ہیں۔“ خاقان کے چہرے پر اب فکر یا پریشانی کا کوئی  
نثر نہ تھا۔ بلکہ یوں لگتا ہمارے کسی موسموں کو پھلانگتے  
ہوئے اس کے سامنے کئی پھول بوٹے لگا گئی تھی۔

”لیکن بھائی اس کے اپنے منگیترے اسے چھوڑ دیا  
کہ اس کے چند دوستوں نے اسے شانزہ کی تصویر  
دیکھنے کے بعد بتایا کہ وہ کتنی ہی دلکش فون پر اس کے  
ساتھ ٹائم پاس کر چکے ہیں۔ محض رویوں کی لالچ میں  
بہت گھٹیا حرکتیں کرتی رہی ہے یہ حالانکہ ماں باپ کی  
ایک ہی ایک تو ہے پھر بھی جانے کرتی کیا ہوئی ان  
رویوں سے۔“ اس کا لہجہ خود اس کے لیے ہرگز نیا نہ  
تھا اسے خاموش یا کر اماں نے لہو گرم جانے ہوئے  
سلطانہ ہی کی بات کا تسلسل قائم رکھا تھا۔

”اور کیا ہم تو اسے کتنی بھولی سمجھتے رہے اور اب  
بھی سمجھتے رہتے اگر کمال اصلیت نہ کھولت۔“  
”اماں وہ اب بھی وہی ہی بھولی بھلی ہے جیسا آپ  
اسے پہلے سمجھتے تھے۔“ خاقان کی بات پر اماں نے ابرو  
چڑھا کر سلطانہ کی طرف دیکھا مگر چپ رہیں۔  
”در اصل اس سارے معاملے میں غلطی میری ہے۔“

”تیری غلطی۔“ بیک وقت دونوں نے کہا تھا۔  
لیکن جب خاقان نے دیرے دیرے اول تا آخر  
انہیں ساری بات پوری سچائی کے ساتھ بتائی تو وہ  
دونوں منہ کھولے رہ گئیں۔

”باہ بھائی ہم نے بھی اتنے سالوں کی آپس میں  
موجود محبت کو مل میں ان ثبوتوں کے سامنے بھلا کر ان  
کے سامنے نہ کسی مکرمل میں اسی بے چاری کو قصور  
دار ٹھہرایا۔“ چند لمحوں پہلے لہجے کی ناگواریت چند ہی  
لمحوں بعد محبت میں بدل گئی تھی۔

”اب آپ خود ہی سوچیں میری وجہ سے وہ سارے  
گاؤں میں بدنام ہوئی ہے تو پھر اسے عزت بھی تو مجھے  
ہی دینا ہوگی نا اور پھر بدنامی سے بھی وہ سب کو بے تو پھر  
پھر سب سب کب جائیں گے تاریخ لینے؟“

”خاتو تو نے بہت برا کیا اس بے چاری معصوم کے  
ساتھ لیکن ہاں ہم اسے اپنا میں گئے ضرور مگر گاؤں  
والوں کو حقیقت بتانے کے بعد تاکہ کوئی اس کے کردار  
پر انگلی نہ اٹھا سکے۔“  
اماں کی عدالت نے انصاف کیا تھا۔

”لیکن بھائی کیا تم سب کے سامنے اعتراف کر پاؤ  
گے کہ تم سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے؟“ سلطانہ  
خوش تھی کہ یہ سب حقیقت کھلنے کے بعد اب وہ دھند  
چھٹ چکی تھی اور سامنے کا منظر براہی دلکش اور واضح  
تھا۔

”ہاں بھئی میں سب کے سامنے بھی سچ کہوں گا اور  
سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا، لیکن اس کے لیے میری  
بھی ایک شرط ہے۔“ مزاج ایک بار پھر شرارت پر آمادہ  
تھا۔

”بول بول تیری۔ شرط منظور ہے۔“ اماں خوشدلی  
سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔  
”نہیں اماں مجھے اپنے لیے تو کچھ نہیں چاہیے  
لیکن سوچتا ہوں سلطانہ کی شادی کے بعد آپ کو اس  
کی کتنی یاد ستائے گی نا۔“  
”ہاں پتہ یہ تو ہے۔“ اماں اداس ہونے کو تھیں  
جبکہ سلطانہ اس کا مطلب جان کر مسکراتے لگی۔

تو اس کا ساہ ساحل ہے تا میرے پاس اور وہ یہ کہ  
ہونا تو چاہیے کہ اس کی رخصتی سے ایک دن پہلے ہی  
شانزہ رخصت ہو کر آپ کے پاس آجائے تاکہ آپ کا  
بھی دل بہلا رہے اور اس توئی کی کمی وہ لوکی پوری کر  
دے۔“

”اچھا۔“ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے  
پھیرتے اماں کا ہاتھ ایک دم اس کے کان پکڑ چکا تھا۔  
”اوپر تجی اتنے بھی ہو سارے بنو۔ مت بھولو کہ  
جس کنویں کا تم پانی پیتے ہو اسے ہم نے کھودا تھا۔“  
اماں نے پیار سے اس کا کان کھینچا اور دونوں ماں بیٹی  
ہنسنے لگیں۔

ساری بات ابا کو بتا چلی تو پہلے تو انہوں نے خود اس  
کی تواضع کی پھر نہایت معذرت خواہانہ انداز میں شانزہ  
کے والدین کے سامنے جا کر ساری کہانی بیان کرنے  
کے بعد سر جھکا کر کافی دیر تک برا بھلا سننے کے بعد جب  
انہوں نے بتایا کہ خاقان گاؤں کی پچاسیت اور ان کے



سامنے خود اعتراف کر کے شانزہ کو بے قصور ثابت کرنا چاہتا ہے تو شانزہ کے والدین کے چہرے پر ایک سکون کی ہلکی سی لہر نمایاں ہوئی ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا نوید ہو سکتی تھی کہ ان کی بیٹی کے دامن پر لگے داغ نگہ دار پر لگائی تسمت غلط ثابت ہو جائیں۔

”بھائی! جی سفید کپڑے پہن تو سب لیتے ہیں لیکن انہیں بے داغ ہر کوئی نہیں رکھ سکتا اور معاف کرنا میرا بیٹا ایسے کپڑے پسند نہیں کرتا جن پر پہننے سے پہلے بھی داغ لگا ہو۔ ہماری طرف سے یہ رشتہ ختم۔“

ہمن کی آواز ذہن میں گونج کر ایک بار پھر ان کی سماعت پر تازیانے برسانے لگی تھی۔

اور پھر آخر کار پختائیت کے سامنے من و عن چج بیان کرنے اور اس غلطی کی طعانی کا ارادہ ظاہر کرنے پر پہلے تو اسے ملاحت کیا گیا کہ اس کی ایک غلط حرکت کی وجہ سے پورا خاندان کسی ذہنی مشکل سے دوچار رہا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے بچ کو سراپتے ہوئے خاقان کے اماں بابا کے عنیدہ ظاہر کرنے پر شانزہ کے والدین کو شادی کی رضامندی کی بھی سفارش کر دی جس پر باہمی مشاورت سے قبولیت کی مہر لگا دی گئی۔

☆☆☆

دونوں طرف گویا خوشیوں کی سیج ج چکی تھی۔ خاقان کی خواہش کے عین مطابق اس کے ولیمہ کے دن سلطانہ کی رخصتی تھی۔ زید و نسیم اور نادر کو اس نے فون پر یہ بریکنگ نیوز دی تو وہ سب ہی حیران رہ گئے۔ سچ کہتے ہیں دل کا موسم جی موسم پر جاوی ہو تا ہے جیسی تو اسے ہر چیز ٹھہری ٹھہری لگنے لگی تھی۔

یوں بھی ہمارا کی آمد آمد بھی جب سبک خرام ہوا اپنی تمام تر زراہٹ اور تازی کی ساتھ دھرتی کا سینہ چومتی تو ہر ذی روح جیسے کھل سا جاتا۔ چاروں طرف بکھرتے رنگ موسم کی دلکشی میں اضافہ کرنے کا سبب بنتے تو لہلاتے پھول پودے پورے جون کے ساتھ ماحول کی رنگینی میں اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے۔

زندگی یوں اچانک بدل جائے گی یہ تو اس نے کبھی

سوچا بھی نہیں تھا۔

اسے کمرے میں موجود کھڑکی سے شانزہ کو دیکھتا تو اس سے بات کرنے، ملنے کی تڑپ مزید بڑھ جاتی۔ بھی کبھار دونوں کی نظر۔ لگائی تو وہ فوراً ”ہی لگا کر نہ رہ کر رہی۔ یوں بھی اماں نے اسے چند دن مبر کرنے کا بڑی سختی سے مشورہ دیا تھا۔ لیکن ہائے یہ دل۔“

اس رات دونوں گھروں میں ڈھلک کی تھاب پر گیت گائے جا رہے تھے۔ رواج کے مطابق آج کیونکہ گیتوں والی پہلی رات تھی اس لیے شانزہ کی والدہ کو اپنی سہ ماہی کو مٹھائی اور سرخ دودھ دینے آنا تھا اور یہی وہ موقع تھا جب وہ نازکی مدد سے شانزہ سے دو کھڑکی ملنے اس کی چھت پر جا پہنچا۔

”آپ یہاں۔۔۔؟“ شانزہ اسے اپنی چھت پر موجود اور ناز کو دہل سے غائب کیا یوں ڈر گئی تھی جیسے وہاں کوئی بھوت اس کے مد مقابل ہو اور بھی خاقان کو احساس ہوا کہ ناز نے شانزہ کو اس کی آمد سے بے خبر رکھا تھا۔

”کیوں اچھا نہیں لگا میرا آتا؟“ شانزہ کی گھبراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”میں نے یہ کب کہا۔۔۔؟“

”یعنی اچھا لگا، ٹھیک ہے روز اسی وقت آیا کروں گا۔“ مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا گیا جملہ شانزہ کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ کر گیا تھا۔

”نن! نن! تو میں نے یہ تو نہیں کہا۔“

”یعنی تمہیں میرے آنے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔“ خاقان بھی اپنے نام کا ایک تھا اور اسے تنگ کرنے میں شاید مزا آ رہا تھا۔

”کیوں آپ۔۔۔ بچکی! کب سے ہو گئے کہ مجھے آپ کے آنے سے خوشی ہو۔“

ابھی چند لمحوں پہلے خاقان کے گھر پر کی گئی لائننگ کی وجہ سے اپنی چھت پر بی بیانی کی ہلکی سی آڑ میں کھڑے ہونے کے باوجود وہ گھبراہٹ تھی کہ کو دیکھ نہ لے لیکن جیسے ہی لائننگ کی تو گویا خاقان کے فیوز اڑانے کو دل چاہ رہا تھا اس کے سامنے تھی۔

”اوہ تو اب پھر بھی بولنے لگے۔۔۔“

”جی نہیں، پھر ہوتے تو لوگ ایک جھلک دیکھنے کو محنت نہ سمجھتے بھراپنی کھڑکی کی آڑ میں خود کو لپکن نہ کرتے۔“

جوانی کا دل بڑی تندھی سوچوری پکڑے جانے پر خاقان کو کوئی جواب نہ سوجھا تو مسکراتے ہوئے کان پکڑ لیے۔

”سوری یار۔۔۔ تمہیں برا لگتا ہو گا نا۔“

”صرف برا نہیں بلکہ بہت برا لگتا تھا کئی دفعہ سوچا کہ ناز سے آپ کی شکایت کروں گی کہ۔۔۔“ وہ لمحہ بھر رک کر خاقان کے تاثرات دیکھنے لگی۔ چاندنی راتوں کا فائدہ آج اسے محسوس ہو رہا تھا۔

”کہ۔۔۔“ خاقان نے اسے خاموش دیکھ کر بات مکمل کرنے کو کہا۔

”کیا شکایت کرنی تھی تمہیں؟“

”ہی! کہ کھڑکی کی آڑ میں کیوں کھڑے ہوتے ہیں سامنے کھڑے ہو جائیں تو کسی اور کا بھی بھلا ہو جائے۔“ بات کرتے کرتے شریکس سی مسکراہٹ نے اس کے دودھیا چہرے کو مکمل طور پر اپنے حصار میں لے لیا تھا خاقان کو اس کے اس معصوم انداز پر بے پناہ پار آیا۔ جھل جھل نظروں کے ساتھ سامنے کھڑی شانزہ ابھی چند لمحوں پہلے پائے جیسی باتیں کرنے والی ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔

چاندنی رات کو بھی شاعروں نے خواہ مخواہ ہی اتنا دوانشک نہیں کہا۔

دل میں انگڑائیاں لیتے نئے جذبہ محو ہوا کی لور یوں کے ساتھ مزید بے دار ہونے لگے تھے۔

”سنو۔۔۔ ایک بات کہوں۔“ خاقان نے دھیرے سے سرگوشی کی تھی۔

”مجھے پتا ہے اس لیے رہنے دیں۔“ شانزہ محسوس کر رہی تھی کہ دونوں اطراف سے دل میں جاگتے خوب صورت احساسات اب ایک مفروضہ اظہار کا قاضا کرنے لگے ہیں جیسی خود کو سمجھاتے ہوئے ایک بار پھر جاگ سی گئی۔

”کیا۔۔۔ کیا پتا ہے تمہیں؟“ لہجے کی محو ریت ابھی

تک برقرار تھی۔

”ہی! کہ میں بہت خوب صورت ہوں۔“

شانزہ نے بڑی ادا سے کہا اور اسی لمحے لائنٹ آجانے پر فوراً ”سیرھیوں کی طرف بھاگی۔ ساری کائنات جیسے جھلکے لگی تھی۔ اور وہ جو اس سے معافی مانگنے آیا تھا قریب آنے پر جیسے اپنی یادداشت ہی کھو بیٹھا یاد رہا تو بس چاندنی رات اور من چاہے سا محسوس کا احساس!!!

چند ہی دنوں میں زندگی نئی کرٹھ لے چکی تھی اور وہ خود بھی زندگی کو نئے انداز سے جینا چاہتا تھا جیسی آنکھوں میں آنے والے کل کے خوب صورت سپنے سجائے اب وہ بڑی شدت سے اپنی یہ فیلنگز دوستوں سے شیئر کرنے کو بے تاب تھا جو آج ہی اس کی شادی کی رونقوں میں اضافہ کرنے کے لیے ہاسٹل سے روانہ ہو چکے تھے لیکن ہاں آنے سے پہلے خاقان کی ہدایت کے عین مطابق اشتہار کے ذریعے حاصل کی گئی رقم کو کینسر ہی کے مریضوں کے لیے donate کرنا وہ ہرگز نہیں بھولے تھے۔

☆☆

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

حنا



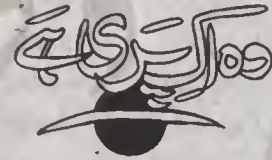
نادرہ خاتون

قیمت: ---/- 550 روپے

منگوانے کا پتہ:

کتاب گھر ان ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی۔





مرے افکار باغی ہو رہے ہیں  
مری ہر سوچ پر پھرے بٹھا دو  
خریداروں! جو ممکن ہو تو آؤ  
مرے احساس کی قیمت چکا دو

”تو کیا کروں؟ تم کیا سمجھتی ہو مجھے اپنے باپ سے  
محبت نہیں۔“

فرزان اپنے کرتے کی فولڈ آستین کھولتا ہوا زارا کی  
طرف بڑھا۔

”صرف اکیلا فرزان ہی لائسنس ہولڈر ہے باپ کی  
محبت کا محبت یہاں ہوتی ہے۔ یہاں۔“ فرزان نے  
اپنے سینے پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔

”جب ساری پدرانہ شفقت اسی پر نچھاور ہوتی ہے  
تو وہ اس محبت کا حق ادا کرے نا۔ جائے۔ میں کیوں  
جاؤں۔“

فرزان کے لہجے میں تنگی تھلی ہوئی تھی۔

”ایسی بات نہیں۔ وہ آپ سے بھی محبت کرتے  
ہیں آخر آپ ان کا خون ہیں۔ آپ سے کچھ شکایات  
ہی تو ہیں انہیں اور جو شکایات ہیں وہ کچھ غلط بھی  
نہیں۔ آپ اس بات کو مان کیوں نہیں لیتے۔“ زارا  
نے چاٹل چٹتے ہوئے ہلکی لہجے میں کہا۔

”ہو نمس۔“ فرزان نے طنزیہ ہنکارا بھرا اور پھر گویا

ہو۔

کل بھی میں نادان تھا اور آج بھی نادان ہوں  
میں مکمل ہو نہیں سکا کہ میں انسان ہوں

”حالانکہ آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا۔“ میں مکمل ہو  
نہیں سکا کہ میں ”فرزان“ ہوں۔“ زارا نے ماحول کی

تنگی کو کم کرنے کے لیے بذلہ منجی کا مظاہرہ کیا مگر  
فرزان کو اس وقت زارا کا یہ شمع انداز پسند نہیں آیا وہ  
برہمی سے بولا۔

”ہر شخص مجھے ہی قصور وار ٹھہراتا ہے میں برا ہوں  
تو مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ سب  
خدا کی فوجدار بنے ہوئے ہیں۔ میری اصلاح کا بیڑہ اٹھا  
رکھا ہے سب نے۔ ہو نمس۔ غلطیوں سے پاک

ہو جاؤں تو کیا انسانیت کے مقام سے بہت اونچا نہیں  
اٹھ جاؤں گا؟ اور تم لوگ مجھے فرشتہ بنانے پر کیوں تے  
ہوئے ہو؟ میں زمین زاد ہوں عرش پر نہیں رہتا مجھے  
زمین پر ہی رہنے دو تم لوگ۔“

ہمیں ابھام کی ساری اذیت سے الگ کر دے  
زمین زادے ہیں جذبے آسانی رکھ نہیں سکتے  
فرزان کا رخ لہجہ شعر سناتے ہوئے کچھ نرم ہوا تو  
زارا کو پھر حوصلہ ہوا اس نے ہمت نہیں ہاری اور  
دوبارہ بولی۔

”جائیں گے بابا کو لینے۔“ فرزان نے گھور کر زارا کو  
دیکھا پھر سر لہجے میں بولا

”میرا نام فرزان ہے جانتی ہو نا؟ خون کی مثال تو  
فورا“ دے دی تاثیر بھول گئیں۔ میں بھی ان ہی کا بیٹا  
ہوں اگر وہ اپنی انار پر قائم ہیں تو میں بھی ہار ماننے والوں  
میں سے نہیں ہوں۔“

”رشتوں، رفاقتوں اور محبتوں میں جب اناتیں  
حائل ہو جائیں تو معافی مانگ لینے یا معاف کر دینے کا  
لہجہ بہت دور چلا جاتا ہے پھر اس لمحے تک جاتے جاتے  
صدیوں کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ تب تک بہت

دیر ہو چکی ہوتی ہے اور میں تمہیں چاہتی آپ کو دیر  
ہو جائے باپ، بیٹے کے رشتے میں کیسی ہار کیسی  
جیت؟ یہاں آپ غلط سوچ رہے ہیں وہ انار پر قائم  
نہیں ہیں بس ناراض ہیں آپ سے۔ آپ ان کی  
ناراضی سے مقابلہ مت سمجھیں خود کا باپ ہیں وہ آپ  
کے؟“

زارا نے دبے لہجے میں فرزان کو سمجھانے کی  
کوشش کرتے ہوئے بے چارگی سے کہا اس کے اندر

سے رنج و تفس کی ایک لہر ابھر کر اس کے چہرے کا  
احاطہ کر گئی تھی۔  
”تمہاری اتنی محبت جاگ رہی ہے تو تم چلی  
جاؤ نا؟“  
فرزان نے اطمینان سے کہہ کر کرسی کی پشت سے  
ٹیک لگالی۔

”میں تو چلی ہی جاؤں گی مگر جو خوشی انہیں آپ کو

چوتھی قسط





دیکھ کر ہوگی مجھے دیکھ کر نہیں ہوگی۔“ زار نے کمزور سے انداز میں جیسے آخری کوشش کی اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔

”خوشی تو انہیں اذان کو دیکھ کر ہوگی تمہارے یا میرے جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑنے والا اور سنو تم بھی زیادہ نشی منقی بننے کی کوشش مت کرو۔ اپنی بقراطی اپنے پاس رکھو، آئندہ مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرنا، میں جو بہتر سمجھوں گا وہی کروں گا انڈر اسٹینڈ۔“

فرزان نے انگلی اٹھا کر سخت لہجے میں زار کو ڈانٹتے ہوئے کہا اور پھر غصے سے پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ زار اہم امت بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چال کی پرات اٹھا کے پچن کی طرف بڑھ گئی۔

\*\*\*

چارہ گر مجھ سے جو پوچھے تو بتاؤں کیسے دل کہاں ہوتا ہے اور درد کہاں ہوتا ہے وہ کہ جس شہر میں روشن تھے محبت کے دیے اب تو اس شہر میں ہر رات دھواں ہوتا ہے آنکھ کھلنے پر چند لمحے اس نے خالی خالی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے فوراً ”مڑکوال کلاک کی جانب دیکھا جس کا ٹونا ہوا شیشہ اپنی خستہ حالی کے ساتھ ساتھ مکینوں کی عسرت زندہ زندگی کا آئینہ دار تھا۔

وقت دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ ابھی فجر کی اذان ہونے میں کچھ دیر ہے۔ اس نے برابر کی چارپائی پر نظر ڈالی۔ اسی حسب معمول موجود نہیں تھیں وہ صبح کے لیے ابھری تھیں تو پھر رات کو ہی سونے کے لیے لیٹتی تھیں کچھ دیر لیٹے لیٹے اس نے چھت پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ پھر کچھ سوچ کر اٹھ بیٹھی کسکندی سے چلتی ہوئی وہ چھت پر آگئی کمرے کے کھٹے ہوئے ماحول کی نسبت کھلی چھت اور کھلی فضا میں آکر اسے خوشگواریت کا احساس ہوا تھا اس نے سر اٹھا کر آسمان

کی طرف دیکھا جہاں جلتے بجھتے تاروں کی چادر سی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے باریک جالی کے دوپٹے پر سفید رنگ ٹانگ دیے ہوں۔ ماہم محبت سے اس حسین منظر کو دیکھ رہی تھی کہ تخیل کے پردوں پر ایک دھندلی سی تصویر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

”آپ بہت اچھی شاعری کرتی ہیں مس ماہم۔“ ہوا نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی اس نے طمانیت سے آنکھیں بند کر لیں آنکھیں بند کرتے ہی جو منظر اس کی پتلیوں میں ٹھہرا تھا وہ منظر ایک دور دراز نیم فرا موش شدہ خواب کی طرح حقیقت سے مشابہت نہیں رکھتا تھا اس نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں خوشگوار منظر کا سارا احمد دھواں بن کر اڑ گیا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں پیچ لیا تھا اس نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب بھی ستارے اسی طرح جھللا رہے تھے اس نے اس بار شدت کرب سے آنکھیں پٹیچ لیں اور اس کی پلکوں پر بے ستارے ٹوٹ کر خاک میں مل گئے۔

اس نے قدم آگے بڑھانے چاہے مگر اسے محسوس ہوا اس کے آگے بھی دیوار ہے اور پیچھے بھی دیوار۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن راستہ اسے رستہ نہیں دے رہا تھا اسے محسوس ہوا کہ جیسے اسے ذخیرہ کر دیا گیا ہے۔ ”کیا یہ دیکھ میرا جیون بھر کا ساتھ ہے حالانکہ میں تو خوشیوں کی کھوج میں ہوں۔“

اک مدت سے سرگرداں ہوں کھوج میں ان کی بیت گئے جو روز و شب ٹاپا سہرے اور یہ تو قدرت کا اصول ہے انسان کو کسی غم کا شکار ہونا ہی پڑتا ہے حقیقتوں کا انکشاف ہی انسان کے کرب و لذت کی ابتدا ہے حاصل الا حاصل ہو جانا ہے، موت کمزوری بن جاتی ہے تو انا وجود کمزور اور باتواں ہو جاتا ہے آنکھوں کے رپد ہم ہو جاتے ہیں فکر کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں تب لگتا ہے آگے بھی دیوار ہے اور پیچھے بھی دیوار۔ اور ان دیواروں کے ساتھ بدن کی قید میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے تو حصار

ذات سے باہر نکلتا بھی دشوار ہوتا ہے صرف دکھ باقی رہ جاتا ہے اور سوائے دکھ کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ دکھ آنکھوں کو آنسو بخشتا ہے لیکن رونا تو اسی بات کا ہے کہ رونے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا بس کرب ہی کرب۔ لذت ہی لذت۔ اور اس لذت میں ایک سوز بھری آواز نے کمی کی تھی۔ کچھ دور سے مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔

موزن بھلائی کی طرف بلارہا تھا خواہیہ لوگوں کو تیار رہا تھا نمازیندے بہتر ہے۔ وہ خیالوں سے نکل کر دوپٹے سر پر ڈال کر اذان سننے لگی۔

”آپ!“ اذان ختم ہوتے ہی اس نے دعا پڑھ کر من پر ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ صغیر کی آواز بلند ہوئی۔

”آپ!“ اسی کہہ رہی ہیں نماز پڑھ کر سموسوں اور دہی بیوں کی تیار کی گئی۔

ماہم نے ایک نظریں چھو کر کھڑے صغیر کو دیکھا ٹھنڈی سانس لی اور دوبارہ آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ آسمان کے کناروں کی سیاہی سرخی میں تبدیل ہو رہی تھی تارے دیکھتے ہی دیکھتے ٹٹٹا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے بادلوں کے نرم و نازک سے کنارے کے کچھ ہی اوپر دھندلے دھندلے آسمان کی ٹھنڈی دستوں میں سورج کی پہلی کرن روشنی میں ٹپکے ٹپکے چمک اٹھی بھی ماہم نے غور سے اس پہلی کرن کو دیکھا اور سیزھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔

\*\*\*

سورج کی کرنیں بے آواز طریقے سے اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں ان دور دراز فاصلوں کو جہاں سے وہ آیا تھا سنہری روشنی کے لہاوے میں چھپاتی جا رہی تھیں۔ بڑھتا ہوا گرم غبار خود سیر کی کے ساتھ زمین سے لپٹے ہوئے مکانوں کو باغوں کو درختوں اور بہاؤں پر دیران اواسی لیے خورد و پودوں کو اپنی گرم آغوش میں لے رہا تھا۔ ہر چیز پر ایک باریک سی پیش کی چادر چھاری تھی۔

اس نے دھوپ کی پیش سے بچنے کے لیے پیش پائی پر وائیں ہاتھ کا چھجھایا بناتے ہوئے اس دھوپے نما بوسل کے اس اینٹنک قسم کے بورڈ پر نظروں دوڑائیں جس کی عبارت امتداد ازلانہ کے ہاتھوں اپنے اصل رنگ و روغن سے محروم ہو چکی تھی اور الفاظ بھی خاصہ مدہم ہو چکے تھے لیکن ہر حال وہ بورڈ پر لکھے الفاظ پڑھ چکا تھا۔

”مکہ ہوٹل۔“ اس نے دوبارہ دہرایا اور سرشاری سے قدم آگے بڑھا دیے ہوٹل کے باہر کچھ دکان دار لکڑی کے کین لگا کر اپنا مال بیچ رہے تھے۔

اس چھوٹے سے بازار میں روزمرہ کی ضروریات کا تقریباً سارا ہی سامان موجود تھا ارد گرد دو تین کشادہ چائے خانے اور بھینار خانے تھے شوقین مزاج اپنے اپنے کاموں میں وقفہ دے کر اس وقت ہوٹل میں بیٹھے ریڈیو سے بیجان انگیزی فلمی گیت سن رہے تھے چائے کے گلاس ان کے سامنے رکھے تھے اور وہ خوش گہریوں میں مصروف تھے کچھ لوگ خاموشی سے کھانے پینے میں مصروف تھے کچھ اپنے دوستوں سے بے ہوش مذاق کر رہے تھے اور وہیں بیٹھے بیٹھے تھوک رہے تھے اور ہوٹل کا ڈیڑھ چکر کی طرح محسوس کران کے آرڈر میا کر رہا تھا کبھی کبھی چائے بنانے والے کو چائے بنانے میں دیر ہو جاتی تو دیر کو خشکی گالی دی جاتی اور وہ دور سے ذرا سخت لہجے میں اپنے آنے کی اطلاع دیتا تو جل رہا تھا روٹیاں یک رہی تھیں کچھ لوگ وہاں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ہوٹل کے باہر بھی بڑی بڑی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور لوگ پیٹ کا دوزخ بھرنے میں مصروف تھے۔ ان کے قریب ہی کئی کتے ان کو تنک رہے تھے جیسے ہی کوئی ہڈی بچوڑ کر پھینکنا کتے اس پر جھپٹتے ان کی بھوں بھوں سے ایک شور اٹھاتا تو گیتوں کا سارا مزرا کر کر رہا ہوتا جو تھوڑا بھاگ کر راستے سے دو چار پتھر اٹھا کر ان پر پوری طاقت سے مارتا پتھر ان کمزور کتوں کے جسموں پر اتنے زور سے لگتے کہ وہ لڑائی بند کر کے دوہرے ہو جاتے کتوں کے بھاگتے ہی فضا پھر لوگوں کی گفتگو اور دیر کی آواز اور فلمی



گیتوں سے لرزے لگتی۔

اس نے ایک طائرانہ سی نظر سارے ماحول پر ڈالی اور ہوٹل کے اندر داخل ہو گیا۔

بوسیدہ سی ٹیبل کے گرد رکھی خستہ حال کرسیوں میں سے ایک کرسی سمیٹ کر جوں ہی وہ بیٹھنے لگا وہ منجی ساعر رسیدہ شخص چراغ کے جن کی طرح نمودار ہو گیا۔

”بہزی ہے، وال ہے، قیمہ ہے، آلو گوشت، مٹر گوشت، مرغ فرائی اور کڑائی ہے۔“

”وال کون سی ہے؟“ اس نے بغور اس عمر رسیدہ شخص کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”وال چتا ہے وال ماش ہے صاب۔“ اس نے چند لمبے کچھ سوچا پھر بولا۔

”وال چتا لے آؤ۔“

”سادہ لے آؤں یا فرائی؟“ مدقوق شخص نے چستی سے پوچھا۔

”فرائی ہی لے آؤ یا ر۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

وینر نے کندھے سے کپڑا اتار کر دائیں سے بائیں اور پھر بائیں سے دائیں اسے ہاتھ میں گردش دی اور پھر جھکاؤ سے دیوے اشاکل سے دوبارہ کندھے پر رکھ کر چلتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف منہ کر کے آواز لگائی،

”صاب کے لیے وال چتا فرائی۔“ وینر کی حرکات و سکنات دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”شاید یہ رجنی کانت کا قیمن ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

چند لمحوں بعد وہ گرم گرم فرائی وال سمندور کی روٹی، کلادی نمٹار اور پیاز کی سلاو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ڈھابے نما ہوٹل کی ظاہری حالت کے برعکس کھانا لذیذ تھا وہ سر جھکائے بڑی رغبت سے شکم سیری میں مصروف تھا جب اچانک ایک گھبرائی ہوئی سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”بھائی جان آپ کے پاس موبائل ہے؟“ اس نے نظریں اٹھا کر آنے والے کا جائزہ لیا سرخ و سفید چہرہ

جگہ جگہ سے ملتے ہوئے میلے اور بوسیدہ کپڑے، بکھرے بال، چہرے پر باریک موچیں۔ جوڑی پیشانی، موٹی آنکھیں، مضبوط اور سڈول جسم کا مالک پریشان حال نوجوان اس کے قریب کھڑا اس سے مخاطب تھا۔ اس کی وضع قطع سے مفلوک الحالی عیاں تھی۔

اس نے سوالیہ نظروں سے نوجوان کو دیکھا تو وہ نوجوان گڑبڑا کر بھٹکاتے ہوئے دوبارہ بولا۔

”وہ جی۔۔۔ مہم۔ میرا نام حافظ عامر ہے۔ میرے والد کو پارٹ انیک ہوا ہے اور ان کی طبیعت شدید خراب ہے اگر آپ کے پاس موبائل ہے اور صف، منٹ کی بات کروادیں آپ کا منت بردار احسان ہو گا۔“

نوجوان کی پریشان اور روہینے والی آواز سن کر بے اختیار اس کا ہاتھ جب میں رینگ گیا اس نے موبائل نکال کر نوجوان کو تھمایا جسے نوجوان نے پھرتی سے اچک لیا اور پھر گھبرائے ہوئے انداز میں ایک نمبر پیش کر کے

کلن سے لگاتے ہوئے روہی آواز میں بولا۔

”ہیلو۔۔۔ جی۔۔۔ کسی طبیعت ہے اباجان کی۔“

نوجوان نے درزیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا وہ اسی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔

”کیا۔۔۔ کون سے اسپتال میں۔“

نوجوان نے بات کرتے کرتے پریشانی سے ارد گرد دیکھا ریڈیو کی آواز کی باعث شاید وہ بات صاف طور پر سن نہیں پا رہا تھا اس نے کھانا کھاتے کھاتے سر اٹھا کر اسے تشویش سے دیکھا نوجوان ایک کلن پر انگلی رکھے

دوسرے کلن سے موبائل لگائے دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

”آواز نہیں آ رہی۔ کون سے اسپتال۔“ پھر یہی سے اس کی طرف دیکھا اس نے گردن ہلا کر اسے

سائیڈ پر جا کے بات کرنے کا اشارہ دیا اور بدستور کھانے میں مشغول رہا۔ نوجوان پریشان انداز میں بات کرتے کرتے ہوٹل سے باہر نکل گیا کھانا کھا کے پانی کا گلاس

پی کر اس نے ارد گرد دیکھا۔ نوجوان کہیں نظر نہیں آیا اس نے داخلی دروازے کی طرف دیکھا نوجوان ہوٹل میں داخل نہیں ہوا تھا وہ آرام سے چلتا ہوا ہوٹل سے

باہر نکلا لیکن اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھوں کے توڑے اڑ گئے اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا لیکن موبائل لے جانے والے نوجوان کا نام و نشان تک نہ تھا اس نے گھبرا کر وینر کی طرف دیکھا جو اسی کی جانب متوجہ تھا۔

اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلاتے ہوئے وہ بے اختیار بولا۔

”اؤئے رجنی کانت ذرا ادھر آؤ۔“ وینر پھرتی سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور ایک ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔

”ریمو رجنی صاب۔“ لیکن وہ اس کے اشاکل اور الفاظ پر توجہ دے بغیر گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

”تم نے اسے دیکھا؟ ابھی جس لڑکے نے مجھ سے موبائل مانگا تھا کیا تم اسے جانتے ہو؟“

”نہیں صاب۔۔۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ کون تھا وہ لڑکا؟ کیا تھا وہ لڑکا؟ کہاں سے آیا تھا وہ لڑکا؟“

وینر کی ”لڑکے“ کی گردان پر اس نے بے زاری سے اسے دیکھا۔

”بکواس بند کرو۔“ وہ وحاشا اور اس کی دھاڑیں ڈھابا ہوٹل کا مالک اور کھانا کھاتے کافی لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور وہ ان سب کو تفصیل بتا رہا تھا۔

”میرا نام ڈاکٹر شاہد ہے اس شہر میں مہمان ہوں۔ آپ کے ہوٹل میں کھانا کھانے آیا تھا کہ اچانک ایک گھبرایا ہوا نوجوان میرے پس آیا اور بولا۔“

سارا واقعہ سننے کے بعد ایک بھلے آدمی نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اپنا نمبر ملا کے چیک کرو ڈاکٹر صاحب۔“

شاہد نے موبائل لے کر نمبر پیش کیے اور لاؤڈ اسپیکر آن کر دیا لیکن دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

سوچ آف تھا۔

لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”نت نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں لوگوں نے لوٹنے کے۔“ ایک آدمی نے کہا۔

”ضرورت ایجاد کی ماں ہے جب لوگوں کی اپنی ضروریات جائز طریقے سے پوری نہیں ہوں گی تو وہ اسی طرح کے ناجائز طریقے اپنائیں گے۔“ کسی دل جلے نے کہا۔

”یہ سارا قصور ہماری حکومت کا ہے۔“

لے دے کے تین حکومت پر ٹوٹی تھی شاہد خاموشی سے کھڑا سب کے تبصرے سن رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت

ریمو نے بھی اپنے اقوال زریں سے اسے مستفید کرنا ضروری سمجھا اور اسے اطلاع دی۔

”کم لے گیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ حوصلہ کرو۔ بندہ اب ہاتھ نہیں آنے کا۔“ چپت ہو گیا ہے۔

زمین و آسمان و بحور سے گزر جانے دو گھج کو خنک دترے کھلی آب و ہوا سے کھلنے دو

بڑی مشکل سے میں نکلا ہوں گھر سے

خوب صورت نقشین فریم کے درمیان چمکتے گلاس

دور کو ہنسی کر کے اس نے اندر قدم رکھا ہے ایک چوکور

کرہ تھا۔ فرش پر گر سن کلر کا پیشیت قائم تھا ہوا

تھا نرم و گداز نیلے کلر کے شہنشاہ کے صوفے بہت

نری کا تاثر دے رہے تھے آس کی ڈیکوریشن مشرقی

انداز میں کی گئی تھی۔ نازک سے ڈیکوریشن ہمسز

کمرے کے ملیں کے فنق کا آئینہ دار تھے۔

اس کے اندر قدم رکھتے ہی کمرے میں گہرا سکوت طاری ہو گیا صوفوں پر تشیف فرما دونوں آدمی سینٹرل

ٹیبل کے عقب میں ریو الونگ چیئر پر تمکنت اور شان سے بیٹھی اس صحرائیز شخصیت کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس کے چہرے سے لگ رہا تھا وہ ان کی باتوں کو کسی خاطر میں نہیں لارہی۔

فرزان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خاموشی چھا گئی تھی۔ دونوں حضرات نے ناگواری اور تنگم سے خوشگوار سے اسے دیکھا اور بے ساختہ اپنی سیٹ سے کھڑی ہو گئی اس کے اس بے ساختہ انداز پر وہ



دونوں حضرات دوبارہ سے فرزان کی طرف متوجہ ہوئے۔

گرے رنگ کے شلوار سوٹ میں اونچے قد، خوب صورت چہرہ، ذہین آنکھوں والا ایک مکمل شخص بے نیازی سے کھڑا تھا اس کی شخصیت واقعی سحرانگیز تھی جس نے نیلم جی لڑکی کو محو کر دیا تھا۔

”زبے نصیب، زبے نصیب، آئیے آئیے۔“

فرزان صاحب۔  
نیلم بے اختیار ہی گھوم کر نیلم کے عقب سے نکلی اور فرزان کے قریب جا پہنچی۔ فرزان نے ایک نظر اسے اور پھر صوفوں پر بیٹھے ان دونوں اشخاص کو دیکھا جو نیلم کی بے قراری پر ایک دوسرے کو مثنیٰ خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نیلم نے فوراً ہی خود پر قابو پایا اور بولی۔

”بیٹھیں نا فرزان۔“ پھر ان میں سے ایک صاحب کو مخاطب کر کے بولی۔

”ٹھیک ہے سیف صاحب آپ برسوں تشریف لے آئیں۔ میں دُکسن کرتی ہوں۔ ان شاء اللہ ہمارا پرنٹنگ کاسٹار کام آپ ہی کریں گے۔“

”بہت شکریہ مس نیلم۔ ہمیں امید ہے آپ ہمارے کام سے مطمئن ہوں گی اجازت دیں ان شاء اللہ پرسوں ملاقات ہوگی۔“

”اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ دونوں افراد آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے نیلم اور فرزان ان دونوں کو خاموشی سے جاتا دیکھتے رہے۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی پھیل گئی اس خاموشی کو نیلم کی آواز نے مجروح کیا۔

”آپ کھڑے کیوں ہیں فرزان۔ بیٹھیں نا۔“

فرزان مشکل صوفے کی طرف بڑھا۔

”نہیں۔ نہیں وہاں نہیں آپ یہاں بیٹھیں۔“

نیلم نے بڑے صوفے کی طرف اشارہ کیا فرزان نے قدم اس طرف بڑھا دیے۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ میرے آفس آئے

ہیں۔“  
”آپ نے دعوت دی تھی مس نیلم سو میں حاضر ہو گیا۔“ فرزان کے لہجے میں کچھ تھا۔ اس کے چہرے پر یک دم ہی شفق کے رنگ بکھر گئے ایک دلفریب مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ فرزان نے غور سے اس کے سراپے پہ نگاہیں دوڑائیں سیاہ رنگ کے سوٹ میں کھلے بالوں اور ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ پریشانی پر آئے بالوں کو ایک اوڑھے پیچھے کرتے ہوئے وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”جیسا آپ کے بارے میں سن رکھا تھا اس کی روشنی میں مجھے لگا تھا کہ شاید آپ ہمارے ساتھ کام کرنا پسند نہ کریں۔ میں تو مایوس ہو گئی تھی لیکن اب آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میری پریشانی دور ہو گئی۔“

لیکن جو اس قسم کی رسمی باتوں کا خیر مقدم کر لیتا وہ

فرزان ہی کیا۔  
وہ چند لمحے نیلم کی غزالی آنکھوں میں جھانکنے کے بعد گویا ہوا۔

”ہم سب اپنی اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں اور ہماری سب سے بڑی پریشانی دوسروں کی خوشیاں ہوتی ہیں یہ دیکھ کر کہ دوسرے خوش اور شادمان ہیں ہم خود پریشان اور غمزدہ ہونا شروع کر دیتے ہیں۔ جانتی ہیں کیوں مس نیلم۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر نیلم کی طرف دیکھا جو چہرہ دونوں تھیلیوں پر لگائے بڑی محبت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک تھی اور ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی لگتا تھا اس کی ساری سحرانگیزی فرزان کے الفاظ دلچسپ کے بحر میں ڈوب چکی ہو۔ جلد وہ سو سڑھ کر بولے۔  
فرزان کی شخصیت اس کے مقابلے میں صم ہو کر رہ جاتی تھی مقابلے اس کے لفظوں کے تانے بانے میں الجھ کر رہ جاتا تھا۔ نیلم کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا فرزان

کے الفاظ کا جامہ ایک نئی طرح اس نے خواہش پر لاری ہو گیا تھا اور وہ ان لفظوں سے زیادہ اس کے کنبیر لہجے کے فسون میں گم تھی۔ اس بے خودی میں وہ کیا بول رہی تھی لہذا ہنوز خاموش رہی۔ فرزان نے یہی سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

”ہم اپنی ہی مشکلات اور دوسروں کے چہرے ہی دیکھ کر رہے ہیں۔ ہم دوسروں کی تکلیفوں اور محبتوں پر نظر نہیں رکھتے بلکہ ہمارے سامنے صرف نی کی آنکھوں اور ہونٹوں پر کھلی مسکراہٹ ہی ہوا کرتی ہے۔“

فرزان چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا تو نیلم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔  
”اگر ہم اپنے اوپر غور کریں تو کیا یہ سچ نہیں کہ اندر سے ہم جتنے بھی دیکھی باریشان ہوں بیرونی طور پر خوش نظر آنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔“

فرزان نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور جب کو ٹٹولنے لگا نیلم اٹھی اور میز پر رکھا سنہری سگریٹ کیس اٹھا کر فرزان کی طرف بڑھا دیا۔ فرزان نے بغیر کچھ کے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا۔ نیلم نے لائٹر جلا کر شعلہ فرزان کے سگریٹ کے قریب کر دیا فرزان نے ایک طویل کش لے کر دھواں فضا میں پھوڑا۔  
نیلم لائٹر سے ہیلنے لگی۔ وہ کون سے مہمان تھے جن کے واسطے یہاں ایک لڑکی اپنی نیلم پر سگریٹوں کا انتظام رکھتی تھی فرزان نے اس پر غور نہیں کیا کمر پھر چونک گیا اس نے دیکھا نیلم اپنی تخریطی انگلیوں میں سگریٹ بائے ہونٹوں سے لگا رہی تھی۔

فرزان خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ نیلم نے سگریٹ سلاک کر دھواں فضا میں پھوڑا اور اس کا دھواں فرزان کے چھوڑے ہوئے دھوئیں سے مدغم ہو گیا۔ وہ خوشی کے عالم میں فضا میں دھیت رہی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔

فرزان دوبارہ کش لیتے ہوئے گویا بولا۔

”یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ ہماری مسکراہٹ اپنی پریشانی کو دوسروں سے چھپائے رکھنے کا

ایک ذریعہ ہوتی ہے کوئی نہیں چاہتا کہ وہ دوسروں کے سامنے خود کو غیر مطمئن ظاہر کرے، اگر وہ ناخوش ہے تب بھی دوسروں کے سامنے خود کو آسودہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ خود کو نا آسودہ اور غیر مطمئن ظاہر کرنا دراصل اپنی بے آبروئی کا اعتراف اور شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ لیکن ہم اندر سے وہی ہوتے ہیں جو اصل میں ہیں اور اندر۔ اندر صرف آنسو بھرے ہوئے ہیں بس۔ لیکن ہم باہر سے خوش نظر آنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی ہمیں دیکھتا ہے تو ہمیں مسکراتے ہوئے پاتا ہے اور اس کے برعکس جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے۔ خود کو مصائب اور آلام میں گھرا پاتا ہے۔“

فرزان کی بات پر نیلم نے اپنے ہونٹ سکڑے تھے فرزان نے اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزرتے دیکھا تھا۔ وہ کچھ دیر غیر ارادی طور پر خاموش رہا۔ پھر نیلم ہی نے کہا۔

”لگتا ہے فرزان صاحب آپ بھی اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں ہیں۔“

فرزان نے اسے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

سانوں کا بوجھ ڈھونے کو جینا کو اگر زندہ ہیں زندگی کی جھاڑوں کے روپ میں فرزان نے حسب عادت شعر سنایا۔

”صرف سانوں کا بوجھ ہی اٹھاتا ہے یا کسی اور کا بوجھ بھی اٹھانے کی سکت رکھتے ہیں۔“ نیلم نے مخمور لہجے میں پوچھا فرزان کسی احساس کے تحت سنبھل کر بولا۔

”مس نیلم ایک شخص نے اپنے مصائب اور آلام سے گھبرا کر اپنے رب سے دعا کی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے غم اور دکھ نہ دے کیونکہ اگر میں پریشانیوں کا حق دار ہوں تو یقیناً مجھے یہ ملنی چاہیے۔ لیکن میرے مالک اتنا کہنے کی اجازت تو ہو کہ مجھے حد سے زیادہ پریشانیوں میں مت ڈال، دنیا کا ہر شخص ہنسی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔ ہنستا مسکراتا نظر آتا ہے، لیکن میں



ایکلا پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہوں۔ غم کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہوں۔ آخر میں نے ایسا کیا گناہ کیا ہے؟ اے میرے رب میری فرما اور اپنی رحمت سے میرے مصائب کے بدلے کسی نئے عذاب کا عذاب دے۔ میرے دکھوں کو اپنی پسند کے کسی اور شخص سے بدل دے میں قبول کر لوں گا۔

فرزان کچھ دیر خاموش رہا۔ نیلم اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی اس کے اگلے جملے کی منتظر تھی۔ کچھ لمحوں بعد فرزان گویا ہوا۔

”اس رات اس نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ ایک بہت بڑی عظیم الشان حویلی ہے کیا دیکھا ہے کہ لاکھوں لوگ اپنے کندھوں پر اپنے اپنے دکھوں کے گھنٹہ لاد کر چلے آ رہے ہیں۔ دکھوں اور پریشانیوں کے اتنے بھاری بوجھ دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور ذہنی طور پر الجھ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے بڑوسی کو دیکھا۔ جسے اس نے ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھا تھا اور ہر صبح اس نے جب بھی اس کی خیریت دریافت کی وہ یہی جواب دیتا کہ اللہ کا شکر ہے سب کچھ بہتر ہے۔

لیکن اس کا وہی بڑوسی اب اپنے دکھوں کا اتنا ہی بوجھ اٹھائے ہوئے تھا جتنا کہ خود اس کا اپنا تھا۔ کیا عقل مند کیا ہے وقف کیا امیر کیا غریب کیا محت مند کیا بیمار ہو گئی ایک جتنا بوجھ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ وہ حیرت کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ لوگوں کی مصیبتوں کو آج اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

اچانک ایک بلند آواز سنائی دی۔

”پاپی اپنی گھنٹی بجا کھوئی پر لٹکاؤ۔“

اس آدمی سمیت ہر شخص نے ایسا ہی کیا۔ کیونکہ ہر شخص اپنے دکھوں سے فوری نجات چاہتا تھا۔ آواز دوبارہ بلند ہوئی۔

”اب جو بھی چاہے اپنی پسند کی گھنٹہ بجاتے۔“

فرزان لکھ بھر کور کا اور نیلم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

آپ سمجھ رہی ہوں گی اس آدمی نے کسی دوسرے

کی گھنٹہ بجاتی ہوگی۔ نہیں۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اس سے پہلے کہ کوئی اور اس کی گھنٹہ بجاتا اس نے بے تعلقت اپنی گھنٹہ بجاتی کر لیا۔ اس نے اپنی ہی گھنٹہ بجاتی حاصل کرنا بہتر سمجھا۔ کیونکہ اس کے اندر موجود مصائب کا وہ نیلم سے ہی عادی تھا۔ کیا خبر دوسروں کی گھنٹہ بجاتی میں کس قسم کے مصائب بھرے ہوئے ہوں۔

پھر اس آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ جس نے اس کے دکھ اسے واپس کر دیے تھے۔ اس نے آئندہ کے لیے اس قسم کی کوئی سی بھی دعا مانگنے سے توبہ کر لی۔

قصہ مکمل کرتے ہی فرزان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ارے کیا ہو گیا، آپ کھڑے کیوں ہو گئے، بیٹھے نا۔“ نیلم نے بے اختیار کہا تو فرزان نے جواباً کہا۔

”اٹھانے کی سکت بھلے ہی موجود ہو، لیکن اپنا ہی بوجھ اچھا ہوتا ہے، دوسروں کا نہیں۔“

میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی مس نیلم میں چلتا ہوں۔“

فرزان کی بات سن کر نیلم کے دماغ میں دھماکے ہوئے تھے۔ فرزان جو اس دوران چلتا ہوا بیرونی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھ کر پلٹتے ہوئے گویا ہوا۔

جس کی خاطر سر کٹانے ہم گئے قاتل کے پاس رسم الفت وہ ادا کرتے ہوئے ڈرتے رہے۔

ان کو اپنی ذات سے بڑھ کر رہا محشر کا خوف اور ہم ذکر خدا کرتے ہوئے ڈرتے رہے۔ فرزان نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ جبکہ نیلم اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی رہ گئی۔

\*\*\*

”اس طرح ساکت خاموش اور گم سم کب تک بیٹھی رہوگی۔ تقدیر پر شاکر رہنا سیکھو۔“ میراں مدرانہ انداز میں بولی۔

”نازہ چھوٹے، مرغ چھوٹے۔ گرم چھوٹے۔“ ہر کلمے میں بلند ہوتی غلام عیسیٰ کی مخصوص آواز ایک سنائی دی۔ صبح ہی صبح ناشتے کے وقت سنائی دیتی یہ آواز ہمیشہ کا معمول بھی چونہ جانے کب سے اس منظر کا حصہ تھی۔ یہ گلیاں اور ان گلیوں کے مکین اس آواز سے مانوس تھے۔

”ہاں یہ تفریق یہ تضاد کیوں۔“ وہ کراہ اٹھی۔

”ایسا کیوں ہوتا ہے آخر! کچھ لوگ تو منہ میں سونے کا چھچھ لے کر پیدا ہوتے ہیں اور کچھ ایک چھچھ تاج کے لیے ترس رہے ہوتے ہیں۔ کچھ پیدا انٹی امیر کچھ لوگ غربت کی آغوش میں جنم لیتے ہیں۔ کیوں ہے یہ تفریق۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔“

”ایسا نہیں کہتے بیٹا، یہ اللہ کا نظام ہے۔“ میراں نے نوا۔

”کیوں ہے یہ نظام کیا سکون اور خوش حالی پر ہمارا کوئی حق نہیں۔“ ایک ایک کر کے اندر کے سارے زخم اس کی زبان سے جھلستے ہوئے باہر آ گئے۔

”شکوہ کے بجائے شکر ادا کرو۔ ہم بہت سے لوگوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔“

”نہیں۔ کوئی بہتر زندگی نہیں گزار رہے۔“ وہ معترض ہوئی۔ میراں نے اپنی انتہائی فریادیں ہر وارے صابر اور ہمیشہ قانع رہنے والی بیٹی کو حیرت سے دیکھا۔ وہ ایسی نہیں تھی اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ اب اس کے منہ سے یہ باتیں سن کر میراں حیران نہ ہوئی تو کیا ہوتی۔

وہ کچھ دن سے اس کی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ذہن، سمجھ دار بیٹی دنیا کو غم و حسرت کے قلاب کے اندر سے دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سوالیہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جو بہت پھر تکی اور خوش دلی کے ساتھ ان حالات سے نبھتا تھا۔ جس نے ہمیشہ ماں باپ کو قوت اور توانائی سے سرشار کیا تھا اب خاموش اور مضمحل۔ رہنے لگی تھی۔

”ماہم بیٹا تم تو میری قوت تھیں۔ تم ایسی باتیں

کر رہی ہو۔“

”ہاں مجھے اب کا سائیکل پر گھوم پھر کر گلی گلی خوار ہو کر چھوٹے بچپنا دکھی کرنا ہے۔ اتنی جان تو زحمت انہیں دقت سے پہلے بڑھا کر رہی ہے۔“

”نہیں تو اپنے باپ پر فخر کرنا چاہیے کہ تم غلام عیسیٰ جیسے عظیم باپ کی اولاد ہو۔ وہ اپنی حق حلال کی کمائی سے اپنے بچوں کی پرورش کر رہا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے اعلا مستقبل کے خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے وہ اتنی محنت کر رہا ہے۔“

ماہم نے اپنی ماں کو دیکھا۔ کم عمری میں ہی ان کے ماں بہت تیزی سے سفید ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر ٹیکرس بڑ گئی تھیں۔ ہنسا تو وہ عرصے سے بھول چکی تھیں۔ وہ بھی تو اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاری تھیں۔ صبح ہی صبح اٹھ کر سمسوے اور وہی بڑے بنا کر قریب ہی اسکول کی کینٹین میں پہنچتی تھیں۔

”آپ بھی اتنی محنت کرتی ہیں کیا زندگی بس محنت کرتے رہنے کا نام ہے۔“ وہ ایک بڑھی لکھی بی بی کام کی اسٹوڈنٹ ہو کر اس طرح کی گفتگو کر رہی تھی۔ میراں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”تمہارے اندر یہ کس قسم کے جذبات اور سوالات سر اٹھا رہے ہیں۔ بیٹا آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی میں اتنا بڑھاؤ آتے ہی ہیں۔ ہم انسانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم زندگی کے بہت زیادہ حصے کو یک دم مٹھی میں کر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم ساری زندگی کو ایک سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک ہی دن میں پوری زندگی بسر نہیں کرتے۔ زندگی میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا یعنی کئی الگ الگ رنگ بھرنے پڑتے ہیں۔“

ماہم نے اپنی ماں کو دیکھا جس نے کسی اسکول سے نہیں بڑھا تھا مگر بڑھے لکھے لوگوں کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔

”آپ یہی سوچتی ہیں ناکہ یہ دقت گزر جائے تو آنے والا وقت بہت حسین ہو گا۔“



”ہاں میں پر امید ہوں۔“ میراں نے سموسوں کی  
ٹرے سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے فخر ہے کہ میں غلام عسائی کی بیوی ہوں۔ اس  
عظیم انسان کی بیوی جو سائنکس پر کھوم پھر کر، کئی کئی  
خوار ہو کر چھوٹے بیچتا ہے۔ لیکن وہ تمہاری بڑھائی کا  
سارا خرچ اٹھا رہا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے اعلا مستقبل کے  
خواب دیکھتا ہے۔ وہ سختی محض قابل تضحیک نہیں  
بلکہ تمہیں تو اس کی بیٹی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔

مجھے دیکھو۔ میں سارا دن اسکول کی کیتھین میں  
یہ سموسے اور دہی بڑے بیچتی ہوں، لیکن مجھے فخر ہے  
کہ میں تمہارے باپ کا بوجھ بانہتی ہوں۔ اس کا ہاتھ  
بٹاتی ہوں۔ تم صاف ستھرا لباس پہنتی ہو۔ پریس کیا ہوا  
یونیفارم پہن کر کالج جاتی ہو، تمہیں کس بات کی  
شرمندگی ہے کیا اس بات کی کہ تم ایک چھوٹے  
والے کی بیٹی ہو یا اس بات کی کہ تمہاری ماں ایک  
اسکول کی کیتھین چلاتی ہے۔

اچھے کپڑے پہنتی ہو، پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہو، گھر  
کا آرام تمہیں حاصل ہے۔ کالج جاتی ہو۔ تعلیم  
حاصل کر رہی ہو۔ پھر تمہارے ہونٹوں پر یہ شکوہ  
کیوں؟ ہم نے تو تمہیں ایک ایک لقمہ رزق حلال  
کھلایا ہے، محنت کر کے، پال پوس کر تمہیں جوان کیا  
ہے۔ اسی ماحول میں تم نے سانس لیا ہے اور اسی انداز  
میں تم نے پرورش پائی ہے۔ تمہاری پلکوں پر سہانے  
خواب کس نے ٹانک دیے۔ جس ماحول سے آج تم  
بے زاری کا مظاہرہ کر رہی ہو اسی ماحول میں زندہ رہتے  
مجھے بیس سال بیت گئے۔ خواب دیکھنا بری بات نہیں  
بیٹا، مگر اپنی اصل کو اپنی بنیاد کو نہیں بھولنا چاہیے۔  
اپنی محنت سے کوئی مقام حاصل کر لینا ہرگز برا نہیں،  
کسی دوسرے کو حقیر سمجھنا انسانیت کے منافی ہے، جو  
کسی صورت بھی درست عمل نہیں۔“

میراں بہت دن سے ماہم کے بدلے انداز نوٹ  
کر رہی تھی۔ آج موقع ملا تو سمجھانے بیٹھ گئی۔ میراں  
کی بات ختم ہوتے ہی ماہم جلدی سے بولی۔  
”اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مجھے آپ دونوں

کی اولاد ہونے پر فخر ہے، میں تو اللہ کی اس تعریف کی  
بات کر رہی ہوں جب سب انسان برابر ہیں تو پھر یہ اونچ  
’بیچ‘ امیری، غریبی، یہ طبقاتی فرق آخر کس لیے؟ سب  
انسان ایک جیسے کیوں نہیں؟ دولت اور درجات کی  
تقسیم کرتے ہوئے مالک نے مساوات سے کام کیوں  
نہیں لیا۔ آخر اس درجہ بندی کے پیچھے کیا اسرار ہے  
کون سی حقیقت پوشیدہ ہے جب سب انسانوں کے  
نقش و نگار، جسم، دل و دماغ سب چیزیں ایک جیسی ہیں  
تو رہن سہن میں اتنا فرق کیوں؟ آخر کس لیے؟ دل تو  
سب کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ جذبات تو ہر دل میں  
جاگتے ہیں تو پھر یہ تفریق کیوں؟ یہ تضاد کیسا؟“

”بنیاد تو کز رے گا تو یہ بات بھی تمہاری سمجھ میں  
آجائے گی۔ وقت سب کچھ سکھا، سمجھا دے گا تمہیں،  
میں تو بس اتنا جانتی ہوں دنیا کا تمام فلسفہ صرف دو  
لفظوں میں پوشیدہ ہے اور وہ دو لفظ ہیں برداشت اور  
عزم۔“

برداشت کرو اور عزم سے اپنی قوت کو کام میں بدل  
ڈالو، بے کار رہو گی تو وہیں پڑی رہو گی۔ ایک بات ہمیشہ  
یاد رکھنا مالک کے ہر کام میں کیا راز کیا، مجید ہے، وہی  
جانتا ہے، میں یا تم اس پر تنقید کرنے والے یا سوال  
کرنے والے کون ہوتے ہیں۔

چلو اٹھو، کالج جانے کی تیاری کرو میں بھی جا رہی  
ہوں۔“ میراں نے کہا، ماہم نے اٹھ کر میراں کے گلے  
میں پیار سے بازو حائل کیے اور لاڈ بھرے انداز میں  
بولی۔

”شاید آپ میری باتوں سے ناراض ہو گئیں۔ میرا  
مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ پھر بھی اگر آپ کو  
تکلیف پہنچی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔“ میراں نے  
غصے سے گردن جھٹکی اور چہرہ دوسری جانب گھمایا۔  
ماہم نے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں میراں کا چہرہ  
بھر کر ہار سے اپنی جانب گھمایا اور اس کی پیشانی پر ہوسہ  
دے کر ٹھٹکتے ہوئے بولی۔  
”معاف کرو ناں۔“



”کیسے معاف کروں“ نقصان کیا تمہارا باپ پورا کرے گا؟“ کمرے میں ایک دھاڑی ہوئی آواز گونجی۔

”معاف کر دیں ملک صاحب“ غلطی ہوئی“ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ جواباً وہی فریادی آواز بلند ہوئی۔

یہ ایک حال کرہ تھا جس میں جگہ جگہ سالن بکرا بڑا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں بے ترتیب انداز میں رکھا ڈبل بیڈ جس پر بیچے فوم کے گدے پر جا بجا پیٹ کے دھون کی مینا گاری نظر آرہی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ بڑا ہوا کھری سیٹر صوفہ سیٹ جس پر دیواروں اور کھریوں سے اتارے گئے پردوں کا ڈھیر تھا۔ صوفوں کے سامنے بڑی سی جہازی ساز کی ٹیبل اور اس پر رکھا ہوا کمپیوٹر بھی پیٹ سے بنے ہوئے نقش و نگار سے محفوظ نہ تھا۔

ایک کونے میں دیوار کے ساتھ فولڈ کیے ہوئے کارپٹ کھڑے کر دیے گئے تھے۔ میز می اور اسٹول جنہیں عرف عام میں ”گھوڑی“ کہا جاتا ہے کی کمرے میں موجود تھیں۔ اس بات کا ثبوت تھی کہ یہاں پیٹ کا کام کیا جا رہا تھا۔ ایک طرف آٹھ کتا ہوا ڈرم بھی موجود تھا۔ جس میں ڈسٹمبوتیار کر کے رکھا گیا تھا۔ بائیں نما چھوٹے چھوٹے ڈبے برش اور اسکرپر جا بجا بکھرے نظر آ رہے تھے۔

وسطی حصے میں موجود بیڈ کے اس کونے پر براجمان کلف لگا کر ڈاکٹا سوٹ پہنے اکڑ کر بیٹھا ہوا وہ نوجوان اس منظر میں مس فٹ محسوس ہو رہا تھا۔ باریک نوکیلی مونچھیں گندمی رنگت، غلائی آنکھیں، مضبوط جسمت کا مالک یہ نوجوان کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گتے کا ایک چوکور ڈبا موجود تھا۔ جس میں ایک خوب صورت قیمتی سوٹ سجایا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سس پکڑے کا یہ پھول دار سوٹ اس وقت پیٹ کے رنگ برنگ کے دھبوں سے لتھڑ کر عجیب و غریب صورت اختیار کر گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پیٹ کے یہ چھوٹے بڑے بے ترتیب دھبے کپڑے کے ڈیزائن کا حصہ ہوں۔

سامنے ہی بیٹوں کے نیچے سے ہاتھ گزار کر کاتوں کو

پکڑے ہوئے ایک شخص مرعبا ہوا تھا۔ جس کی کمر کم از کم پندرہ اینٹیں جتنی ہوئی تھیں۔ دائیں بائیں آوی ہاتھ باندھے مودب کھڑے تھے۔ بیڈ پر بیٹھے کلف لگے نوجوان کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ چہرہ لال بھسوا کا ہو رہا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے مرعبا شخص دوبارہ منمنایا۔

”آپ کو اللہ کا واسطہ ملک صاحب“ ایک بار معاف کر دیں“ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

ملک کے چہرے پر مزید تھوڑے کے اثرات پیدا ہو گئے۔

”اوئے تم کیا سمجھتے ہو“ تمہاری جس ماں کے لیے میں نے یہ سوٹ خریدا تھا اسے تمہاری یہ ڈیرا ٹنگ بہت پسند آئے گی۔“ ہمیں جیسی بڑی بڑی آنکھیں ہیں تمہاری“ تمہیں ٹیبل پر رکھایا ہوا ڈبا نظر نہیں آیا۔ اسے اٹھا کر بند نہیں کر سکتے تھے۔ کیا حال بنایا ہے تم نے پورے کمرے کا میں نے کچھ نہیں کہا“ لیکن یہ سوٹ۔

اوئے فضل دین دس اینٹیں اور رکھ اس کے اوپریس۔“

نوجوان ملک صاحب نے غصے کی شدت سے دھاڑتے ہوئے مودب کھڑے ایک شخص کو مخاطب کیا تو وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور مرعبا شخص کی کمر پر رکھے ہوجھ میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

ملک صاحب بھی شاید اپنی جگہ ایک ہی تھے جنہیں اس کمرے میں قیمتی فرنیچر، کمپیوٹر اور دوسری پردوں کے بجائے صرف ایک سوٹ کے خراب ہونے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت تو یہ تھی کہ کمرے میں موجود ہر چیز کا بڑھ بڑھ عرق ہو چکا تھا۔ ملک صاحب نے دوبارہ سوٹ پر نظر کی تو ان کا غصہ دوچند ہو گیا۔ انہوں نے قریب ہی بیڈ پر رکھی کن اٹھائی اور قدم چلے ہوئے مرعبا شخص کی جانب بڑھنے لگے تو اس شخص کی فریاد میں شدت آگئی۔

”معاف کر دیں ملک صاحب“ آئندہ احتیاط کروں گا۔ بس ایک بار معاف کر دیں۔“

لیکن ملک صاحب کے کان پر جوں تک نہ پہنچی۔ انہوں نے گمن کو تنال کی جانب سے پکڑا اور تھاکر پوری قوت سے اس شخص کی تشریف پر جما لیا۔

”معافی دے دو ملک صاحب؟“ مرعبا شخص انہوں اور بیروں کے بل آگے کی طرف سرکتے ہوئے کھینچا لگا۔ لیکن ملک صاحب گمن دوسری طرف نے فضا میں بلند کر چکے تھے اور دوسری بار بھی انہوں نے پوری قوت سے گمن اس شخص کو رسید کر دی۔ پھر اس پر بھی بس نہیں ہوا“ ملک صاحب کا پاؤں ہوا میں بلند ہوا اور انہوں نے زوردار ٹھوکرا اس شخص کے پہلو پر مار دی اور وہ بیٹوں سیت لڑھک کر رو رہا جا کر۔

”اوئے فضل دین گاڑی نکالو۔“

اور فضل دین بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ملک صاحب نے گمن دوسرے مودب کھڑے آوی کی جانب اچھال دی۔ جسے اس نے بڑی خوب صورتی سے کچھ کر لیا تھا۔ ملک صاحب نے آگے بڑھ کر زمین پر پڑے آوی کو ایک اور ٹھوکرا سید کرتے ہوئے کہا۔

”تو رفق ملک نام ہے میرا۔“ اور پھر پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ معاً گاڑی اشارت ہونے کی آواز ابھری اور پھر روہوتے ہوئے معدوم ہو گئی۔ کمرے میں گمراہ سکوت طاری تھا۔ بس کبھی کبھی زمین پر بکھرے پڑے شخص کی سسکاری کی گونج اچھتی تھی۔

ہم کو سی بازی نہ کسی چال نے مارا مارا تو ہمیں شامت اعمال نے مارا باہر تو کوئی دشمن جاں اپنا نہیں تھا یا رول ہمیں اندر کے خود چال نے مارا

”کیا آپ کی خدا سے ملاقات ہوئی۔“ ضیفغ نے سوال کیا۔

”ہاں بالکل صبح کام پر آتے ہوئے راستے میں ملا

”سلام دعا ہوئی“ پھر میں نے کہا۔ ”شکر ہے آپ نے کیسے۔“

”مجھے تمہاری سوچ پہ حیرت ہے یار“ یہ بالکل دیا

یہ سوال ہے جیسا کسی پولیس والے سے توقع کی جاسکتی ہے۔“

فرزان نے حسب عادت ہر سکون لمحے میں کہا۔

”درا تم میرے ایک سوال کا جواب دو کہ کیا خدا کبھی کسی سے جدا ہوا ہے۔ بھائی میرے اس قسم کا کوئی خدا نہیں ہوتا باغرض محال ایسا ہو بھی جائے تو وہ خدا آپ کی اپنی تخلیق ہو گا اور اس سے ملنا ملنا تنائی پر فریب ہو گا جتنا کہ اسے کھودیتا۔

خدا کو پانا۔ خدا کو حاصل کرنا۔ خدا سے مل لینا۔ یہ الفاظ بہت گمراہ کن ہیں۔ کیونکہ میں اگر کہوں کہ خدا مجھے مل گیا تو اس کا مطلب ہو گا کہ میں نے اسے گمشدہ فرض کر لیا تھا۔ وہ تو پہلے سے ملا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہم اسے کھو بیٹھے ہیں تو وہ پھر بھی ہمارے ساتھ ہو گا۔“

فرزان خاموش ہوا تو اس زیر تعمیر عمارت کے اس مخصوص ہال کمرے میں گمراہ سکوت طاری ہو گیا۔ جہاں وہ اس سے پہلے بھی بیٹھا کرتے تھے۔

حسب معمول آج بھی فرزان، استاد اچھو اور کھاری سب کے سب وہاں موجود تھے۔ تب یا سر ضیفغ کو لے کر وہاں آؤمکا۔ ضیفغ ادھر سے گزر رہا تھا تو فرزان کی خیریت دریافت کرنے اور کشاپ لگیا اور یا سر اسے ساتھ لے کر ان کے مخصوص ڈیرہ پر پہنچا۔ جہاں وہ روزانہ دوسرے وقت بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور دیگر ”شوق“ بھی پورے کرتے تھے۔

فرزا“ فرزا“ سب سے مصافحہ کر کے اور خیریت دریافت کرنے کے بعد بیٹھے ہی ضیفغ کا پہلا بے تکا سوال تھا جس کا فرزان نے مکمل اور جامع جواب دیا تھا۔

تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر وقت ہمارے ساتھ ہے اور ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے“ یہی نا۔ لیکن تمہارے میں تو تم کچھ اور کہہ رہے تھے۔“ ضیفغ نے سنجیدگی سے کہا۔

میں تماشا تو نہ تھا“ پھر بھی تماشا بن کر میں نے خود شان بڑھائی ہے تماشائی کی



”نہیں میں یہ نہیں کہہ رہا۔ میں اب بھی وہ کہتا ہوں۔ میں سمجھنے کا فرق ہے۔“  
حضرت نے نا سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا تو فرزان بولا۔

”پلو میں سمجھتا ہوں، شاید بات تمہاری عقل میں آجائے۔“

دیکھو میں یہ کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ اگر تم مجھے ڈھونڈنے نکلو گے تو پہلے تمہیں میرے لباس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر تم میرے کپڑوں سے ہی خوف زدہ ہو گئے تو تم مجھ سے کبھی بھی واقف نہیں ہو سکو گے۔ ہاں اگر تم میرے لباس سے ڈرے بغیر مجھ سے نزدیک تر ہوتے جاؤ گے تو لباس کے نیچے تمہیں میرا جسم ملے گا۔ درحقیقت میرا جسم بھی تو میرا لباس ہی ہے۔ اگر تم جسم کو تسلیم نہیں کرتے تو اس تک رسائی کیسے حاصل کرو گے جو اندر موجود ہے۔ وہی ایک۔ جس سے ملنے کا ہر کوئی خواہش مند ہے۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ جسم کی دیوار اس ہٹا کر وہ خود بڑے وقار کے ساتھ اندر بیٹھا ہوا ہے۔ جسم فانی اور وہ اندر موجود لافانی۔

یہ تاجرت کی بات؟ لیکن سچ یہ ہے کہ جب تک خدا کو کوئی اپنے اندر محسوس نہیں کرے گا وہ اس کو کہیں بھی نہیں پہچان سکے گا۔ جس نے ابھی تک اس کو اپنے اندر نہیں پایا وہ اسے کسی دوسری جگہ کیسے شناخت کرے گا۔ پہلے آپ خدا کو اپنے اندر محسوس کریں۔ خود محسوس کریں گے ہی نزدیک ترین راستہ ہے۔

من و تو کے مابین فرق صرف اسی وقت تک رہے گا جب تک تم اپنے اندر کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ جب ہم اپنے آپ میں داخل ہوں گے تو ”میں“ کے ساتھ ساتھ ”تو“ بھی غائب ہو جائے گا۔ اس کے بعد جو بچے گا وہ ”کل“ کہلائے گا۔ وہی سچ ہے۔

جس روز مہاتما بدھ کو عرفان حاصل ہوا لوگوں نے اسے گھیر لیا اور پوچھا۔

”تم کو کیا مل گیا۔“ مہاتما بدھ نے جواب دیا۔  
”مجھے کچھ نہیں ملا۔ میں یہ ہوا ہے کہ میں نے اسے

دیکھ لیا جو مجھ سے کبھی دور نہیں تھا۔ مجھے وہ مل گیا ہے جو میرے پاس پہلے سے موجود تھا۔“  
گاؤں کے لوگوں نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا۔  
”یہ تو بہت برا ہوا۔ آپ کی محنت رائیگاں ہو گئی۔“  
مہاتما بدھ نے جواب دیا۔

”ہاں میں نے بے کار اپنی مشقتیں اٹھائیں۔ لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے اب اس کی محنت میں نکلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب میں تلاش میں بھگوں گا نہیں۔ میں جان چکا ہوں کہ میں وہیں ہوں جہاں پہلے تھا اور میرے لیے یہی سب سے بڑا فائدہ ہے۔“

فرزان نے اپنی بات ختم کی تو ضعیف سر ملاتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھ گیا فرزان تمہارا کہنے کا مقصد ہے کہ جس کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے وہ ہر چیز کی حقیقت جان لیتا ہے۔“ فرزان نے بغور اس کی جانب دیکھا اور پھر گویا ہوا۔

”ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں۔ اس دن بھی میں یہی کہہ رہا تھا۔ جو تمہارے پولیس والوں کی سمجھ میں کسی صورت نہیں آسکتا تھا اور یہ ہمارے مذہبی ٹھیکیدار اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ جن کو ہم پیشوا سمجھتے ہیں۔ دراصل ان مسائل کی تہ میں وہی ہوتے ہیں۔ وہی سارے فسادی جڑ ہیں جو کہتے ہیں لوگوں کو تبلیغ کرو کہ دشمنی چھوڑ کر سب ایک ہو جائیں، لیکن اپنا اپنا نکتہ نظر مسلط رکھنے والے یہی لوگ تصادم کے ذمہ دار بھی ہیں۔“

جب تک ان لوگوں کے خدا مختلف رہیں گے۔ عبادت گاہیں مختلف رہیں گی، دعائیں مختلف رہیں گی، فرقہ بندی کی یہ دبا ختم نہیں ہوگی۔ پہلے آدمی اللہ تو ایک پیار ایک محبت کا نام ہے جو تھا جو ہے جو رہے گا، وہی رب ہے۔ وہ جو مسجد میں ہے، قتل گاہوں میں بھی اتنا ہی موجود ہے۔ معبد میں بھی وہی ہے اور خانقاہوں میں بھی وہی ہے۔ چور کے اندر بھی وہی ہے اور درویش میں بھی وہی ہے، کیا ہندو، کیا مسلمان، سب

اسی راہ میں ہیں۔ مگر یہ بات میں کر سکتا ہوں کوئی کر سکتا ہے، تم کر سکتے ہو ضعیف رشد، لیکن حضرت نہیں۔ کیونکہ اگر وہ بات مان لیں کہ وہی ایک بات جو ہر جگہ سب میں کار فرما ہے تو ان کی خدا سازی کی منفعت کو ناقابل تلافی نقصان سمجھیں گے۔“

سب ملگ بٹھتے تھے، کیونکہ فرزان آج کچھ زیادہ بول گیا تھا۔

ضعیف کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے۔ پھر وہ بے اختیار اٹھا اور بولا۔

”تم۔ میں چلتا ہوں۔ شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“ اور پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

فرزان نے ایک اچھتی ہوئی سی نظر سب کے چہروں پر لپکی پھر گویا ہوا۔

آسمان سے بھی پرے پرواز دل  
معجزہ ہے یا کہ ہے انجاز دل  
پوچھتے ہو کیا ہمیں رہنے بھی دو  
کیا کرو گے جان کر تم راز دل

جاسن اور فالسے کے درختوں میں چھپے ہوئے اس گہری سفید پتھروں سے بنی بلند دیواریں سکون و اطمینان کے ساتھ مضبوط چھت کو اپنے سروں پر لیے خاموش کھڑی تھیں۔

صاف و شفاف سرخ اینٹوں سے بنا ہوا صحن وسیع و باریک اور مغربی پہلو میں لگا سب سے گھنا برگد، اس بڑے برگد پر سارا دن سبز چٹیاں سرخ رنگ کے پتھروں کو کتر کتر کر چھینتی رہتی تھیں اور صحن گندا کرتی رہتی تھیں۔

ذکیہ بیگم اور زارا دن میں کئی بار صحن صاف کرتیں تھیں، کبھی تو جھینلا بھی جاتیں لیکن کوئی بھی ان درختوں کے کاٹنے کے حق میں نہ تھا۔

زارا نے پہلے تو کھلے دروازے کو حیرت سے دیکھا پھر ان میں قدم رکھ دے صحن خلاف معمول پتوں اور

جامنوں سے رنگین ہو رہا تھا۔ ذکیہ بیگم صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے صحن صاف کرتی تھیں صحن میں بکھرے پتے اس بات کے گواہ تھے کہ آج ان پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے زارا اپنی حیرت پر قابو پائی آگے بڑھی۔

ذکیہ بیگم پر پنی دروازہ بند کرنے کے ارادے سے صحن میں آئی تھیں زارا کو دیکھ کر ٹھیک گھنٹہ حیرت سے ارد گرد دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ذکیہ بیگم کو سامنے سے آتے دیکھ کر تیز قدموں سے ان کی طرف بڑھی۔

”السلام علیکم امی۔ خیر بہت تو ہے یہ دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے۔“

”علیک السلام۔ دودھ لینے آئی تھی۔ دودھ والے سے پتیلی پورچی خانے میں رکھ کر اب دروازہ بند کرنے ہی آ رہی تھی۔“ آواز اندر آئی۔ ”ذکیہ بیگم پلٹ کر اندر دنی سے کی جانب بڑھ گئیں زارا ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔

”مجھے پتا چلا تھا کہ بابا لاہور میں ہیں اور ان کی طبیعت ناساز ہے۔“ ذکیہ بیگم جو اس دوران کمرے میں داخل ہو رہی تھیں رک کر مڑتے ہوئے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”رات فرزان ذکر کر رہے تھے لیکن جس انداز میں۔“ زارا جو بات کرتے کرتے کمرے میں داخل ہو چکی تھی فیضی صاحب پر نظر پڑتے ہی جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی ذکیہ بیگم نے درزیدہ نظروں سے فیضی صاحب کی طرف دیکھا کیونکہ ان کے دماغ میں زارا کا ادھورا جملہ مکمل ہو چکا تھا۔

”جاؤ میں نے ناشتا تیار کر دیا ہے۔ اذان کو اس کے کمرے سے بلا لاؤ اور اسے ناشتا کروادو۔“ ذکیہ بیگم نے بات کو سنہالتے ہوئے جلدی سے کہا۔

زارا! فیضی صاحب کو سلام کر کے ان کی طبیعت پوچھ کر کمرے سے باہر نکل گئی پھر ہی در بعد اذان ان



کے کمرے میں داخل ہوا۔

”بابا آپ نے ناشتا کیا؟“ اذان نے فیضی صاحب سے پوچھا تو ان کے جواب دینے سے پہلے ذکیہ بیگم پریشانی سے بولیں۔

”ان کی طبیعت بہتر نہیں شاید سفر کی وجہ سے تھکن ہو گئی ہے۔ تم نے ناشتا کر لیا ہے تو گاڑی لے آؤ اور اپنے بابا کو اسپتال لے جاؤ۔“

”میں اس کی ضرورت نہیں۔“ ڈاکٹر نے نسخہ لکھ کر دیا تو تھام دی وہ ادائیاں لے آؤ۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ فیضی صاحب نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ٹھیک ہے بابا جانی! میں وہی دوائیں لے آتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں“ اذان جو اس دوران بیڈ کے قریب پہنچ چکا تھا بات مکمل کرنے کے بعد ذکیہ بیگم کی طرف جھٹکتے ہوئے بولا۔

”اسی میں ڈاکٹر کو یہیں لے آتا ہوں۔“ پھر کچھ ہی دیر کے بعد اس کی بائیک ڈاکٹر غلیل الرحمان کے کلینک کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا اور ڈاکٹر صاحب بھی شاید ابھی سوچتے تھے کیونکہ کلینک پر زیادہ رش نہیں تھا اذان ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں صرف دو تین مریض نظر آئے ڈاکٹر صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد اذان بولا۔

”ڈاکٹر صاحب بابا جانی کی طبیعت کافی خراب ہے آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن پلیز آپ کچھ دیر کے لیے گھر چلیں۔“ ڈاکٹر صاحب جو ایک نسخہ تحریر کر رہے تھے اذان کو تسلی دیتے ہوئے بولے۔

”بس دو منٹ! ایک مریض ہے اسے بھی دیکھ لوں پھر چلتے ہیں۔“ اور پھر وہ چند منٹ جو ڈاکٹر صاحب کو دوسرے مریض کو دیکھنے اور اس کا نسخہ تجویز کرنے میں لگے اذان نے بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے گزارے پھر ڈاکٹر صاحب اذان کے ساتھ کلینک کے باہر نکلے اور اذان نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ڈاکٹر صاحب کو

لے کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر غلیل الرحمان جو بڑے علم دوست اور ادب نواز قسم کے انسان تھے وہ اذان اور اس کی فیملی کی بہت عزت کرتے تھے فیضی صاحب کے اچھے دوستوں میں سے تھے اور یہ ہی نہیں ان کے خاندانی معلق بھی ہے۔

بائیک نے ابھی بمشکل چند گز کا فاصلہ طے کیا ہوا کہ اذان کی جیب سے تنک تنک کی آواز بلند ہونے لگی اذان نے ایک ہاتھ سے موٹر سائیکل کنٹرول کرتے ہوئے جیب سے موبائل نکالا اور روڈ سے نظر ہٹا کر موبائل کی اسکرین پر ڈالی جہاں زارا ابھی کاٹم بنگ کر رہا تھا اذان نے کال ریسیو کرتے ہوئے موبائل کھن سے لگایا تو دوسری جانب سے زارا کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”سہلو اذان بھائی آپ کہاں ہیں جلدی سے گھر آجائیں بابا کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔“ اور اذان کا دل جیسے اچھل کر حلق میں اگیلا اسے اپنے ہاتھ پاؤں بے جان ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر آ رہا ہوں راستے میں ہوں بس ابھی آیا۔“ جملہ مکمل کرنے کے بعد اذان نے کال ڈسکنکٹ کر کے موبائل جیب میں ڈالا اور موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی۔ جو کئی گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے بائیک کھڑی کی۔ گھر کے اندرونی حصے سے زارا کی سنائی دی جانے والی دغخراش چیخوں نے اسے لرزاکے رکھ دیا۔ اذان جیسے صبر کاوا من چھوڑ بیٹھا وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بھگاتے ہوئے بولا۔

”نچ۔ جلدی آئیے ڈاکٹر صاحب۔“ اور پھر وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھے بنا بھاگتے ہوئے اندر جا پہنچا جہاں ایک روح فرسا منظر اس کا منتظر تھا۔

زارا ایک جانب کھڑی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی ذکیہ بیگم دونوں ہاتھ فیضی صاحب کے سینے پر رکھے روتے ہوئے اور جیسے انہیں جھنجھوڑتے ہوئے چیخ

رکھ رہی تھیں۔

فیضی صاحب آپ بولتے کیوں نہیں۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیں آپ کیوں نہیں بول رہے کچھ تو ہیں۔“ اذان بھاگ کر فیضی صاحب کے قریب پہنچا سینے سے کھن لگا کر ان کی دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ایک گہرا سکون، ایک گہمیر سا تھاجو ان کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ وہ فیضی صاحب کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بولا۔

”بابا جانی۔ بابا جانی۔“ ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

”ڈاکٹر صاحب جلدی آئیے نا۔ دیکھیں بابا جانی کو کیا ہو گیا۔ یہ کچھ بولتے کیوں نہیں۔“ اذان نے نمنناک لہجے میں فریاد کی۔

”پک جانب نہیں آپ۔“ ڈاکٹر صاحب نے اذان کو ہانپا اور فیضی صاحب کا ہاتھ اٹھا کر ان کی نبض چیک کی پھر ان کا ہاتھ چھوڑا تو وہ بے جان انداز میں بیڈ پر جا کر اچھا بیٹھ سکوپ نکال کر ان کی دھڑکنیں چیک کرنے لگے۔ لیکن بے سود۔ ڈاکٹر صاحب نے اسٹیتسکوپ ہٹا کر جیب سے منجھی سی ٹارچ نکال کر دونوں انگلیوں کی مدد سے فیضی صاحب کی آنکھیں کھول کر ان میں ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے بغور کچھ دیکھنے کی کوشش کی پھر جیب میں ڈالی اور ایک ہاتھ فیضی صاحب کے چہرے پہ پھیرتے ہوئے ان کی آنکھیں بند کر دیں۔

”آئی ایم سوری۔ اب یہاں کچھ باقی نہیں بچا ہم نے بہت دیر کروی۔“ ڈاکٹر صاحب نے افسردگی سے کما اور ڈھیلے قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اذان بے جان سے انداز میں بت بنا بیٹھا تھا اور کمرے میں ذکیہ بیگم اور زارا کی دل دہلا دینے والی چیخیں کونج رہی تھیں۔

بوڑھا برگد گرا ہے کیا اچھہ عزیزیں۔ ساتباں کھو بیٹھیں

پیارے بچوں کے لئے

## پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

## محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت - 300/- روپے  
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



## مستکدرہ

زویہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی، جبکہ زویہ ان سے بات کر کے کہے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوئی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ زویہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔ وہ روح کو بلائے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیہ، سنبھل اور نعل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نعل ان دونوں کو لچکی دعوت دیتی ہے۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، وکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کر لیتا ہے، اور انہیں سچے کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زویہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے۔

## ۲۷ ستائیسویں قسط





خرم کے بڑھتے قدم ایک لخت رک گئے۔ اس نے چونک کر زبیدی کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔  
 زبیدی کے چہرے پر خوف کے سائے نمایاں تھے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ناک درمی تھی اور چہرے کا رنگ  
 سفید پڑ گیا تھا۔ دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے وہ کسی ایک نکتہ پر نظریں مرکوز کیے کھڑی تھی۔  
 خرم نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ کسے دیکھ رہی ہے۔ سامنے کئی اسٹال لگے  
 تھے۔ جہاں بے شمار لڑکے لڑکیاں نا صرف کھڑے تھے، بلکہ آ جا رہے تھے۔  
 زبیدی کی بولڈوز چیخ پر تقریباً سب ہی رک کر اسے دیکھنے لگے مگر زبیدی کی محبت میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔  
 ”زبیدی تم ٹھیک ہوتا۔“ خرم نے اس کے نزدیک آکر آہستگی سے پوچھا۔ حالانکہ وہ شکل سے بالکل بھی ٹھیک  
 نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی چیز سے بری طرح ڈر رہی ہے۔  
 لیکن وہ چیخ کیا تھی؟ یہ خرم کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

”زبیدی۔“ خرم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اسے کس طرح متوجہ کرے۔  
 کیونکہ پہلے ہی وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے اور اب زبیدی کے چیخنے اور چیخنے کے بعد مورتی بن کر  
 ساکت کھڑے ہونے پر بھیڑا کھڑی ہوئی شروع ہو گئی تھی۔  
 ”کیا ہوا ہے زبیدی؟“ خرم نے نہایت دھیمی آواز میں وائٹ بیٹے ہوئے کہا۔ اسے اب غصہ آنا شروع ہو گیا  
 تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا ساری تیز نیلائے طاق رکھ کر اس کا بازو پکڑ کر جھجھو ڈرے۔  
 ”دوسرے وہاں۔“ زبیدی بے ربط انداز میں بولی تو خرم نے ایک بار پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور  
 اپنی جھنجھلاہٹ کو قابو میں رکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”وہاں کیا؟“

”دوسرے وہاں شائستہ خالہ۔“ زبیدی سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ جبکہ شائستہ خالہ کا نام سن کر خرم کی بے زاری  
 میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔

گویا اسے شائستہ خالہ کی روح نظر آ گئی ہے اور اس لیے وہ سنے بنائے کھیل کو بگاڑنے والی حرکت کر رہی ہے۔  
 اگر اس کا یہ یا گل پن کسی پر ظاہر ہو گیا تو اس پر رشک سے اٹھنے والی نظروں میں اس کے لیے تسخیر آئے گا۔  
 ”تو اس میں اتنا خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔“ خرم نے کوشش کرتے ہوئے اپنا لہجہ نرم بنالیا۔  
 وہ جلد سے جلد اس کی حالت نارمل کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر وہ اس قابل ہو جائے کہ وہ اسے لے کر کہیں بیٹھ  
 جائے۔

”دوسرے وہاں اس لڑکے کو مارنے والی تھیں۔“ خرم نے چونک کر مجمع کی طرف دیکھا۔  
 ”کے؟“ خرم نے بے ساختہ پوچھا تو زبیدی بے چینی سے مجمع کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے اس طرح چیخنے پر  
 بھیڑ میں اضافہ ہو گیا تھا اور اب اسے وہ چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا جسے اس نے کچھ لمحوں پہلے دیکھا تھا۔ بلکہ ایک طرح  
 سے وہ بھیڑ میں اسے ڈھونڈ رہی نہیں پاری تھی۔  
 لوگوں کو حیران اور متحس سا اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ مزید ہراساں ہو گئی تھی اور اب خرم کو مدد طلب نظروں سے  
 دیکھ رہی تھی۔

”دیکھو ایسا کو تم تھوڑی دیر کہیں بیٹھ جاؤ۔ ہم ہم کینٹین چلتے ہیں۔ وہاں چل کر ایک کپ چائے پو، تھوڑا  
 ریلیکس ہو جاؤ۔ پھر مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا، ٹھیک ہے۔“ خرم بڑی رسانیت سے بات کر رہا تھا۔  
 زبیدی کے چہرے کے تاثرات قدرے بہتر ہو گئے۔ وہ خوف زدہ تو اب بھی تھی۔ مگر خود کو کمپوز کرنے کی کوشش  
 شروع کر چکی تھی۔



”کیا شائستہ خالہ نے تمہیں بھی کچھ بتایا ہے۔“

”پتا نہیں وہ کچھ بتاتی ہیں یا نہیں۔ لیکن اکثر کچھ ایسی باتیں مجھے پتا چل جاتی ہیں جو مجھے بھی علم نہیں ہو سکتا۔“  
”وہ کیا؟“ خرم کو اب اس کہانی میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لیے وہ غیر محسوس طور پر سست روی سے میز کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ اسے یہاں اسی مقصد سے تولایا تھا کہ اس کے ساتھ گھومے گا اور جب تمام لوگ ان دونوں کو ساتھ دیکھ لیں گے تب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اسے واپس بھیج دے گا۔  
اب اگر گھومنے کے بجائے وہ دونوں ٹیبل پر بیٹھ کر لمبی گفتگو کر لیتے ہیں تو یہ تو اور بھی اچھی بات تھی سو بے بھی وہ لڑکی اتنی پورنگ نہیں تھی۔ بلکہ کسی سسپنس کی ممدوی طرح اب آگے کیا ہو گا کے اشتیاق میں اس کی تلو اس سنی جاسکتی تھی۔ بھلے ہی یقین نہ کیا جائے۔  
”میرے کالج کی ایک لڑکی اچانک غائب ہو گئی تھی۔ سب اسے تلاش کر رہے تھے، جبکہ مجھے پتا تھا وہ مریجی ہے۔“ خرم ’’ندو یہ کو دیکھتا رہ گیا۔

”مجھے نہیں پتا کہ مجھے کیسے پتا چلا، لیکن میں جانتی تھی اس کا پاؤں مڑ گیا اور کمرٹیں مرنے کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی۔“ ’’ندو یہ دیکھ لےجے میں بولی۔  
”اور تمہیں لگتا ہے یہ سب تمہیں شائستہ خالہ بتاتی ہیں۔“ خرم سناتے لہجے میں بولا تو ’’ندو یہ کمر سانس کھینچتے ہوئے ایسے خرم کو دیکھنے لگی جیسے اس کے پاس کچھ کہنے کے لیے نہ ہو۔  
اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ خرم کی تقلید میں چلتی ہوئی تا صرف میز تک آچکی تھی بلکہ کرسی تھمٹ کر بیٹھ بھی گئی تھی۔

”چاہیے تاؤ تمہاری دوست کو شائستہ خالہ نے کیوں زخمی کیا تھا۔“ خرم نے سرسری انداز میں پوچھا۔  
اسے صرف ’’ندو یہ کا جواب سننا تھا۔ ورنہ اسے کون سا اس کی بات پر یقین کرنا تھا۔ لیکن ذرا پتا تو چلے کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ اس کے خیالات و تاثرات کیا ہیں، لیکن خرم کو امید نہیں تھی کہ وہ جو جواب دے گی وہ خرم کو بل بھر کے لیے ساکت کر دے گا۔

”کیونکہ وہ میری دوست مجھ سے فائدہ اٹھانے کے لیے بنی تھی۔“ ’’ندو یہ ایسے بولی جیسے کسی ٹرانس میں بول رہی ہو۔  
کچھ دیر کے لیے ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ آخر خرم کو یہ وضاحت طلب کرنے کے لیے بولنا پڑا۔  
”میں سمجھا نہیں۔“

”اس نے کہا تھا میں روحوں کو بلانا جانتی ہوں تو میں نے اسے اپنے گھر بلایا تھا کہ میں شائستہ خالہ سے بات کر سکوں وہ سمجھ رہی تھی ایسی کوئی روح وغیرہ ہے ہی نہیں۔  
وہ میرے سامنے ڈرامہ کرنے لگی کہ شائستہ خالہ کی روح اس کے جسم میں گھس گئی ہے اور پھر وہ اپنے مطلب کے مطالبات کرنے لگی جیسے شائستہ خالہ مجھے تلقین کر رہی ہوں کہ

تم اس کے کام کر دیا کرو

اس کے نوٹس نہ تادیا کرو

اس کو پیسے وغیرہ دے دیا کرو۔

اس لیے مجھے لگتا ہے کہ شائستہ خالہ کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ کوئی میری کمزوری کا فائدہ اٹھائے اور مجھے اپنے



مطلب کے لیے استعمال کرے۔“ خرم یک نیک اسے دیکھ گیا۔

ہر چند کہ وہ ان سب باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ بھی تو یہی کر رہا ہے اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔

اس کی پوری توجہ ندویہ کی طرف تھی پھر بھی اسے علم تھا کہ ارد گرد بیٹھے لوگ ان کا بڑی گہری نظروں سے مشاہدہ کر رہے ہیں ایک تو وہ جس طرح آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے وہ خاصا معنی خیز تھا اور پھر خرم جیسے مقبول لڑکے کے ساتھ اتنی حسین لڑکی کا ہونا وہ بھی ایسی صورت میں جب وہ لڑکی یونیورسٹی کی تھی بھی نہیں لوگوں کا چونکنا۔ عین فطری تھا۔

یہ سب کر کے خرم اس کی نفسیاتی بیماری کو ایک بنیاد بنا کر اسے اسکیڈلائز ہی تو کر رہا تھا۔

ورنہ وہ اس قسم کی لڑکی بھی نہ ہی ان دونوں کے بیچ کوئی ایفیل چل رہا تھا۔

خرم کو یہ دُر محسوس نہیں ہوا تھا کہ شائستہ خالہ اس پر بھی حملہ کر دیں گی لیکن ضمیر نے یہ سوال ضرور کیا تھا کہ جسے پہلے ہی لوگ اپنے فائدے کے لیے بے وقوف بناتے آ رہے ہوں اسے اس طرح اپنی یونیورسٹی میں زبان عام پر لانا صحیح ہے کیا۔

جس نے خرم کا کچھ نہیں دگاڑا، خرم اس کا کردار کیوں دگاڑ رہا ہے لوگوں کی نظر میں۔

”اس لیے مجھے دُر لگ رہا ہے کہ شائستہ خالہ اس لڑکے کی طرف ہاتھ کیوں بوسا رہی تھیں کہیں وہ اسے بھی نقصان تو نہیں پہنچانے والی ہیں۔“ ندویہ نے تھکر مھرے لہجے میں کہا۔

”مگر اس لڑکے نے تو تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تم تو اسے جانتی بھی نہیں پھر وہ اسے نقصان کیوں پہنچائیں گی۔“

”ہاں میں تو واقعی اسے نہیں جانتی لیکن میں نے اسے ٹھیک طرح سے دیکھا ہی کب تھا ہو سکتا ہے دوبارہ دیکھوں تو مجھے یاد آجائے کہ میں اسے جانتی ہوں۔“

جیسے جب آپ ہمارے گھر آئے تھے تب مجھے یاد نہیں آیا تھا کہ آپ سے مل چکی ہوں یہ مجھے بعد میں یاد آیا تھا کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے۔“ خرم ٹھنک کر اسے دیکھنے لگا مگر اس سے پہلے کہ کچھ پوچھتا اس کا موبائل بج اٹھا۔

خرم اسکرین پر ہارون کا نام جگمگا تو دیکھ کر کرسی ٹھہٹھہے ہوئے کہنے لگا۔

”ندویہ تم تین بیٹیں بیٹھو بس دس منٹ میں آیا۔“ ندویہ کو جواب کا موقع دیے بغیر ہی خرم اس سے خاصا دور ہٹ کر کھڑا ہو جاتا تھا اور موبائل کان سے لگاتے ہی ہارون کی دھونس بھری آواز سن کر وہ ندویہ کو بالکل فراموش کر کے اس سے گفتگو کرنے لگا جو کہ رہا تھا۔

”Wahat’s going on yaar تم کس لڑکی کو پکڑ لائے ہو یونیورسٹی گھمانے کے لیے کچھ آئیڈیا بھی ہے لوگ تم دونوں کو کس طرح دیکھ رہے ہیں۔“

”کیا تم نے نہیں پہچانا کہ یہ کون ہے۔“

”واٹ ڈو یو مین؟“ کیا میں اسے جانتا ہوں۔“ ہارون کی آواز میں تعجب تھا۔

”جنتا میں جانتا ہوں انتہائی جانتے ہو سیدہ وہی ہے جس کا میں نے ہوش میں نمبر لیا تھا اور نمل کو شرط میں ہرا دیا تھا۔“ خرم کے لہجے میں فخر اتر آیا تھا جس میں اضافہ ہارون کے متوقع رد عمل نے کر دیا۔

”کیا بات کر رہے ہو یہ وہ ہے؟ تم اسے یہاں کیسے لے آئے؟“

”How it could be possible“ ہارون کے لہجے میں ہلاکی حیرت تھی۔

”تم تو جانتے ہو۔“ میرے لیے سب کچھ پابلی ہے بلکہ ابھی تم نے دیکھا نہیں میں اسے نمل کے سامنے لے گیا تھا نمل اور اس کی دوست حیرت سے دنگ رہ گئیں۔ ندویہ کو میرے ساتھ دیکھ کر۔“

”میں نے دیکھا ہے سب کچھ کتنی دیر سے دور سے بیٹھے تم دونوں کا نظارہ کر رہے ہیں آخر تک اگر فون کرنا پڑا کہ تمہارا تو شاید کوئی ارادہ ہی نہیں ہے کسی دوسرے کو لفٹ کرانے کا۔“ ہارون کی بات پر خرم نے چاروں طرف متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم ہو کہاں اور دور بیٹھ کر کیوں سچا ہو رہے ہو؟ تمہیں ندویہ سے ملنا تھا۔“

”جی نہیں مجھے کوئی شوق نہیں ہے دیے بھی میری سمجھ میں تو یہی نہیں آ رہا کہ تم یہ سارا ڈرامہ کر کیوں رہے ہو مجھے تو یہ لڑکی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

”کیوں کیا برائی ہے اس میں۔“ خرم نے لا پرواہی سے پوچھا۔

”برائی نہیں ہے لیکن ابھی حمید کو دیکھ کر اتنی بری طرح چیختی تھی کہ میں نے۔“

”وہ حمید کو دیکھ کر چیختی تھی۔“ خرم نے چونکتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہاں تو اور کیا۔“ تمہیں حمید کی عادت کا پتا تو ہے نا اتنی خوبصورت لڑکی اس کے سامنے ہو اور وہ ہیرو بننے کی کوشش نہ کرے ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

وہ بڑے اتراتے ہوئے چلے آ رہے تھے کہ اس لڑکی کو بری طرح چیخا دیکھ کر گھبرا گیا اب وہ اس کے سامنے جانے سے انکار کر رہا ہے اس کا کہنا ہے تم اس لڑکی کو کچھ سمجھا بھگا کر لائے ہو اور تمہارے کہنے پر ہی اس نے حمید کو دیکھ کر اتنی زوردار چیخ ماری ہے۔

یار تمہیں اگر نمل کو جلاتا ہی تھا تو حمید کو دل نہ بنانے کی ضرورت کیا تھی اس کی پہلی ہی یونیورسٹی میں کوئی عزت نہیں ہے اور تم اسے مزید مشکوک کر رہے ہو۔“ ہارون کا انداز صاف مذاق کرنے والا تھا مگر خرم حد درجہ سنجیدہ تھا تب ہی کہنے لگا۔

”ہارون تم سب یہاں بھی بیٹھے ہو فوراً“ میرے پاس آ جاؤ اور حمید کو ضرور لے کر آنا۔“

”پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم اس لڑکی کو کیا کہہ کر یہاں لانے میں کامیاب ہوئے ہو۔ اگر حمید نے کچھ التاسید ہاکی دیا تو تمہارا بننا بنایا مکمل بگڑ جائے گا۔“

”اینا کچھ نہیں ہو گا میں ساری ڈشیل تمہیں بعد میں بتا دوں گا بس ابھی تم حمید کو لے کر فوراً“ آؤ میں اسے ندویہ سے ملوانا چاہتا ہوں۔“

”اے یار۔“ ہارون کے اچانک بولنے پر خرم نے کچھ نا سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہوا حمید کو ملوانے میں تمہیں کیوں پریشانی ہو رہی ہے۔“

”مجھے کیوں پریشانی ہو گی میں تو ابھی حمید کو لے کر پہنچ جاتا ہوں لیکن تم زرا پلٹ کر ندویہ کی طرف دیکھو۔ ہم یہاں باتوں میں لگے رہے اور وہاں ایک نیا محاذ کھل گیا۔“ خرم بے ساختہ ندویہ کی جانب پلٹا۔

وہ اس کی میز پر سے کالی دور آ گیا تھا اس لیے وہ نمل اور ندویہ کے درمیان ہوتی گفتگو تو نہ سن سکا لیکن نمل اور نمل کو ندویہ کی ٹیبل پر موجود دیکھ کر ہی اس کی ساری حیات الٹ ہو گئیں۔

وہ ہارون کو بغیر کچھ کہے فون بند کرنا تیزی سے ان کی ٹیبل کے نزدیک آ گیا نمل کی پشت اس کی جانب تھی اسی لیے وہ بغیر کہے بول رہی تھی۔

”میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں وہ ضرور یہاں تمہیں کچھ التاسید ہا بول کر لایا ہے لیکن اس کی بات پر ہرگز یقین مت کرنا بلکہ آئندہ اس سے ملنے۔“



”اے نمل کیا ہوا۔ میرے بٹے ہی میری برائیاں شروع کر دیں تم نے تو ابھی سے بیویوں والے طریقے اپنا لیے ہیں۔“ خرم کو نمل کی باتیں زہریلی تھیں مگر وہ بظاہر بڑی خندہ پیشانی سے بولا۔

نمل اس کی آواز پر چونک کر چلنی بھی گمراہی جگہ سے اٹھی نہیں گویا وہ صرف خرم کی غیر موجودگی میں اس سے بات نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ اس کے سامنے بھی نذیبہ سے گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

مگر خرم بڑے ہی مطمئن انداز میں چلتا میز پر پہنچی واحد کرسی کو کھینچنا نمل کے عین سامنے بیٹھ گیا اب ان دونوں کے ایک جانب نذیبہ اور ایک جانب نمل تھی اور ان دونوں کے ہی چہرے ہوتے ہی ہوتے تھے۔

نذیبہ تو ابھی خاصی ہراساں تھی اسی لیے خرم اسے مخاطب کرتے ہوئے بڑے مودب انداز میں کہنے لگا۔

”ان سے ملو یہ سبیل ہے نمل کی فرزند اور یہ نمل ہے میری منگیت۔“ خرم کے تعارف کرانے پر نمل سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگی۔

اسے قطعاً ”امید نہیں تھی کہ خرم اپنی منگنی کو نذیبہ پر ظاہر کرے گا وہ تو امید کر رہی تھی کہ خرم اس کے سامنے اس کے ساتھ کسی قسم کی جان پہچان سے بھی انکار کر دے گا۔

جبکہ خرم کو ایسا کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اسے کون سا نذیبہ کے ساتھ عشق لڑانا تھا جو وہ اپنی منگنی پوشیدہ رکھتا بلکہ اچھا ہی تھا اگر نذیبہ خرم کی منگنی کے بارے میں جان جاتی۔

نمل جانے اب تک اس کے بارے میں نذیبہ سے کیا کچھ کہہ چکی تھی اگر نذیبہ اسے کوئی آوارہ قسم کا انسان سمجھ رہی ہوگی تو اس کے منگنی شدہ ہونے کے متعلق سن کر تھوڑی سی مطمئن ہو جائے گی کہ جو شخص پہلے ہی ان کی جگہ ہے وہ اسے بے وقوف بنا کر کیا کرے گا البتہ اس نے نمل کی مداخلت کو ایک دوسرا رنگ دیتے ہوئے اس کی کئی باتوں کا اثر نذیبہ پر زائل کرنے کے لیے کہا۔

”بالکل روایتی منگیت ہے میری۔ مجھے کسی لڑکی کے ساتھ بالکل برواشت نہیں کر سکتی۔ یہ بھی نہیں سوچتی کہ ہو سکتا ہے مجھے تم سے کوئی ضروری کام ہو اور اسی لیے میں تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے کر آیا ہوں۔“ نذیبہ کے چہرے پر پچھلی پریشانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی البتہ وہ خرم کو مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

خرم کو اس سے بڑی طمانیت کا احساس ہوا تھا گویا وہ اب بھی خرم پر بھروسہ کر رہی تھی اور نمل کے مقابلے میں خرم کا یقین کر رہی تھی تب ہی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور نمل کی طرف نہیں۔

جبکہ نمل خرم کی بات سن کر چباتے ہوئے انداز میں بولی۔

”نکو اس مت کو خرم! مجھے تمہیں کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر چلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر ایک سیدھی سا دی لڑکی کو تم اپنے مفاد کے لیے استعمال کر دے تو یہ میں ہرگز برواشت نہیں کروں گی۔“

”بات تو تم ایسے کر رہی ہو جیسے تم نے خود کبھی کسی کو اپنے مفاد کے لیے استعمال نہیں کیا۔“ خرم ایک دم سنجیدگی سے بولا۔

نمل سمیر کی طرف اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ خرم اپنی جون میں آتے ہوئے بول پڑا۔

”میں یہاں نذیبہ کو بڑے ضروری کام سے لے کر آیا ہوں میرے پاس تمہاری شکی فطرت کو مطمئن کرنے کا وقت نہیں ہے۔“ پھر نذیبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

”چلو نذیبہ! چالی کا انتظام ہو گیا ہے۔“ خرم نذیبہ کو نمل کے پاس سے اٹھانا چاہتا تھا تب ہی کہہ گیا جبکہ نذیبہ کے پریشان چہرے پر ایک دم رونق آگئی۔

وہ خود نمل وغیرہ کے پاس سے اٹھنا چاہ رہی تھی۔ خرم کی طرف سے اشارہ پاتے ہی وہ کرسی کھینچ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر نمل تب بھی بولنے سے باز نہیں آئی۔

”چالی کیسی چالی؟ نذیبہ اس نے تم سے جو کچھ بھی کہا ہے سب کو اس ہے بلکہ پچیس ہو نمل میں جب اس نے تمہارا موبائل نمبر انکا کتابت ہم سب وہیں موجود تھے۔

یہ صرف ایک چیلنج کے طور پر تمہارا نمبر لے گیا تھا۔ جسے حاصل کرنے کے لیے اس وقت بھی اس نے جانے کیا کمائی نہائی کہ تم نے فوراً ”اینا نمبر اٹھا کر دیا۔

اصل میں خرم نے شرط لگائی تھی کہ وہ آدھے گھنٹے میں تمہارا نمبر حاصل کر لے گا۔“ نمل تیز تیز کہتی گئی۔

نذیبہ اپنی جگہ بد تن گئی تودہ عجیب استغناء یہ انداز میں خرم کو دیکھنے لگی۔

خود خرم بھی چند ثانیہ کے لیے دنگ رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ نمل کی بات کے جواب میں ایسا کیا کہے کہ نذیبہ کا مجھ کو ہوتا اعتماد پھر بحال ہو جائے۔

بھلے یہ یہ سب وہی فطری طور پر ہو سکتا لیکن کم از کم اس وقت نمل کے سامنے نذیبہ اسے بری بھلی سنا کر نہ نکل جائے ورنہ تو اسے کون سا نذیبہ کے ساتھ لمبا چوڑا ایئر چلانا تھا۔

ابھی خرم سے کوئی جواب نہ تھا بھی نہیں تھا کہ ہارون کی آواز نے ان کو چونک کر پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

”ہائے خرم! کیسے ہو یا ر؟“ ہارون کے ساتھ حمید ڈکی اور نادر کو کھڑا دیکھ کر خرم بے اختیار نذیبہ کے تاثرات دیکھنے لگا۔

اس نے حمید کو بلوایا ہی اس لیے تھا کہ ہارون کی بات کی تصدیق ہو سکے۔ آیا نذیبہ نے واقعی حمید کو دیکھ کر چیخ ماری تھی یا یہ ان لوگوں کی غلط فہمی تھی۔

مگر اب نذیبہ پر نظر پڑتے ہی اسے یقین ہو گیا کہ ہارون کا انداز غلط نہیں تھا نذیبہ بالکل فتن پڑتے چہرے کے ساتھ حمید کو دیکھ رہی تھی اپنی جگہ سے وہ پہلے ہی کھڑی ہو چکی تھی مگر اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں کھڑے ہونے کی سکت نہ ہو اور وہ ابھی لہرا کر گر پڑے گی۔

بائی کوئی بھی نذیبہ کی طرف متوجہ نہیں تھا کیونکہ سب نمل کے تاثرات دیکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اس لیے اور کسی نے تو نہیں دیکھا البتہ حمید ضرور نذیبہ کو دیکھ رہا تھا شاید یہ بات اسے پسند نہیں آئی تھی کہ کوئی لڑکی اسے دیکھ کر بھرے مجمع میں جی جیوں پڑی تھی۔

اس کا اپنا خیال تھا کہ اس کی شکل تو بہت اچھی ہے پھر وہ کیوں اسے دیکھ کر ڈر گئی یا تو ہارون وغیرہ کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی کسی اور چیز کو دیکھ کر ڈر گئی ہوگی یا پھر یہ سب خرم کی کوئی سازش تھی بہتا نہیں خرم اسے کیا سمجھا بھگا کر لایا تھا جو وہ اتنی اور ایک تنگ کر رہی تھی۔

اس کے چہرے پر پھیلتے خوف کے سائے حمید کو زچ کر گئے تھے مگر اس پل وہ خود بھی بوکھا گیا جب نذیبہ منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جی جیوں کرنے کی کوشش کے دوران ایک جانب کو لڑھک گئی۔

خرم اس کی جانب پہلے ہی متوجہ تھا اس نے بروقت اس کے گرتے وجود کو قحط لایا یہ اور بات ہے کہ اس کوشش میں وہ خود بھی زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ مگر نذیبہ پوری طرح ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

نمل اور نمل ”نکو! آس پاس موجود سب ہی لوگ اپنی اپنی نشستیں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔“

نذیبہ۔۔۔ نذیبہ۔۔۔ خرم نے گہرا کر اس کے گال پر ہلکے ہلکے پھینٹ مارے مگر اس کی بے ہوشی میں کوئی فرق نہ آیا تو خرم سر اٹھا کر ہارون اور نادر کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

”میرے خیال سے اسے فوراً ”نکو! کٹر کے پاس لے کر جانا چاہیے۔“ نادر اس کا سوال سمجھتے ہوئے فوراً ”ہو۔۔۔“

خرم نے آس پاس کی پروا کیے بغیر ایک سی پل میں نذیبہ کے نازک سے وجود کو اپنی بانہوں میں اٹھالیا۔

منظروا واقعی بہت عجیب تھا نمل اور نمل تو بالکل دم بخود سی اپنی جگہ کھڑی تھیں لیکن لوگوں کی چہ میگوئیاں



شروع ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ خرم محض چند قدم چل کر دوسری ٹیمبل کے پاس سے گزرا ہی تھا کہ کرسی پر بیٹھے شخص نے باقاعدہ کھڑے ہو کر اپنے موبائل سے خرم اور زویہ کی تصویر لی تو خرم کے تیزی سے بڑھتے قدم اپنی جگہ جم گئے۔

زویہ کی حالت کے پیش نظر وہ فوراً آگے بڑھ جانا چاہتا تھا مگر تصویر لینے والے پر نظر پڑتے ہی خرم ٹٹکیا اس کے ساتھ آتے اس کے سارے دوست بھی بری طرح تپ گئے تھے۔

وہ ان کے سب سے بڑے حریف گروپ کالز کا تھا یعنی کہ سمیر کا دوست تھا۔ اور سونے پر سہاگاہ کہ اس کے ساتھ ہی دوسری کرسیوں پر سمیر اور اس کے دیگر دوست بھی موجود تھے۔ ”عارف اس پکچر کو ابھی اور اسی وقت ڈیلیٹ کر دو۔“ خرم غرا کر بولا تو وہ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہنے لگا۔

”اور اگر نہ کروں تو۔“ خرم کا دل چاہا زویہ کو ایک طرف پھینک کر ابھی اور اسی وقت اس درگت بناوے اس سے پہلے کہ وہ اپنی خواہش پر عمل کرتا دیکھ کر کوئی شیانہ انداز میں خرم کے کان کے پاس منہ کر کے بولا۔

”بے رہنے دے یار۔ اچھا ہی ہے وہ یہ تصویر فیس بک میں ڈال دے تمہارا مقصد اور بھی کامیاب ہو جائے گا۔“ خرم کی گویا کھوپڑی گھوم چکی تھی دل چاہا عارف کے ساتھ ساتھ دیکھ کر بھی ہڈی پھلی ایک کر دے اور واقعی اس نے اپنی خواہش کو دیا یا نہیں بلکہ زویہ کو دین پر نشانہ کر کے اس سے بعد میں نبٹنے کا تہیہ کرتے ہوئے عارف پر بل پڑا۔ سمیر اور اس کے دوسرے دوست بھی تیزی سے کرسیاں چھوڑ کر میدان میں آگئے مگر خرم کے دوستوں کی ایسی کوئی غیرت نہیں جاگی۔

حمید اور دیکھ کر تو باقاعدہ وہاں سے بھاگے تھے جبکہ نادر اور ہارون بھاگے نہیں لیکن آگے بھی نہیں بڑھے چنانچہ آدھے منٹ کے بعد ہی صورت حال یہ تھی کہ خرم تنہا سمیر اور اس کے تین دوستوں کے مقابل تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود اس کا پٹھو بھاری تھا جو سمیر کو بری طرح تپا گیا تھا۔

حالانکہ وہ اپنے جوتے میں پستول رکھنے والے لوگوں میں سے تھا مگر اس وقت وہ اس کے لیے بے کار ہو گئی تھی کہ اس میں گولیاں نہیں تھیں ورنہ تو وہ خرم کو بھون کر رکھ دیتا۔

مگر جب حمید اور دیکھ کر اس کے بھی دوست میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تب سمیر کو خالی پستول ہی نکالنی پڑی اپنی ساتھ کو برقرار رکھنے کے لیے۔

خرم کو اتنا جنون ہو رہا تھا گویا اگلے پچھلے سارے حساب برابر کر دینے والا ہو جانے کون کون سے وقت کا غصہ بھرا ہوا تھا اس کے اندر جو وہ ابھی نکالتے والا تھا ایسے میں اگر عارف بھی باقی دوستوں کی طرح اسے خرم کے مقابلے میں تنہا چھوڑ کر چل پڑتا تو خرم تو اسے دم منٹ میں ڈھیر کر دیتا۔

اس سے تو بہتر تھا وہ خالی پستول نکال کر خرم کو ڈرا کر اس لڑائی کو یہی روک دے کم از کم بھرم تو رہ جاتا۔ ”Don't move“ سمیر نے پستول اس کی طرف تانے ہوئے چیخ کر کہا مگر تب تک خرم کا مکا عارف کو زمین بوس کر چکا تھا البتہ اس کا موبائل خرم کے ہاتھ میں تھا جسے وہ پوری قوت سے زمین پر مارنے کا ارادہ رکھتا تھا اور جسے بھانپتے ہوئے سمیر دھمکانے والے انداز میں بولا۔

”مگر یہ موبائل تو ناثوٹا میں گولی چلا دوں گا۔“ سمیر بڑے اعتماد سے بولا اسے یقین تھا گولی چلانے کی نوبت نہیں آئے گی خرم ڈر کر ابھی موبائل اس کے حوالے کر دے گا اور سمیر شاہانہ انداز میں اس کی جان بخش دے گا۔ اور واقعی اس کی دھمکی پر خرم اپنی جگہ ساکت ہو گیا وہ یک ٹک سمیر کو دیکھ گیا جو پستول اس کی طرف تانے چند



قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا گویا نشانہ جو کہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔  
ناور اور ہارون بھلے ہی مار پیٹ کرنے آگے نہیں بڑھے تھے مگر اس صورت حال پر ان کے چہرے بھی فٹ ہو گئے تھے۔

”خ۔ خرم موبائل سمیر کو دے دو۔“ ناور ہٹلا کر وہی آواز میں بولا مگر خرم کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ موبائل کو پختے کے لیے اپنا ہاتھ سر سے اوپر لے گیا تھا سمیر کے دھمکانے پر اس کا ہاتھ ہوا میں ہی متعلق رہ گیا اور اس پاس جمع مجمع کی سانسیں بھی اس کے ہاتھ کے ساتھ رک گئیں۔  
نمل اور سنبل تو اسی وقت نذیبہ کے نزدیک چلی آئی تھیں جب خرم نے اسے ایک طرف زمین پر لٹا دیا تھا۔ نمل نے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور اسے جگانے کی کوشش کرنے لگی تھی پتھ چلی وہ خرم وغیرہ کی طرف بھی دیکھ لیتی جبکہ سنبل اس کے قریب زمین پر بیٹھ تو گئی تھی لیکن اس کی توجہ پوری طرح سے خرم کی ہی جانب تھی۔

نمل نے جب نذیبہ کو مکمل طور پر بے ہوش پایا تب ہر اس ان کے اس نے سنبل کی طرف دیکھا اور سنبل کو دم بخود دیکھ کر وہ بھی بے اختیار خرم کو دیکھنے لگی جہاں کا منظر اسے بھی ساکت کر گیا تھا۔  
”خرم میں کہہ رہا ہوں موبائل مجھے دے دو گولی چلانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ سمیر نے وائٹ پیپے ہوئے کما سے خرم کا بغیر ہلے بلے بلا وجہ وقت ضائع کرنا سخت ناگوار گزر رہا تھا اگر اس کی پستول میں گولی ہوتی تو وہ اب تک اسے واقعی جان سے مار چکا ہوتا بھلے ہی بعد میں اس کا جو بھی حشر ہوتا۔  
اس وقت اسے خرم کا کیلے ان سب پر حاوی ہونا اتنا برا لگا تھا کہ یونیورسٹی میں اپنا رعب برقرار رکھنے کے لیے وہ بغیر نتیجے کی پروا کیے خرم کو قتل تک کرنے کے لیے تیار تھا لیکن خرم کا جسم بن جانا اسے فکر مند کر گیا تھا کہ اگر اب بھی اس نے موبائل نہیں دیا تو وہ تو گولی چلا نہیں سکتا پھر وہ کرے گا کیا اور اس کی عزت کیا رہ جائے گی۔  
پھر جس کا سمیر کو ڈر تھا وہی ہوا خرم نے بڑے بے خوف انداز میں براہ راست سمیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے موبائل کو زمین پر دے مارا۔

مجمع میں ایک ساتھ کئی چیخوں کی آوازیں نکلیں سمی کو یقین تھا کہ اب سمیر ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر گولی چلا دے گا ناور نے تو باقاعدہ  
”خرم۔ خرم۔“ چلانا شروع کر دیا تھا مگر خرم ہنر و زیمیر کے سامنے ایسے ڈٹا کھڑا رہا جیسے مارنا ہے تو مار دو۔ مجھے جو کرنا تھا میں نے کر لیا۔

سمیر بل بھر کے لیے بالکل ہلنک ہو گیا اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا اب وہ کیا کرے اپنی بے بسی پر اسے اتنا ناؤ آ رہا تھا کہ اس کا ہر اور آنکھیں غصے کی شدت سے سرخ ہو گئیں جسے دیکھ کر سارے مجمع کو بھی لگا کہ اب وہ گولی چلانے والا ہے ان ہی میں سے ایک سنبل تھی جو ایک زندہ جیتے جاگتے انسان کو اپنے سامنے مل ہو تا دیکھنے کے خیال سے ہی حواس باختہ ہو کر چلا پڑی تھی۔  
”نہیں۔ نہیں۔ سمیر۔ نمل تم ایسے روکتی کیوں نہیں؟“ سنبل کا انداز بالکل بے ساختہ تھا وہ بدستور سمیر کو دیکھتے ہوئے نمل کا بازو پکڑ کر چلا رہی تھی۔  
نمل بھی ایک طرح سے خوف کے زیر اثر دنگ رہ گئی تھی ایسے منظر فلموں میں لاکھ بار بھی دیکھے ہوں مگر

حقیقت میں دیکھنا برا سوہانہ صحنہ ہوتا ہے۔  
اس کی سمیر اور خرم دونوں سے ہی کوئی دلی اور جذباتی وابستگی نہیں تھی مگر خود وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ سمیر نہیں رک جائے لیکن وہ سنبل کی طرح زبان سے کچھ نہیں کہہ سکی تھی بس پتھر اے ہوئے انداز میں سب دیکھ رہی

جس کی زندگی اللہ تعالیٰ نے رکھی ہو اسے کون مار سکتا ہے سمیر کی پستول ہمیشہ بھری ہوتی تھی مگر اپنے نشانے بازی کے شوق کے باعث وہ کل ہی اسے خالی کر چکا تھا اور محض اپنی لاپرواہی کی وجہ سے اسے آج لوڈ کرنا بھول گیا تھا اس کے نیچے میں وہ خرم پر گولی نہ چلا سکا۔

البتہ سنبل کی چیخ نے اس کی مشکل آسان کر دی وہ جو یہاں سے بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا دل ہی دل میں سنبل کا شکر گزار ہوتے ہوئے پستول پشت کی جانب لے جا کر پیٹ میں پھنساتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا۔  
”جاؤ کیا یاد کرو گے گریل فرینڈ کی دوست کی خاطر آج تمہاری جان بخش دیتا ہوں ورنہ۔“ سمیر نے صرف اپنے جلد کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے اپنے گولی نہ چلانے کی صفائی دی تھی۔  
مگر اس کی بات خرم تو کیا، نمل کو بھی تیر کی طرح لگی تھی اس کا دل چاہا وہ ابھی چیخ کر اس کی بات کی تردید کر دے مگر وہ شرمندگی کے مارے اپنی جگہ سے ہل نہ سکی جبکہ خرم کا دل چاہا اس بات پر سمیر کی ہی پستول سے اسی کو ختم کر دے اپنے اوکو کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ سمیر کی جانب بڑھا بھی تھا مگر سنبل کے اٹھ کر کچھ میں آجائے پر اس کے قدم رک گئے۔

”خرم پلٹے پھوڑو نذیبہ سب۔ اس وقت نذیبہ کو اسپتال لے جانا زیادہ ضروری ہے۔“ سمیر خود بھاگنے کے لیے پر تول رہا تھا خرم کو سنبل کی جانب متوجہ ہوتا دیکھ کر وہ برق رفتاری سے منظر سے غائب ہو گیا۔  
خود خرم بھی ساری باتیں ذہن سے جھٹکتا ہے مدد پڑی نذیبہ کی طرف بڑھ گیا۔  
ماحول صاف ہوتا دیکھ کر ناور اور ہارون بھی حرکت میں آ گئے اور خرم کے پاس چلے آئے۔  
”تم ٹھیک تو ہونا۔“ ہارون نے فکر مندی سے پوچھا مگر خرم نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا وہ جلد از جلد نذیبہ کو اسپتال لے جانا چاہتا تھا اس کے ارادے کو بھانپتے ہوئے نمل تیزی سے بولی۔  
”اے کہاں لے کر جا رہے ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”کیوں؟“ خرم نے ایک فٹ بھری نظر اس پر ڈالتے ہوئے تب کر پوچھا ہے یقین تھا نمل اس خطرے کے پیش نظر اس کے ساتھ جانا چاہتی ہے کہ خرم نذیبہ کی بے ہوشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جانے اس کے ساتھ کیا کر ڈالے۔

اور اس کا شک و واقعی درست تھا۔ نمل نذیبہ کے تن تنہا خرم کے ساتھ جانے کے حق میں نہیں تھی کیونکہ نذیبہ بالکل بھی ہوش میں نہیں تھی لیکن نمل یہ سب زبان سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔  
اسی لیے وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کہے کہ بھی ناور اس کی حمایت کرتے ہوئے تیزی سے بولا۔  
”ہاں ہاں۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے نمل تو کیا سنبل کو بھی ساتھ چلانا چاہیے اس لڑکی کو اس کے گھر پر ڈراپ کر دیتے ہیں اس کے گھر والوں سے یہ دونوں بات کر لیں گی۔“ ناور تائیدی انداز میں ہارون کو دیکھنے لگا تو اس نے بھی آنکھ کے اشارے سے خرم کو موقع کی نزاکت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

خرم دل ہی دل میں بھنا کر رہ گیا مگر زبان سے کچھ نہیں بولا جانتا تھا اس وقت بحث کرنا بے کار ہے نمل مانے گی تو نہیں الاؤتات ہی ضائع ہو گا البتہ گاڑی کے قریب پہنچنے پر جب ناور نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تو خرم دو ٹوک انداز میں بولا۔

”تمہیں ساتھ چل کر خاموشی متاثراتی بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ نمل اور سنبل کے سامنے خرم کا یہ لب و لہجہ ناور کو سبکی کا احساس دلا گیا تھا بھی وہ خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا کچھ کہہ کر وہ خرم کو اپنی مزید تذبذب کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور عقلمند کے لیے اشارہ کافی کی ترجمانی کرتے ہوئے ہارون نے بھی ساتھ چلنے کا کوئی



ارادہ سرے سے کیا ہی نہیں۔

”اسے کون سے اسپتال لے کر جائیں گے یہ تو بالکل ٹھنڈی پڑی ہوئی ہے۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر زدیہ کافر اپنی گود میں رکھتے ہوئے سہل اپنی عادت کے مطابق بری طرح پریشان ہو کر بولی مگر خرم نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے گاڑی پارکنگ سے نکالنے کے لیے ریورس کرنے لگا۔

”بے ہوش کیوں ہو گئی اگر کسی کمزوری وغیرہ سے چکر آئے تھے تو اب تک تو اسے ہوش میں آ جانا چاہیے تھا نمل نے تم نے تو پانی کے چھیننے بھی بارے تھے اس کے منہ پر پھر بھی۔“ سنبل اس کی بے ہوشی طویل ہوئی دیکھ کر اب رو ہائی ہونے لگی تھی۔ فکر تو نمل اور خرم کو بھی ہو رہی تھی مگر وہ دونوں سہل کے مقابلے میں زیادہ حوصلے والے تھے، یہی ضبط کیے بیٹھے تھے البتہ سنبل کے سوال پر نمل خاموش نہ رہ سکی۔

”مجھے تو لگتا ہے یہ خرم کے دوستوں کو دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ تم نے اپنے دوستوں کے بارے میں ایسا کیا کہا تھا کہ وہ انہیں دیکھتے ہی چیخ پڑی۔“ نمل نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے اپنے دوستوں کے بارے میں کچھ ایسا کہنے کی کہ کوئی ان سے خوف زدہ ہو کر بے ہوش ہو جائے۔“ خرم کاموز تو پہلے ہی خراب تھا نمل کا مٹھکوا انداز دیکھتے ہوئے وہ بھی ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

”تمہارے دوست تمہارے کتنے ”دوست“ ہیں وہ تو آج نظر ہی اگیا ہے ایسے میں اگر زدیہ کو بے وقوف بنانے کے لیے تمہیں ان کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بھی بولنا پڑا تو یہ تمہارے لیے کون سا مشکل کام ہے۔“ نمل کا لہجہ طنز نہ تھا وہ حقیقت پسندی سے بول رہی تھی۔

خرم کے لیے یہ اعتراف کوئی نیا نہیں تھا اسے پہلے سے ہی علم تھا ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق اور نا تمپاس کر لینے والے اس کے نام نہاد دوستوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اس کے برے وقت میں کام آجاتا نہاد وہ نمل کی بات کے جواب میں خاموش ہی رہا جسے دیکھتے ہوئے نمل زندگی میں پہلی بار بڑی رسانیت سے اس سے مخاطب ہوئی۔

”خرم! زدیہ کے ساتھ یہ سب مت کرو۔ یہ بہت مختلف لڑکی ہے بہت ڈرپوک بہت خاموش طبع اور بہت کمزور اعصاب کی تہائی پسند ہے یہ۔“

تم کہہ رہے تھے میں بھی لوگوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے والوں میں سے ہوں۔ تمہارا اشارہ اگر سمیر کی طرف ہے تو تم خود دیکھو سمیر اور زدیہ میں زمین آسمان کا فرق ہے تم اسے سمیر کے ساتھ کیسے کمپیر کر سکتے ہو۔“ ”کیا تم زدیہ کو جانتی ہو؟“ خرم نے بیکو پورمر سے نمل کو دیکھا جس کی نظریں زدیہ کے بے سہارے سوجھ بوجھ جی تھیں۔

”ہاں یہ ہمارے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی۔“ نمل صاف گوئی سے بولی۔

”کبھی تم نے مجھے اس کے پاس نمبر لینے بھیجا تھا تاکہ میں شرط جیت ہی نہ سکوں۔“ خرم برحسہ بولا۔

”ہاں۔“ لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ تم بھی اسے جانتے ہو اس لیے اس کا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

انکار مت کرنا خرم۔ یہاں نہ تمہارے دوست ہیں نہ یونیورسٹی کے فضول اسٹوڈنٹس جو موبائل میں تمہارا اعتراف ریکارڈ کر کے فیس بک میں ڈال دیں گے۔“ نمل اتنے وثوق سے بولی کہ خرم کا دل چاہا واقعی اعتراف کر کے کہ اس نے زدیہ کی کمزوری کو جاننے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا نمبر حاصل کیا ہے۔

مگر کیا کرتا عادت سے مجبور تھا۔ کسی بھی طرح سے خود کو ڈاؤن کرنا اسے منظور نہیں تھا۔ اپنے کریڈٹ پر ایک کامیاب آپریشن کو وہ حقیقت بیان کر کے ایک عام سے ٹرک نہیں بنا سکتا تھا۔

لیکن وہ اس کے یقین کو جھٹلا بھی نہیں سکا، جبکہ اس کی خاموشی کو محسوس کیے بغیر نمل کی بات پر سنبل کچھ چو سکتے ہوئے بولی۔

”جب ہم لوگوں کی کلاسز ہی اسٹارٹ ہوئی تھیں تب آپ نے ہماری کلاس میں اگر ایک لڑکے کا موبائل چھین کر توڑ دیا تھا۔“

کیا اس نے بھی کوئی کچھ یاد یونانی تھی جو اس کے اتنے مٹکے موبائل کا یہ حشر ہوا تھا۔“

”سمیر نے پہلے دن تم لوگوں کے ساتھ جو مذاق کیا تھا اس کی ویڈیو بنا کر فیس بک میں اسی نے تو ڈالی تھی۔ تم لوگوں نے نہیں دیکھی کیا۔“ خرم ساٹ لہجے میں بولا۔

”نہیں! ایسا ایسی کوئی سوڈی نیکی بھی تھی۔“ سنبل نے اٹھنے سے کہا۔

”نئی بھی تھی اور سب نے دیکھی بھی تھی سب سے زیادہ کنشٹنٹ تم تینوں پر ہی تھے۔“ خرم بے زاری سے بولا۔

سنبل حیرانی سے نمل کو دیکھنے لگی جو دانستہ خاموش رہی۔ اگر سمیر نے اپنے دوست کے قصور لینے پر جس طرح اس کا ساتھ دیا تھا وہ نمل کو سخت ناگوار کر رہا تھا۔

ہر چند کہ وہ سمیر کے لیے کوئی احساسات نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی اس سے کوئی امیدیں وابستہ کیے بیٹھی تھی۔ مگر اس کی حرکت نے نمل کو مایوس ضرور کیا تھا۔ چنانچہ اس وقت وہ اس کی حمایت کرنے کے بالکل موڈ میں نہیں تھی۔

پھر جانے کیوں اسے خرم کی بات صحیح لگ رہی تھی کہ وہ مذاق ان لوگوں کے ساتھ خرم اور اس کے دوستوں کی بجائے سمیر اور اس کے گینگ نے کیا ہو گا۔

شاید اس لیے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں تھی جس پر پردہ ڈالا جائے۔

فرسٹ ایر کو بے وقوف بنانا ایک عام رواج بن چکا ہے۔ سینئر تو ڈنکے کی چوٹ پر یہ سب کرتے ہیں۔ پھر بھلا خرم کو سمیر کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے۔

بہر حال جو کچھ بھی تھا نمل نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ تینوں شہر کے جانے مانے اسپتال میں زدیہ کو لے کر پہنچے تو ڈاکٹر کے جواب نے ان تینوں کی قلوں کو دوڑ کر دیا۔

”بی بی بہت زیادہ لو ہو جانے کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو گئی ہے۔ ابھی تو میں ڈرپ لگوا رہا ہوں ویسے ان کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھا جائے۔“

”ڈرپ لگنے میں تین چار گھنٹے تو لگیں گے اس کے گھر والوں کو انفارم کر دو ورنہ وہ پریشان ہو جائیں گے۔“ نمل نے خرم کو دیکھا۔

”میرا اس کے گھر والوں سے کوئی کانٹیکٹ نہیں ہے۔ اس کے بیگ میں دیکھو۔ موبائل میں اس کے گھر کا نمبر دیکھو ہو گا۔ تم ہی بات کر لیتا۔“ خرم نے نمل لا تعلقی ظاہر کر دی۔

اور واقعی بلال اختر کا نمبر بلال کے نام کے ساتھ سیوا تھا۔ نمل نے ان سے بات کر کے زدیہ کے اچانک بے ہوش ہو جانے کی اطلاع باقی ساری ہزنیات بتائے بغیر وہی تو وہ محض پندرہ منٹ میں سیدھا اسپتال پہنچ گئے۔

نمل اور سنبل سے مل کر وہ خاصے حیران لگ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی بیٹی کی بھی لڑکیوں سے علیحدگی ملنا ہوتی ہے۔ جن کے ساتھ وہ یونیورسٹی گئی تھی۔

دراصل نمل اور سنبل نے یہی کہا تھا وہ اسکول کے زمانے میں ساتھ ہوا کرتی تھیں اور یہ تفصیل بتانے سے وہ



پہلو تھی کر گئیں کہ ان کے بیچ معمولی بات چیت بھی نہیں تھی۔  
جبکہ خرم ایک طرف تماشا ہی بنا رہا۔ کس قدر سچائی کے ساتھ ندیہ کا جھوٹ کھپ گیا تھا کہ اس کی کالج کی کچھ لڑکیوں کے بہن بھائی جن کالج اور یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اور وہاں کے ماحول کی تعریف کرتے ہیں۔ ندیہ وہاں جا کر ان تبصروں کا جائزہ لیتا جاتی ہے۔  
نمل اور سنبل سے بات کر کے بلال اختر کو یہی لگا تھا کہ ندیہ سے ان کی دوستی نہیں ہے مگر اتنی بات چیت ضرور ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مزاج جانتی ہیں اور ندیہ کی فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی ان دونوں نے اسے فینٹیل والے دن یونیورسٹی آنے کا مشورہ دیا ہوگا۔ تاکہ وہ اپنے ایڈجسٹ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ زیادہ آسانی سے کر سکے۔

یہ سارے اندازے بلال اختر کے خود ساختہ تھے۔ انہوں نے ایک بھی تصدیق نہیں کی تھی۔ ندیہ کو بے ہوش دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے تھے اور زیادہ بات چیت نہیں کیا رہے تھے۔  
جب وہ تینوں جانے لگے تب اچانک انہوں نے چونکے ہوئے خرم کو مخاطب کیا۔  
”مجھے لگتا ہے میں تم سے مل چکا ہوں۔“ بلال اختر کا لہجہ کھویا کھویا تھا۔  
”جی بالکل۔ میں فرحان حسن کا بیٹا ہوں۔“ خرم نے ایک اچھٹی سی نظر نمل پر ڈالنے ہوئے کہا۔  
”وہ آئی سی۔ کیا الگ رہا ہے اپنے نئے گھر میں رہنا۔“ بلال اختر خوش دلی سے بولے۔  
”ہوں۔ گھر نیا لگتا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے ہمیشہ سے وہیں رہ رہے ہیں۔“ خرم نے پوری سچائی سے کہا۔  
”That's Good۔“ بلال اختر نے کہا تو خرم الوداعی جملے بولتا ان سے مصافحہ کرنا آگے بڑھ گیا۔ نمل اور سنبل بھی اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ گئیں۔  
”ہمیں یونیورسٹی چھوڑ دو ہم وہاں سے گھر چلے جائیں گے۔“ خرم کے آگے بڑھتے قدم نمل کی آواز پر یک لخت رک گئے۔

”گھر ہی جانا ہے تو یونیورسٹی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔“ خرم نے تنخی سے کہا۔ اس کی یہ خواہ مخواہ کی خودداری خرم کو اس وقت زہر لگی تھی۔  
”میری گاڑی وہیں رہ گئی ہے۔ پھر میرا اور سنبل کا گھر الگ الگ جگہ پر۔“  
”تو رکشا کر کے یونیورسٹی چلی جاؤ نا اتنا بھی احسان لینے کی کیا ضرورت ہے کہ میں یہاں سے واپس تمہیں یونیورسٹی لے کر جاؤں۔“ خرم ہری طرح چڑ کر بولا۔

اس کے مزاج پر پہلے ہی جھنجھلاہٹ سوار تھی۔ اس پر نمل کی بے جا باتیں۔ وہ تب کر رہ گیا تھا۔  
بات تو اس نے فطریہ کسی تھی۔ مگر نمل واقعی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ پھر کا وقت تھا۔ اچھی خاصی چل پھل تھی۔ وہ اور سنبل آرام سے رکشا میں جا سکتی تھیں۔ بلکہ گاڑی بھی یونیورسٹی سے لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک دن کی بات تھی۔ سنبل کے والد بھی انہیں یونیورسٹی ڈراپ کر سکتے تھے۔  
”آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔ چلو آؤ سنبل۔“ نمل نے ایک ہی بل میں سب سوچ کر اگلے بل قدم گیٹ کے ساتھ قطار سے گھڑی رکشا کی طرف بڑھا دیے۔

خرم پہلے تو سمجھا ہی نہیں کہ وہ اچانک کہاں چل پڑی۔ پھر اسے رکشا والے سے بات کرنا دیکھ کر پہلے تو خرم حیران حیران سا رہ گیا تھا۔ پھر جب وہ دونوں اس رکشا میں سوار ہو کر اس کے سامنے سے گزرتی چلی گئیں تب خرم سمجھتا ہوا اور پاؤں پٹختا اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔  
اسی وہ گاڑی میں بیٹھا تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پر دیکھ کر دل تو جا ہلا کال کاٹ دے۔

دیے بھی اس وقت اسے بے تحاشا تھکن ہو رہی تھی۔ اس کا دل بستر پر لیٹ کر سونے کا چاہ رہا تھا۔ ایسے میں بھلا وہ کی سے بات کرنے کی خواہش کیسے ہو سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے کچھ سوچتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔ توقع کے عین مطابق وہ اس کی طرف سے غیر معمولی فکر کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس پر خرم نے اسے فوراً ہی جھڑک دیا۔

”تی پروا تھی میری تو اس وقت منہ چھپا کر کیوں بھاگ گئے۔ جب میں اکیلا ان سب سے لڑ رہا تھا۔“ وہ کی جیسے ڈھیٹ انسان پر طعنے بازی کا کیا اثر ہوتا تھا۔ وہ آئیں بائیں شاخیں کر کے اصل عداوت نکالتا۔  
”یار یہ ندیہ تو بہت سی حسین لڑکی ہے۔ میں نے اس دن نمل میں تو اسے ٹھیک سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ کیا چیز ہے یار۔“

”نمل کو اس ہند کر دو کی میرا داغ اس وقت پہلے ہی گھوما ہوا ہے۔“ خرم فون کاٹنے والا تھا کہ وہ کی تیزی سے کہنے لگا۔

”داغ تو یونیورسٹی میں سب کا گھوم رہا ہے۔ ایک تو تمہارے ساتھ اسے دیکھ کر سب حیران رہ گئے ہیں۔ پھر دوسرے جس طرح وہ حمید کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر بے ہوش ہوئی ہے۔ اس پر تو تمام اسٹوڈنٹس بات کر رہے ہیں۔ اک سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ کہہ رہے ہیں یہ ڈرامہ تھا۔ کیا اس نے کچھ بتایا کہ وہ حمید کو دیکھ کر کیوں چیختی تھی۔“ وہ کی کے لہجے میں ہلا کا جھٹس تھا۔

”نہیں۔ کچھ نہیں بتایا۔ اور اگر بتایا بھی ہوتا تو بھی تمہیں کچھ نہ بتاتا۔ سن لیا یا اور کچھ سنتا ہے۔“ خرم نے تپے ہوئے انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ بلکہ موبائل ہی آف کر دیا۔ تاکہ اب مزید کوئی اس کو پریشان نہ کر سکے۔ حالانکہ اس نے خود ہی اپنے آپ کو اتنا پریشان کر لیا تھا کہ اب مزید کسی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔  
یہ سوال تو خود اس کے ذہن میں اٹھ رہا تھا کہ ندیہ صرف حمید کو دیکھ کر ہی دونوں بار خوف زدہ کیوں ہوئی۔ کیا اسے واقعی کچھ نظر آتا ہے یا یہ صرف اس کی نفسیاتی بیماری ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہونے کے باوجود اس سوال کو حل کرنے کا حکم ارادہ کر چکا تھا۔



رومیلہ کو گھر پر ڈراپ کرنے کے بعد الیان مشاہد اور نوید کے ساتھ پلان کے مطابق آگے کہیں چلا گیا۔  
آج شام وہ سب گاؤں جا رہے تھے۔ اس حوالے سے نانی اماں اور ماموں وغیرہ نمل سے چیک آؤٹ کر کے ریاض غفار کے گھر ہی آگئے تھے۔ چنانچہ گھر میں ایک میلہ سالگاہ ہوا تھا۔ رومیلہ کو یہ ماحول بہت پسند تھا۔ ان تمام بزرگوں اور کزنز کی موجودگی میں رومیلہ کو ریاض غفار کی فیملی کا کھڑا ہوا رویہ محسوس کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔  
کیونکہ بریرہ نے ابھی تک اس سے ایک لفظ بات نہیں کی تھی۔ مگر رومیلہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے دیتی کہ اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ تمام سرسرایوں کے بیچ میں وہ خاص طور سے اس سے کیا مخاطب ہو۔

مگر شگفتہ غفار کا رویہ اسے حیرت کرنا تھا۔ دلا تھامہ انہوں نے محض زبردستی اسے ہو کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے ایسی نفرت بھری تھی کہ رومیلہ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں کرتی۔  
بس ایک ریاض غفار کا رویہ قدرے نارمل تھا۔ بہت جوش و خروش اور لگاؤ تو ان کے انداز میں بھی نہیں تھی۔ براہی رمی سا طریقہ ہوا تھا ان کے مخاطب ہونے کا۔ مگر باقی سب کے مقابلے میں یہ نپا تلا انداز بھی رومیلہ کو گہری تاریکی میں امید کی ایک کرن کی طرح لگتا تھا۔

پھر دوسرے یہ کہ وہ نمل کی ہدایت کے مطابق چلنے کڑھنے اور منہ بسورنے میں اپنی ہمت اور طاقت ضائع نہیں



کرنا چاہتی تھی۔ یہ بھلے ہی ایک مشکل عمل تھا۔ مگر وہ مسائل کو اپنے اور حاوی نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ جس کے باعث اتنے ڈپریشن میں چلی جائے کہ وہ مسئلہ بھی حل نہ کر سکے، جس کو سلجھانا ناممکن ہو۔  
اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ خوش اور مطمئن رہنا اور نظر اتنا چاہتی تھی، جو کہ ثانی اماں کے گھرانے کے سامنے خاصا آسان تھا۔

اس کی تقریباً "تمام ہی لڑکیوں سے دوستی ہو گئی تھی۔ سب ہی خوش مزاج اور ہنس مکھ تھیں۔ رومیلہ ان کے ساتھ لگ کر واقعی دیگر سارے رویے اور مسئلے بھول جاتی۔ اس لیے گاؤں جانے تک کا راستہ کم از کم رومیلہ کے لیے بڑا خوش گوار اور یادگار رہا۔

البتہ اس کی موجودگی میں بریرہ کی ذات بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ اس سے کھل مل نہیں سکتی تھی۔ نہ ہی کزنز کو اس سے بے تکلف ہونے سے روک سکتی تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر وہ سرور کا ہانہ کر کے اس گاڑی میں جا بیٹھی تھی جس میں ماموں جان اور ڈرائیور کے علاوہ صرف سامان رکھا ہوا کہ یہاں خاموشی ہے تو وہ آرام سے سو سکتی ہے۔

لیکن جب اندر آگ لگی ہو تو کیسا آرام اور کہاں کی نیند۔ اپنے دامن کے داغ دار ہونے کا احساس اسے مسلسل بچو کے لگا رہا تھا۔

حامد کو ہتا چل جانے کا خوف اسے ڈرا رہا تھا۔

رومیلہ کے لیے نفرت اسے جلا رہی تھی۔

ثانی اماں کے گھر والوں کی رومیلہ کے لیے پسندیدگی اور اسے سرہانا سے سلگا رہا تھا۔

شگفتہ غفار کی حالت بھی کم و بیش ایسی ہی تھی بلکہ اس سے بھی بری تھی۔ ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ساری لڑکیوں کو رومیلہ کے پاس سے ڈانٹ کر اٹھاؤں جو ان کی بیٹی کی بجائے اس چڑیل کے آگے پیچھے بھر رہی تھیں۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا رومیلہ نے آتے ہی بریرہ کی جگہ چھین لی ہے۔

وہ لڑکیاں اپنی بھابی کے آنے پر خوش ہونے کی بجائے رومیلہ کے گمن گاری تھیں۔ یہ سب دیکھ کر ان کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہی تھیں کہ بریرہ ان کے گھر کی لڑکی تھی جسے وہ بچپن سے دیکھ رہے تھے۔ اسے بیاہ کر لانے کی خوشی اپنی جگہ، مگر اس کی ذات کے برت کھولنے کا کوئی تجسس نہیں تھا۔ کیونکہ وہ سب پہلے ہی ان پر دو تھا۔ دوسرے ان کی اپنی بیٹی سب سے کنارہ کشی اختیار کیے بیٹھی تھی تو کوئی کتنی دیر اس کے پاس بیٹھ سکتا تھا۔

مگر یہی تو انہیں افسوس تھا کہ بریرہ کنارہ کشی اختیار کرنے والوں میں سے تھی ہی نہیں۔ وہ تو بہت خوش مزاج اور باتوئی تھی۔ مگر اس چڑیل اور اس کے بھائی کی وجہ سے ان کی بیٹی کی ساری شوخی ختم ہو گئی تھی۔

انہیں اس قدر صدمہ تھا کہ ریاض غفار کے سختی سے تنبیہ کرنے کے باوجود وہ رومیلہ کے لیے اپنے رویے میں تبدیلی نہیں لاسکی تھیں، بلکہ انہیں تو ریاض غفار کا اس کے ساتھ نارمل طریقے سے بات کرنا بھی ٹھنک رہا تھا۔

ایک طرف الیان تھا جس کے رویے کا وہ مشاہدہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ ان کی والدہ کے گھر میں پرے کا ماحول تھا۔ چنانچہ تمام لڑکیوں کے ہوتے ہوئے الیان ان کے پاس آتا ہی نہیں تھا۔ اور بس ایک یہی بات تھی جس کی وجہ سے انہیں اپنے یہاں آجانے پر خوشی ہوئی تھی۔

لیکن وہ خوشی اس وقت لمبا میٹ ہو گئی جب ریاض غفار اور شگفتہ غفار کی طرح الیان اور رومیلہ کو بھی آرام کے لیے ایک کمرہ عنایت کر دیا گیا۔ شگفتہ غفار تو ثانی اماں کی۔



”چلو سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام کرو۔“ کی ہدایت پر بے ساختہ بولنے والی تھیں۔  
 ”رومیلہ! الیان کے کمرے میں نہیں، بلکہ ان لڑکیوں کے کمرے میں رہے گی۔“ لیکن بروقت اپنی بات کے نامناسب ہونے کا احساس انہیں خاموش کر گیا۔ ایسی کوئی بات کہہ کر وہ والد کی زبردست جھاڑنے کے بالکل موڈ میں نہیں تھیں اور نہ ہی اپنی بھابیوں کے سامنے خود کو کوئی خال ساس ہونے کا خطاب دینا چاہتی تھیں۔ پہلے ہی سب ان کا اکھڑا اکھڑا رویہ محسوس کر رہے تھے۔ ایسی بات منہ سے نکال کر تو وہ گویا سب کو خود سے بری طرح بدگمان کر لیتیں اور پھر ان کی ایک بھابی تو اب خود ان کی اپنی بیٹی کی ساس بن گئی تھیں۔ ایسے میں سمجھ داری کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ اپنی سو پر جان چھڑکے والی ساس بن جاتیں۔ تاکہ ممانی جان بھی برہرہ کے ساتھ ایسی ہی بن جائیں۔  
 لیکن بعض اوقات انسان جانتے بوجھتے غلطیاں کرتا ہے اور عقل پر جذبات کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ چنانچہ شگفتہ غفار کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر چھٹی ہوئی نظروں سے رومیلہ کو اپنے کمرے کی جانب بڑھتا دیکھتی رہیں۔ اتنا ہی بہت تھا کہ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔  
 مگر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ان کی آنکھوں سے نفرت و حقارت کی ایسی چنگاریاں نکل رہی تھیں کہ رومیلہ جو کینہ کی کسی بات پر ہنستے ہوئے بڑے خوش گوار انداز میں اس کی رہنمائی میں چل رہی تھی ٹھٹھک کر رک گئی۔  
 اسے اچانک اپنے چہرے پر اتنی تیز پیش کا احساس ہوا تھا کہ اس کی نظرس خود بخود شگفتہ غفار کی جانب اٹھ گئیں۔

پھر تو اس کے قدموں کو کیا اس کی ہنسی کو بھی بریک لگ گئے شگفتہ غفار کی صرف زبان خاموش تھی۔ باقی ان کے تمام اعضا اس سے اپنی نفرت کا کھل کر اظہار کر رہے تھے۔ کینہ نے صرف اتنا کہا تھا کہ۔  
 ”آپ آپ بھی تھوڑا آرام کر لیں۔ سب موصوفات تو سونے بھی لیت گئے ہیں۔ آئیں میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔“

رومیلہ اس کی بات سن کر اٹھ گئی تھی۔ اسے تو خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اس کمرے میں الیان بھی ہو گا۔ کینہ اسے اپنے منڈیل کالج کا کوئی قصہ سن رہی تھی۔ جسے رومیلہ کے اٹھنے کے بعد بھی اس نے جاری رکھا تھا اور جو رومیلہ کے لیے اتنا دلچسپ تھا کہ وہ بے ساختہ بنے جا رہی تھی۔  
 مگر شگفتہ غفار کے تاثرات دیکھتے ہی اسے کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ کیونکہ اس وقت ان کے چہرے پر پھیلی بے زاری اور حقارت ہمیشہ سے زیادہ تھی۔

رومیلہ نے اختیار کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کینہ کو ٹوکنا پڑا۔  
 ”کیا ہوا بھابی، تجلیں نا۔“

”آل۔۔۔ ہاں۔۔۔ کہاں چلنا ہے؟“ رومیلہ غیر ارادی طور پر بولی تو کینہ ہنس پڑی۔  
 ”بھئی اپنا کمرہ دیکھ لیں اور تھوڑا آرام کر لیں، لگتا ہے آپ کچھ زیادہ ہی تھک گئی ہیں۔ آپ کہیں تو میں آپ کے لیے چائے بھیجوا دوں۔ الیان بھائی سے بھی پوچھ لیں۔“ الیان کے نام پر رومیلہ چونک اٹھی۔  
 تو گویا وہ الیان کے کمرے میں جا رہی ہے۔ ایک بار پھر اس کی نظرس شگفتہ غفار کی طرف اٹھ گئیں اور اس بار وہ جس طرح بولیں رومیلہ کو سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگی کہ وہ اسے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں۔

”تم بھی کمال کرتی ہو کینہ! الیان کوئی جاگ تھوڑی رہا ہو گا، جواب بیٹھ کر چائے پیے گا۔ شادی اور سفر کی تھکان میں وہ تو بستر پر لیٹتے ہی سو گیا ہو گا۔ خواہ مخواہ چائے وغیرہ بنا کر دینے کی ضرورت نہیں۔ بلاوجہ چائے پینے کے مرحلے میں باتوں کا دور چل نکلے گا۔ پھر سونا اور آرام کرنا سب ایک طرف ہو جائے گا۔“ وہ جس طرح انکارے

جاتے ہوئے بول رہی تھیں۔ وہ رومیلہ کے لیے نہانہ ہونے کے باوجود نیا تھا۔  
 کینہ تو ان کی بات کا پس منظر نہیں سمجھی، کیونکہ وہ بہت ساری باتوں سے بے خبر تھی، لیکن رومیلہ کو بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اسے کیا اور کرنا چاہتی ہیں۔  
 الیان کمرے میں چائے پیتے وقت بھلا کس سے باتیں کر سکتا تھا۔ رومیلہ کی موجودگی میں اس کا کوئی کزن تو کمرے میں آئے گا نہیں۔

پھر الیان کو آرام کرنا چاہیے اور اسے سونے دینا چاہیے۔ چائے اور باتوں کا وقت نہیں ہے۔  
 یہ ساری ہدایتیں کسے دی جا رہی تھیں۔ جو شگفتہ غفار رومیلہ کو سنانا اور دہرانے چاہتی تھیں۔ وہ اس کی سمجھ میں بھی طرح آیا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہیں۔  
 کیوں وہ نہیں چاہتیں کہ وہ الیان کے ساتھ جا کر اس کے کمرے میں رہے۔

کیوں وہ یہ چاہ رہی ہیں کہ اس کے کمرے میں جانے سے پہلے ہی الیان سو چکا ہو۔  
 رومیلہ کتنی ہی دیر شگفتہ غفار کو دیکھتی رہی، جو خود بھی اسے غصے سے گھور رہی تھیں۔ لیکن کینہ کے ٹوکنے پر رومیلہ مشینی انداز میں گھومتی اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی اور جب تک وہ تائی اماں کے کمرے سے نکل نہیں گئی اسے اپنی پشت پر شگفتہ غفار کی نفرت بھری نظروں کی پیش محسوس ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ ایک طویل راہ داری عبور کر لینے کے باوجود ان کی نظروں کی حدود سے نکل جانے کے باوجود ان کے سامنے موجود نہ ہونے کے باوجود۔  
 اس نفرت بھری نظروں کا حصار اس کے گرد ہی کھینچا رہا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

☆ ☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مردانہ

خوبصورت چھپائی

شائع ہو گئے ہیں

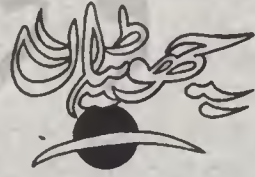
مضبوط جلد

آفٹ ہیپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امرنیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

نشانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361





رمضان شروع ہونے میں محض دو چار دن رہ گئے ہیں۔ اور ہر ”یکے مسلمان“ کی طرح میں نے بھی پورے جوش و خروش سے کمر کس لیا ہے۔ ہزاروں کام بھگتانے والے ہیں۔ گھر کی تفصیلی صفائی، کچھ نئے آئینہ کی خریداری مثلاً نئے پردے، کٹن کورڈ بیڈ شیٹس حتیٰ کہ کراکری ڈیکوریشنز وغیرہ وغیرہ۔ میرا تو دماغ گھوم گیا ہے۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا کہاں سے شروع کروں۔ پورے مہینے کی راشن کی لسٹ عموماً آخر مہینے کی اور بچوں کی فراہمی پہ سحری اور افطاری کے لیے جو ان گنت لوازمات چاہئیں ان کی تیاری کے لیے مجھے ابھی سے ہی کمر کسنا ہے۔ رول، کباب، سموے، ٹکس اور ٹکٹس یہ وہ چیزیں ہیں جن سے پورا مہینہ میرا فریئر لبالب بھر رہا ہے۔

زیر زمینیں میرے خاوند کے عہدے پہ فائز ہونے کا درجہ حاصل ہے ان کے لیے سارا کمال بس یہی ہے کہ ایک خطیر رقم ان تمام چیزوں کی خریداری کے لیے میرے ہاتھ میں سمادیتے ہیں اور بس! پھر میں جانوں اور میری اکیلی جان۔ اوپر سے افطار پارٹیوں کے بھی بلا کے شوقین ہیں۔ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی کو انوائٹ کر لیتے ہیں۔ ایسے میں ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ میرا اس صورت حال میں کیا حال ہو سکتا ہے؟ وہ تو ابھی اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاس دو کل وقتی ملازمتیں ہیں۔ جو بچوں کے ساتھ ساتھ گھر کی بھی دیکھ بھال کر لیتی ہیں۔ عید توار پہ بھی میں انہیں گھروں کو نہیں بھیجتی کب ظاہر ہے سوطح کا آنا جانا لگا رہتا ہے میں تنہا تو نہیں بھگتا سکتی نا؟ اور پھر غریبوں کی بھی کیسی

عید؟ حق ہاں!

بے چاروں کو دس دس ہزار کے عوض مل باپ کام کرنے کے واسطے لوگوں کے گھروں میں رکھواتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ بس مہینے کے کسی ایک دن اگر ان کی تنخواہ لے جانا نہیں بھولتے۔ بس اس کے علاوہ ساری سرور و کاماری۔ کہہ لانا پناہ چیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اسی بات سے یاد آیا ابھی تو مجھے اپنی ”چھوٹیوں“ اصل میں ہمارے ہاں ان لڑکیوں کو اصل ناموں کی بجائے چھوٹی اور منھی ٹائپ ناموں سے ہی پکارا جاتا ہے۔ کے لیے بھی کپڑے نکالنے ہیں۔ دونوں کو ہی اپنے پچھلے ییزن کے پنے ”نمدہ سوٹ“ کٹ چھانٹ کے بعد انہیں دیتی ہوں دو دن تھوڑے سے پیسوں میں ان کے ناپ کا کر دیتی ہے اللہ اللہ خیر ملا۔

مجھے تو درزن کے چہرے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیا پانی بھر آتا ہے اس کے منہ میں میرے اتنے عمدہ کپڑے دیکھ کر۔ تو یہ اللہ برا وقت نہ دکھائے بے چاری کے خود کے کپڑوں کا گھس گھس کر شہ ہو چکا ہوتا ہے۔ میں نے اکثر ”دکھاوا“ کرنے والی عورتوں کو اپنی اترن اسے پہنچاتے دیکھا ہے جسے وہ اپنی چار عدد بیٹیوں اور خود کے استعمال میں لاتی ہے۔ لہذا میرے کپڑے دیکھ کر جو مخصوص ”کلاچ کی چمک“ اس کی آنکھوں میں اترتی ہے وہ مجھے اندر تک رسوا کر دیتی ہے۔ میں سلی میں آجاتی ہوں کہ میرے گھر کاہر کرنے والی دونوں ”چھوٹیاں“ ان کپڑوں کو پہن کر شاد ہو جائیں گی۔

ایک دفعہ دو درزن نے مجھ سے تقاضا کیا بھی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر گھر میں کام کرنے والیوں کے تن بھی تو دیکھنے ہیں نا! ٹھیک ہے کہ میں ایک ییزن کے کپڑے اگلے ییزن ذرا ”سیاہے“ سے ہی پہنتی ہوں پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنے میاں کی محنت کی کمائی جھگیوں میں جا کر باٹ آؤں کب ہر ییزن کے کم رقم بھی کچھ جوڑے میں سنبھالوں تو ایک ایک کے حساب سے میری دونوں ”چھوٹیوں“ کے تن ییزن تو نکل گئے نا اسی لیے تو اوپر والے کمرے کی پوری وارڈ روپ میرے پرانے کپڑوں سے بھری ہے۔ ساری عمر بھی پہنیں تو جوڑے کم نہ ہوں گے

”چھوٹیوں“ کے اب میں نے ان غریبوں کا دل بھی خوش کرنا ہے نا اللہ جزا دے بس مجھے اسی کا دیا ہے برباٹ رہے ہیں نہیں تو بندے کی کیا اوقات برا وقت ہو گیا اسی جوڑ توڑ میں، میرا خیال ہے اب میں بازار کے بے نکل ہی پڑوں کیونکہ میں تو وہ ”مومنہ“ ہوں جو

رمضان میں خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے لو لگاتی ہے۔ مجھے نہیں پسند اپنی عبادت میں خلل۔ میں تو رمضان سے دو دن پہلے ہی سب کچھ بٹا کر کوٹا سنبھال لیتی ہوں بچاں میں ہوتی ہوں اور مجھ پہ برستی ہوئی رب کی ان گنت ”رحمتیں“ باقی سب گھر کے دھندے نبھانے کے لیے ہیں نا ”میری پھوٹیاں“۔



ناشتے کے بعد میں جلدی جلدی تیار ہوئی تیاری کیا کرنی تھی مجھ سے ساہ بندے نے؟ بس گاؤن پن کے اسکارف لیتی ہوں۔ ذرا سی ہفنگ اور لائٹ رسٹ کلر کی اپ اسٹک پنل لگا کر میں ریڈی ہوتی ہوں۔ میں شروع سے ہی خاصی سویرا دھرتی ہوتی ہوں۔ سوا دقت بھی میں نہیں ہی دکھ رہی ہوں اچھا چلیں چھوڑیں میری فاسٹ کے قے، کون سا آپ کو کتاب چھاپنی ہے۔ اچھا تو میں چاہ رہی ہوں کہ ذیور اور بچوں





کے واپس آنے تک میں مارکیٹ کا کام چھوڑتا ہوں۔ زبیر فیکٹری سے لوئیں یا بچے اسکول سے مجھے گھر نہ پا کر باؤ لے ہو جاتے ہیں۔“

”چھوٹی...! اے چھوٹی سہتا نہیں کہ بختیں فوراً کیوں نہیں آتیں۔ ارے آپ زیادہ چوکلیں مت۔ یہ پات دار اور تیز دھاڑ آواز میری ہی تھی جو مجھے بوقت ضرورت اپنی چھوٹیوں کو حاضر کرنے کے لیے نکالنی پڑتی ہے۔“

نہیں بٹھا سکتی۔ بس جی! ایسا ہی درو مند ہے میرا دل بھی  
تو وہ طور طریقے ہیں جنہیں سکھانے میں، میں ہلکان  
ہو گئی ہوں۔ آج میری آواز پہ دونوں بے شک مرنے  
پڑی ہوں۔ بحث بھائی آتی ہیں۔ تو کل سراس کی آواز پہ  
چھی لپیک کہیں گی! اور سراس مجھے دعا میں دے گی  
کیونکہ وہ بھی تو دیکھی ہی تسکین محسوس کرے گی یا  
جیسی میں محسوس کرتی ہوں۔ بالکل ملکاؤں جیسی آہ!  
بس نیکی کرنے کا شوق ٹھنی میں پڑا ہے میری۔

منہ کو آتا ہے جب وہ نئے غور ہی رو کر رہے جاتے ہیں۔ آخر میرے شوہر کی محنت اور جان فشانی کی کمانی ہے اور اس کمانی کو مکمل طور پر ضائع ہونے سے بچانے کے لیے میں نے تقریباً "دو سال پہلے کمال کا حل" دعوئہ نکالا جس سے ایک غریب کی دعائیں بھی مفت میں ہاتھ آجاتی ہیں۔

ماشاء اللہ زمین ہوں گے ہی آپ ”مگر مجھ سے کم“ شکر  
میرے مولا تیرا! سب تیری ہی دین ہے۔



و خوش دیکھیے۔

توبہ۔ توبہ اس قدر رش ہے۔ لو! بندہ بوجھے مفت  
بٹ رہا ہے کیا راشن؟ اب طرح طرح کی  
بدبوئیں، سوکھنی پڑیں گی۔ یہ عورتیں اتنا نہیں کرتیں  
کہ ہم جیوں میں آنے سے پہلے پسینے کے بجکے  
مارتے کپڑے ہی بدل آیا کریں۔ چلیں! کیا سمجھتے، میری  
بھی مجبوری ہے کہ مجھے آج ہی خریداری کا کام ختم  
کر کے مصلحہ سنبھالنا ہے میرے تو ذکر و کار کی ہی  
بڑی لمبی فہرست ہے۔ فہرست سے یاد آیا کہ میں بھی  
راشن کی طویل فہرست نکال لوں، نہیں تو بڑا کچھ بھول  
جاتا ہوں۔ آپس کی بات ہے یہ آپ چھوٹی کو تو  
دیکھ ہی رہے ہوں گے کیسے دھڑا دھڑ کرناٹلی میں میرا  
مطلوبہ سالن بھرتی جا رہی ہے۔ یہ ہے میری ریننگ کا  
نتیجہ۔ ہر ماہ آتی ہے میرے ساتھ کون سا پروڈکٹ یا  
آئٹم کس مقدار اور حساب سے ٹرائی میں رکھنا ہے؟  
سب پتا ہے اسے۔ ابھی ٹھوڑی دیر میں اگر فہرست  
بھی لے جائے گی مجھ سے۔ اور جو چیزیں وہ لکھی ہوں گی  
انہیں بھی پورا کر لے گی جو جی سے اٹھوایا تھا میں نے  
اسے، اس کی مال کو کہہ کر وہی تھوڑا لکھا پڑھا میرے  
بھی کام آجاتا ہے۔

”آئے ہائے۔ اب دیکھو، بے چاری دو چھوٹی بچیاں  
کیش کاؤنٹر پر آئی ہیں، چینی کا دو گلو والا پیکٹ اور روج  
افزا کی چھوٹی بول پکڑے۔ لیکن ہاتھ میں ہیں صرف  
150 روپے۔ لو بھلا بتاؤ اتنے پیسوں میں کہاں  
آئے گا یہ سب توبہ! کتنے ظالم ہیں یہ لوگ، بے شرمو  
اتنا بڑا اسٹور چلا رہے ہو، اتنا دے رکھا ہے رب نے  
بے چاری کو اللہ واسطے کی ہی دے دو۔ حالت تو دیکھو  
غریب کی۔ یا اللہ تو معاف کرنا ہمیں، تیرا دیا کھاتے ہیں  
’غریبوں کا بھی کیا روزہ؟ دو گلو چینی اور روج افزا کی بول  
تو خرید نہیں سکتے، روزے کی اخاک رکھیں گے۔“

اب یہ سامنے انتہائی قیمتی کپڑوں میں بلوس عورت  
کو ہی دیکھتے کتنا سونا چڑھا کر آئی ہوئی ہے۔ مولیٰ پھسکی  
ماتنا نہیں کرتی رمضان شروع ہونے سے پہلے پہلے  
نیکوں کی ”ہوئی“ کر دے۔ نظر بچا کر تھوڑے سے پیسے

تھما دے بے چاریوں کو۔ پر نہیں جی! اتنا کجبر کہاں  
سے آئے لوگوں میں۔ بس جھینس جیسے دیدے پھاڑ کر  
تماشا دیکھ رہی ہے۔

اب میں کہاں جاؤں اپنا ”ٹشو پیپر“ جیسا دل لے  
کر ادھر کسی کے آنسوئے نہیں، ادھر ہی گھبراہٹ  
سکڑا نہیں۔ پر مجھ سے ریاکاری کیسے ہو؟ ایسے کدوں  
میں دکھاؤ؟ کوئی دے دوں پر میں کیسے بھری دینا  
کے سامنے اپنی نیکی جتانوں۔ ایک دو چار سو روپے کے  
لیے میں اپنا پردہ کیسے کھولوں؟ آئے! اچلی گئیں بے  
چاریاں بچ بچ یا اللہ تو غریبوں کے گھر بھر دے تو قادر  
ہے۔

”ہیں۔ ہیں۔ یہ دیکھیے ذرا کجبت چھوٹی کو دیکھیے  
دیکھیے پانچ سو پیسے، نا؟ ہنگ حرام نے اپنے دوپٹے کے  
پلو میں باندھ رکھے تھے وہی ان بچوں کو پکڑا دیئے  
ہیں۔ دیکھا ان چھوٹیوں کی کم طرکی کو؟ کھلا میں ہم  
پلا میں ہم اور بچ جھالہ لٹاؤں دو سروں پر۔ سمجھ رہی  
ہے بڑی نیکی کی۔ بھلا غریب کی بھی نیکی کوئی نیکی ہوئی  
ہے۔

چل چھوٹی! ذرا گھر چل، تیرے سارے جوڑ کھولتی  
ہوں۔ پہلے میں کاؤنٹر پر اپنا پینتیس ہزار کا بل ادا  
کروں۔ یہ ذیل چھوٹی کب کی ساری ٹرائیاں لیے  
کیش کاؤنٹر پر پہنچ چکی تھی اور میں معصوم، خیلوں میں  
گن دیکھ بھی نہ سکی۔ اوپر سے کجبت پانچ سو روپے کا  
نقصان بھی کرا پیٹھی۔ اور یہ تو میں سود سمیت وصول  
کر ہی لوں گی۔ آخر شوہر کی کمائی یہ جان لٹا سکتی ہوں  
میں۔“

”یا اللہ! یہ منحوس چپ کیوں نہیں کرتی؟ روئے  
چلی جا رہی ہے، روئے چلی جا رہے۔ جیسے ماں مر گئی ہو  
اس کی۔“ ایک تو ان چھوٹیوں کے رنگ قدرتی کپے  
ہوتے ہیں اوپر سے ذرا منہ کے زاویے بگڑیں  
تو آگے آپ خود تصور کر لیجیے کتنی بدہیئت دکھتی  
ہیں۔

”آخر میں نے کہہ کیا دیا ہے؟ انگلی تک تو لگا لی  
نہیں حالانکہ 500 روپے غرق کرنے کا تھوڑا

میں جیسا دل لے کر ادھر کسی کے آنسوئے نہیں، ادھر ہی گھبراہٹ  
سکڑا نہیں۔ پر مجھ سے ریاکاری کیسے ہو؟ ایسے کدوں  
میں دکھاؤ؟ کوئی دے دوں پر میں کیسے بھری دینا  
کے سامنے اپنی نیکی جتانوں۔ ایک دو چار سو روپے کے  
لیے میں اپنا پردہ کیسے کھولوں؟ آئے! اچلی گئیں بے  
چاریاں بچ بچ یا اللہ تو غریبوں کے گھر بھر دے تو قادر  
ہے۔

”ارے! ارے! منہ تو بند کیجیے آپ لوگ۔ میرا  
مطلب ہے کوئی اتنا بڑا ظلم نہیں تو نہ بیٹھی میں۔ آپ  
ساری بات سن بیٹھے، پھر خود ہی سمجھ آجائے گی۔ آپ  
خود ہی نتیجہ نکال لیں گے کہ سارا کریڈٹ میری  
غناست اور صفائی پسند طبیعت کو چاہئے گا۔“

شاہنگ کرنے کے بعد میں سخت تنگی بھاری دھماکی  
بجے گھر لوٹی تھی۔ زہیر اور بچے آگے تھے اور ”بڑی والی  
چھوٹی“ نے انہیں کھانا بھی کھلادیا تھا۔ ابھی سارا سامان  
گاڑی سے اترا کر میں نے کچن سے ملحق پینٹری میں  
رکھوایا ہی تھا اور سنک کے پاس کھڑی ”چھوٹی والی  
چھوٹی“ سہمی ہوئی گلاس سے چھوٹے چھوٹے پانی کے  
گھونٹ بھر رہی تھی۔ بس جی! اس کے چہرے کا رسم  
دیکھ کر مجھے پانچ سو روپے کا نقصان یاد آگیا۔ (بے شک  
وہ روپے اس کے اپنے تھے پر جوڑے تو میرے میاں  
کی کمائی سے ہی گئے تھے نا؟ پھر کیا تھا! میں نے جھٹ  
سے جھپٹ کر اسے بالوں سے پکڑا اور کھینٹے ہوئے  
لے گئی وہی لاؤنچ میں۔ زہیر اور بچے وہی دیکھ رہے  
تھے، حیران سے تماشا دیکھنے لگے۔ میں نے دو چار مزید  
جھٹکے دے کر سارا قصہ کہہ سنایا۔

زہیر نے مجھے ہیزا ٹھنڈا کیا پر مجھے 500 کا دکھ  
نہیں جا رہا تھا۔ تبھی میرا منجھلا لٹال اٹھا کر بولا۔

”مما! اجانے بھی دیں۔ دیکھیں تو اس کے بالوں کا  
چتر! اوپر سے آپ اتنے جھٹکے دے رہی ہیں کہ ساری  
ہوئیں بالوں سے انز کر کا پٹ پٹ پٹ کر رہی ہوں  
گی وہاں سے صوفے پر چڑھیں گی۔ ہو سکتا ہے ایک  
ٹوہ آپ کے ساتھ ہی بیٹھی بیوی دیکھ رہی ہو۔“ میرا  
دل بخ بھگ سے اڑ گیا۔ ایسا لگا جیسے میری انگلیوں اور  
ہاتھوں میں جو میں چھنکری بڑی ہیں۔ آخ تھو! میری  
نہیں طبیعت پہ بڑی گراں گزری تھی یہ بات۔ میں  
نے چھوٹی کے بالوں سے بھرے ہوئے سر کو دیکھا جو

اس کے زور زور سے رونے کی وجہ سے جھٹکے جا رہا تھا  
اور یکدم ایک خیال میرے دل میں ابھرا۔ میرا غصہ  
بھی ٹھنڈا ہو جانا اور میں کسی غریب پر ہاتھ اٹھانے سے  
بھی بچ جاتی۔ (دل زہری نا، میرا نرم دل) بس جھٹکے کو ہی  
بھگایا کڑ تک اور ٹائی گھر بلوایا۔ پورج میں بٹھا کر  
ساری کھیتی صاف کرادی۔

نہیں نہیں! جھٹکے کی نہیں، چھوٹیوں کی۔  
کجبت چھوٹی کے غصے میں بڑی والی چھوٹی بھی رگڑی  
گئی۔ مانا کہ طیش کی وجہ سے میں زیادہ دھیان نہیں  
دے پائی اور ٹائی بد تمیز نے بالکل ”تنگی“ اٹھو کر کٹہ بنادیا  
دونوں کا۔ وہ تو شکر ہو! کہ بڑے ٹائم سے میں نے دیکھ لیا  
وگرنہ استرے کے ساتھ ابھی مزید کار گیر کرنے ہی والا  
تھا۔ بس جی اتنی سی بات تھی اور تب سے دونوں نے  
ہی رو رو کر دریا بہا دیے ہیں۔ بھلا کون سی نئی بات  
کردی میں نے۔ تین سال پہلے تک ہر گرمیوں میں  
میں دونوں کی ”نیم ٹنڈ“ کروا دیتی تھی۔ پر جب سے بڑی  
والی چھوٹی تیرہ کی اور چھوٹی والی چھوٹی دس کی ہوئی  
تب سے ہی میں نے احساس کرتے ہوئے ٹنڈ کروائی  
چھوڑ دی تھی۔ یہ تو اب آگے پیچھے کے واقعات نے  
مجھے دوبارہ اس ”بال صفائی“ پر مجبور کر دیا اور رہی سہی  
کسر چھوٹی والی کے آج کے واقعات نے پوری کر دی۔

اصل میں چھوٹیاں رکھنے کے ساتھ سو طرح کے  
چھوٹے مسائل بھی ہیں۔ اول تو ہمارے گھروں میں  
کوئی بھی چھوٹی پانچ چھ سال سے زیادہ عمر کی رکھی نہیں  
جاتی۔ ہوش سنبھالتی ہی ماں باپ بیگمات کے گھروں کو  
ہانک دیتے ہیں اور جوان ہوتے ہی بیگمات سسرال  
لڑھکا دیتی ہیں۔ (مگر لڑھکانے سے پہلے ایک اور چھوٹی  
کھل ”قارم“ میں لائی جا چکی ہوتی ہے) ان بڑی ہوئی  
ہوئی ”چھوٹیوں“ کی جوانی کو نگام ڈالنے کے لیے ان  
کے ظاہری حیلے ذرا ”سٹائٹ“ رکھتے پڑتے ہیں۔

اب آئیے اصل مسئلے کی طرف۔ یہ بے ہودہ بڑی  
والی چھوٹی جب سے تیرہ کی ہوئی ہے، پر پر زے نکالنے  
شروع کر دے ہیں۔ کارنگ بھی قدرے صاف ہو گیا  
ہے۔ (ماحول کا اثر) پر ان سب باتوں کا اثر میرا بڑا بیٹا



بلال لے رہا ہے۔ دو تین بار تو میں نے اسے ”بڑی والی چھوٹی“ کے گرد خود منڈلاتے دیکھا ہے، آگے پیچھے کا ہٹا نہیں۔

ابھی کچھ دن پہلے میں سارے دن کی ”تھکی باری“ دھپہ کو آرام کرنے کے بعد مغرب کے آس پاس کمرے سے نکلی تو بلال کو کچن سے نکلتے دیکھا، مجھ پہ نظر پڑتے ہی بری طرح گھبرا گیا میرا جب میں فوراً کچن کے اندر گئی تو بڑی والی چھوٹی سہمی ہوئی تنک نہ کپ کھٹکال رہی تھی، شکل سے روئی ہوئی بھی لگی مجھ میں سب سمجھ گئی، غصے سے میرا برا حال تھا۔ آپ بھی سمجھ گئے نا؟ وہ مکار میرے معصوم بلال کو اور غلا رہی ہوگی، میرا سیدھا سادا بچہ قابو نہیں آیا ہوگا اس کے پیچھے تو میرے بلال کے معصوم چہرے پہ گھبراہٹ اور پکڑے جانے کی وجہ سے چھوٹی کی آنکھوں میں آنسو تھے)

بس جناب! وہی لمحہ بہت تھا، مجھ جیسی ”معاملہ فہم“ عورت کو معاملے کی تہہ میں پہنچنے کے لیے اسی وقت ٹھان لی تھی کہ اس ”کالے منہ والی“ کا منہ دوسرے پاس نہ لگایا تو میرا نام نہیں دیکھیں نا، جی! ان چھوٹیوں نے دل پشوریاں کر کے خود تو کھل لیتا ہے، پتلی گلی سے خراب ہونے کے لیے رہ جاتے ہیں ہمارے لٹو، پیزوں جیسے بچے۔ جی۔؟ کیا نما؟ بیٹلی جیسے۔ نہیں جی نہیں! جلیبی گو میں ٹھانی مانتی ہی نہیں۔ اجی چلیں چھوٹیں، آپ بھی کیا ٹھانی کی دکان لے کر بیٹھ گئے۔

ہاں تو چھوٹی والی چھوٹی کو سزا مل گئی جنرل اسٹور میں ”شوخیان“ مارنے کی، اور بڑی والی چھوٹی کو میرے بیٹے کو ”شوخیان دکھانے کی“ آج یقیناً ”آپ کو اصل مفہوم سمجھ آیا ہو گا۔ مندرجہ ذیل محاوروں کا!

”ایک پتھ“ دو کاج“ ”ایک تیر“ دو شکار“ ”اب کم از کم میں گھر کے پائیزہ ماحول کی طرف سے مطمئن تو ہو جاؤں گی۔ آخر ان چھوٹیوں کے ہاں باپ کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔ کیا بیٹے کی ان پر جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کی بیٹیوں کی وجہ سے میرے شریف اور سلیجھے

ہوئے بچے بگڑنے چلے تھے۔ ان تمام گہری اور دراندیش باتوں سے آپ اچھی طرح جان گئے ہوں گے کہ ان حالات میں میرا یہ عمل کتنا جائز اور بروقت ہے۔ تو پھر بھلا مجھے ان منحوسوں کا روٹا کوفت میں جٹا کیوں نہ کرے؟ ایک بچن میں کھسی سوے بہا رہی ہے اور دوسری میرے پیروں پہ سردھرے انہیں تراوٹ پہنچا رہی ہے۔ سمجھایا ابھی ہے دونوں کو کہ عید آنے تک اتنے بال آجائیں گے کہ آرام سے کنگھی ہو سکے، ہو سکتا ہے چھوٹی چھوٹی پنہن بھی تنک جائیں اور پھر ابھی تو روزے شروع ہونے میں بھی ایک دو دن ہیں پر ان چھوٹیوں کی عقل بڑی موٹی ہوئی ہے۔ جب تک سر بردندانہ پڑے ”دو عمروں“ کی طرح اڑی رہیں گی۔

ان کے رونے کا علاج بھی میرے پاس ہے وہ ہے نا میرا منجھلا لٹال۔ بس ایک آواز دوں گی میں اسے اور دونوں کی دونوں ایسے چپ ہوں گی جیسے ہو جاتا ہے۔ وہ کیا ہے نا! میرا لٹال بڑا تھ چٹ ہے، نہیں دکھنا ہاتھ میں بلا ہے یا ریکٹ بس جہاں کھڑا ہوتا ہے وہیں سے ٹانگ کے نشانہ مارتا ہے، جو کبھی خطا نہیں ہوتا اور بدب ہوتی ہیں ”چھوٹیاں“ اسی لیے جب میں بڑی زنج ہو جاتی ہوں ان دونوں سے تو اپنے بھٹلے پہ سالار کی مدد کرتی ہوں دونوں کا دم نکلتا ہے اس کے طور دیکھ کر۔ اسی لیے تو بندے کے پتھر کر کام سے لگی رہتی ہیں۔ ورنہ میں بے چاری تو بلکان ہو، ہو جاتی ہوں۔ کیونکہ مجھ میں تو ایک کاکوچ مارنے کا خوصلہ اکٹھا نہیں ہوتا۔ (کراہیت کی وجہ سے) تو پھر کبھی چھوٹی پہ ہاتھ کیسے اٹھاؤں؟ میرا تو جی بادل پڑا نرم ہے نہیں پیٹ سکتی میں انہیں۔ بی بی لو ہونے لگتا ہے اسی لیے تو بھٹلے کی خدمت حاصل کرتی ہوں ورنہ تو جی دنیا بڑی ظالم ہے۔

ساتھ والی ”مسز شیخ“ ہی دیکھ لیں بڑی ظالم ہیں روئی کی طرح دھنک دیتی ہیں اپنی چھوٹیوں کو۔ ابھی چند ہفتے پہلے کی بات ہے میں تیس میں بیٹھی مڑے دار موسم کا مڑا لے رہی تھی۔ رات بارش کھل کر برسی

تھی اور ابھی تک موسم یہ اس کے اثرات تھے قریب ہی ”بڑی والی چھوٹی“ کو چاول چننے کے لیے ٹھایا ہوتا تھا۔ (پورے سال کے چاول میں ایک دفعہ میں ہی صاف کروا کر اشاک کر لیتی ہوں)

تھوڑی دیر بعد میں کیا دیکھتی ہوں کہ مسز شیخ اپنے وسیع دعوٰی سے بچنے کے پر آمدے میں کھڑی اپنی چھوٹی پہ زور زور سے چلا رہی تھیں۔ وہ غریب بے چاری پتا نہیں کیا کر بیٹھی تھی کہ مسز شیخ — توپ کا کولہ بن بیٹھیں۔ پھر تو گالیوں کا وہ طوفان منہ سے نکلا ان کے کہ محلے پر بھی اثرات گئے ہوں گے۔ تو بہ! یا اللہ میری توبہ کیا دکھ بھرا منظر تھا، وہ چھوٹی سی غریب بچی ہاتھ جوڑے ہاتھ نہیں کون سی صفائیاں دینے جا رہی تھی پر مسز شیخ تو فرعون بنی قہر سائے جا رہی تھیں۔ میرا شو بہرے ساول بھینکا شروع ہو گیا۔ دیکھا نہیں جا رہا تھا مجھ سے ایسا درد ناک منظر بہرمت جمعیت کے کھڑی رہی کہ آخر دیکھوں تو سہی وہ ظالم عورت اگلا ظلم کیا توڑتی ہے (جسکد)۔

کیا دیکھتی ہوں کہ مسز شیخ نے اسے قدرے چوڑے ہاتھوں سے اپنی چھوٹی کو بالوں سے پکڑا اور اس کا سر پر آمدے کی کرل سے ٹکرایا۔ ایک بار نہیں تین بار۔ میرے تو خوف سے روٹنے کھڑے ہو گئے سہمی نظروں سے آسمان کی طرف نگاہ کی تو یوں محسوس ہوا کہ ابھی قہر ٹوٹا کہ ٹوٹا۔ میں تو جی بادل تھا، اس غریب بچی پہ ترس کھاتی واپس مڑی تو دیکھا میری ”بڑی والی چھوٹی“ یہ منظر دیکھتے ہوئے نیہ مائے جا رہی ہے۔ میں نے رکھ کے لگائیں دو اور وہاں سے دفع کیا۔ بھلا چھوٹی کو چھوٹی سے کاہے کی ہمدردی۔ (اس کام کے لیے میں ہوں نا!) بس جی تب سے مجھے اگر اپنی چھوٹیوں کے کس بل نکالے ہوتے ہیں تو بھٹلے کو آواز دیتی ہوں وہ آتا ہے اور تھری ٹھکانی گر جاتا ہے۔ میرے خدا ترس ہاتھ کسی غریب۔ اٹھنے سے بچ جاتے ہیں۔ مار کھانے کے بعد اگر چھوٹیوں کے کہیں گمراہ خم بائیل نمایاں ہو جائے تو دونوں کو ایک دوسرے کی سنگائی پہ بھی لگا دیتی ہوں۔ (بتایا تو ہے 101 طریقے ہیں میرے پاس تو اب کمانے کے۔)

## مشہور و مزاح نگار اور شاعر انشاء جی کی خوبصورت تحریریں

کارٹونوں سے مزین	450/-
آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گروپوش	450/-
سب کلام	450/-
آوارہ گرد کی ڈائری	450/-
دنیا گول ہے	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	275/-
معمری مری پھر اسافر	225/-
خوار گندم	225/-
آورد کی آگری کتاب	225/-
اس ہستی کے کوچے میں	300/-
چاند گھر	225/-
مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	225/-
اندھا کتواں	200/-
لاکھوں کا شہر	120/-
باتیں انشاء جی کی	400/-
آپ سے کیا پوچھ	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی



## ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بسا دل	آندریش	500/-
دروم	راحت جمیں	600/-
دعائی اکروشی	رخسانہ رحمان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ رحمان	200/-
شہول کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
حیرت نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جوں	آپہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	قادر انوار	500/-
بہول بھلیاں تیری گلیاں	قادر انوار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	قادر انوار	250/-
یہ گلیاں یہ چارے	قادر انوار	300/-
مین سے عورت	فرخ العزیز	200/-
دل مے دھوڑ لایا	آسید زاتی	350/-
تھرنا جانیں غراب	آسید زاتی	200/-
ڈگر کھدھی سمائی سے	فوزیہ یاسمین	250/-
اماؤں کا چاند	جزی سعید	200/-
رنگ خوشبو دہلا دل	انٹاس آفریدی	450/-
درد کے قافلے	رضیہ جمیل	500/-
آج مگن پرچا نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	ہیم عورتیشی	300/-
تیری دہائی میں دل کی	میر نور شہدیل	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ	400/-

ناول منکرنے کے لیے کتاب ایک خرچ - 30/- روپے

منکرنے کا

کتبہ و مران ڈائجسٹ 37- اردو بازار کراچی۔

فون نمبر 32216361

مسکین پر رحم اور کم بھی دے ڈھائی لاکھ زکوٰۃ کی مدد میں نکل جاتے ہیں۔ پر میں اتنی بڑی رقم یکشت ان نذیروں میں بانٹ دوں تو یہ تو بیٹھ بیٹھیں گے۔ اسی لیے سارا سال تھوڑا تھوڑا کر کے اپنا ”فرض“ ادا کر لی ہوں اور اسی میں سے ”بڑی والی چھوٹی“ کا پکا چھلکا جیز بھی تیار کر رہی ہوں کم بخت کی چھ ماہ تک شادی ہے۔ اور ”چھوٹیاں“ رکھتے وقت ہماری ان کے ہاں باپ سے یہی بات طے ہوتی ہے کہ معمولی تنخواہ اور بیاہ کے وقت جیز کا ایک عدد ڈرگ، اب اس جیز میں چاہے ماٹے کے برتن ہوں یا ادو گرد سے اکٹھے کیے ہوئے بستر یہ ہماری درد سر کیلے ہلکی ترین کالٹی کا فرنیچر اور ٹھیلوں سے لئے والے دیگر سٹے لوازمات، آٹھ دس سالوں میں لی گئی انتھک بیگار کے عوض تمکے تو نہیں اب میں ذرا اس سے نبٹ لوں۔ پتا نہیں کیا تقاضا کرنے آیا ہے۔

”ہاں بولو بدایت اللہ“ خیر سے آئے ہونا؟ ابھی تو رمضان کی پہلی چڑھی ہے اور تمہاری رالیں بھی منکینے لگیں۔“ چھوٹی کا باپ میرے سامنے نرم تحلیل گھاس پھینٹا تو میں نے پوچھا اور میری بات سن کر یہ جو اس کا چہرہ لال، لینگنی اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو اس کی وجہ غیرت نہیں بلکہ یہی بات ہے ”بے شرمی“ (غیرت اور عزت نفس سے بھلا ان کا کیا واسطہ)

”وہ جی جی؟ کس خوشی میں؟ تم کہیں ڈی سی تعینات ہو گئے ہو؟“ تو بھلا بتاؤ۔ صبح کیسی ہونا تک بات کر دی۔

”وہ باجی، میری بیٹی کام نہیں کرنا چاہتی، وہ زہنا چاہتی ہے۔ آپ کو پتا ہے ناچو بھی جماعت میں تھی جب آپ کے اس چھوڑ کر گیا تھا جی بڑھائی میں ہو شیار بھی تھی۔ میں پچھلی دفعہ آیا تھا تو آپ کی نظر بچا کر میرے پیچھے گیٹ سے باہر آئی تھی اور کتنی دیر روتی رہی تھی کہ میں اسے ساتھ لے جاؤں وہ زہنا چاہتی ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ آپ کے بچے اسے

کے والدین کو جواب دے ہوں۔ چاق و چوبند ہی حوالے کروں گی۔ اسی لیے سحری میں کبھی پرانے نہیں کھلاتی کہ تمہاری نہ چڑھے۔ رات کی روٹی سالن کے ساتھ دیتی ہوں اور پھر ہضم کرنے کے لیے فوراً دوڑیں بھی لگا دیتی ہوں مختلف کاموں کے لیے۔

اب غریب کے نماز پڑھنے کے علاوہ اور کیا ذکر اذکار کرتے ہیں۔ یہ تو ہم جیسوں پہ اللہ کا خاص کرم ہے کہ زبان اس کے ذکر سے تر رہتی ہے۔ قرآن ان چھوٹیوں کو سکھایا نہیں جاتا اور میں نے بھی کبھی سکھانے کا رسک نہیں لیا کہ غلط پڑھیں گی تو گناہ میرے سر۔ استغفر اللہ! ویسے میری ”چھوٹی والی چھوٹی“ کو پڑھنا آتا ہے۔ میں نے بتایا ناچو بھی جماعت میں بھی جب میرے پاس آتی تھی پر میں قرآن کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی کہ اتنی بچی کی کیا کیٹپاکی کا کیا بھروسہ؟ اور میں آفتیں مول نہیں لے سکتی۔

گھروں کے دھندے چلا میں بھی بڑی غنیمت ہے ان کے لیے سکھ جائیں گی تو ان کا ہی فائدہ ہے۔

میں ذرا دیکھوں۔! کب سے اوپر والی منزل کی صفائی کے لیے بیچ رکھا ہے۔ سارا کاغذ کبار پھینکنے کو کہا ہے، جالے اتارنے ہیں، پردے بدلنے ہیں، ہاتھ روز میں تیزاب ڈالنے ہیں، پھر چمچت دھونے میں ہی ایک بن جائے گا انہیں کل سوچ رہی ہوں نیچے پورشن کی تفصیلی صفائی کرواؤں، آج رہے ہوں، نہیں تو صبح سے نہیں کریں گی۔

”اے! یہ چوکیدار کے ساتھ بھلا کون منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔“ آگے تا میری عبادت کے دشمن۔ اب پتا نہیں کون دماغ کی دی بنانے آیا۔ ارے۔! یہ تو میری ”چھوٹی والی چھوٹی“ کا باپ ہے۔

ہاں۔! سمجھ گئی، رمضان شروع ہو گیا نا اہل ہے زکوٰۃ لینے۔ ایسے چل ہوتے ہیں اس طبقے کے لوگ، سچی کا پیالہ کی کر بھی ہونٹ خشک ہی رہیں گے ان کے کپڑوں کو جتنا مرضی بھردو، اور کی ہوس نہیں جاتی۔ مانا کہ اللہ کی بے بہا رحمتیں ہیں مجھ عاجز و

”سبحان اللہ! الحمد للہ! یا اللہ تیری رحمتیں یونہی برستی رہیں۔ سال میں ایک ماہ یہ ایسا آتا ہے کہ بس میرا جی چاہتا ہے وجد طاری کیے رکھوں۔ میں ہوں اور بس میرا مصلہ۔“ نتیجہ۔ نہ مجھے کوئی بلائے اور نہ میں کسی سے بات کرنے کے لیے منہ کھولوں۔“ (بس بیٹ بھر سحری اور جی بھر افطاری کا وقت منہا کر دیں)

آج پہلا روزہ ہے۔ واہ! واہ کیا رونقیں ہیں۔ رات چاند نظر آنے کے ساتھ ہی سحری کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ کیونکہ پھر تراویح پڑھنے میں بھرپور وقت صرف ہوتا تھا۔ اس کے بعد دوسرے ذکر اذکار قرآن پاک کی تلاوت، نفل وغیرہ وغیرہ (ارے نہیں نہیں! میں آپ کو تفصیلاً اس کیے بتا رہی ہوں کہ بہت سی بہنیں متاثر ہو کر عبادت میں دل لگا سکیں۔ صرف ثواب کی نیت ہے بس۔! اب یہ ہی دیکھیے کہ سحری میں دو بھاری قہقہے والے رانھے اور منگین لسی کے تین گلاس پینے کے بعد کس کا دل چاہے گا کہ لمبی تان کر نہ سوئے؟ بس! مجھ جیسی کوئی ہوگی (اڑیے ہو نہیں سکتی۔!) جو رمضان کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کے لیے اپنی نیند قربان کر کے اللہ کے ذکر میں محو رہے۔

ساتن چڑھے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کے بعد کب سے لانا میں بیچ کے لیے بھیجی ہوں۔ ہاتھوں کی پوریں گویا جھڑکئی ہوں، پر شوق عبادت نہیں جاتا۔ دوسرا ہٹ کے لیے میں چھوٹیوں کو بھی جگائے رکھتی ہوں۔ کیونکہ بچے اور زہرا تو آج اتوار ہونے کی وجہ سے خوب ڈٹ کر سوئیں گے۔ اوپر سے روزے کی حالت میں خیریلے بھی بڑے ہو جاتے ہیں جب یہ لوگ سو کر اٹھیں گے تب میں ذرا کمر سیدھی کر لوں گی۔ (دوپہر تین بجے تک اٹھ جاؤں گی، فکر مت کریں) ہاں چھوٹیاں تب تک اپنا کام بند یا ہی لیں گی۔ اصل میں سحری کے بعد میں ہمیشہ انہیں کسی نہ کسی مصروفیت میں کم رکھتی ہوں۔ سو جائیں تو سارا دن بیمار بیمنوں کی طرح لپک لپک چلیں گی اور مجھے اتنی چھوٹی لڑکیوں میں سستی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ میں تو ویسے بھی ان



# مُحِبِّ سَمِلے داعیہ افتخار



- (۵) ”وہ چیز جو موڈ خراب کر دے؟“  
 ☆ ”جب کوئی منہ پر جھوٹ بول رہا ہو اور آپ پر الزام لگا رہا ہو۔“  
 (۶) ”دشمن کیسے لہو؟“  
 ☆ ”جب ڈاکٹر نے مجھے کارڈیالوجی ہاسپٹل کے ٹیسٹ لکھ کر دیے۔“  
 (۷) ”بہترین تعریف جو وصول ہوئی؟“  
 ☆ ”جب میرا ناول ”دروانی توبہ کروم“ شائع ہوا تو بہت تعریف ملی۔ ایک بہن ”روشنائے سین“ جو فیصل آباد کی تھیں انہوں نے بہت تعریف کی۔ میرا

- (۱) ”تاریخ پیدائش / اشارے؟“  
 ☆ ”دس جنوری / جدی۔“  
 (۲) ”خدا سے تعلق؟“  
 ☆ ”بہت مضبوط۔“  
 (۳) ”فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟“  
 ☆ ”اپنے بچوں کے ساتھ کارٹون دیکھنا، عائشہ بائی در شمس (بہن سے) خون پر باتیں کرنا۔“  
 (۴) ”کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟“  
 ☆ ”فجر کا وقت، بارش کا موسم، بچوں کی مسکراہٹ۔“

یہ الگ بات کہ میرے دامن و دھیروں دعائیں ڈال کر کیا ہے ہدایت اللہ، میرا تو دوسرا دم سکون میں آگیا کہ میرا رب مجھ سے راضی ہے، بھی تو ایسے چھوٹے بڑے نیک کام میرے ہاتھوں انجام پائے ہیں، بس دین ہے اس کی۔

چھوٹی کا کیا ہے؟ ابھی اسے پتا نہیں تاکہ پڑھنے وڑھنے میں ”چھوٹیوں“ کا مستقبل نہیں ہے اب اس قدر احساس میرے علاوہ کوئی کرے گا کہ میں نے ہدایت اللہ سے کہہ کر اس کی ایک اور بیٹی منکوالی ہے جی ہاں، اصل میں میری ”بڑی والی چھوٹی“ تو چھ ماہ بعد چلی جائے گی، بیابہ کر۔ تو پھر میری ”چھوٹی والی چھوٹی“ بے چاری اکیلی رہ جائے گی، بس اس کی دو سہ ماہی کے لیے میں نے اس سے بھی چھوٹی اس کی بہن بلوا بھیجی ہے۔ وہ کیا ہے نا، دو دو چھوٹیوں کی ایسی عادت ہے کہ

لیکن اصل بات ساری نیت کی ہے۔ ثواب محض ثواب، غریب کی بچیاں ہیں کچھ طور طریقہ سیکھ جائیں گی، کچھ بن جائے گا ان کا بدھائی لکھائی ان چھوٹیوں کا کام نہیں۔ سبھی تو میں نے ہدایت اللہ کی دوسری بیٹی کو بھی اسکول چھڑوانے کا کہہ دیا ہے کم بخت پانچویں کر رہی ہے، ٹائٹل والے اسکول سے کیا فائدہ؟

آپ یہ تو نہیں سوچ رہے تاکہ میں نے اپنے حال کی خاطر ان ”چھوٹیوں“ کے مستقبل پہ پاؤں رکھ دیا ہے، نہ سنہ ایسا نہیں ہے بالکل بھی نہیں۔ بدگمانی نہیں کرتے۔ بانی اللہ نیتوں کے حال آپ سے بہتر جانتا ہے میں تو اس کی عاجز مخلوق ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ غریبوں کے کام آسکوں۔ لیں بیٹھے بھائے ظہر کر دی۔ آپ بھی بل بیچے تھوڑا۔ حرکت میں برکت ہے ضروری نہیں میری طرح رب نے آپ کو بھی چھوٹیوں سے نواز رکھا ہو۔ میں بھی چلوں اب۔ ظہر کی نماز ادا کروں، پھر قرآن، پھر ذکر و اذکار پھر نوافل۔ پھر۔!

☆ ☆

مارتے ہیں اور ویسے بھی باہمی جی! میں نے جو جمع کر کے چھوٹی سی دکان کھولی ہے روپیٹ کے سہی گزاری ہو جائے گا۔ کچھ عرصے تک کوشش کروں گا کہ اتنی رقم بڑ جائے کہ بیٹے کو باہر بھجوا سکوں۔ بس جی آپ میری بیٹی کو میرے حوالے کر دیجئے میں اوقات بھر کوشش کروں گا کہ وہ پڑھ لکھ جائے اور اس کا مستقبل بن جائے۔ میری چھوٹی کا باپ اپنی اتنی بی بیات کہہ کر چپ تو ہو گیا ہے پر میری سوتی مستقبل پہ اگر انک مٹی ہے۔ مستقبل، کیسا؟ کس قسم کا؟ کیا بن جائے گی چھوٹی؟ بچہ؟ یا پھر ڈاکٹر؟ آخر کیا؟ بھلا چھوٹیوں کا بھی کوئی مستقبل ہے؟ ماسوائے اس کے کہ اپنے جیسی مزید ”چھوٹیاں“ پیدا کریں ہمارے لیے اگر یہ پڑھیں گی تو ”چھوٹی“ کون کہلائے گا؟ ”چھوٹیوں“ کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ ہم جیسے گھروں کا نظام کیسے چلے گا، جہاں چھوٹی کے بنا کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہیں سمجھی نہیں! چھوٹی کے اس چھوٹے مستقبل کی ایسی کی تھی۔ سب سمجھ رہی ہوں اس چھوٹی کی چالبازی۔ کب سے اور والی منزل کو جانی سیرٹیوں میں چھپ کر کھڑی جھانک رہی ہے۔ بے ایمان، مکار، میرا بھی پندرہ سالہ تجربہ ہے چھوٹیوں کا۔ بڑے دیکھے ایسے دھکوکسلے آدمے گھنے کی مار ہے تو چھوٹی دیکھ کیسے تجھے نیچوڑتی ہوں۔ پہلے ذرا میں تیرے باپ کو ایک دو باتیں سمجھاؤں پھر تیری باری۔

☆ ☆ ☆

ارے کہاں گم ہیں آپ؟ کیا سوچ رہے ہیں؟ یہی تا کہ میں نے ہدایت اللہ کو ایسا کیا تاکہ وہ چھوٹی کو لیے بغیر بلکہ ملے بغیر چپ چاپ چلا گیا۔  
 لیکن مانہ! میں نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ کیا ہے وہ یہ کیا ہے کہ اندر الماری سے ایک بڑی رقم لاکر (زکوۃ میں سے) اس کے ہاتھ میں دھری کہ جاؤ بے شک دکان کو بدھاؤ یا بیٹے کو باہر بھجواؤ پر چار پانچ سال تک چھوٹی کو لے جانے کے لیے ادھر کا رخ مت کرنا اور وہ بے ہدایت اتنی بڑی رقم دیکھ کر چھوٹی کو چھوڑ گیا۔  
 (اب دکان تک اس کا دونا مجھے برداشت کرنا پڑے گا)



سیروں خون پر حصار اور ابوجی کا فخر سے مجھے دیکھنا۔“  
 (۸) ”وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟“  
 ☆ ”ایس ایم ایس فارورڈ کرنا۔“  
 (۹) ”زندگی کا خوف کب واقعہ؟“  
 ☆ ”جب ہمارے گھر ڈاکو آئے، جب میری امی ہاسپٹل میں تھیں۔“  
 (۱۰) ”بہترین تحفہ میری نظر میں؟“  
 ☆ ”دعائیں جو غلوں دل سے دی جائیں اور میاں بیوی کا ایک دوسرے کو چھوٹے چھوٹے نقشہ بننا۔“  
 (۱۱) ”ایسی تاریخی شخصیت جس سے میں ملنا چاہوں؟“  
 ☆ ”جلال الدین محمد اکبر اور علامہ اقبال۔“  
 (۱۲) ”پسندیدہ ساسھی؟“  
 ☆ ”میرے شوہر، میرے جیون ساتھی محمد عارف۔“  
 (۱۳) ”پسندیدہ ہستی؟“  
 ☆ ”ایک نہیں دو ہیں، میرے والدین۔“  
 (۱۴) ”پسندیدہ پروفیشن؟“  
 ☆ ”ہیچنگ۔“  
 (۱۵) ”بہترین کاوش؟“  
 ☆ ”درجہ اولیٰ توبہ کروم۔“  
 (۱۶) ”پسندیدہ ملکیت؟“  
 ☆ ”میرے میاں، میرے بچے۔“  
 (۱۷) ”زندگی کی خواہش؟“  
 ☆ ”میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری دینے تک زندہ رہنا چاہتی ہوں۔“  
 (۱۸) ”پریشن کن لمحہ؟“  
 ☆ ”جب مجھے خبر ملی کہ میرے ابوجی ہاسپٹل میں ہیں۔“  
 (۱۹) ”جب موڈ آف ہو گیا کرتی ہوں؟“  
 ☆ ”بس چپ ہو جاتی ہوں، میں کسی کو کچھ کہہ نہیں سکتی اور اگر کسی نہ کسی طریقے سے کہہ دوں تو بعد میں معافی ضرور مانگتی ہوں۔“  
 (۲۰) ”کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟“  
 ☆ ”ویسے تو کوئی نہیں لیکن قابلیت کے لحاظ سے

میرا بھائی فلاسٹک فنٹ محمد علی۔“  
 (۲۱) ”کون کب مسئلہ بنتا ہے؟“  
 ☆ ”جب بدل جائے اور آپ کے پاس پرانے فیشن کے ست سے کپڑے ہوں۔“  
 (۲۲) ”انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟“  
 ☆ ”جب کوئی غلوں پر شک کرے۔“  
 (۲۳) ”کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟“  
 ☆ ”آنسو۔“  
 (۲۴) ”زندگی کا یادگار دن؟“  
 ☆ ”جب میں ماں بنی۔“  
 (۲۵) ”موسیقی میرے نزدیک؟“  
 ☆ ”جذبات کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔“  
 (۲۶) ”پسندیدہ گانا؟“  
 ☆ ”رہنے دیں گانا بتا دیا تو بہت سے راز کھل جائیں گے عارف صاحب خوشی سے مزید پھول جائیں گے۔“  
 (۲۷) ”پسندیدہ فقرہ؟“  
 ☆ ”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“  
 (۲۸) ”پسندیدہ کردار؟“  
 ☆ ”مولوی نذیر احمد کی ’اصغری‘ اور ’میں معلوم ہی کب تھا‘ کا یحیٰی عسوب آفریدی۔“  
 (۲۹) ”سب سے عزیز اور قیمتی اثاثہ؟“  
 ☆ ”والدین کی تعلیم و تربیت، عارف صاحب کی طرف سے دی گئی محبت، عزت اور توجہ۔“  
 (۳۰) ”اچھا اور خوب صورت موسم؟“  
 ☆ ”بارش کا موسم۔“  
 (۳۱) ”نا قابل فراموش واقعہ؟“  
 ☆ ”میری شادی، واقعہ ہی تو ہے نا قابل فراموش واقعہ۔“  
 (۳۲) ”پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟“  
 ☆ ”ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔ میں بہت خوش تھی۔“  
 (۳۳) ”وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟“

☆ ”جب میرے ابو امی رات کو میری دلالی لینے گئے تھے، مجھے شدید تکلیف تھی۔“  
 (۳۴) ”میرا خواب؟“  
 ☆ ”ایک اچھی رائٹن سکول۔“  
 (۳۵) ”پسندیدہ مزاح؟“  
 ☆ ”آج کل تو بس مزاح لکھنے کی کوشش ہی کی جا رہی ہے۔“  
 (۳۶) ”حد محسوس کرتی ہوں؟“  
 ☆ ”نہیں، حد محسوس نہیں کرتی کیونکہ میرے رب نے مجھے سب کچھ دیا ہے، حد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“  
 (۳۷) ”خوشبو پسند ہے تو کیوں؟“  
 ☆ ”بہت پسند ہے اور کیوں کا کیا سوال، سب کو اچھی لگتی ہے۔“  
 (۳۸) ”پسندیدہ خوشبو؟“  
 ☆ ”بارش کے بعد مٹی کی خوشبو، بریانی کی خوشبو، پکوانوں کی خوشبو، دیے Gardenia۔“  
 (۳۹) ”آخری کتاب جو میں نے پڑھی ہو؟“  
 ☆ ”مرآۃ العروس۔“  
 (۴۰) ”پسندیدہ جگہ؟“  
 ☆ ”میرا اپنا گھر جو ہم دونوں نے بہت محنت سے بنایا ہے۔“  
 (۴۱) ”وہ جگہ جہاں چھٹی گزارتا پسند کروں؟“  
 ☆ ”امی کے گھر ویسے اگر چھٹی زیادہ ہو تو کسی اچھے سے پہاڑی مقام پر۔“  
 (۴۲) ”میری قوتِ ارادی؟“  
 ☆ ”بہت مضبوط۔“  
 (۴۳) ”گھر کا پسندیدہ کمرہ؟“  
 ☆ ”نی دی لاؤنج اور میرا کچن بھی مجھے بہت پسند ہے۔“  
 (۴۴) ”کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟“  
 ☆ ”شلوار قمیص، آج کل کی لمبی قمیص مجھے بہت پسند ہے۔“  
 (۴۵) ”پسندیدہ رنگ؟“

☆ ”سفید، سیاہ اور سبز۔“  
 (۴۶) ”پسندیدہ مصنف؟“  
 ☆ ”ڈبلی نذیر احمد، شفاق احمد، پریم چند، آسیہ رزاقی، فائزہ افتخار، لبنی عروج اور اب انبیہہ اتانے جو لکھا، اچھا لکھا۔“  
 (۴۷) ”پسندیدہ شاعر؟“  
 ☆ ”مرزا غالب، علامہ اقبال۔“  
 (۴۸) ”ویران سنسان جزیرے پر پہلا کام کیا کروں گی؟“  
 ☆ ”اسے Explore کروں گی۔“  
 (۴۹) ”خود اپنی بری عادت؟“  
 ☆ ”اپنے لیے بچت نہیں کرتی۔“  
 (۵۰) ”کھانے کی پسندیدہ جگہ؟“  
 ☆ ”اپنا گھر کے ایف سی۔“  
 (۵۱) ”اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟“  
 ☆ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، میں تو ہر وقت کہانیاں بنتی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

محمد علی لکھی لکھی



فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

ملکوانے کا ہند:

ملکتہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:

32735021

37، اردو بازار، کراچی

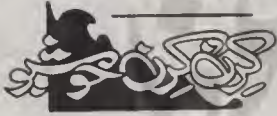


رہتی ہوں یہ الگ بات ہے کہ وہ کاندھ پر اتریں یا نہ اتریں۔“  
 (۵۲) ”ایک لفظ جو مجھ کو واضح کر دے؟“  
 ☆ ”مخلص۔“  
 (۵۳) ”جس مخالف کے بارے میں رائے؟“  
 ☆ ”ابھی تک میرا بیچ مردوں سے واسطہ پڑا ہے، اب تو بھائی، میاں اور میرے دونوں بیٹے بیچ تو یہ ہے کہ ان کے بغیر زندگی محفوظ — اور مکمل نہیں ہوئی۔“  
 (۵۴) ”محبت کے بارے میں خیال؟“  
 ☆ ”کائنات کی بنیاد۔“  
 (۵۵) ”پسندیدہ رشتہ؟“  
 ☆ ”میاں بیوی کا، اگر ان میں دوستی اور عزت کا جذبہ بھی ہو۔“  
 (۵۶) ”اگر محبت کی تو کیا تین ٹکے؟“  
 ☆ ”سب، ہنسی خوشی رہ رہے ہیں اور کیا۔“  
 (۵۷) ”پسندیدہ لواستوری؟“  
 ☆ ”اپنی لواستوری۔“  
 (۵۸) ”کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟“  
 ☆ ”چلڈرن آف دی ہیون، ہیرا پھیری اور باغبان۔“  
 (۵۹) ”چہرے کچھ بتاتے ہیں؟“  
 ☆ ”بہت کچھ، غم، غصہ، خوشی، پیار، نفرت۔۔۔ سب کچھ بتاتے ہیں۔“  
 (۶۰) ”شاعری کے بارے میں خیال؟“  
 ☆ ”دریا کو کوزے میں بند کرتی ہے۔ بہت گہرائی ہے اس صنف ادب میں۔“  
 (۶۱) ”میری جستجو میری کھون؟“  
 ☆ ”ہمارے معاشرے میں لوگ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے اور دوسرا یہ کہ اگر کوئی اپنی غلطی پر شرمندہ ہو، معافی مانگے تو کھلے دل سے معاف نہیں کرتے۔ میری جستجو یہی ہے کہ ہم سب اپنی غلطی دوسروں کے سر ڈالنا چھوڑیں اور معاف کرنے میں دیر نہ کریں۔“  
 (۶۲) ”بہترین کامیابی؟“  
 ☆ ”میری تحریروں کی اشاعت۔“  
 (۶۳) ”وہم کا زوالہ کس طرح کرتی ہیں؟“

☆ ”اپنے میاں سے شیر کرتی ہوں، وہ ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ دعا کرنے کو کہتے ہیں اور دوسرا شریف بڑھنے کی توجہ ہی تلقین کرتے ہیں۔“  
 (۶۴) ”سائنس کی بہترین ایجاد؟“  
 ☆ ”موبائل فون اور کمپیوٹر۔“  
 (۶۵) ”بدترین ایجاد؟“  
 ☆ ”یہ موبائل فون ہی میری نظر میں بدترین ایجاد بھی ہے اور انتہی کم۔“  
 (۶۶) ”ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟“  
 ☆ ”نہیں کوئی نہیں۔“  
 (۶۷) ”بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟“  
 ☆ ”نماز عشاء کی ادا کیگی۔“  
 (۶۸) ”ایک سبب جو ہمیشہ یاد رہی؟“  
 ☆ ”دوسروں کے لیے دعا کرو، خواہ وہ تمہارے حق میں کتنا ہی برا کیوں نہ ہو اگر وہ برا کرے گا تو اسے سزا ضرور ملے گی لیکن اس کے حق میں کی جانے والی دعائیں آپ کی زندگی کی راہیں ہموار کر دیتی ہیں۔“  
 (۶۹) ”زندگی کا خوب صورت ترین دن؟“  
 ☆ ”تین دن ہیں جس دن میری شادی ہوئی۔ پھر جس دن میرا بیٹا حسین پیدا ہوا اور پھر وہ دن جس دن میرا دوسرا بیٹا شہزادہ محمد حسن پیدا ہوا۔“  
 (۷۰) ”قارئین کے لیے پیغام؟“  
 ☆ ”ہمارے قارئین بہت سمجھدار ہیں، بہت غور سے تحریر کو پڑھتے ہیں پھر بھی یہ ضرور کہوں گی کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ موضوع پر انا تھا۔ موضوع اسی دنیا سے لیا جاتا ہے ہر مصنف کا طریقہ الگ ہے جو تحریر کو منفرد بناتا ہے۔ تنقید کریں لیکن تعریف بھی کریں کیونکہ آپ کی تعریف آسجین کا کام کرتی ہے۔“  
 (۷۱) ”کرن کے بارے میں رائے؟“  
 ☆ ”کرن نے بہت سی مصنفین کو متعارف کروایا۔ اللہ بہت ترقی دے۔ (آمین)



شعاع عمید



### — حدیث مبارک —

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔  
 ”جو لوگ رمضان کے روزے ایمان و احتساب کے ساتھ رکھیں گے ان کے گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور ایسے ہی لوگ ایمان و احتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح و تہجد) پڑھیں گے ان کے سارے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ اسی طرح جو شب قدر میں ایمان و احتساب کے ساتھ نوافل پڑھیں گے ان کے بھی تمام پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔“

(صحیح بخاری)

مدف عبداللہ لاہور

### انمول موتی

☆ بے شک دلوں میں برے خیالات آتے ہیں، مگر عقل و دانش انسان کو ان سے دور کر دیتی ہے۔  
 ☆ موت کو بہت زیادہ یاد رکھنے سے دل نرم ہو جاتا ہے۔  
 ☆ گناہ نیکی کے لباس میں دھو کاوے سکتا ہے۔  
 ☆ اچھی کتابوں کا مطالعہ دل کو زندہ اور بے دار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔  
 ☆ ناامید مت ہو کہ اس سے زندگی کم ہو جاتی ہے۔  
 ☆ (مترجم)

☆ جو صدقہ کرتا ہے اللہ اسے شرف قبولیت سے نوازتا ہے۔  
 ☆ عقیدت کا براہ راست تعلق دل سے ہوتا ہے۔ دل غم سے نہیں۔  
 ☆ جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آ جاؤ اور رزق کا کوئی راستہ نہ نکلے تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کر لیا کرو۔

(حضرت علیؓ)  
 مددہ وزیدہ خوشاب (پبل)

### حرفِ مدعا

لندن میں ساقی فاروقی کا ایک محبوب مشغلہ باہر سے آنے والے دوستوں کو مرحوم مشاہیر کے مکاتوں اور ان سے منسوب جگہوں کی سیر کروانا ہے۔ ایسی ہی ایک سیر کے دوران اس نے مجھے عطاء الحق قاسمی اور بڑے قاسمی، یعنی احمد ندیم قاسمی صاحب کو ڈی ایچ لارنس چارلس ڈکنز، رابندر ناتھ ٹیگور، جان کیمٹس اور ڈاکٹر جانسن سے منسوب مختلف جگہیں دکھائیں اور ساتھ ساتھ کسٹری بھی جاری رکھی کہ ان مشہور آدمیوں کی ان جگہوں سے تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ اس عمل میں تین چار گھنٹے لگ گئے زبان پر کانٹے اگنے اور پیٹ میں چوبے دوڑنے لگے مگر سہاٹی اپنے دھنور اضطراب و اشتیاق میں ایسا محو تھا کہ اسے ہماری حالت کی خبر ہی نہیں تھی۔ اچانک ایک جگہ رک کر عطاء الحق قاسمی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بہت سنجیدگی سے پوچھا۔



”یار ساقی! یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں مشہور لوگ بیٹھ کر کھانا دانا کھایا کرتے تھے۔“  
(اجد اسلام اجد کے سفر نامے ”ریشم ریشم“ سے اقتباس)

شہلارضا۔ جلال پور

کچھ کر میں

☆ سناٹے جب روح میں اتر جائیں تو رونقیں مٹا کر نہیں کرتیں۔  
☆ بعض لوگ اس لیے زیادہ بولتے ہیں کہ کوئی ان کے اندر کے سناٹوں کو نہ جان لے۔  
☆ جو نہیں مل سکا اس میں آپ کی خیر خواہی کا پہلو چھپا ہو گا۔  
☆ اعتبار عمل میں ہوتا ہے، لفظوں میں نہیں۔  
☆ ایک لمحے کی نفرت ساہا سال کی محبت بھلا دیتی ہے۔  
☆ کسی کے خوابوں پر کبھی مت نہیں کیونکہ جو لوگ خواب نہیں دیکھتے ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔  
☆ شفیق راجپوت۔ گوجرہ

گفتگو کا سلیقہ

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید نے خواب دیکھا کہ اس کے بہت سے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ صبح ہوئی تو عالموں کو بلا کر خواب کی تعبیر پوچھی۔ ایک عالم نے کہا۔ ”آپ کے اکثر عزیز آپ کے سامنے انتقال کر جائیں گے۔“ یہ بات سن کر خلیفہ نے اسے دربار سے باہر نکلوا دیا، پھر دوسرے عالموں سے تعبیر پوچھی اور جواب سے ناخوش ہو کر انہیں بھی باہر نکلوا دیا۔  
آخر میں ایک عقل مند اور موقع شناس درباری نے عرض کی۔

”جہاں پناہ! حضور کا خواب بہت مبارک ہے جس کے مطابق اللہ حضور کو اتنی لمبی عمر عطا فرمائے گا کہ حضور کے جیتے جی شاہی خاندان میں شادی اور غم کی اکثر رسمیں انجام پائیں گی۔“

یہ جواب سن کر ہارون رشید بہت خوش ہوا، بہت سا انعام درباری کو دیا اور کہا۔ ”میں خوب سمجھتا ہوں کہ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ مگر بیان کرنے کا انداز جدا جدا ہے“ آخری درباری کو گفتگو کا سلیقہ آتا ہے۔

شہناز تاج۔ میرپور خاص

باتوں سے خوشبو آئے

☆ توبہ جب منظور ہو جاتی ہے تو یاد گناہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔  
☆ ہم لوگ فرعون کی سی زندگی چاہتے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی سی عاقبت۔  
☆ نگاہ کا عامل وہ ہے جسے دوسرے کی بیٹی میں اپنی بیٹی نظر آئے۔  
☆ جو انگلیاں کانٹوں کی نوک سے ڈرتی ہوں وہ پھولوں کی نرمی سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتیں۔  
☆ آرزو ایک خوب صورت تلی ہے جس کو پکوانے کی خواہش میں ہم نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔  
☆ زیادہ آرزو کرنے والے انسان کی جیب بھرتی ہے، دل نہیں بھرتا۔  
☆ خوشامدی چھری، عقل و فہم کے پرکٹ کر ذہن کو آزادی کی پرواز سے محروم کر دیتی ہے۔  
☆ پیار ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے آگے ہر دیوار ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

صباحت مباح۔ آزاد کشمیر

ناراضی

خط میں لکھا کہ عید کب ہوگی  
ہم کو تاریخ لکھ بیجو آؤں  
چونکہ جھڑا تھا اس لیے ہم نے  
لکھ دیا آپ جب آجائیں  
روینہ شریف۔ کراچی

پیشکش

اتنے اچھے موسم میں  
روحنا نہیں اچھا  
ہار جیت کی باتیں  
کل پہ ہم اٹھارہیں  
آج دوستی کر لیں!

(روینہ شاکر)

صباحت۔ کراچی

غافل مچھلیاں اور دانابی

ایک بزرگ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ مچھلیاں پکڑتے تھے اور آپ کے ساتھ آپ کی چھوٹی لڑکی بھی بیٹھی تھی۔ آپ جو مچھلی پکڑتے وہ لڑکی کو دیے جاتے اور وہ لڑکی والد سے مچھلیاں لے لے کر پھر دریا میں ڈالتی جاتی۔ حضرت جب فارغ ہو کر اٹھے تو لڑکی سے فرمایا۔  
”مچھلیاں کہاں ہیں؟“ تو وہ بولی۔  
”ابا جان میں نے تو ان سب کو پھر دریا میں ڈال دیا ہے۔“ حضرت نے فرمایا۔  
”تم نے کیا کیا ساری محنت برباد کر دی۔“ تو وہ بولی۔  
”آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ جو مچھلی ذکر اللہ سے غافل ہو جاتی ہے وہ جال میں پھنسی ہے تو آپ جس مچھلی کو پکڑتے تھے میں سمجھ لیتی تھی کہ یہ مچھلی ذکر اللہ سے غافل ہے۔ جب ہی تو پکڑی گئی ہے۔ اس لیے میں نے اس خیال سے کہ غافل مچھلیاں لکھا کر ان کی صحبت سے نہیں ہم بھی ذکر اللہ سے غافل نہ ہو جائیں۔ لہذا میں نے وہ ساری مچھلیاں پھر دریا میں ڈال دیں۔“

نور زہیرہ۔ گجرات

تم بھی سنو

☆ دیرے موسموں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔  
اس سے بچنے کے لیے جھول کے لباس بدلنے پڑتے

☆ بعض لوگوں کے ساتھ ریتاں سے جدا ہونے سے زیادہ لذت ناک ہوتا ہے۔

☆ لڑکیاں رزق کی طرح ہوتی ہیں۔ اپنی ہوں تو ہمیشہ خوشی اور شکر کی نگاہ والی۔ لفظوں سے مت کو نگاہوں اور دل سے ان کی سلامتی چاہو۔ دوسروں کی ہوں تو نگاہیں جھکاؤ بات کرو تو کوئی گدلا خیال دل اور نگاہوں کو آلودہ نہ کرے۔ تمہارا ہونا تحفظ کا احساس دلانے ناکہ سامنے والے کو اپنی عزت کی بڑ جائے۔

☆ پتھروں سے واسطہ پڑے یا پتھر دلوں سے زندگی کا سفر کرتا نہیں۔

☆ خوابوں کی تیل کو اتنا تو نجاست چڑھنے دو کہ جب پھل اٹارنے کا وقت آئے تو تمہارے ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکیں۔

☆ گناہ اس قدر کم کرو کہ اس کی عقوبت کی تاب نہ لاسکو۔

☆ کردار کی مضبوطی میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک قوت ارادی اور دوسری ضبط نفس۔

☆ محبت میں محبت جائز ہے، دھوکہ جائز نہیں۔  
نور محمد۔ گجرات

انتظار

میں نے انتظار کرنے والوں کو دیکھا۔ انتظار کرتے کرتے سوجانے والوں کو بھی اور مرجانے والوں کو بھی۔ میں نے منتظر نگاہوں اور بے چین بدنوں کو دیکھا ہے۔ آہٹ پر لگے ہوئے کانوں کے زخموں کو دیکھا ہے۔ انتظار میں کانپتے ہاتھوں کو دیکھا ہے۔ منتظر آدمی کے وجود ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مقررہ جگہ پر انتظار کرتا ہے۔ دوسرا جو پذیرائی کے لیے بہت دور نکل جاتا ہے۔ جب انتظار کی گھڑیاں دنوں، مہینوں اور سالوں پر پھیل جاتی ہیں تو کبھی کبھی دوسرا وجود واپس نہیں آتا اور انتظار کرنے والے کا وجود اس خالی ڈبے کی طرح رہ جاتا ہے جسے لوگ خوب صورت سمجھ کر سینٹ کر رکھ لیتے ہیں اور کبھی اپنے درمیان سے جدا نہیں کرتے۔



خالی ڈبا کئی بار بھرتا ہے۔ مگر اس میں وہ لوٹ کر نہیں  
تا جو بڑائی کے لیے آگے نکل گیا تھا۔ ایسے لوگ  
بے مقصد بن پورے طور پر شانت ہو جاتے ہیں ان  
سکون اور شانت لوگوں کی برساتی میں بڑا چارم ہوتا  
ہے اور انہیں اپنی باقی ماندہ زندگی اسی چارم کے ذریعے  
گزارانی پڑتی ہے۔ یہی چارم صوفیوں اور عمرقیدوں کے  
غریبہ دکھائی دے گا۔ اسی چارم کی جھلک آپ کو عمر  
سیدہ پرودہ فیصلوں کی آنکھیں میں نظر آئے گی۔

(اشفاق احمد کی "سفر و سفر" سے اقتباس)  
خور العین اقبال۔ کراچی

### حق دار

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا۔  
"میں صدقہ خیرات کرنا چاہتا ہوں، لیکن مجھے اندازہ  
میں کہ کون حق دار ہے اور کون نہیں۔"  
"تم اس کو دے دو جو حق دار ہے۔" بزرگ نے  
کہا۔

"اور اس کو بھی دے دو جو حق دار نہیں، اللہ تجھے وہ  
دے گا جس کو حق دار ہے اور وہ بھی دے گا جس کا تو حق  
دار نہیں ہے۔"

فوزیہ شمس گجرات  
خط ناک دھمکی  
ایک عورت کافی دنوں سے اپنی ماں کے گھر آئی  
ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کو فون کیا۔ شوہر جی  
کے مزاج گرائی پہ بات ہوئے گی تو اس نے بتایا۔  
"آج کل میں نے اپنے شوہر کے غصے کو کنٹرول کیا ہوا  
ہے۔ سہیلی حیرت سے بولی۔ "وہ کیسے؟"

"میں نے انہیں دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے  
زیادہ غصہ کیا تو میں فوراً گھر واپس آ جاؤں گی۔"  
عورت نے چمکتے ہوئے جواب دیا۔  
موش اختر۔ تارتھ کراچی

### رہم دل

ایک دفعہ تاتاریوں کے سردار چنگیز خان سے کسی

نے پوچھا۔  
"اے خان تاتار تو نے کبھی کسی پر رحم کیا ہے؟"  
"ہاں! چنگیز خان نے جواب دیا۔  
"ایک دن میں گھوڑے پر سوار نیزہ اٹھائے ایک  
ندی کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک  
عورت ندی کے کنارے کھڑی روہتے ہوئے مدد کے  
لیے پکار رہی تھی۔ قریب ہی اس کا بچہ ندی میں  
ڈکیا ہوا تھا۔ مجھے عورت پر ترس آ گیا۔ بچہ  
کنارے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں گھوڑے سے اتر  
کر بچے کے قریب پہنچا، پھر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر نیزہ  
بچے کے پیٹ میں کھوپ دیا اور اسے نیزے کی نوک پر  
اٹھا کر اسے اس کی ماں کے سپرد کر دیا۔"

سیدہ عابدہ حسین شاہد فتح جنگ  
اولاد کی تربیت

شیخ سعدیؒ نے پوچھا گیا۔  
"اولاد کی تربیت کیسے کرنی چاہیے؟" تو آپ نے  
فرمایا۔

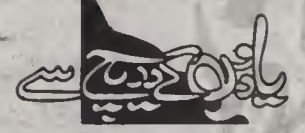
"جب بچے کی عمر دس سال سے زائد ہو جائے تو  
اسے نامحرموں اور اربوں غیروں میں نہ بیٹھنے دو، اگر تم  
چاہتے ہو کہ تمہارا نام باقی رہے تو اولاد کو اچھے اخلاق کی  
تربیت دو، اگر تمہیں بچے سے محبت ہے تو اس سے  
بے جالاز پیار نہ کرو، بچے کو استوا کا ادب سکھاؤ، اسے  
استاد کی سختی سننے کی عادت ڈالو۔ بچے کی تمام ضرورتیں  
خود پوری کرو، اسے عمدہ طریقے سے رکھو، تاکہ وہ  
دوسروں کی طرف نہ دیکھے، بچوں پہ کڑی نگرانی رکھو،  
تاکہ وہ بڑوں کی صحبت میں نہ بیٹھیں۔ بچوں کو ہنر  
سکھاؤ، تاکہ کسی بھی برے وقت میں کام آسکے۔"

غزوہٴ احرار۔ کراچی

### اب بھی

اب عمر نہ موسم نہ وہ رستے کہ وہ پلٹے  
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جانی  
ہمارے پھول کھلائی تھی جودل میں  
اب شام وہی دور سے خالی نہیں جانی  
فرہ العین۔ لاہور

### بشری محمود



اُمِّ رومان، مکی ڈائری میں تحریر  
رحمن خاوند کی غزل  
دل میں توقید ہے اب مجھ کو دہا کیا کرنا  
جسم سے روح کو دانستہ جدا کیا کرنا

میں نے جب یاد کیا، یاد وہ آیا مجھ کو  
اب زیادہ اسے مجبور دف کیا کرنا

کچھ ملے یا نہ ملے کو چہ جاننا ہے بہت  
ہم فقیروں کو کہیں اور صدا کیا کرنا

مجھ کو جب ترکِ محبت کا کچھ احساس نہ ہو  
مجھ سے پھر ترکِ محبت کا گلوہ کیا کرنا

یاد کرنے پہ جو ناراض ہے مجھ سے خاوند  
تھول کر اس کو بھلا اور خفا کیا کرنا

نوشین اقبال نوشی، مکی ڈائری میں تحریر  
ایک نظم

### لڈو

یہ جو سانپ سیر می کا کھیل ہے  
ابھی بائٹھ تھے دونوں ہم نوا

وہ بھی ایک ہے، میں بھی ایک ہے  
اُسے سیر می ملی وہ چڑھ گیا  
مجھے رستے میں ہی دس لیا  
میرے بخت کے کسی سانپ نے  
بڑی دھڑ سے بڑا لوتنا  
زخم کھا کے اپنے نصیب کا  
وہ ننالوے پہ پہنچ گیا  
میں دس کے پھر میں گر گیا  
اُسے ایک نمبر تھا چاہیے  
جو جیس ملا سو نہیں ملا  
میں بڑھا تو بڑھتا چلا گیا  
لبس ایک چوہے کی بات تھی  
پراس سے جیتا میری مات تھی  
میں نے جان کے گولی غلط ملی  
اور سانپ کے منہ میں ڈال دی  
یہ جو پیار ہے کبھی سوچنا  
یہ بھی سانپ سیر می کا کھیل ہے

فاخرہ، مکی ڈائری میں تحریر  
احمد بخاری کی غزل  
وقت بے وقت کسی پر نہ عنایات کرو  
تم جو چاہو تو فقیروں سے ملاقات کرو

منتظر تھا کہ کبھی آؤ گے تم پاس مرے  
اکے بیٹھے ہو تو غور شو کی طرح بات کرو



مجھ پر احسان میری جان تمہارا ہوگا  
آج کی رات اگر وقفِ ملاقات کرو

زندگی جب کہ تمہاری ہے تمہاری مرضی  
دل میں تم عیدِ گرد و رات کو شہرت کرو

میری جانب سے اجازت ہے ذمہ والو  
درد جیتے ہیں مرے نام سے خیرات کرو

کچھ تو رکھو مرے جذبوں کا بھرم جاہِ گردو  
یوں ذمہ لے میں عیاں میرے نہ جذبات کرو

صدقِ سلیمان، کی ڈائری میں تحریر  
فیض احمد فیض کی نظم

### کہاں جاؤ گے؟

اور کچھ دیر میں لٹ جلتے گا ہر نام پہ چاند  
عکس تھک جائیں گے آئینے ترس جائیں گے  
عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری  
سب ستارے سرخاشاک برس جائیں گے  
اس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں  
اپنی تنہائی سیمے گا، بجھائے گا کوئی  
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ ملاقات کا وقت  
اس گھڑی اپنے سوایا نہ آئے گا کوئی  
ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت  
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے  
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں رہے دو  
کوئی اس وقت طے گا ہی نہیں رہے دو  
اور طے کا بھی تو اس طور کہ پھٹاؤ گے  
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے  
اور کچھ دیر بعد جاؤ کہ پھر نثرِ صبح  
زخم کی طرح ہر اک کچھ کوبے داد کرے

اور نہ پرکشتہ واماں کی آخر شب  
بھول کر ساعتِ درممان کی آخر شب  
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

شفقِ راجپوت، کی ڈائری میں تحریر  
گزارا کی غزل

کھلی کتاب کے معنی اُلتے رہتے ہیں  
ہوا چلے نہ چلے، دن پلٹے رہتے ہیں

بس ایک دشتِ منزل ہے اور کچھ بھی نہیں  
کہ چند سیرِ عیاں چڑھتے اترتے رہتے ہیں

مجھے تو روزِ کوئی پہ دردِ کتاب ہے  
کہ جاں سے جم کے نیچے اوڑھتے رہتے ہیں

کسمبے رکھا نہیں کوئی مقامِ صحرا میں  
کہ ٹیلے پاؤں تلے سے سرکے رہتے ہیں

یہ روٹیاں ہیں، یہ سکتے ہیں اور دائرے ہیں  
یہ اک دو بجے کو دن بھر کھڑے رہتے ہیں

بھرے ہیں رات کے رہنے کے لیے اکٹلوں میں  
اُجالا ہو تو ہم آنکھیں جھپکتے رہتے ہیں

خور العین اقبال، کی ڈائری میں تحریر  
احمد فراز کی غزل

عیز سے تیرا آشنا ہونا  
گویا اچھا ہوا برا ہونا

خود نگوں سا، ہم سفرِ ناز  
اک سہ سے شکستہ پا ہونا

کتنی مانگا ہے میر کی موت  
کتنی آسن ہے بے وفا ہونا

نشہ لذت گناہ کے بعد  
سختِ مشکل ہے پارِ سا ہونا

آدمی کو خدا نہ دکلائے  
آدمی کا کبھی خدا ہونا

دل کی باتوں پہ کون جانے دلائے  
ایسے دشمن کا دوست کیا ہونا

شائستہ امتیاز کی ڈائری میں تحریر  
پروین شاکر کی نظم

### "عیادت"

پت بھڑکے موسم میں تجھ کو  
کون سے پھول کا تحفہ بھیجوں

میرا آنگن خالی ہے  
لیکن میری آنکھوں میں

نیک دعاؤں کی شبنم ہے  
شبنم کا ہر تارا

تیرا آچل مقام کے کہتا ہے  
خوشبو، مگیت، ہوا، پانی اور رنگ کو چاہنے والی رنگ

جلدی سے اچھی ہو جا  
صبح بہار کی آنکھیں کب سے

تیری نرم ہنسی کا رستہ دیکھ رہی ہیں

روینہ سران کی ڈائری میں تحریر  
یعقوب غزنوی کی غزل

جو قیدِ تجھ کو ملی اس کو داغدار نہ کر!

درِ قفس پہ کسی کا بھی انتظار نہ کر

زمانے بھر سے مراسم تو ٹھیک ہیں لیکن

محببتوں میں کسی کو بھی رازدار نہ کر

جنوں میں حد سے گزرنے کا فائدہ کیا ہے

یہ مصلحت ہے اسے اتنا پائدار نہ کر

اُسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی ہے

ذرا ٹھہر کر ابھی مجھ کو سوٹا رہ نہ کر

ہر اک خواب ہے میرا تجھی سے وابستہ  
یہ بات سچ ہے مگر میرا اعتبار نہ کر!  
کسی کے دل میں دھڑکتا ہے اب بھی نامِ ترا  
محببتوں میں نیا کوئی کاروبار نہ کر!!

مرا خبیال تیری آنکھ سے جھلکتا ہے  
نئی کہانی، نسیبِ لہجہ اختیار نہ کر!!

نمرا، اقراء، کی ڈائری میں تحریر  
عبدالوہید یتاب کی غزل

دل میں کوئی آسا اچھا لگا  
بھول صحرائیں کھلا اچھا لگا

ہر ادا اس شوق کی ہے دلغزب  
کیا بتائیں ہم کو کیا اچھا لگا

جب بے دیکھی کسی کی ایک جلد

پھر نہ کوئی دوسرا اچھا لگا

ساتھ رہتا ہے تصور میں کوئی

بے عجب یہ رابطہ اچھا لگا

بیٹھ کر تنہا کسی کو سوچنا

خوب ہے یہ مشغلہ اچھا لگا

پیار میں گو کچھ نہیں جزا اضطراب

پر، ہمیں یہ سلسلہ اچھا لگا

فوزیہ رشید کے ڈائری میں تحریر

عاصی کرنا کی ایک غزل

اب ہر وقت ہے سورج میرے گھر کا دریاں

اب ستاروں سے ملاقات نہیں ہو سکتی

ان کی سائش کے قبضے میں ہیں بادل میرے

اب میرے گاؤں میں برسات نہیں ہو سکتی

ایک دریا کے قبیضے میں ہیں شامل موجیں

کیا میری ذات تری ذات نہیں ہو سکتی

ان کی تفریق کا سامان ہیں میری غزلیں

اس سے بڑھ کر مری اوقات نہیں ہو سکتی

فن کے انہماک کی کیا شکل نکالیں عاصی

آنکھوں آنکھوں میں بھی اب بات نہیں ہو سکتی



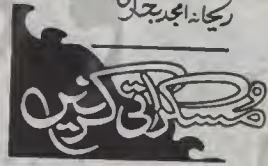
نہ امتیاز  
میرے آنکھ میں دے پاؤں تھے دو گلیے  
سال کے سال کوئی عید ملی آتی ہے  
سید عباس  
روٹھنے والے اگر اجازت ہو  
عید کے روز ملنے آ جاؤں  
نہ  
تم آؤ بام پہ ایسے کہ دید ہو جائے  
اسی بہانے سے میری بھی عید ہو جائے  
ہک سہیل  
عزت کے سلتے میں پڑا اک ننھا سا بچہ  
جھوٹی ہنسی سے عید پر احسان کر گیا  
انیہ  
مجھے تیری نہ تھے میری خبر جانے گی  
عید اب کے بھی دے پاؤں نہ جانے گی  
دیکھ خان  
عید کے چاند غریبوں کو پریشان نہ کر  
تجہ کو معلوم نہیں لذت گراں ہے کتنی  
الما س علی  
میرے دیران درپچوں میں بھی خوشبو ملے گی  
وہ میرے گھر کے دو دو بام سچلنے آئے  
اُس سے اک بار تو رو وصال میں اُسی کی مانند  
اور میری طرح سے وہ مجھ کو منانے آئے  
شہلا دلیق  
وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا  
میں اُس کے ہجر کی راتوں میں کب اٹلی ہوئی  
شافعہ اعوان  
ہمیں خبر ہے کہ ہوا کا مزاج رکھتے ہو  
مگر یہ کیا کہ ذرا دیر کو دُکے بھی نہیں

فوزیہ غریب  
پریت کی مٹی تو عمر بھر نکھاتے سب  
یوں بیچ راہ میں تو چوڑے نہ جاتے سب  
دے گئے ہوا سنو، آہیں اور غم کی بارشیں  
ساوَن رُت آئی ہے کاش تم بھی چلے آتے سب  
حور العین اقبال  
بڑھ گئیں وحشتیں موسم کی عنایت کے بعد  
ہم بھی روئے کبھی ہنس دیے برسات کے بعد  
آہی مضبوطی سے دیرانے کے در بند ہوئے  
دل میں اتنی نہ کوئی ذات تیری ذات کے بعد  
سدرہ وزیر  
تیری نظر کو فرصت نہ ملی دیدار کی  
وند نہ میرا مرض اتنا لا علاج نہ تھا  
ہم نے وہاں بھی محبت بانٹی فراز  
جس شہر میں محبت کا کچھ دلوں نہ تھا  
غفرہ قیصرانی  
کوٹ قیصرانی  
بہت تبدیلیاں لائے ہیں اپنے آپ میں لیکن  
تمہیں بس یاد کرنے کی وہ عادت اب بھی باقی ہے  
نمر، اقرا  
ہوا کے ساتھ اُڑ گیا گھر پرندوں کا !!  
کیسے بنا تھا گھوٹلا یہ لوفان کیا جلنے  
حنا کنول  
راہ و فسا میں اذیت شناسیاں نہ گئیں  
کسی بھی رُت میں ہماری اداسیاں نہ گئیں  
شفق راجپوت  
میں شہر بھر میں ایک ہی اذیت پسند ہوں  
گر چاہیے دعا تو میرا دل دُکھائے  
امامہ حبیب  
جو تیرے ہجر کا سال ہے سو گز رنا اس کا حال ہے  
نہ مجھے کوئی بھی ملال ہے مجھے صرف تیرا خیال ہے

اسیہ جاوید  
اے اپنا نہیں سکتا مگر تانا بھی کیا کم ہے  
کچھ مدت حسین غابوں میں کھو کر گئی لیا ہم نے  
عذرا ناصر  
محبت میں غدا جانے یہ آپس میں گلہ کیوں ہے  
محبت میں بھلا کیا کام شکوے اور شکایت کا  
سمیعہ حبیب  
ہم نے یہ سوچ کر ہنسنے کا ہنر سیکھ لیا  
درد رکھنا ہے تو بھر دیدہ تر کیا دکھنا  
ارم آفتاب  
اوروں کا ہاتھ مقام، انہیں راستہ دکھاؤ  
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر تم کو اس سے کیا  
تم نے تو تنگ کے دشت میں جیسے لگا لیے  
تنہا کے کسی کا سفر، تم کو اس سے کیا  
صباح  
میں جب بھی جا ہوں، اُسے چھو کے دیکھ سکتی ہوں  
مگر وہ شخص کہ نگاہ ہے اب بھی خواب ایسا  
تو نشاط  
حال پوچھا تھا اس نے ابھی  
اور آئندہ رواں ہو گئے ا  
افشاں اسلم  
ایک نظر دیکھ لو میری جانب  
اس سے آگے میرا مقدہ ہے  
صائمہ  
کوئی نہ بخیر نہیں پھر بھی گرفتار ہوں میں  
کیا خبر تھی مجھے یہ ہنر بھی آتا ہو گا  
مہوش فاروق  
تقصود میرا جو مجھے چھو جائے  
میری ہر سانس سے تیری خوشبو آئے  
یہ کس موڑ پہ لے آئی ہے جستجو  
پانی میں عکس میرا ہوا اور نظر تو آئے  
اقصی، عذرا  
سمجھ جاتا ہوں مگر دیر سے میں داؤ پیچ اس کے  
وہ بازی جیت جاتا ہے میرے چالاک ہونے تک

سعدیہ اشتیاق  
اسی الجھن کو شب بھر سوچنا اور جاگتے رہنا  
وسائل سے جوان بیٹی کے قد کو ناپتے رہنا  
رباب علی  
یہ انگ بات مقدر کے سبب دیکھے ہیں  
ایسے کب دیکھے تھے جیسے کرب دیکھے ہیں  
غم کو اپناؤ کہ کچھ زلیست کے معنی کھلیں  
دوستو! تم نے فقط رنگِ طرب دیکھے ہیں  
شاہینہ  
سکوت عرض تمنا کو ہم نہ توڑیں گے  
محبتوں کا یہی سلسلہ تو ملت میں ہے  
جمیلہ احمد  
تو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ  
پھول روئے تو اُسے خندہ شاداب سمجھ  
اب کیسے ساحلِ امید سے تکتے ہے قزاق  
وہ جو ایک کشتی دل بھٹی لے غرقاب سمجھ  
فرزادہ گلستان  
اُن کی بکھری ہوئی زلفوں کا تصور تو یہ !  
نکبتِ غم کے دھاروں کو سزا ملتی ہے  
وہ جو داتوں میں دباتے ہیں گلابی آئین  
کتنے پر کیف نظاروں کو سزا ملتی ہے  
فوزیہ خالد  
یوں خوش ہیں آج اس سے ملاقات پر کہ ہم  
تشریف جیسے ارض و سما کے آئے ہیں  
ناہیدہ ضمیر جو نیچو  
زمانہ تیرے مقدس ہجر مکہ دے گا !  
کسی سے بھول کر ذکر وصال مت کرنا  
تعلقات کی تشہیر ہونے جلنے کہیں  
میری خدائی کا اتنا ملال مت کرنا  
ہما بشارت  
میں بہتوں سے رونا رہا اور کچھ لوگ  
مکی زمین کو کھود کر فرما دین گئے





### درست طریقہ

ایک اسپتال میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو نرس نے ریپورڈ اٹھایا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔  
”کیا آپ کمرہ نمبر 52 کے مریض کا حال بتا سکتی ہیں۔ اس کا آپریشن پچھلے ہفتے ہوا تھا۔“  
نرس نے فون کرنے والے کو دو منٹ رکنے کو کہا، پھر بتایا۔

”میں نے ریکارڈ میں مریض کا چارٹ دیکھا ہے، ان کی حالت ٹھیک ہے اور وہ تیزی سے رویہ صحت ہیں۔ آپریشن کامیاب رہا ہے اور اب یہ بیماری انہیں کبھی نہیں ہوگی۔ وہ تو اس وقت سو رہے ہوں گے صبح کو میں انہیں آپ کا کیا نام بتاؤں؟“ فون کرنے والے نے جواب دیا۔

”میں کمرہ نمبر 52 کا مریض ہی بول رہا ہوں، آپ کو اس لیے زحمت دی کہ میرے ڈاکٹر تو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہیں۔“

ٹینس منڈی سمبڈال

### زخمی ہیرو

ایک صاحب اپنے دوست کو بتا رہے تھے۔  
”پاکستانی فلم میں ہیرو زخمی ہوا تو اسے اسلحے کی گاڑی میں ڈال کر لے جایا گیا۔“  
”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ دوست نے تصحیح کرنے کی کوشش کی۔

”وہ اسلحے کی گاڑی نہیں ہیرو لائنس ہوگی۔“  
”نہیں بھئی! وہ اسلحے کی گاڑی ہی تھی۔“ ان صاحب نے یقین سے کہا۔

”دراصل ہیرو کے جسم میں اتنی گولیاں ہیوست تھیں کہ اسے اسلحے کی گاڑی میں لے جانا ہی مناسب تھا۔“

سونیا۔ لاہور

### بے بسی

شوہر نے پہلی بار اپنی نئی ٹیلی فون کے ہاتھ کاٹا ہوا کھانا شروع کیا تو پہلے ہی نوالے میں حالت خراب ہو گئی، نوالا اس کے منہ سے باہر نکلیا اور اسے الٹی آتے آتے رہ گئی۔ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”بیگم! میں یہ کھانا ہرگز نہیں کھا سکتا۔“ موت کے مارے اس نے بیوی کو یہ بتانے کی کوشش نہیں کہ کھانا کس قدر بد ذائقہ تھا۔ بیوی اطمینان سے بولی۔

”کوئی بات نہیں۔ میں نے کھانا پکانے کی ترکیبوں والی کتاب میں یہ بھی پڑھا ہے کہ بچے ہوئے اور باقی کھانوں سے نئی ڈشیں کیسے تیار کی جاتی ہیں۔“ یہ سن کر شوہر خوف زدہ انداز میں نہایت بے بسی سے کھانے کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔ نہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں یہی کھانا کھا لیتا ہوں۔“

سعدیہ۔ لاہور

### آزادی

”مجھے جو نئی ملازمت ملی ہے اس میں مجھے بہت آزادی حاصل ہے؟“  
”کیسی آزادی۔“ سلیم نے جانتا چاہا۔

”میں صبح نو بجے سے پہلے جس وقت چاہوں دفتر پہنچ سکتا ہوں اور شام کو پانچ بجے کے بعد جس وقت

چاہوں چھٹی کر سکتا ہوں۔“ حمید نے فخریہ انداز میں بتایا۔

عائشہ سعید۔ گلشن اقبال

### عملی مظاہرہ

ایک دیوبند پبلوٹائپ آڈی ایک شراب خانے میں آیا اور بار اینڈ ڈسکس گئے لگا۔

”میں نے سنا ہے کہ تمہیں ایک کن کنے بد معاش کی ضرورت ہے جو تپندیدہ افراد سے نمٹ سکے۔“  
”ضرورت تو بڑی شدید ہے مگر تمہیں اس کا کوئی تجربہ ہے؟“ بار اینڈ ڈسکس نے پوچھا۔

”تجربہ تو کوئی خاص نہیں، لیکن میں عملی مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر کن کنے بد معاش نے اوپر اوپر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مست شرابی فون پر کسی کو گلایاں دے رہا تھا۔ کن کنے نے کمرے میں جا کر اس شخص کو دلو چا اور کسی احتجاج کی پروا کیے بغیر اسے شراب خانے سے باہر پھینک دیا اور فاتحانہ انداز سے جمو تھاپا واپس آیا اور کہنے لگا۔

”عملی مظاہرہ پسند آیا؟“  
”بہت خوب۔“ بار اینڈ ڈسکس نے کہا۔

”مگر تو کسی کی اجازت تمہیں باس سے لینی پڑے گی۔“

”باس کہاں ہے؟“ بد معاش نے پوچھا۔  
”جیسے تم باہر پھینک آئے ہو، ویسی اس بار مالک ہے۔“

الماس علی۔ کورنگی، کراچی

### اندیشہ

ایک صاحب جموٹے ہوئے ٹائٹ کلب سے نکلنے لگے تو در بیان ان کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض سے لپکا، مگر کسی چیز میں الجھ کر گر پڑا۔ کلب کے مینجر نے باہر آ کر اس کو ڈانٹا۔

”ذرا احتیاط سے چلا کرو، تمہارے اس طرح مگر نے سے کوئی سمجھے گا کہ تم در بیان نہیں، کلب کے ممبر

ہو۔“

رافعہ۔ کراچی

### بچے ہمارے عہد کے

بچے گلی میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ گیند ایک مکان کی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔ خاتون خانہ نے جھلا کر دروازہ کھولا، لیکن گلی سنسان پڑی تھی۔ انہوں نے گیند اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر ایک بچہ موجود تھا۔

”معاف کیجیے گا آئی۔ ہماری غلطی سے آپ کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا، وہ اوپر دیکھیے۔ میرے والد نیا شیشہ لگانے کے لیے آرہے ہیں۔“ اس نے گلی کی طرف اشارہ کیا۔

”اب آپ جلدی سے مجھے گیند دے دیجیے۔ خاتون خانہ نے دیکھا کہ ایک شخص اٹھیا ہاتھ میں لیے اور دو سرے ہاتھ میں کھڑکی کے سائز کا شیشہ تھا۔ ان کے مکان کی طرف چلا آ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا، گیند لے لو۔“ خاتون نے بچے کو گیند دیتے ہوئے شیشے کے لیے میں کہا۔ اتنی دیر میں وہ شخص دروازے پر آ گیا۔ بچے نے گیند لی اور روف پتھر ہو گیا۔

اس شخص نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ نیا شیشہ لگا دیا اور خاتون سے بولا۔

”سورہ نے عنایت کر دیجیے۔“  
”کیا۔ کیسے سورہ پے؟“ خاتون نے گڑبڑا کر حیرت سے پوچھا۔

”کیا تم اس بچے کے باپ نہیں ہو، جو ابھی گیند لے کر گیا ہے؟“  
”ہرگز نہیں!“ اس شخص نے جواب دیا۔ پھر چونک کر پوچھا۔

”کیا آپ اس بچے کی ماں نہیں ہیں؟“  
”کسوس۔ بنوں

### منافع بخش



ایک دولت مند صاحب کھانا کھانے کے لیے اپنے مخصوص ہوٹل پہنچے تو انہیں دیکھ کر پریشانی ہوئی کہ آج انہیں ایک نیا ویٹرانینڈ کر رہا ہے۔  
”وہ پرانا ویٹر کہاں ہے؟“ انہوں نے غصے سے ویٹر سے پوچھا۔

”جناب اب میں ہی آپ کی خدمت کیا کروں گا۔ گزشتہ رات میں نے جوئے میں آپ کو اس سے جیت لیا ہے۔“ نئے ویٹرنے متانت سے جواب دیا۔  
”مونا علی۔ بدین

### ہم خیال

فیلڈنگ کے دوران ایک کھلاڑی بار بار ایرائر کے قریب آکھڑا ہوتا اور ہراس گیند پر جوس ہو جاتی اپیل لی ڈبل کی اپیل کرتا۔ مگر ایرائر ٹس سے مس نہ ہوا۔ آپیلوں کی تعداد جب حد سے تجاوز کر گئی تو ایرائر پلٹ کر کھلاڑی کی طرف متوجہ ہوا اور اسے چھوڑتے ہوئے بولا۔

”پچھلے آدمے گھٹنے سے میں تمہاری حرکت دیکھ رہا ہوں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ کھلاڑی نے ذرا سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
”مگر آپ کھیل کیوں نہیں دیکھتے؟“

”انیہ خان۔ کراچی

### نالا نلق

باپ نے طیش میں آکر بیٹے سے کہا۔  
”میں نے اپنا عیش و آرام عارت کیا دن رات محنت مشقت کر کے روزی کما رہا ایک ایک پیسہ بجا کر رکھا۔ محض اس لیے کہ تمہیں میڈیکل میں داخل کرواؤں گا۔

اور اب جبکہ تم ڈاکٹر بن چکے ہو تم نے پہلا کام کیا کیا۔ یہی کہ مجھ سے کہہ رہے ہو اباجی! اس گریٹ چھوڑ دیجیے۔“

انہرین اسلام۔ کراچی

### شکایت

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے شکایت کی۔  
”تم نے عالیہ سے وہ راز کی بات کیوں کہہ دی۔ حالانکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے مت بتانا۔“  
”چھا۔“ سہیلی افسوس کرتے ہوئے

”جبکہ میں نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ تمہیں ہرگز نہ بتائے کہ میں نے اس سے وہ بات کہہ دی ہے۔“

”اوہ! اس عورت نے طویل آہ کھینچی اور بولی۔  
”خیر جو ہوا سو ہوا مگر اب اسے یہ مت بتا دینا کہ میں تم سے شکایت کر رہی تھی۔“

سیری عدم۔ میرپور خاص

### دھمکی

کرکٹ کا ایک شو قین بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔  
”کیا بات ہے؟“ اس کے دوست نے پوچھا۔

”بیوی نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ نہ چھوڑی تو وہ مجھے چھوڑ جائے گی۔“

”اوہ! یہ تو واقعی بری خبر ہے۔“ دوست نے افسوس کا اظہار کیا۔

”ہاں۔ یقین کرو میں اپنی بیوی کو بہت مس کروں گا۔“

رحمانہ علی۔ کراچی

### علاج

ایک ڈاکٹر فخر سے دوسرے ڈاکٹر کو بتا رہا تھا۔  
”آخر کار میں نے جمل کے لڑکے کا علاج کر ہی لیا۔ تمام ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا۔“

”کیا بیماری تھی اسے۔“ دوسرے ڈاکٹر نے پوچھا۔  
”وہ دانتوں سے ناخن کو کترتا تھا۔ میں نے اسے ڈنٹس کے پاس بھیج کر تمام دانت نکوا دیے۔“ پہلے ڈاکٹر نے فخر سے بتایا۔

فوزیہ شربٹ۔ گجرات

### حلوہ کون سا

نئی نویلی دلہن نے اپنے شوہر سے کہا۔  
”مجھے دو ڈشز بتانے میں مہارت حاصل ہے۔ ایک مرغی کا سالن دو سرا گاجر کا حلوہ لیجئے ذرا چلیے۔“

شوہر نے داد دیے ہوئے کہا۔  
”خوب بہت خوب۔ لیکن یہ بتاؤ کہ ان میں سے سالن کون سا ہے اور حلوہ کون سا۔“

ہانیہ عمران۔ گجرات

### ڈانمڈ کا سیٹ

بیوی نے شوہر کو فون کیا۔  
”اس وقت کہاں ہیں آپ؟“ شوہر نے کہا۔  
”تمہیں وہ جو لڑکی کی دکان یاد ہے جہاں تم کو ڈانمڈ کا سیٹ پسند آیا تھا اور میرے پاس پیسے نہیں تھے کہ خرید سکتا۔“ بیوی خوش ہوتے ہوئے بولی۔  
”ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔“

”میں اس کے ساتھ والی دکان میں بال کٹوا رہا ہوں۔“ شوہر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

ثانیہ جمل۔ بہاولنگر

### ہدایت

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی کو بتایا۔  
”کل میں بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ ایک اسمارٹ اجنبی نوجوان آیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھ سے اظہار عشق کرنے لگا۔“ سہیلی نے پوچھا۔  
”ہائے اللہ! تم نے اسے ڈانٹا نہیں خاموش ہونے کے لیے نہیں کہا؟“

”نہیں! تمہیں تو معلوم ہے کہ اسی نے مجھے اجنبی لڑکوں سے بات کرنے کے لیے منع کیا ہوا ہے۔“ لڑکی نے بے بسی سے جواب دیا۔

جیلے۔ حیدر آباد

### جواز

کانچ میں ایک لڑکے نے اپنے کا اس فیلو سے

### پوچھا۔

”تم نے تقریری مقابلے میں حصہ لینے کے لیے فارم بھرا تھا کیا تمہیں مقررین کی ٹیم میں شامل کر لیا گیا ہے؟“

”نہیں۔ نہیں۔ ان۔ ک۔۔۔ ک۔۔۔ ک۔۔۔ کا۔۔۔ کہنا ہے۔ کہ۔۔۔ مم۔۔۔ میرا۔۔۔ ق۔۔۔ قد۔۔۔ چھ۔۔۔ چھوٹا ہے۔“ کلاس فیلو نے بہ مشکل جواب دیا۔  
ناصر۔ لطیف آباد

### بے بسی

ایک شخص اپنے دوست سے۔  
”یار جب میری شادی ہوئی تھی تو مجھے اپنی بیوی بڑی خوب صورت اور پیاری لگتی تھیں۔ میرا دل کرنا تھا میں اسے کھا جاؤں۔“  
دوست جواب کیا لگتی ہے۔

”سوچتا ہوں اسے اس وقت کھا ہی جاتا تو اچھا تھا۔“

اقرا۔ گجرات

### سوالا جوابا

○ ”بیگم! تمہیں کچن میں گئے تین گھنٹے ہو گئے ہیں کیا چائیس ابھی تک تلی نہیں جا سکیں۔“

”ہل تو میں نے لی تھیں لیکن وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں تلی نہیں تھیں اس لیے میں نے انہیں بھون لیا۔ لیکن بھونتے ہوئے وہ جل گئیں اب اگر آپ صبر کریں تو میں انہیں ابل کر بس لا رہی ہوں۔“

○ ”کیا واقعی اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی اکثر مردوں کو خود کشی سے باز رکھتی ہے۔“  
”جی ہاں! اعداد و شمار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خود کشی اکثر مردوں کو شادی سے باز رکھتی ہے۔“

نجمہ حفیظ۔ کراچی





ناخن انگلیوں کی خوب صورتی ہیں، ضرورت ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ خاص طور پر لڑکیوں کے ناخن دیکھے جاتے تھے کہ کہیں بڑے بڑے تو نہیں ہیں۔ اس زمانے میں ناخنوں کی سجاوٹ بس اتنی تھی کہ ان پر نل پالش یا مہندی لگائی۔

لیکن اب ناخنوں کو مختلف دلکش انداز سے سجایا جاتا ہے، بلکہ یہ ایک آرٹ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ناخنوں کو طرح طرح سے سجایا جاتا ہے۔ پھر ان کی چمک دک کسی بھی تقریب میں لوگوں کو دیکھنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔

یہ ایک ایسا آرٹ ہے جس میں بے شمار رنگوں کا ماہرانہ استعمال کیا جاتا ہے اور یہ آپ کے ناخنوں کو دیدہ زیبی عطا کرتا ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ کے ناخن لائے ہوں۔ یہ آرٹ ہر طرح کے ناخنوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی قدرتی چھوٹے ناخن اور مصنوعی بڑے ناخن۔

آپ کے ناخن اس آرٹ کی وجہ سے جگمگانے لگیں گے اور ان کا حسن آپ کی پوری شخصیت پر محیط ہو جائے گا اور محفل میں آپ مرکز نگاہ بنی رہیں گی۔

اس قسم کی آرائش کے لیے کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ شوخ گہرے اور چبھتے ہوئے رنگوں کا انتخاب کریں۔ بلکہ آپ خود اس میں اپنی مرضی اور موڈ کے مطابق جدت پیدا کر سکتی ہیں۔

آپ کے پاس انتخاب کے لیے بہت کچھ ہے۔ فلاور ورک، لائن ورک، جیو میٹرک ورک، آرٹ کے مناظر، تگینے یا اسی قسم کی اور ایسی چیزیں یا منظر جو آپ کے ناخنوں کو زیادہ سے زیادہ خوش نما بنادیں اور یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ ہلکے رنگوں کا استعمال کرتی ہیں یا گہرے شوق رنگوں کا۔

فرض کریں کہ آپ پھولوں کی شوقین ہیں تو پھولوں کا کوئی پیرن اپنا سکتی ہیں۔ اس طرح کے بے شمار پیرن آپ کو مل جائیں گے۔ نل آرٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ آپ کے تصور کے ساتھ رہتا ہے۔

آپ خود جتنی آرتسٹک ہوں گی اتنی ہی خوب صورتی آپ کے ناخنوں میں آئے گی۔ ان کی سجاوٹ کا اصل گر آپ کی مہارت، مشق اور صبر میں پوشیدہ ہے۔ لہذا برش اٹھائیں اور مصوری شروع کر دیں۔

آپ کے پاس رنگوں کا انتخاب ہے۔ پرنس کا انتخاب ہے یا پھر آپ نے ایک ناخن پر جو پیرن اختیار کیا ہے۔ دوسرے ناخنوں پر دوسرے رنگوں میں کر سکتی ہیں۔

آپ اپنے ناخنوں میں وائر لکھ بھر سکتی ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آخر میں نل شائز کا ایک کوٹ کر دیا جائے تاکہ آپ کے ناخن اپنی چمک دک برقرار رکھ سکیں۔

لیکن یہ عمل اس وقت ہی کریں جب آپ کے

پاس آپ کے لباس کی میچنگ کی نل پالش نہ ہو۔ سوائز کلر کے صحیح رنگوں کو ایک دوسرے سے ملا کر اپنے لباس کے رنگوں کے مطابق نل لکھ تیار کریں اور اپنے ناخنوں کو اس سے سنواریں جائیں۔

آپ نے بہترین رنگوں اور ڈیزائن کا انتخاب کیا۔ پینٹ کرنے میں محنت کی، لیکن آپ کی یہ ساری محنت اس وقت رائیگاں ہو جاتی ہے جب آپ کے ناخن بے ڈھنگے ہوں۔

تخت اور کھورے ناخن آپ کے ہاتھوں کی ساری خوب صورتی کو برباد کر دیتے ہیں۔ آپ نے جو نل پالش استعمال کی ہے۔ وہ آپ کو کبھی کبھی مطلوبہ زلزل نہیں دے گی۔

باریک سخت ذرات سے بچاؤ

اگر آپ ایسا کوئی کام کرتی ہیں جس میں ہاتھ پیر مٹی میں اٹ جاتے ہیں تو ناخنوں کو نلدا ہونے سے بچانے کے لیے کام شروع کرنے سے قبل اپنے ناخنوں کو صابن کی گلی گلی پر مٹی مرتبہ رگڑیں۔

اس طرح آپ کے ناخنوں کے اندر صابن بھر جائے گا اور گرد و غبار کو ناخنوں کے اندر داخل ہونے کا موقع نہیں مل سکے گا۔

ناخن ماس

○ اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح چکنا کر رکھیں۔ پھٹی ہوئی خشک جلد ناخن ماس (بیگ نل) کا سبب بن سکتی ہے۔

○ اسی طرح ضرورت سے زیادہ مقدار میں کیوٹیکلز کو تراشا بھی اس کا باعث ہو سکتا ہے۔ کیوٹیکل کنڈیشنر صرف مٹی کیور (ناخن تراشنے) کے دوران ہی نہ لگائیں بلکہ روزانہ لگانی رہا کریں۔

○ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آپ کوئی خوب صورت پینٹنگ کر رہے ہوں، لیکن کیوس اگر صاف اور ہموار نہیں ہو گا تو پھر آپ کی محنت بھی بے کار ہو جائے گی۔

○ ناخنوں کی ہمواری کو آپ بڑی آسانی سے نل بفر کے ذریعے دور کر سکتی ہیں۔ یعنی اسے اپنے ناخنوں پر رکھیں کر، لیکن یاد رکھیں کہ مٹتے ہوئے اس کا رخ ناخنوں کی جڑوں کی طرف ہونا چاہیے اور اوپر کی طرف نہیں۔

○ ناخنوں کو کاٹنے یا مختصر کرنے کے لیے کبھی قینچی یا ریتی وغیرہ استعمال نہ کریں۔ اس سے آپ کے ناخنوں کی پلیٹ پر ضرب پہنچتی ہے اور ناخن برباد ہو جاتے ہیں۔

○ انہی انگلیوں کو چند منٹ کے لیے زیتون کے نیم گرم تیل میں تر کر لیں۔ یہ تراوٹ آپ کے کیوٹیکلز اور ہاتھوں کو ملائم کر دے گی اور ناخنوں کو مضبوط بنا دے گی۔

○ کوشش کریں کہ ناخنوں کی تراش کے لیے لوہے کی ریتی کی بجائے ایمری کی فائل استعمال کیا کریں۔ (ایمری ایک قسم کا نرم پتھر)

○ یہ فائل چونکہ نرم پتھر سے بنا ہوتا ہے اس لیے مٹتے وقت ناخنوں پر زور نہیں پڑتا اور وہ ٹوٹنے سے بچ جاتے ہیں۔

○ مردہ جڑے اور ٹوٹے ہوئے ناخنوں کو علیحدہ کرنے کے لیے بہت اچھی کیوٹیکل کریم استعمال کیا کریں۔ اس کے علاوہ اگر جلد دکھ رہی ہو اور ناخن سے باہر نکلی ہوئی ہو تو اسے اورن اسٹک کی مدد سے آہستگی سے پیچھو دھیل دیں۔

یاد رکھنے کی باتیں

یاد رکھیں کہ نل آرٹ شروع کرنے سے پہلے آپ کے ناخنوں کا صحت مند خوب صورت اور ہموار ہونا بہت ضروری ہے۔ اس آرٹ کی ابتدا اسے پہلے آپ کو دو چیزیں دھیان میں رکھنی ہیں۔

ایک بہتر اور عمدہ و اعلا معیار کے رنگوں کا انتخاب اس کے بعد آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ کس قسم کے رنگ آپ کی شخصیت، لباس اور ماحول کے لحاظ سے خوب صورت لگیں گے۔



# کرن کا دستہ خزان

خالہ جیلانی



پکائیں۔ آخر میں کیوڑا ڈال کر چولہا بند کر دیں اور گرم گرم سرو کریں۔

## کرمی شیر خرم

ضروری اجزا :

دودھ  
کرم  
چاول کا آٹا  
کیوڑا  
پتے بادام ناریل پھوہارے حسب ضرورت  
چینی  
باریک سویاں  
کھجی  
الابچی پاؤڈر

ترکیب :

دودھ کو ابال لیں۔ آدھا کپ ٹھنڈے دودھ میں چاول کا آٹا گس کر کے گرم دودھ میں شامل کر دیں اور چینی بھی ڈال دیں۔ فرانگ پین میں کھجی گرم کریں۔ اس میں سویاں اور بادام پتے ناریل پھوہارے بلی

## بادامی شیر خرم

ضروری اجزا :

دودھ  
باریک سویاں  
بادام پتے  
چینی  
کھویا  
کیوڑا  
کھجی  
الابچی (کئی ہوئی)  
بادام پتے ناریل  
کشمش پھوہارے  
ایک کپ

ترکیب :

ایک دسلی میں کھجی گرم کریں۔ الابچی ڈالیں۔ سویاں اور پتے بادام اور کشمش پھوہارے ڈال کر بلی آٹھ پر فرانی کریں۔ پتے ہوئے دودھ میں سویاں، میوہ، چینی ڈالیں۔ ابال آجائے تو بلی آٹھ پر کر دیں۔ پتے بادام، کھویا ڈالیں، بلی آٹھ پر پانچ منٹ

اور تیل بونے بنانا چاہتی ہیں تو خالی جگہوں پر نوک دار چنریا Tooth Pick کے ذریعے ڈیرائن بنائی جائیں۔

اگر Dots کے بجائے لانی لیکر بنائی ہے تو اس کے لیے نوک دار برش استعمال کریں۔ پھر اوپر سے نیل شافٹو کا ایک شفاف کوٹ چڑھالیں۔ تاکہ وہ ڈیرائن ناخنوں پر محفوظ ہو جائیں اور بگڑنے نہ پائیں۔ پھر خشک ہو جائے دیں۔

## سجاوٹ کے لیے بندی کا استعمال

پہلے تمام ناخنوں کو خوب اچھی طرح صاف کر لیں۔ کسی قسم کا داغ دھبہ نہ رہے۔ اس کے بعد بندیوں کے سائز اور ڈیرائن کا انتخاب کریں۔ اس انتخاب میں یہ بھی مد نظر رکھیں کہ آپ اسے سادہ ناخنوں پر استعمال کرنا چاہتی ہیں یا رتنے ہوئے ناخنوں پر۔ پھر نوئیزر کی مدد سے بندی اٹھائیں اور ناخنوں پر رتھتی چلی جائیں۔ پھر Sealing کوٹ لگا کر اوپر سے ہلکے ہلکے دیا دیں۔ تاکہ یہ اچھی طرح چپک جائیں۔

بندیوں کو اچھی طرح چپکائے رکھنے کے لیے کم از کم دو کوٹ ضرور استعمال کریں۔ ایک ناخن کے بعد ہی عمل دوسرے ناخنوں پر دہرائیں۔

آپ بندیوں کے آس پاس رنگ برنگے Dots کے لیے خال یا نوک دار چیز وغیرہ کا استعمال بھی کر سکتی ہیں۔

## چمک دار ناخنوں کے لیے

آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کے ناخن انتہائی چمک دار اور دلکش دکھائی دیں۔ اس کے لیے آپ اپنے ناخنوں کو تیز یا ہلکے رنگ سے پینٹ کر لیں۔ (آپ چاہیں تو انہیں بچل لک بھی دے سکتی ہیں۔)

اگر آپ اپنے ناخنوں کو کلاسیکل یا روایتی انداز میں سنوارنا چاہتی ہیں تو اس کے لیے زور رنگ کا انتخاب سب سے بہتر ہوگا۔

آپ کے سامنے وسیع انتخاب ہے۔ تیز رنگ سے لے کر ہلکے رنگ تک۔ سویرے لے کر شمع و خشک رنگ تک۔ یہ انتخاب آپ کی مرضی اور سلیقے پر منحصر ہے۔

## رنگ

○ ناخنوں کی سجاوٹ کے لیے بازار میں کسی خاص قسم کے رنگ نہیں ملتے، بلکہ وہی پولشر کٹر وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو عام طور پر آپ پینٹنگ میں استعمال کرتی ہیں۔

○ سیدھی یا خم دار لیکرس بنانے کے لیے نوک دار برش استعمال کریں۔ ڈیرائن کو شارپ کرنے کے لیے آپ باریک خلال یا اسی قسم کی کوئی نوک دار چیز استعمال کر سکتی ہیں۔

○ پینٹنگ اس وقت شروع کریں جب پہلا کوٹ مکمل طور پر خشک ہو چکا ہو اور پہلے کوٹ سے پہلے آپ کو بنیاد بنانے کے لیے بھی کوٹ (ت) کرنا ہوتا ہے۔

○ اور جب آپ نے اپنے ناخنوں پر کوئی ڈیرائن بنالیا تو اسے مکمل طور پر خشک ہو جانے دیں ورنہ رنگ بگڑ جائیں گے۔ ڈیرائن کے اوپر اسے محفوظ رکھنے کے لیے آپ ایک — کوٹ بھی کر سکتی ہیں۔

○ ان ڈیرائنز میں آپ خشک پھولوں، تکیوں، بنیاد یا موتیوں کا استعمال کر کے چار چاند بھی لگا سکتی ہیں۔

## خشک پھولوں کا استعمال

پہلا مرحلہ تو یہی ہے کہ اپنے ناخنوں کو خوب اچھی طرح صاف کر لیں۔ اس پر کسی قسم کا داغ دھبہ نہ رہے۔ ورنہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ پھر جہاں جہاں پر آپ خشک پھول چپکانا چاہتی ہیں وہاں Sealing کوٹ لگا دیں۔ پھر نوئیزر کی مدد سے پھول اٹھا کر مقررہ مقام پر چپکائی چلی جائیں اور جب یہ اچھی طرح چپک جائیں تو اوپر سے ایک اور کوٹ کر دیں۔

اب ناخنوں کو اچھی طرح خشک ہو جانے دیں۔ کچھ







شاعر بخاور حاصل پور

ہمارے گھر شروع سے خواتین اور شعل ہی آتے تھے لیکن پھر پچھلے سال سے میں نے کران بھی منگوانا شروع کر دیا۔ کران بہترین ڈائجسٹ ہے جس سے بہت سی لڑکیوں کو سیکھنے کو بہت کچھ ملتا ہے۔ کران میں یہ میرا دوسرا خط ہے پہلا خط شائع کرنے کے لیے شکریہ

اب بات ہو جائے کران کی تحریروں کی تو جناب سب سے پہلے بات کرتے ہیں ٹائٹل گرل کی۔ ٹائٹل گرل کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ سب سے پہلے حمد و نعت سے دل و دماغ کو معطر کرنے کے بعد ہیچے ”در دل“ پر اس ناول میں مجھے زری اور علیزے کا کردار بہت پسند ہے۔ پہلے دل اور شاہد بہت پسند تھا۔ حقیقت بھلنے پر کچھ خاص اچھا نہیں لگتا۔ زری کی محبت، عشق، جنون پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ واہ نبیلہ جی کیا بات ہے آپ کی۔ پہلے آپ میری فیورٹ رائٹر تھیں۔ پر ”در دل“ لکھنے کے بعد آپ میری موٹ موٹ موٹ فیورٹ رائٹر بن گئی ہیں۔ پلیز زری کے ساتھ براہ امت پیچھے گاسے دل اور شاہد کے مقدرمیں لکھنے گا۔ مدیہ حیات کے بدلے بدلے انداز بھی بہت پسند آئے۔

”دست کوڑہ گر“ میں زویہ کی بے وقوفی اور معصومیت پر غصہ آیا کہ وہ خرم کے ساتھ یونیورسٹی چل پڑی مغل اور خرم کو ایک دوسرے کو چڑانے اور غصہ دلانے والی حرکتیں اچھی لگتی ہیں۔ پلیز زویہ جی رو میلہ کے بھائی کے کیے کی سزا رو میلہ کو مت دیجیے گا۔ لیان کے دل میں رو میلہ کے لیے محبت نہیں تو ہمدردی ہی جگا دیجیے اور جلد از جلد لیان پر رو میلہ کا

بے قصور ہونا ثابت کر دیجیے اور پلیز تھوڑے صفحات بڑھا دیں اور کہانی کی رفتار بھی تیز کر دیں۔ اب بات کرتے ہیں مکمل ناول ”میں ندیا تم ساگر“ کی ہلکے پھلکے انداز میں معصومیت سے لبریز کہانی پڑھ کر بہت مزا آیا۔ بہت مہینوں بعد کوئی ایسی تحریر پڑھنے کو ملی جو دوسری تحریروں سے مختلف تھی۔ نازکی باتیں اور میر کی محبت بہت اچھی لگی۔ حسرت پر غصہ آیا اور حیرت بھی ہوئی کہ ایسے بھائی بھی ہوتے ہیں جو بہنوں کو اپنے ہاتھوں اندھے کنویں میں دھکیل دیں۔ بھائی تو بہنوں کا ماں ہوتے ہیں۔ ان کی عزت کے رکھوالے ہوتے ہیں۔ پر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو رشتوں کے تقدس کو پاگل کر دیتے ہیں۔

”اک بل فصلے کا“ فرحین اظفر کی تحریر پسند آئی۔ غانیہ کی زندگی کے نشیب و فراز پڑھ کر افسوس ہوا اور وقار پر غصہ بھی آیا۔ جو شخص محبت کا دعوے دار ہو اسے کمزور نہیں ہونا چاہیے ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ مرتضیٰ کا کردار پسند آیا۔ غانیہ کے دل میں اب بھی کہیں وقار کی محبت باقی رہی یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلی محبت انسان چاہ کر بھی بھلا نہیں سکتا۔

”وہ اک پری ہے“ میں اذان کی فرماں برداری پسند آئی اور فرزنان کی باتوں پر غصہ۔ پلیز رحمانہ جی کہانی کو آگے بڑھائیے۔ تین اقساط کے بعد بھی لگتا ہے کہ کہانی اپنی جگہ پر ٹھہری ہوئی ہے۔ سادوش گل کی تحریر ”بھول“ میں سب لڑکیوں کے لیے رہنمائی موجود تھی اور اس بار وہ کہانی سب سے زیادہ اچھی لگی وہ ہے فرحت شوکت صاحبہ کی ”وفا میری ضد“ پڑھ کر مزا آ گیا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔

افسانے سب بہت اچھے تھے اعتبار ذات تو بہت ہی پسند آیا۔ ”مڈر کے ابا“ پڑھ کے بھی ٹھہم ہی نہیں رہی تھی۔ ”بادلوں کے ورثے“ سے شریانو کی ڈائری میں تحریر اور شعور کی غزل پسند آئی۔ ”نمائے میرے نام“ کران خوشبو ”سب سلسلے بہت اچھے تھے۔ مجموعی طور پر کران اس دفعہ بہت بہت اچھا تھا۔

عاصمہ فرحین۔ کراچی

امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ بہت دن ہو گئے کران کی برس میں شامل ہوئے۔ اس دفعہ میں نے صرف قسط دار کہانیاں پڑھی ہیں۔ ”دست کوڑہ گر“ کی اگر تعریف نہ کی جائے تو زیادتی ہوگی۔ کہانی پڑھ کر محسوس ہو رہا ہے کہ کم از کم اس کی پوزیشن درمیانی حالت میں تو اچھی ہے۔ خیر نمل اور خرم کو ایک بہترین مضبوط کردار کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ آر فوہیہ خرم کا بھٹو زویہ سے بناتی ہیں۔ تو کم از کم مجھے ٹھہم نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہ کردار اس ناول کے شروع سے ہی تا صرف انٹرٹیننگ ہیں۔ بلکہ ہمیں تو اسے پڑھنے میں بھی اس لیے مزا آتا ہے۔ کہ اس میں نمل اور خرم ہیں۔

”در دل“ بھی شاندار جا رہا ہے۔ شاید نبیلہ جی نے علیزے کی نازک مزاجی سے آگاہی اس لیے کیا تھا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہا رہی ہیں۔ دل اور شاہد کا کردار حیرت میں مبتلا کر گیا۔ جبکہ کوئل سے یہی امید تھی۔ آتے ہیں۔ رحمانہ امجد بخاری صاحبہ کی جانب۔ ان کا نیا ناول میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ بلاشبہ ایک شاہکار ہے۔ میں کبھی بھی کہانی پڑھتے وقت شاعری پر دھیان نہیں دیتی۔ لیکن ان کی کہانی میں شاعری کے بغیر کچھ مزا نہیں خیر فرزنان اور اذان دونوں بڑے اچھے لگے۔

ایک عدد کہانی بھی ارسال کر رہی ہوں پڑھ لیجیے گا۔ اپنی آرا سے نوازیں کی تو خوشی ہوگی۔ مجھے آپ لوگوں پر تا صرف یقین ہے۔ بلکہ بھروسہ بھی ہے۔ کہ اگر میری تحریر اچھی ہوئی تو تا صرف چھپے گی۔ بلکہ واہ بھی پائے گی۔ اگر نہ چھپی تو میں ایک دوسری کہانی لکھوں

کی۔ محنت کروں گی۔ اور ایک دن اللہ نے چاہا تو میری پہلی کہانی کران میں ہی چھپے گی۔ اچھا نہیں مت اجازت دیں آئندہ پھر حاضر ہوں گی۔

فوزیہ شمرٹ۔ کجرات

اس بار کران سولہ تاریخ کو ملا۔ حسب روایت مائل اچھی لگی۔ اس کی آنکھوں کا میک اپ اچھا لگ رہا تھا۔

حمد و ثنا سے دل و ذہن کو منور کیا۔ انٹرویوز بھی تھوڑے سے اچھے تھے۔ کافی مشہور ہستیاں براجمان تھیں ”خالد انجم“ کی ملاقات اچھی رہی۔ ”مسیوین مسبلی“ کافی پرسکش شخصیت کی مالک ہیں۔ فہرست میں اک نگار ڈائری سب سے پہلے افسانہ ”مڈر کے ابا“ پڑھا بشری احمد نے کیا اچھا آئینہ تراشا ہے۔ پر مزاج پہلے تھے۔ بے اختیار ہنسی آتی رہی۔ مزے دار تحریر تھی۔ خوب انجوائے گیا۔

مکمل ناول فرح بخاری کا ”میں ندیا تم ساگر“ بہت اچھا لگا۔ میر کا کردار پسند آیا۔ بہت اچھا موضوع تھا۔ شاید کہیں ایسا ہمارے ملک میں بھی ہوتا ہو۔ دور جہالت کے کچھ لوگ ابھی بھی ایسی رسم و رواج کو پورا کر رہے ہیں۔ افسوس ہوا نازکی بھائی بھائی بھی یہ کہ ایک مکان کی خاطر اپنی بہن کو کھال بھی جن کا سایہ کے ڈرائے رچائے رکھا۔ نازکی قسمت اچھی تھی۔ جو میر جیسا معاملہ فہم انسان اس کی مدد کرتا رہا ہے اور پھر اسے اپنی عزت بھی بنالیا۔

”ایک بل فصلے کا“ غانیہ حسن بے چاری اک عرصہ وقار احسن کے محبت کے حصار میں رہی۔ غانیہ کو تو اسی وقت اپنی زندگی سے سمجھو نا کر لینا چاہیے تھا۔ جب وقار نے ماں بہنوں کے دباؤ میں آکر غانیہ کو چھوڑا دیا۔ ایسے ہی زندگی کے قیمتی سال برباد کر دیے تھیک ہے محبت چھڑ جائے تو سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر انسان کو یہ بھی تو دیکھنا چاہیے جو محبت میں دھوکا دے اس کو اک بل میں بھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ غانیہ کا زندگی کی طرف لوٹنا اچھا تھا۔ اور نازش جیسی لڑکیوں جب کسی اور کا مقدر کا ستارہ اپنے نام کر لیں



ہیں تو ان کو ہمیشہ اک شرمندگی کا احساس رہتا ہے۔ جو نازش و قار احسن سے لڑ جھگڑ کر نکالتی تھی۔ نہ خود خوش رہتی ہیں نہ دوسروں کو خوش ہونے دیتی ہیں۔ ماہوش گل کی ”بھول“ ”اچھی تھی۔ ایٹلا جیسی لڑکیوں کو جب تک ٹھوکر نہ لگے۔ زندگی انہیں سمجھ نہیں آتی۔ مدثر اور ایٹلا کے اتنے اچھے دوست تھے انہوں نے اچھی دوستی کا بھی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ اصل میں انسان کی فطرت ذرا مشکل سے ہی بدلتی ہے۔ ایٹلا جیسی لڑکیاں بھول جاتی ہیں۔ یہ مروت اپنا فائدہ نکال کر بے وقعت کر دیتا ہے عورت کو۔ یہ تحریر بھی ایک نصیحت تھی لڑکیوں کے لیے۔ جو اگر عمل کر لیں۔

”ہرک“ بھی اچھی کہانی تھی۔ سائرہ خاتون شکر ادا کریں کہ اپنی بیٹی — کو بہو نہیں بنایا۔ ورنہ ان کے گھر کا بھی ویسا ہی حال ہوتا تھا جو ماہم نے اپنے گھر کا کیا تھا۔

”وفا میری ضد“ ساری کہانی کا مزا کر کر اویا۔ جب باقی آئندہ دیکھا۔

عمیرہ گل کے افسانے کی شاعری اچھی تھی۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح حلا جواب تھے۔

”نامے میرے نام“ اس بار اچھا لگا۔ اگست میں رمضان شروع ہو چکا ہوگا۔ 28 اگست کو میرے بھائی عمران بٹ صاحب کی سالگرہ ہوتی ہے اللہ انہیں ڈھیروں خوشیاں عطا کرے۔

سب کو رمضان کی مبارک باد۔ ہم سب کو اللہ پاک توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس پر نور مینے کو نہایت ادب و احترام سے رخصت کرے۔ اور اپنے اعمالوں کو درست کرے۔ جن کی وجہ سے ہمیں نااہل حکمران مل رہے ہیں۔ اللہ پاک کرن کے تمام اشاف کو خوش و آباد کرے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت دیں ہم سب کو رب رحیم اپنی حفظ و امان میں رکھے (آمین۔)

ام روہان۔ عبدالحکیم

کرن چودہ کو ملا، مسروق اچھا لگا۔ حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد سب سے پہلے مستقل سلسلوں کی طرف دوڑ لگی اپنی غیر موجودگی افسوس کا باعث بنی

”اس کے بعد نبیلہ عزیز کا ناول ”در دل“ پڑھا علیزے کی حالت بہت دکھ ہوا جو بھی ہے وہ بے چاری تو بالکل بے قصور ہے اور زری کی اتنی شدید محبت کا انجام بھی دل ہولا رہا ہے۔

اس کے بعد فوزیہ یاسمین کی ”دست کوزہ گر“ پڑھی خرم کا نوسہ کو استعمال کرنا بالکل اچھا نہیں لگا، باقی ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔

فرخ بخاری کا مکمل ناول ”میں ندیا تم ساگر“ بہت اچھا لگا۔ باقی کا رسالہ پیسہ اور رمضان المبارک کی مصروفیت کی وجہ سے نہ پڑھ سکی ان پر بھروسہ ادا رہا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے کرن کو اسی طرح دل دینی رات چوکنی ترقی اور کامیابی سے نوازے۔ قارئین اور تمام اہل وطن کو دل کی کمرائی سے عید مبارک اللہ پاک وطن کو ایسی ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کر آمین۔ ثم آمین۔

ایٹلا گل خوشین گل۔ ایٹ آباد

خوب صورت ناسٹل سے سجا کر ڈائجسٹ پندرہ جولائی کی پینکی پیکی شام میں مل گیا۔ سب سے پہلے نبیلہ عزیز کا ”در دل“ پڑھا۔ دل آورا ناخت دل کیسے ہو سکتا ہے وہ بھی علیزے کے ساتھ۔ علیزے کی حالت بہت دل بست دھکی ہو۔ مریم اور جودت کے بارے میں ضرور لکھا کریں۔ ”دست کوزہ گر“ میں خرم اور زویہ کا ساتھ بالکل نہیں اچھا لگا۔ فوزیہ جی خرم اور نمل کے درمیان غلط فہمیاں ختم کریں۔ خرم اور نمل کے درمیان نفیہ کو لارہی ہیں۔

اس بار سب سے زیادہ جو ناول پسند آیا وہ فرحت شوکت کا ناول ”وفا میری ضد“ تھا۔ پہلی قسط بہت اچھی لگی۔ افسانوں میں نمو انوار کا ”فسانہ محبت“ بہت اچھا لگا۔ مکمل ناول دونوں اچھے تھے۔ لیکن فرخ بخاری کا زیادہ اچھا لگا۔

کرن کی راز کش کہیں ہیں؟ نازیہ جمائیکر، نازیہ امین، سعدیہ راجپوت، آمنہ ریاض، زائبہ رزاق، مریم عزیز ان سے کرن کے لیے لکھو میں پلیز۔ نایاب جیلانی کا بھی بہت شدت سے انتظار کر رہے ہیں عید کے شمارے میں نایاب جیلانی اور نبیلہ عزیز کے مکمل ناول

مردور ساس جیجیہ۔ باقی رسالہ کی بہت اچھا تھا۔ انبیہ انا اور نواب زادی سولگی کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ پلیز آپ دونوں ضرور کرن میں شرکت کیا کریں۔

نموثرین انوار۔ راولپنڈی

سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے میرے افسانے کو اس قابل سمجھا کہ وہ کرن میں شائع ہوا۔

اب آتے ہیں کرن کی طرف، ناسٹل بہت زبردست تھا کھر قل ساماڈل کاڈریس اور بیک گراؤنڈ کا کھر بہت ملتے جلتے تھے سپیلی کون کی فنائنک۔ ناول ایک ہی پڑھا ہے بہت زبردست تھا جبکہ دوسرا ناول دیکھا تو باقی آئندہ لکھا ہوا تھا اس لیے اس کو آئندہ رہی چھوڑا کہ ایک ساتھ پڑھوں گی۔ ”مجھ سے ملے“ میں ایٹلا کرن سے مل کر اچھا لگا کافی حساس معلوم ہوتی ہیں۔ ایک ریکویٹ کرنی تھی کہ ”مجھ سے ملے“ میں سدرہ سحر عمران سے بھی ملاقات کروائیے پلیز۔ ناول دونوں ہی کافی اچھے تھے۔ افسانوں میں ”مدثر کے ابا“ بہت مزے کا افسانہ تھا۔

صدف سلیمان۔ شور کوٹ شہر

کرن تب سے پڑھ رہی ہوں جب ”عشق آتش“ کی دوسری قسط تھی نہ جانے کیسا سحر تھا اس ناول میں لگتا ہے اب تک اس کے حصار میں بندھی ہوئی ہوں۔ کرن تو بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے بھی زیادہ انتظار کروانا ہے دس تاریخ سے لے کر پندرہ تک مسلسل پانچ دن انتظار کرنا پڑتا ہے اور جب ”کرن“ کی کرن ہم پر پڑتی ہے تو گویا سکون آجاتا ہے۔

اس بار بھی کرن پندرہ کو ہی ملا مسروق، ماڈل اور بیک گراؤنڈ دونوں ہی زبردست تھے۔ حمد و نعت کے بعد سیدھا اپنے فیورٹ ناول ”در دل“ کی طرف بڑھے۔ جس نے واقعی میں دل میں درد بڑھا دیا علیزے اتنے مشکل دور میں، آزار اتنا افسردہ اور دل آوز زری کے اتنے قریب ہو کر اس کے قریب نہیں رہ سکتا۔ یہ تینوں سوال مشکل ترین لگ رہے ہیں لیکن نبیلہ جی ان کے جواب آپ کے پاس ہیں پلیز

میری آپ سے ریلوے سٹ ہے یہ یہ میلوں سواں جلد سے جلد حل کر دے جیسے، ناول بہت ست جا رہا ہے تھوڑی اسپید پڑھا دیں۔ اگر علیزے، آوز زری اور دل آوز کو خوشی جلد سے جلد مل جائے۔

”دست کوزہ گر“ تو جیسے خرم اور نمل پر رک گیا ہے روز روز ایک ہی بات دہی، جھگڑا اور ایک دوسرے کو تاؤ دلانا فوزیہ جی آپ کو نہیں لگتا ہے جھگڑا بہت طویل ترین ہوتا جا رہا ہے۔ خرم جو زویہ کے ساتھ کر رہا ہے وہ بھی غلط حرکت ہے۔ کسی کی معصومیت کا اس طرح فائدہ اٹھانا بہت غلط بات ہے۔ فوزیہ جی پلیز شکایت خالہ کے معاملے کو بھی کلیئر کر دیجیے ایک ہی بات پڑھ پڑھ بند ہو رہا جاتا ہے۔

”وفا میری ضد“ فرحت جی آپ کا ناول تو زبردست ہے جس کی تعریف لفظوں میں ناممکن ہے بس اتنا کہوں گی اتنا اچھا ناول لکھنے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اگلی قسط کا انتظار شدت سے رہے گا۔ ”بھول“ ماہوش گل نے بہت اچھا لکھا سا بیجا ہے لڑکوں کی وجہ سے ہی آج ہمارا معاشرہ اور ہمارا مستقبل اندھیرے میں ہے اور ایٹلا جیسی لڑکیاں نہ جانے کیوں یہ بات بھول جاتی ہیں کہ وہ ایک مال کی بیٹی اور باپ کی عزت ہیں وہ عزت جس کو بنانے میں نہ جانے کتنے سال لگ جاتے ہیں اور ختم ہونے میں صرف ایک لمحہ۔

افسانے سارے اچھے تھے۔ مکمل ناول میں ”میں ندیا تم ساگر“ نے تو کرن کو چار چاند لگا دیے۔ میر جیسے لوگ واقعی عظیم ہوتے ہیں جو عزت کو محبت پر نفیث دیتے ہیں۔ اور وہ محبت بھی عظیم ہوتی ہے جو عزت کی حفاظت کرتی ہے۔ فرخ بخاری جی آپ ٹوکھا ہوا اور ایسے کمال کر رہے گا۔ ”فرحین اعظم کا ناول ابھی پڑھا نہیں اس لیے بھروسہ ادا رہا۔ مستقل سلسلے میں ”یادوں کے درختے“ اور ”مجھے یہ شعر پسند ہے“ میرے فیورٹ سلسلے ہیں۔ شاعری کی دیوانی ہوں۔ اس لیے رسالہ ملتے ہی سب سے پہلے یہ دو سلسلے پڑھتی ہوں۔

”یادوں کے درختے“ میں سارے انتخاب اچھے تھے۔ ”مجھے یہ شعر پسند ہے“ بہت پسند آیا۔ سارے شعر اچھے تھے۔ ”مکمل ناول“ تو پھر میکرانی



کر نہیں ہوتی ہیں۔ جس میں سب ہنسائے کی ضد میں ہوتے ہیں۔

”نامے میرے نام“ میں فوزیہ منظور اور کرن فاطمہ کا تبصرو اچھا لگا۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ تبصرو لمبا ہوتا جا رہا ہے تمام قارئین سے گزارش ہے کہ ہمارے رمضان کے مقدس مہینے میں اپنے ملک پاکستان کی سلامتی اور تمام مشکلات سے آزادی کی دعا کیجیے گا اللہ پاکستان کو تمام مشکلات سے دور رکھے (آمین۔)

نادرہ بیگم۔ راولپنڈی

حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہونے کے بعد آپ اور آپ کی جملہ عظیم کی سلامتی کے لیے ہزار بار دعائیں اور ان پر خالص قلبی محبت سے آمین۔

میں پاکستانی سے آپ کے ڈائجسٹ ”کرن“ کا مطالعہ کرتی ہوں ہر شمارے پر دل میں یہ امنگ انگڑائی لیتی ہے کہ کچھ نہ کچھ اپنی ڈائری سے آپ کے اور اپنے ڈائجسٹ ”کرن“ کے لیے ارسال کروں لیکن وقت کی قلت مجھے ہر مرتبہ ایسا کرنے سے روک رہی ہے مگر اس مرتبہ خود کو مجبور کر کے آپ کے نام اپنا محبت نامہ لکھنے بیٹھ گئی ہوں اور سوچا یقیناً ”آپ میری ڈائری کے ان چند اوراق کو بھی اپنے ہاتھ کی زینت بنائیں گی۔ کرن، بہترین رسالہ ہے اللہ اسے ترقی عطا فرمائے۔ یہ تبصرو شائع ہو گیا تو آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ آپ کی بزم میں حاضر ہوں گی اجازت دیں۔ اللہ ہم سب کی حامی و ناصر۔

مبہجی صدیق۔ نیسلا

میں کرن کی بہت پرانی قاری ہوں۔ جب میں 3rd کلاس میں تھی تب سے کرن زیر مطالعہ ہے حالانکہ اس وقت مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ مگر دھیرے دھیرے سمجھ آنے لگا۔ اب میں اس کی مستقل قاری ہوں۔ اب کچھ تبصرو کرن پر ”ورد دل“ بہت اچھا ہے۔ مجھے اس کے سارے کردار بہت پسند ہیں۔ لیکن زری کے عشق کی پاکیزگی بہت متاثر کرتی ہے۔ اور اسے دل آور شاہ لے گا؟ اگر نہیں تو بہت زیادتی ہوگی، آپ کا خیال کیا ہے؟

”دست کوڑہ کر“ بھی بہت اچھا ناول ہے۔ لیکن اس بار تو تو رومیلہ کے بارے میں بہت ہی محوڑا بتایا گیا ہے۔

”مدثر کے ابا“ بڑھ کر بہت مڑا آیا۔ ”میں ندیا تم ساگر“ بہت خوب تھا بس دھڑکا لگا ہوا تھا کہ میرا اور ناز ملے ہیں کہ نہیں لیکن اینڈ بڑھ کر خوشی ہوئی۔ ”فسانہ محبت“ میں شروع میں ہی ہٹا لگ گیا تھا کہ عینا عریضہ ہی ہوگی۔ لیکن یہ خیال کہ جس کو آپ چاہتے ہو وہ کسی اور کو چاہتا ہے اور آپ کو اس کی خوشی بھی مقصود ہو۔ یہ بہت روح فرسا ہوا ہے۔ ”بھول“ بھی بہت اچھی تحریر ہے صد شکر انیلا کسی ناقابل معافی نقصان سے دوچار نہیں ہوئی۔ اور ”وفا میری ضد“ کی اعلیٰ قسط کا بہت انتظار ہے۔ باقی تمام سلسلے مجھے بہت پسند ہیں اور میں اس سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔ خاص کر کرن کرن خوشبو سے۔

آخر میں ایک فرمائش کرنی تھی کہ مجھے 2002ء نومبر اور 2008ء مئی کا کرن چاہیے۔ کیا اب مجھے مل سکتا ہے۔ پلیز جواب ضرور دیجیے گا۔ اب اجازت دیں۔

نامعلوم

ماتا کہ پرانی قارئین کو ضرور شمارے میں جگہ ملنی چاہیے مگر نئی قارئین (میری جیسی) کو نظر انداز کرنا کہاں کا انصاف ہے یہ میرا پانچواں اور آخری خط ہے جب اک چیز ہوئی ہی رومی کی نذر ہے تو پھر لکھنے کا کیا فائدہ ہے؟ ہمارا گاؤں شہر سے کافی دور ہے۔ میں ڈائجسٹ بہت مشکل سے منگوا پاتی ہوں تو خط بار بار کیسے لکھ سکتی ہوں۔ ڈائجسٹ بھی چھپ چھپا کے بڑھتی ہوں گھر والے ڈائجسٹ کے بہت خلاف ہیں۔ لیکن کیا کروں بڑھنے کا شوق ہی اتنا ہے کہ حساب ہی نہیں۔ پلیز اب کی بار میرے خط کو کرن میں جگہ دے دیجئے گا نہیں تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

پہلے چار خط تفصیل سے لکھے تھے لیکن اب کی بار مختصر لکھ رہی ہوں شاید جگہ مل ہی جائے۔ اگر اب کی بار میرے خط کو کرن میں جگہ ملی تو اعلیٰ بار تفصیل سے لکھ کر بھیجوں گی۔